

[www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

دلپس آونشی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

جولائی 2015

[WWW.PAKSOCIETY.CO](http://WWW.PAKSOCIETY.CO)

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

محمد ان اعلیٰ  
معراج رسول

[WWW.PAKSOCIETY.COM](http://WWW.PAKSOCIETY.COM)



WWW.PAKSOCIETY.COM



55

سراغ

تنویر ریاض

مغرب کے ماحول اور مزاج میں بسی  
ناقابلِ داشت وبائی و غذائی قباحتیں

14

انگارے

طاہر جاوید مغل

سطر سطر رنگ بدلتی...  
ایک لہورنگ اور دل گداز داستان

7

چینی نکتہ چینج

مدبر اعلیٰ

قائیں کی کرم فرمایاں کج اداسی  
نامہ نیما، جیتیش، عنایتیں اور شکستیں

88

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بس

تھیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا  
ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

72

پرچی

کاشف زبیر

بھتے کی پرچی کا پڑا سرار معما  
جسے حل کرنے کا سہرا جلیل کے سر تھا

67

بد قسمت

بشری امجد

لحہ لہسنی خیزی کی جانب گامزن ایک  
اعصاب شکن کہانی کے لرزا خیز موڑ

143

بے ضمیر

جمال دستی

اس نوجوان کا المیہ جو ایک خاموش  
دیوار کی طسرح ساکت ممت

135

تلاش

سکندر علیم

وقت اور حالات کے تحت جسم کا  
شکار ہونے والے ایک شکاری کی پستا

131

رنگ وفا

امجد رئیس

ایک دیرینہ ہمد کی  
یکدم اجنبی ہو جانے کی تلخ نوائی

جلد 45 • شماره 07 • جولائی 2015 • ڈر سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے • خط و کتابت کا آدنا

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



مدیر اعلیٰ  
عذرار سول

WWW.PAKSOCIETY.COM

199  
قصہ جل  
نظار اعلیٰ

خون کی ہولی کھینے والے شریکوں اور  
راست گوانوں کے ٹکراؤ کی ہولناک کہانی

195  
خمیازہ  
سلیم انور

ایک بوڑھے شخص کا انتقامی جذبہ... مغرب  
پرستوں کی تندی و تیزی کا ایک اور شاخسانہ

158  
دل دل  
جبار توقیر

دوست کے گرد گھومتی گولن کے  
بارہ پارہ ہو جانے کا خولی ماحول

221  
بھوت کی واپسی  
محمد عارف آزاد

بھوتوں کے بھوت  
کی صورت واپسی کا سنسنی خیز ماجرا

218  
قطرہ خون  
ایس... انور

پراسرار ماحول میں تجسروں  
کر دینے والی مختصر کہانی...

215  
دیدہ دلیر  
بابر نعیم

باریک بین دہن کے مالک  
سراغ رساں کی جستجو...

000  
تراش و تراکیب  
ادارہ وقارین

اقتباسات گلدیاں مسکراہیں اور قہقہے  
سب کچھ آپ کی تفریح و تہنیت کے لیے

256  
ٹکراؤ  
مریم کے خان

زندگی کے لازوال اندھیروں  
میں روشنی کی کرن کے مستلاشی

232  
بھرا  
رؤف شام کوہلر

عقل و باطن کی گہرائیوں سے ہم کلام ہو  
تو ہر شخص خواہشات سے بالا رہ جاتا ہے

پبلشر و پریپر انٹر: عذرار سول، مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ٹیفنس کمیشنل ایریا، مین کورنگ، روڈ نمبر 75500

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY





عزیزانِ من... السلام علیکم!

لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ پر چٹا ٹریک بالکل قہم کیا۔ پولیس اور امدادی رضا کاروں کی نقل و حرکت نظر آئی پھر ٹریک رواں ہو گیا۔ پتا چلا کہ ایک پیاسا کبوتر غڈ حال ہو کر سڑک پر آگرا تھا۔ اس کے امدادی مرکز روانہ ہونے تک سب سوار سکون اور خاموشی سے کھڑے رہے۔ یہ ایک مہذب ملک کے مہذب شہریوں اور اہل کاروں کا رویہ تھا... رمضان المبارک کے مقدس مہینے کے آغاز میں یہاں کراچی میں بارہ سو سے زائد انسان موسمی سختی کی پتا پر موت کی آغوش میں چلے گئے۔ اندرونِ سندھ بھی موسم کی ہلاکت خیزی نے رنگ دکھایا لیکن کسی کے کان پر جوں نہ رہی۔ محترم وزیر اعلیٰ چار دن گزر جانے کے بعد اسپتال پہنچے۔ سیاسی حلقوں میں الزام تراشیاں اور پوائنٹ اسکورنگ ہو رہی ہے۔ شہر اور شہریوں کو یوں لاوارث چھوڑ دیا گیا ہے جیسے یہ برطانوی کبوتر سے بھی گزرے ہوں۔ گرمی کی حدت اور شدت تو بہر حال امر الہی ہے۔ اس کی ہلاکت خیزی میں اضافہ ہونے کے کچھ اسباب ایسے ہیں جو انسانی کنٹرول میں ہیں۔ بجلی کا نہ ہونا یا پانی کا نہ ہونا کہ یہ ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ یہ بات بجا کہ ہواؤں کا رخ ربُّ العزت کے اختیار میں ہے۔ کسی میں طاقت نہیں کہ سمندر کی طرف چلنے والی ہواؤں کا رخ پھیر سکے مگر گھروں سے اسپتالوں تک میں بجلی کی مسلسل فراہمی، خرابیوں کا پھرتی سے دور کیا جانا، پینے کے پانی کی فراہمی، ایسبوتیکس سروس، اسپتالوں میں ایمرجنسی کا مقابلہ کرنے کا بندوبست، دواؤں کی وافر فراہمی، میت گاڑیوں کی دستیابی اور آخری مرحلے میں جان سے گزر جانے والوں کے لیے ”مناسب داسوں“ پر دو گز قطعہ زمین کی فراہمی..... یہ سب انسانی اختیار و اقتدار کی بنیادی اور انتہائی اہم ذمے داریاں ہیں جن سے مختلف حیلوں بہانوں سے فرار لوگوں کی سرشت کا حصہ بن چکا ہے۔ اس فراری ذہنیت سے نجات حاصل کیے بغیر ہم کبھی بھی قومی سانحات سے خیر و خوبی سے نمٹنے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔ آجے محفل کا رخ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا شگون نے مکمل رہے ہیں اور کون سے مرجھا رہے ہیں۔

ہری پور سے محمد قاسم رحمان کی آمد ”جاسوسی میں ایک دو خط پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور اس بات کا پورا یقین ہے کہ تقریباً سب مجھے بھول چکے ہوں گے۔ کیونکہ امتحان اور اس کے بعد بیماری کی وجہ سے میں کافی ماہ غیر حاضر رہا۔ دودن میں بک اسٹال کے چھ چکر لگانے کے بعد جاسوسی 4 جون کی شام کو مل ہی گیا۔ ٹائٹل گرل شاید یہ سوچ رہی تھی کہ میرے آئیڈیل کا گھوڑا تو آگیا لیکن نہانے خود کب آئے گا۔ ساڑھ پر شاید اکبر شاہ جیلز ہو رہے تھے۔ ادارہ یہ پڑھنے کے بعد دوستوں کی محفل میں آیا جہاں اعجاز احمد راحیل بڑے کردار کے ساتھ براجمان تھے۔ ابن شمس کا مختصر مگر اچھا تبصرہ تھا۔ ساگر کوکر صاحب جاسوسی میں جیسی کہانیاں چھپیں گی ویسا ہی تو ٹائٹل ہو گا نا۔ اور یس احمد خان آپ اپنے آپ میں گمن رہتے ہیں کیوں جی۔ سمندر معاذ یہ آپ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں اور واقعی اب ہر کہانی تو زبردست نہیں ہو سکتی لیکن نارمل سے نکلے درجے سے بھی تو کم کہانی نہیں ہونی چاہیے نا۔ عرفان راجہ کا تبصرہ بھی بہتر رہا۔ محمد مرتضیٰ ٹائٹل گرل سے کہیں آپ تو نہیں بچھڑ گئے۔ ماضی کے اوراق پلٹے نا جی۔ نا درسیال آپ ہیچروں میں بھی جاسوسی پڑھتے ہو۔ زویا اعجاز، بتقیس خان اینڈ عبدالجبار کے تبصرے بہترین تھے۔ جان جانان اینڈ دبیر ویکم۔ کہانیوں کی ابتدا حسب معمول ادارہ گرد سے کی۔ زہرہ بانو کی داستان ختم ہوئی اور کہانی پھر سے اپنی پرانی ڈگر پر آگئی۔ اسپیکٹرم کا اضافہ اچھا ہے۔ احمد اقبال کی تحریر سونا چاندی کے بارے میں اتنا کہوں گا کہ کہانی پڑھنے کے بعد ایک ڈسپین کی گولی لینی پڑی۔ خونی تصویر پڑھ کر حیرت سی ہوئی۔ ایک مذہبی امام کے قتل کی وجہ سے ٹیم کا ٹوٹ جانا اور اسے قتل عجیب سی بات ہے۔ خونِ ناحق میں الفرید اپنے ہی جال میں پھنس گیا۔ خود کردہ بھی زبردست رہی۔ سراغ رساں کیروں نے بہت چالاکی سے ایس مینڈ وزاکو بے نقاب کیا۔ چہرہ شناس میرے فیورٹ رائٹر کی تھی۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ جولی پولیس اسپیکٹر تھی۔ شکار میں فریک نے خواہ مخواہ اندیشہ پال لیا جس کی وجہ سے اسے موت کی آغوش میں جانا پڑا۔ لیورنگ سرورق کی پہلی کہانی زبردست تھی۔ منبرین اور آمنہ بیگم کے کریکٹر پسند آئے۔ کاشف زبیر کی تحریر کی تعریف کرنا ایسے ہی ہے جیسے سورج کو چرائی دکھانا۔ گل نے دل کا پتا لگا ہی لیا تھا مگر افسوس..... لیکن زویا اور منصور کا انجام بہت بھیا تک ہونا چاہیے تھا۔ کتر نہیں اس بار کچھ خاص نہ تھیں۔“

اوکاڑہ سے سز فاروق بلوچ کی محبتیں ”میں جاسوسی کی اس وقت بھی قاری تھی جب 70ء کا زمانہ تھا اور میں ایک نو عمر بچی تھی اور آج بھی بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتی ہوں جبکہ میں خود جوان بچوں کی ماں ہوں۔ 45-40 سال کے اس عرصے میں تعلیم مکمل ہوئی، شادی ہوئی، کراچی شہر چھوٹا، رخصت ہو کر اوکاڑہ آگئی، پھر شوہر کے ساتھ وکالت مکمل کی۔ اس دوران ایک بیٹے اور پھر بیٹی کی نعمت سے اللہ نے نوازا۔ زندگی گزرتی جا رہی ہے مگر میکے کی لگی ہوئی ”لت“ ایسی لگی کہ آج تک پہچانہ چھڑا سکی اور اب بھی اتنی ہی باقاعدگی سے جاسوسی پڑھتی ہوں۔ میرا یہ خط کسی مخصوص شمارے کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی میرے لیے ممکن ہے کہ میں باقاعدگی سے چینی نکتہ چینی کی محفل میں شریک ہو سکوں، لیکن اگر میرے خط کو آپ کی محفل میں جبکہ ملی تو کبھی کبھی خط لکھنے کی جسارت کر لیا کروں گی۔ ورنہ جاسوسی سے رشتہ تو مرتے دم تک رہے گا، انشاء اللہ۔ تقریباً آدمی صدی کے اس عرصے میں جاسوسی نے اپنا معیار جس طرح قائم رکھا، اس کے لیے آپ اور آپ کی تمام ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے کیونکہ بہر حال یہ آپ سب کی کاوشوں کا ثمری تو ہے۔ میرے پسندیدہ ترین معنف علیم الحق کے لیے سلام اور ڈیروں دعا کریں۔ (وہ عالم فانی سے کوچ کر چکے ہیں، دعا کریں) ذاکر صاحب نے جاسوسی کا ”چہرہ“





ہمیشہ اپنے رنگوں سے جوان رکھا ہے۔ ان سے صرف اتنی درخواست ہے کہ وہ اپنے برش سے مزید کام لیتے ہوئے سرورق کی یکسانیت کے تاثر کو بدلیں تاکہ سرورق پر لکھی جانے والی کہانیاں بھی شاہکار ثابت ہوں۔ مصر کی تاریخ و تہذیب کی پراسراریت اور اہرام کی کشش، دوسری جنگ عظیم اور اقوام اسلام کے خلاف ہندو یہود کی سازشیں، خاص طور پر اسرائیل کی نفرت، ظلم اور مکاریاں اور نیچے مظلوم فلسطینی مسلمانوں کی اپنی بھائی کوششیں۔ اور سب سے بڑھ کر اپنے پیارے وطن پاکستان کے سر سے کفن باندھ کر دشمن بھارت ایجنسیوں کی ناپاک اور مذموم سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے افواج کے جوان، یہ ہیں وہ موضوعات جن پر وقتاً فوقتاً جاسوسی کے صفحات پر دل کو چھوتی ہوئی تحریروں کی اشد ضرورت ہے، اگرچہ یہ موضوعات پہلے بھی شامل ہوتے رہے ہیں مگر یہ میرے انتہائی پسندیدہ موضوعات ہونے کے ساتھ ساتھ آج کے وقت اور حالات کی ضرورت بھی ہیں تو آپ اس طرف خصوصی توجہ دیں بلکہ میری آپ سے شہید خواہش کا اظہار ہے کہ مصری تہذیب پر ایک طویل کہانی جلد از جلد جاسوسی کے ابتدائی صفحات میں ضرور شامل کریں تو دل سے دعا لگے گی آپ کے لیے۔ طاہر جاوید مغل نے جس طرح محبت کے جذبے کو اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے اس نے حساس دلوں کی گہرائیوں کو چھو لیا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ محترم محمود احمد سودی صاحب، سرکش، کے بعد مزید کوئی سرکشی نہ دکھائے اب تک۔ منتظر ہیں ہم۔ باقی تمام لکھنے والے اپنی اپنی کاوشوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان سب کی درازی عمر اور درازی قلم کے لیے دعا کریں۔ آپ نے کچھ عرصہ پہلے نئے لکھنے والوں کے لیے فرمایا تھا کہ وہ اپنی کہانیاں جاسوسی ڈائجسٹ کے پتے پر روانہ کریں۔ مناسب اصلاح کر کے شائع کر دیا جائے گا، کیا میں یہ جرات کر سکتی ہوں؟“ (خوش آمدید)

کراچی سے حسن افضال کی شکایت ”طویل عرصے سے جاسوسی ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ چند ماہ پیشتر بھی ایک خط ارسال کیا تھا جس میں ”انکارے“ کے مصنف/خالق کا نام طاہر جاوید مغل میں نے بھی بوجھا تھا لیکن جون کے شمارے میں میرا نام موجود نہیں ہے۔ (معذرت... بڑی تعداد میں آئے ہوئے خطوط کی چھانٹی میں سہواً غلطی ہو گئی ہوگی) بہر حال جاسوسی ایک معیاری رسالہ ہے اور اس کا مطالعہ میں بڑی دلچسپی اور انتہاک سے کرتا ہوں۔ آوارہ گرد بہت اچھی جا رہی ہے۔ میری طرف سے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کو مبارکباد پہنچا دیں۔ دوسری کہانیاں بھی معیاری اور دلچسپ ہیں۔ ٹائٹل ہر ماہ کی طرح اس مرتبہ بھی دیدہ زیب ہے۔ میری تجویز ہے کہ ایک طویل اور سسٹمز سے بھرپور کہانی کا سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ سری ادب کے شائقین بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ میری دعا ہے کہ آپ اسی طرح جاسوسی ڈائجسٹ میں انمول کہانیاں پیش کرتے رہیں اور قارئین ان سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔“

غلام یسین نوناری، چوک سرور شہید سے لکھتے ہیں ”جون کا شمارہ 3 تاریخ کو ملا۔ سرورق میں دور ماضی کا ہلکا سا عکس نظر آیا۔ مسند صدارت پر اعجاز احمد راحیل جلوہ افروز تھے۔ تبصرہ پڑھ کر ان کی قابلیت کے معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ الفاظ کا چٹاؤ، جملوں کا استعمال اور ان میں ترتیب کسی مجھے ہوئے تبصرہ نگار کی خاصیت ظاہر کر رہی تھی۔ چشمہ بیراج سے ساگر تکو کر کا دھیمادھیماء انداز گہری کاٹ لیے ہوئے تھا۔ مظہر سلیم ہاشمی کی دوبارہ آمد خوش آئند رہی۔ طاہرہ گلزار، زویا اعجاز اور بلقیس خان نے عمدہ تبصرے تحریر کیے۔ اپنے دوست محمد زبیر حسین کو پہلا تبصرہ شائع ہونے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اب کچھ بات ہو جائے کہانیوں پر۔ سونا چاندی، احمد اقبال کی پڑھ کر مرے بعد چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ کہانی میں صائمہ کا کردار بہت پسند آیا۔ مسیحا کا آخری حصہ بہت سے راز افشاں کر گیا۔ اس قسط نے سابقہ دو قسطوں کی طمانی کردی۔ کہانی کے اینڈ نے رلا دیا۔ آوارہ گرد میں شفیق شاہ اور زہر بانو کا ماضی اختتام کو پہنچا اور شہزی قل ایکشن میں نظر آیا۔ اول خیر کو بیگم صاحبہ کی طرف سے کڑی سزا ملی اور شاید اب شہزاد بھی بیگم والا سے دور رہے۔ آخر میں لگتا ہے شوکی کو کوئی ٹکی ہے۔ صحیح صورت حال اگلے ماہ معلوم ہوگی۔ رنگوں میں انوار صدیقی چھا گئے۔ کاشف زبیر بھی لازوال تحریر لائے۔ مختصر کہانیوں میں چہرہ شناس مریم کے خان، شکار، سلیم انور اور خونِ ناحق، بابر نعیم بے حد پسند آئیں۔ اگلے مہینے کے شمارے کا شدت سے انتظار رہے گا۔“

ساہیوال سے محسن علی طاب کی حاضری ”جاسوسی ساہیوال میں 10 جون کو ملا۔ تبصرہ حاضر خدمت۔ ٹائٹل شمارے کے حساب و کتاب سے موزوں تھا کیونکہ جب شمارہ پڑھا تو ٹائٹل معقول لگا۔ پہلے شربت نولاد سے جان بنائی۔ پھر جلدی سے نکتہ چینی پر آپہنچے۔ ساہیوال سے اعجاز احمد کی دستک پڑھ کر واقعی گیلی گیلی محسوس ہوئی۔ طاہرہ جی نے بال کی کمال اتاری سب کو اچھی اچھی سنائی۔ جان جاناں جی ویگم۔ انعام حاصل کرنے والوں کو مبارکباد۔ مسیحا محمد الدین نواب نے کہانی کا اینڈ ایسا کیا کہ ہم رنجیدہ ہو گئے۔ آوارہ گرد اگر شمارے کی مسکور کردینے والی تحریر نہ کہیں تو نا انصافی ہوگی۔ بے شک اس کہانی کو انعام ملنا چاہیے۔ اس نے عوام کی آنکھوں پر بندھی پٹی اتارنے کی اپنی کوشش کی۔ لہورنگ کی کچھ سمجھ نہیں آئی کہانی کہیں جا رہی ہے لکھا کچھ اور ہے۔ خواب سراب فرہاد کا کردار پسند آیا۔ اس نے اینڈ پر سر پر اتر دیا۔“

میانوالی سے احسان سحر کی سحر انگیزی ”ٹائٹل کا جائزہ لیا۔ پھول کی پتیوں سا نرم و نازک خوشبودار وجود لیے مصنف نازک نے ساری سستی پل میں دور کردی۔ بھاگتا گھوڑا اور کانٹوں کی یاد ہمیں انتہاء کرتے نظر آئے کہ آگے آنا خطرناک ہے، اپنی حدود میں رہو۔ ہم جیسے بے چارے لوگ دور ہی سے نظارہ کر کے دل کو اطمینان دلاتے رہے کہ آئے گا ایک دن اچھا وقت بھی..... گھبراہٹاں اے دل ناداں۔ خطوط کی محفل میں دل کا گھویا ہوا قرار بحال کرنے آپہنچے۔ پیارے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ کچھ حسد رکھنے والے بھی موجود تھے۔ خیر چھوڑیں۔ طاہرہ گلزار کی آمد گویا بہار کی آمد کے مصداق اچھی لگی۔ بلقیس خان آپ کے بھائیوں کا سن کر جو دکھ ہمیں ہوا اس کا اظہار الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہر دم دعا ہے کہ اللہ پاک مرحومین کے درجات بلند فرمائے اور آپ اور آپ کی فیملی ممبرز کو ذہنی سکون عطا فرمائے، آمین۔ زویا اعجاز کا بھی اچھا تبصرہ رہا۔ میں جاسوسی کے توسط سے رضوان خونی کو جاسوسی میں خوش آمدید کہوں گا۔ کہانیوں پر تبصرہ ہو جائے تو سب سے پہلے احمد اقبال کی بزدلی سیریز سے اشارت لیا۔ ابتدا سے ہی قہقہوں کی برسات نے ذہن و دل کو بکڑ کر ساری کوفت پل میں دور کردی۔ خوشی کی جتنی پراسرار انداز سے کشدگی ہوئی اتنی ہی آسانی سے بازیابی بھی ہو گئی۔ کوئی پاپڑ نہیں بیٹنے پڑے۔ ہلکے پھلکے اور مسکراتے انداز کی اچھی کاوش رہی۔ ہم تو خوشبو میں خود کو بھگو نے کے عادی ہیں اور خوشبو آج کے دور میں مشکل سے ملتی ہے۔ خوشبو (محبت) جو



من میں اتر جائے۔ پہلا رنگ، بہت ہی خوب صورت کہانی رہی۔ حساس رشتوں کی حامل۔ اور یہ رشتے غلط فہمیوں، حرم و حوس اور لالچ کی نذر ہو کر بہت دور چلے گئے ایک دوسرے سے۔ بیٹا ماں کا نہ رہا۔ باپ بیٹے کا نہ رہا۔ بڑوں کی کرنی بچوں کو بھگتنی پڑی۔ خوب صورت الفاظ اور تلخ سچائی کا حامل رنگ اچھا رہا، ویلڈن۔ خوابوں کے پیچھے بھاگنے والے سراپوں کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ اور ایسا ہمیں دوسرے رنگ میں پڑھنے کو ملا۔ ایسے اونچے خواب جب ذہن میں پیدا ہو جائیں تو انسان انہی کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے تو ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔ منصور اور زویا کی لالچی فطرت نے ایک کی جان لی۔ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناتی۔ بچتا کوئی بھی نہیں برے کام کر کے۔ آوارہ گرد، ماضی سے نکل کر حال کی طرف بڑھتی ہوئی یہ قسط پھر سے اپنے ڈگر پر کا مزن ہے۔ اسپیکٹرم کے ناپاک منصوبے اور بہت کچھ ظاہر ہونا ابھی باقی ہے جس سے کافی دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ خون ناحق، کر برا ہو گا برا۔ الفریڈ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ خون ناحق کبھی چھپتا نہیں۔ نہ بھانے والا کبھی چھپا ہے اور نہ سزا سے بچا ہے۔ سیجا بھی آخر اختتام کو پہنچی۔ آخری حصہ کافی طویل اور دلچسپی سے بھرپور رہا۔ اچھائی زندہ رہی اور لالچ و بدی اختتام کو پہنچی۔ خونی تصویر، تجسس سے بھرپور شاہکار کوشش تھی۔ جیلسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر انسان ہمیشہ برے ہی کام کرتا آیا ہے۔ جن میں قتل کرنا بھی شامل ہے۔ بعض سچ ہمیشہ تاخیر سے ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ اس وقت کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا ہے، دوسری وصیت میں بھی کچھ ایسا ہی رہا۔ عورت کی عورت سے جیلسی ازل سے ابد تک رہے گی، چاہے بہن کے روپ میں یا..... اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کی ہمیشہ ضرورت نہیں رہتی انسان کا کردار بھی اسے بلند کرتا ہے اور ہم پاکستانی لوگ کتنے بلند اور اعلیٰ کردار کے مالک ہیں یہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے۔“

منظر آباد، آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کی باتیں ”ٹائٹل خوب صورت اور جاسوسی کے عین مطابق تھا۔ چینی نکتہ چینی میں ادارے سے مستفید ہوتے ہوئے خطوط پر نظر دوڑائی۔ اعجاز احمد راحیل کو براجمان پایا۔ ان کی گیلی گیلی تحریر بہترین ثابت ہوئی۔ اعجاز بھائی نیک خواہشات اور دعا دینے پر شکر گزار ہوں۔ مرتضیٰ احتشام، زویا اعجاز، بلقیس خان، عبدالجبار رومی کے تمبرے بہت پسند آئے۔ منظر سلیم ہاشمی کی واپسی بھی بہت اچھی رہی۔ میں تمام احباب کا جنہوں نے میری امی جان کی مغفرت کی دعا کی اور مجھے یاد رکھا، تہ دل سے مشکور و ممنون ہوں۔ جنہوں نے مجھے تاجپڑے کو اپنے الفاظ میں جگہ دی۔ سب سے پہلے آوارہ گرد کا مطالعہ کیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے مشکور ہیں جنہوں نے اتنی اچھی تحریر کو ہمارے لیے سجا یا۔ بیگم صاحبہ اور لیتھ شاہ کی داستان کا اختتام ہوا۔ اب اول خیر کی داستان کے آثار نظر آرہے ہیں۔ یہ قسط ایکشن سے بھرپور رہی جو کہ حقیقتاً پسند آئی۔ لہورنگ، انوار صدیقی کی تحریر بھی بہترین ثابت ہوئی۔ برجیس ناز کے حالات پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ بے جاری ساری زندگی دکھ اٹھاتی رہی اور آخر کار موت کو گلے لگایا۔ یعنی اور ساجد کا رشتہ چونکا دینے والا ثابت ہوا۔ البتہ اس کہانی میں احتشام احمد کی موت کا کوئی واضح ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ کہانی کی منظر نگاری اور کرداروں سے پورا پورا انصاف اور بہترین اتار چڑھاؤ، مزہ آ گیا پڑھ کے۔ خواب سراب، میں کاشف زبیر صاحب نے قلم کا حق ادا کر دیا۔ جاگتی آنکھوں کے خواب واقعی سچ ثابت نہیں ہوتے۔ گل کا کردار بہت جاندار تھا۔ اتنی نڈر اور دلیر لڑکی چراغ لے کر ڈھونڈ تو نہیں ملتی۔ فرہاد کو کہ جاہل اور اجڈ آدمی تھا پر دل کا بہت اچھا ثابت ہوا۔ مجموعی طور پر دونوں سرورق بہترین رہے۔ سونا چاندی میں، احمد اقبال صاب نے بزدل سے ملاقات کرائی۔ کافی عرصے بعد ملے، سو یہ ملاقات یادگار ثابت ہوئی۔ پرمزاح جیلے اور بزدل، صائمہ کی نوک جھوک لیوں پر مسکراہٹ بکھیرتی چلی گئی۔ ہنسی، مسکراتی یہ تحریر بہت پسند آئی۔ مختصر کہانیوں میں، خون ناحق، بیوی، دوسری وصیت بہت پسند آئیں۔“

معراج محبوب عباسی کی خبریں ہری پور ہزارہ سے ”بات کرتے ہیں کچھ جاسوسی ماہ جون کے سرورق کی تو وہ کھوپڑی در کھوپڑی بنا ہوا نظر آیا۔ لڑکی نہایت معصوم تھی جبکہ صنف مخالف کے دماغ میں شیطانی چال جس کی غمازی کارنر میں موجود گھوڑا کر رہا تھا۔ اس لیے ڈاکرا نکلنے درمیان میں کانٹے دار باڑ لگانا ضروری سمجھا۔ اب پیش خدمت ہے۔۔۔ نکتہ چینی فیشن، آپ تک پہنچانے کے لیے تعاون کیا ہے جاسوسی ڈائجسٹ نے، فیشن میں آپ کو خبر دیں گے کہ اس مرتبہ جاسوسی میں فہرست گوئیں اور منفرد انداز میں پیش کیا گیا۔ ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل ماضی میں کھوئے نظر آئے۔ راحیل صاحب! میری اور نکتہ چینی کی پوری ٹیم کی طرف سے مبارک باد۔ اس کے علاوہ ہماری ٹیم، کراچی سے ابن شمشاد، خانیوال سے صفدر معادیہ، راولپنڈی سے عرفان راجہ۔ جنگ سے مرتضیٰ احتشام، پشاور سے طاہرہ گلزار، عبدالجبار رومی انصاری لاہور کی بھی بے حد مشکور ہے کہ انہوں نے خبر نامہ پسند کر کے نکتہ چینی نیوز کی رینٹنگ میں زبردست قسم کا اضافہ کیا۔ پشاور سے طاہرہ گلزار صاحبہ! سرکاری چینل کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ مرتضیٰ احتشام صاحب جو اُن نہیں، کیا اللہ نے دے دیا ہے وہ بھی چھپر پھاڑ آفر۔ میرا مطلب ہے چھپر پھاڑ کے۔ خبروں کو ٹیشن کا حصہ بناتے رہیں گے یہاں پیش ہے نکتہ چینی خوش خبر جس کے لیے تعاون کیا ہے طاہرہ جاوید مغل نے جبکہ شریک اسپانسر ہیں مگی الدین نواب۔ جاسوسی کے اولین صفحات پر طنز و مزاح کے طوفان باد و باران کے ساتھ رومانس کی ہلکی پھلکی ٹالہ باری بھی دیکھنے کو ملی۔ دوسری جانب مسحا کے صفحات پر بوریٹ کی گرم لوچلتی رہی۔ اس کے علاوہ آوارہ گرد کے ایکشن چمن میں ہر سو بہار دیکھنے کو ملی اور سنسنی خیزی کی موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ اسی موسم نے ہی بابر نعیم کو نیا آئیڈیا دیا اور انہوں نے خون ناحق نامی شاہکار اختصار یہ جاسوسی قارئین کے لیے پیش کیا اور اس میں بھی الفریڈ کی گرفتاری کا موجب یہی بے ایمان موسم بنا۔ اگر بارش نہ ہوتی تو الفریڈ کا منزل سے فاصلہ دوگام بھی نہیں تھا مگر آہ ٹوٹی کہاں اس بے چارے کی کند۔ سلیم انور کی شکار میں شکار کون تھا اور شکاری کون اور شکار کس نے کیا اور کس کو کرنا تھا اس ”کون“ اور ”کس“ میں دماغ اس بری طرح الجھا کہ ہمارے نیوز ڈیسک کو بھی اس خبر کی سمجھ نہیں آ سکی۔ ہاں اس میں جو بات ہے وہ یہ کہ کہانی شروع ہوتے ہی ایک لاش دریافت ہوئی اور کہانی کے آخر میں لاش دریافت کرنے والے کو بھی لاش میں بدل دیا گیا۔ تاکہ اگر اس کہانی کا سیکولر یعنی شکار ٹوہنے تو اسٹارٹ میں لاش موجود ہو۔ سرورق کے دونوں رنگ اس مرتبہ معروف قلم کاروں کے قلم سے تحریر کردہ تھے مگر کچھ نئی مصروفیات کے باعث ہمارا نیوز ڈیسک ان کے متعلق مستند خبر تیار نہیں کر رہا اس لیے مصنفین سے ولی معذرت۔ خبروں کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے اگلے نیوز ٹیشن تک اجازت۔“

اسلام آباد سے سید کھلیل حسین کاظمی کی سرخوشی ”پورا سال توجہ، لگن اور ایمانداری سے کی گئی محنت کا صلہ ملا ہے کہ یکم جولائی کو میں اٹھائیس سال کا



قرار دے دیا گیا ہوں۔ حالانکہ پچھلے سال ہی میں سٹائیکس کا تھا۔ (واقعی میں یہ تو کمال ہے) تمام تر مصروفیات کے باوجود جاسوسی ڈائجسٹ اس دفعہ جون کی سات تاریخ کو خریدنے کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ سرورق پر تبصرہ عموماً نہیں کرتا مگر اس دفعہ خزاں رسیدہ مردکی سوچ کا گھوڑا دوڑاتا ہوا دیکھ کر ذرا کرا صاحب کے فن کا معترف ہونا پڑا۔ نیچے موجود کانٹے یقیناً دو شیراز سرورق کی زباں سے جھڑے ہوں گے، ماشاء اللہ۔ کیا حقیقت کے قریب سرورق سجایا گیا ہے اس دفعہ۔ اس کے بعد بلا توقف چینی نکتہ چینی کا رخ کیا۔ اپنے سائیوال دے بھائی وال جناب اعجاز احمد راجیل کا ابتدائی تبصرہ دیکھ کر خوشی سے آنسو میں آنکھوں آگئے (ضرورت صحیح ندارد)۔ بہت جامع اور مکمل تبصرہ تھا۔ خانیوال سے برادر محمد صفدر کے تبصرے میں ادارے نے بہت اچھی وضاحت کر دی کہ مصنف کی ہر کہانی شاہکار نہیں ہوتی اور ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں مگر آپ بھی اس حقیقت کو دیکھیں کہ مصنف کی ہر کہانی "دیوتا" بھی نہیں ہونی چاہیے۔ محب وطن پاکستانی کا تبصرہ بہت خوب اور حب الوطنی سے لبریز تھا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ آپ نے میرے متعلق عجیب بات کی ہے ورنہ لوگ تو سمجھتے ہیں میں نے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ جما یا ہوا ہے اللہ بخشے فرہاد علی تیمور کی طرح۔ ڈیرہ امراد جمالی سے زبیر حسین شیخ اور ضلع دیر سے اعظم خان کی پہلی دفعہ شرکت پر خوش آمدید۔ واہ کینٹ سے بلقیس خان صاحبہ کا سوگوار تبصرہ ملاحظہ کیا۔ آپ کے گزشتہ تبصرے میں آپ کی ذاتی زندگی کے حالات و واقعات نے اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ الفاظ اور تسلیاں حق ادا نہیں کر سکتیں نہ کوئی تعزیت جو قیامت آپ پر گزری ہے۔ مگر مہر و رضا ہی انسان کا اختیار ہے اور تاخیر کے لیے انتہائی معذرت۔ اس کے علاوہ عہدالہجبار رومی، عرفان راجہ اور زویا اعجاز کے تبصرے پسند آئے۔ کہانیوں کی بات کی جائے تو پہلی دفعہ قسط دار نادل چھوڑ کر کاشف زبیر صاحب کے دوسرے رنگ کا مطالعہ کیا۔ کہانی اچھی تھی اور کاشف زبیر صاحب کا روایتی انداز... لیکن اتنی اچھی نہیں تھی جیسی ہم توقع کر رہے تھے۔ ابتدائی صفحات پر احمد اقبال کی سونا چاندی بہت جادو کار کہانی رہی۔ انجام کو کہ بہت ہی غیر متعلقہ سا محسوس ہوا کیونکہ سونا چاندی اچانک فک پڑے تھے کہانی میں مگر ساری کہانی میں طرافت بدرجہ اتم موجود تھی۔ سکندر عظیم کی مختصر کہانی خود کردہ مزہ دے گئی۔ سراغ رسی کی چھوٹی سی داستان۔ کہانی کا نام اور پھر ایلس کا کیرول سے اتنا آسانی سے تعاون اور تمام جزئیات کا تفصیل سے بیان کرنا ہی اسے مشکوک کر گیا تھا کہ یہ خود ساختہ ڈکیتی ہے اور ایلس ہی اس میں ملوث ہے۔ عمدہ کاوش تھی۔ سب سے آخر میں عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد کا مطالعہ کیا۔ صد شکر کہ کہانی در کہانی سے بات نکل کر اصل کہانی تک پہنچی۔ اسپیکٹرم اور پاور کی رسائشی میں بیوٹسی بھی شامل حال ہو گئی۔ اب یہ جنگ کافی اوپر کی سطح پر لڑی جانے والی ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ امید ہے بھٹی صاحب اس کا ٹیپو اور معیار برقرار رکھیں گے۔ مسیحا کی آخری قسط نے بھی خوب لطف دیا۔ جی میں نے کہانی پڑھنے کا نہیں کہا صرف "آخری قسط" لکھا پڑھ کے ہی لطف آ گیا کیونکہ اب اس کی جگہ اگلے ماہ طاہرہ جاوید مغل صاحب کی انکارے جاسوسی کی زینت بن رہی ہے۔"

چار سہ سے مسٹر جان جاناں کا اظہار "اس پھلپاتی دھوپ میں جاسوسی کا ملنا کسی نرم چھاؤں اور ٹھنڈے شربت سے کم نہیں۔ سو ہم بھی جاسوسی کو ہاتھ میں لینے کے بعد ایسے پُر سکون ہو گئے جیسے کہ..... باقی کی تشبیہات آپ خود ڈھونڈ لیں۔ سرورق پر ایک البیلی حسینہ اپنے گلابی ہونٹوں، ستواں ناک اور نکلی آنکھوں سے کسی جانب مچھوٹا شاتھی جبکہ اس کے گرد خاردار تار کی موجودگی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ بچہ منوہ ہے لیکن دل ناداں بھلا کب ان زنجیروں سے گھبرانے والا ہے کہ میں آدم زاد ہوں مجھ کو بہک جانے کی عادت ہے۔ سوان دیدہ و نادیدہ زنجیروں کی پروانہ کرتے ہوئے ہم نے اپنا چہرہ، مذکورہ خاتون کے عین کان کے درمیان گھسیڑ دیا۔ بہر حال کچھ سن کن لینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ دماغ کے گھوڑے کو سر پٹ دوڑانے کے باوجود محترمہ کی سنجیدگی کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آ سکی سو آسان کام کرتے ہوئے صفحات پلٹ دیے۔ چینی نکتہ چینی میں اعجاز احمد کی گیلی گیلی تحریر مزہ دے گئی۔ تبصرہ واقعی جادو کار تھا۔ ابن شمس ادا ہمارے لیڈروں کو ہمارے خون کا چمکا لگ چکا ہے۔ ساگر لکھو! ہمیں آپ سے اتفاق ہے، یہ منطق ہماری بھی سمجھ میں آج تک نہیں آئی۔ عرفان راجہ بھی بجلی اور مہنگائی کا رونا روتے رہے۔ مظہر سلیم ہاشمی کو دوبارہ خوش آمدید! محب وطن پاکستانی کی رائے ہمارے بھی دل کی آواز ہے اگر انگریزی کہانیوں کے بجائے دہی کہانیاں شامل کی جائیں تو بہت ہی اچھا ہوگا، ایسی کہانیاں پڑھتے ہوئے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ البتہ ابتدائی صفحات پر کسی مشہور مصنف کی ترجمہ شدہ کہانی ہو تو مزہ دو بالا ہو جائے گا لیکن ساتھ ہی مصنف کا نام اور کہانی کا اصل نام بھی ہونا چاہیے۔ تبصروں میں اپنا تبصرہ دیکھ کر حوصلہ بڑھ گیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے احمد اقبال کی سونا چاندی پڑھی، اقبال صاحب کی کہانیوں کو تبصروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف اتنا کہنا ہے کہ کہانی زبردست تھی۔ لگتا ہے اب مختصر بزدل صاحب احزید بزدل ہونے والے ہیں یعنی کہ شادی کے بندھن میں بندھنے والے ہیں۔ سونا چاندی کے بعد بھٹی صاحب کی آوارہ گرد پڑھی، انتہائی شاندار کہانی لکھی ہے بھٹی صاحب نے۔ شہزاد احمد خان کے جو ہر روز بروز کھلتے جا رہے ہیں لیکن ساتھ ہی دشمنوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی خواب سراپ، بھی زبردست تھی۔ ریل اپنی بے وقوفی کی بدولت جان سے ہاتھ دھو بیٹھی جبکہ گل اپنی قسمت سے موت کے منہ میں جانے سے بچ گئی۔ باقی کہانیاں کچھ خاص نہیں تھیں۔ پورے شمارے میں بس دو تین کہانیاں ہی اچھی تھیں اور آخر میں ایک گزارش۔ براہ کرم اعلیم عظیم سے کوئی کہانی لکھو! ہمیں۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی وضاحت "رسالہ تو 4 تاریخ ہی کو مل گیا تھا۔ خطوط کی محفل میں اپنا نام دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی ورنہ میرے 3 خطوط شائع نہ ہونے پر میں بد دل ہو کر بیٹھ گیا تھا کہ شاید نواب صاحب کی بے سرو پا کہانی مسیحا پر میری شدید تنقید آپ کے ادارے کو بری لگی اور میرے خطوط کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ میں آپ کے رسائل کا کئی دہائیوں سے قاری ہوں اور برسوں ممالک غیر میں بھی طویل مسافت طے کر کے انتہائی مہنگے داموں خریدتا رہا۔ بہر حال آپ کی وضاحت سے مطمئن ہو گیا ہوں کہ قصور ڈاک خانے والوں کا تھا۔ اس ماہ میرے ہم شہری شاہ جی اور بھائی ہمایوں سعید بھی غائب تھے اور میرے ہی شہر کی ایک نئی لکھن والی (شاہد روشی خان) بھی ایک جھلک دکھلا کر غائب ہیں۔ ماہا ایمان تو ایک قصہ پارینہ بن چکیں۔ البتہ بی بی طاہرہ گلزار، زویا اعجاز، بلقیس خان، صفدر معادیہ، اعجاز راجیل، ساگر لکھو! ابھی تک ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس ماہ کی بہترین کہانی سونا چاندی رہی



کہ کافی عرصے بعد بزدل اور مساحمہ کی پُر لطف کہانی پڑھنے کو ملی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں فلمی انداز لیے ہوئے تھیں۔ بدیسی ادب میں مریم خان کی چہرہ شاس رہی۔ نواب صاحب کی مسیحا کے اختتام پر سکھ کا سانس لیا کہ اب تو ہر قاری ہی اس کی مخالفت کر رہا تھا۔ طاہر مغل صاحب کی انگارے کا بے صبری سے انتظار ہے۔ بمبئی صاحب کی آوارہ گرد ابھی پڑھ نہیں سکا۔

پشاور سے طاہرہ گلزار کی آمد ”آج صبح یعنی 5 جون کو بجٹ کے دن یہ خوش خبری ایک جاسوسی پڑھنے والے دوست غلام یسین نے کہا کہ جاسوسی کے 10 انعام پانے والوں میں آپ شامل ہو۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ انعام چاہے 10 روپے کا ہو یا 1000 روپے کا ہو خوشی صرف ملنے کی ہوتی ہے قیمت کی نہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ جاسوسی کا وہی معیار بتا رہے جو 20 سال پہلے تھا۔ جاسوسی کا سرورق ایک زبردست سبق دینے والا ہے۔ اگر کوئی گہرائی سے سوچے کہ کوئی کتنے عقل کے گھوڑے دوڑائے مگر مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں لیکن صرف ایک آدم اور ایک عورت کی صورت میں۔ یہ دو دو یا تین، چار شادیاں صرف مردوں کی عیاشی اور کمزوری ہے۔ اس لیے تو مجھے مردوں سے نفرت ہے۔ ہاں ان مردوں کی عزت کرتی ہوں جو صرف اور صرف اپنی ایک بیوی کے ساتھ خوش و خرم اور عزت و احترام کے ساتھ رہتے ہوں۔ آخر میں کر کے انکل کو بھی اعجاز احمد راجیل پر رحم آ ہی گیا اور اس کو پہلے نمبر پر لے ہی آئے، مبارک! آخر کیا کریں رسم دنیا ہے۔ کراچی کے بھائی اور یس احمد خان کا تبصرہ بھی اچھا رہا۔ محمد یوسف سانول کی پہلی کاوش اور اتنی زبردست، ارے بھائی نواب انکل کو تو ہم بھی سمجھا سمجھا کے تھک گئے کہ فرشتے انسان نہیں بن سکتے مگر کیا کریں بڑے ہیں نا۔ بھائی صفر معاویہ بھی تنقیدی تنقیدی سے نظر آئے۔ راولپنڈی سے بھائی عرفان راجہ عوام کی تکلیفوں میں گوڑے گوڑے غرق نظر آئے، نادر سیال جی ٹائٹل گرل نے بھی آپ کو گھاس نہیں ڈالی ہا ہا ہا۔ تبصرہ گزرے حال تھا، لگتا ہے کہ امتحان کی وجہ سے عقل گھاس چڑھنے چلی گئی تھی۔ تمام پرانے تبصرہ نگاروں سے درخواست ہے کہ پلیز واپس آئیں اور وہی روٹی جاسوسی بڑھائیں۔ بابر عباس، نقیر عباس بابر، آغا فرید احمد خان آف سکھر، جاوید بلوچ آف علی پور، قدرت اللہ نیازی، قیصر اقبال، بابا ایمان، ہمایوں سعید، سعدیہ بخاری، شیر علی خان، قمرستی، این ایس آر مدثر اینڈ میرا سویت سادوست رضوان خٹولی..... اب کہانیوں میں تھوڑا سا ہم بھی کھو جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کون کیا گدڑی لعل چمپا کے لایا ہے۔ شروع کے صفحات سے ہی احمد اقبال صاحب کی تحریر سونا چاندی پڑھ کے ہنس ہنس کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ دل خوش کر دیا احمد اقبال صاحب ویلڈن۔ بابر نعیم کی مختصر تحریر خون ناحق واقعی مجرم بھی قاتل بھی اور قانون قدرت سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ چلو جی آخر مسیحا بھی اپنے انجام کو پہنچی۔ سلیم انور کی مختصر مغربی تحریر شکار اچھی رہی۔ آوارہ گرد بمبئی صاحب کی زبردست تحریر۔ آخر کار میڈم کی دردناک داستان ختم ہوئی۔ اور شہزی کا ایکشن شروع، آخر میں شوکت ظالم ڈپٹی روشن خان کے قلم کا نشانہ بنا۔ زور قلم اور تیز ہو بمبئی صاحب۔ سرورق کی دوسری کہانی خواب سراب میرے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی تحریر، کیا جادو ہے ان کے قلم میں، مصفیہ اور فرہاد کی بے جا نفرت نے رمل کی جان لی اور گل مرتے مرتے بجی۔ مصفیہ کو عقل تب آئی جب خود اللہ کے عذاب کینسر میں جھلا ہوئی۔ ویلڈن کاشی بھائی زور قلم اور تیز ہو۔ انوار صدیقی کی تحریر لبورنگ بہت زبردست موضوع والی کہانی لیکن مصنف نے بہت جلدی میں دی اینڈ کر کے کچھ اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔“

ناظم آباد کراچی سے محمد اور یس خان کی شمولیت ”مورخہ 6 جون کو ماہ نامہ جاسوسی کا دیدار ہوا۔ جون کی گرمی میں فرحت کا احساس ہوا۔ سرورق بھی خوب سے خوب تر تھا۔ نازنین و بال پہنے ہوئے مرد اور ایک گھوڑے کو دکھایا گیا اور خاردار تار نظر آ رہا تھا۔ رنگ بھی دیدہ زیب تھے۔ ادارہ یہ بھی حسب حال تھا اور خطوط کی محفل میں اعجاز احمد راجیل سرفہرست نظر آ رہے تھے، مبارکباد قبول کریں۔ بہت شکر یہ کہ تبصرہ پسند آیا۔ برادر عبد الباقی رومی کا بھی تبصرہ پسند کرنے کا شکر یہ۔ کچھ لوگ بہار کے مانند آتے ہیں اور اپنا جلوہ دکھا کر چلے جاتے ہیں اور یادوں کے دیے روشن کر جاتے ہیں۔ سب سے پہلے ابتدائی کہانی پر تبصرہ احمد اقبال کی سونا چاندی دلچسپ تحریر تھی۔ خونی تصویر نے بھی اچھا تاثر پیش کیا۔ خون ناحق میں خون خود ہی گواہی بن گیا۔ دوسری وصیت بھی اچھی تحریر تھی۔ رہی مسیحا تو تکلف برطرف کہ صرف پہلی قسط ہی پڑھ سکے، اس کے بعد چھ انگوٹوں میں روشنی نہ رہی۔ بھد شکر کہ اس کا اختتام ہو رہا ہے۔ امید ہے انگارے بہترین ثابت ہوگی۔ بے چینی سے انتظار رہے گا۔ خود کردہ بھی اچھی کہانی تھی کہ ایٹس نے اپنے ہی اسٹور میں چوری کی مگر ایک چھوٹی سی بات نظر انداز کر دی نتیجتاً پکڑی گئی۔ آوارہ گرد تسلسل کے ساتھ بے حد دلچسپی لیے جاری و ساری ہے اور ایک ہی نشست میں پڑھی جانے والی کہانی ہے اور قسط کے آخری حصے میں تجسس کا زیادہ احساس دلا دیتی ہے۔ بیوٹی میں برناڈیٹ کی چالاکی اور فریب کے باوجود اس کو اس کے جرم کی سزا ملی۔ سرورق کی کہانی لبورنگ حسب سابق بہترین تھی اور دوسری کہانی خواب سراب بھی بہترین سے بہترین تھی، کترنوں نے بھی مزہ دیا۔“

علی پور سے ہارٹ کچر کے نادر خیالات ”نامعلوم مبینے میں اپنا دھڑکا تبصرہ دیکھ کر باوجود لوڈ شیڈنگ کے 6 کم 20 طبق روشن ہو گئے پھر دوبارہ یہ زبان قلم ہم کلام ہونے کا حوصلہ نہ ہوا۔ انکل جان کے بقول ہمارے پاس وقت بہت ہے مگر بقول ہمارے، ہمارے پاس وقت نہیں۔ سرمایہ محبت ہے، انکل جان فرماتے ہیں ہمارے خیالات مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں جبکہ ہم سمجھ میں نہیں دل میں آتے ہیں چاہے درد دل دستک سے نہ کھلے تو ہم دلدار کے دل کا درد توڑ کر تخت دل پر فروکش ہو جاتے ہیں۔ بالآخر ڈے بے ڈے (دن بد دن) کا انتظار جاسوسی ختم ہوا۔ آسمان سے آبی موتیوں کی ٹپ ٹپ تھی اور حالت صوم میں 15 شعبان المعظم کو پنج کم فنی پانچ میں ہمارے نام ہوا۔ ماہ جون کی مس جاسوسی کی آنکھوں کے جام میں آنسوؤں کی بے..... یعنی

### سانچہ ارتحال

6 رمضان المبارک کو ادارے کے دیرینہ کارکن محمد اختر بیک کے چھوٹے بھائی محمد حیات بیک علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ ادارہ مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔



موسم خوشگوار حسن جنت سوگوار فہرست میں انوار صدیقی کو دیکھ کر دیرینہ ترنا پوری ہوئی اس کے بعد بزم محبتاں پر چشم چاہ ڈالی تو سرفہرست، ساہیوال کے ہوائی اعجاز کو بیٹھے پایا۔ موصوف کے خطوں میں کچھ اور ہونہ ہوا البتہ آہ آہ ضرور ہوتی ہے۔ رمشا عرفان لیجے محی الدین نواب کا سچا تمام ہوا۔ اب تو آپ کی ٹنڈ میں ٹھنڈ پڑ گئی ہوگی۔ میڈم ماہرین ناز آپ کی زبان ہمیشہ کی طرح نامبارک ٹھہری اور ایک بار پھر ہم سرسٹ سے ہو کے آگئے۔ جو یہ علی آوارہ گرد بہت ڈیل زبردست کہانی ہے خواجواہ کسی کی محنت پر دواثر پھیر کر دل شکن خیالات کا اظہار نہیں کرتے۔ طاہرہ گلزار تو معلوم کریں نا..... تکلیل کاظمی کو اتنی لمبی پٹی آخر کس نے پڑھائی ہے۔ داؤد ایڈوکیلٹن شہنشاہ ذہانت سرمدی الدین نواب ٹاپک چاہے کتنا ہی ناقابل یقین دانو کھا کیوں نہ ہو آپ دلائل کے چابک سے ناقدین ادب سے منوا کر ہی دم لیتے ہیں کہ بالآخر وہ اپنا گلوگلو سامنہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ ہمیں گوہر جوہر شناس معراج رسول کی دریافت پر غر ہے آپ صرف بے ڈی پی کا ہی نہیں بلکہ سرزمین پاکستان کا پیش قیمت سرمایہ ہیں۔ مسجاک کی آخری قسط پڑھ کر ذہن میں تمام انگڑائیاں بھرتے سوالوں کا مدلل جواب مل گیا۔ احمد اقبال جی ان کی پیچیدہ طرز تحریر ہے آپ کی قسم سے دل، دماغ کی دال ہی بنا ڈالتے ہیں۔ عقل اقبال کے کیا ہی کہنے سونا چاندی ماہ جون شمارے کی زینت رہی۔ خونی تصویر اور بیانی قدرے عام کہانی ثابت ہوئیں اور خاص کہانیوں کو عام کہانیوں کا شکر گزار ہونا چاہیے اگر عام کہانیاں نہ ہوتیں تو خاص کہانیاں بھی عام ہو کر رہ جاتیں۔ سرورق کے دونوں رنگ اپنا اپنا رنگ چمانے میں کامیاب رہے۔“

محمد مرتضیٰ احتشام جمگ سٹی سے لکھتے ہیں ”3 جون 2015ء کی شام بک شاپ سے جاسوسی ڈائجسٹ خرید اور گھر لے آئے۔ ٹائٹل پر نظر دوڑائی۔ آدمی کے دماغ والی جگہ پر گھوڑے کو دوڑتے ہوئے موجود پایا اور حسینہ اپنی پلکوں پر رت جبکوں کے نشان لیے باڑ کے اس پار کسی کو دیکھنے کے لیے ترس رہی تھی۔ ادارہ پڑھا زما بوبے کرکٹ ٹی کا تہ دل سے شکریہ کہ انہوں نے ہمارے بے رونق اور دیران میدانوں کو رونق بخشی۔ اعجاز احمد راحیل فرام ساہیوال کا تبصرہ شاعر تھا۔ ابن شمشاد فرام کراچی جس دن ہمارے لیڈر اس بات کو سمجھ گئے حالات بہتری کی طرف آجائیں گے۔ محمد یوسف سانول بھائی چینی نکتہ چینی میں آپ کو خوش آمدید۔ محمد صفدر معادیہ بھائی آپ کی بات سو فیصد درست ہے مگر تنقید کرنا ہمارا حق ہے۔ زبیر حسین شیخ پیلا خط شائع ہونے پر مبارک ہو۔ رمشا عرفان آپ بھی عقل مند ہیں۔ عرفان راجہ لوڈ شیڈنگ کے تو ہم بھی ستائے ہوئے ہیں۔ اپنا خط دیکھا تو حیرانی ہوئی کہ اتنی زیادہ کٹینچی چلائی گئی (چلائی پڑتی ہے ورنہ آپ لوگوں کے خطوط کی طوالت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ صرف تین چار خط چھاپے جاسکیں) مظہر سلیم آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کی کہانیاں ادارے کے معیار پر پوری اتریں گی۔ طاہرہ گلزار جی آپ کا تبصرہ بڑا شوخ مگر جاندار ہوتا ہے۔ نادر سیال بھائی اللہ تعالیٰ آپ کو جلد سے جلد رہائی دے، آمین۔ مرحا گل کبھی خط شائع نہ ہو تو نو پر اہلم آپ باقاعدگی سے خط لکھا کریں۔ اعظم خان فرام دیر آپ کی سوئی بالکل ٹھیک جگہ پر لگی ہے۔ بلقیس خان آپ امید رکھیں انشاء اللہ ماہا ایمان آپ کے دکھ بانٹنے ضرور آئیں گی۔ عبدالجبار روی انصاری ہمارے اندر تو دوستی اور محبت کی پوری قوس قزح بھری پڑی ہے۔ آپ کو صرف گلابی رنگ نظر آیا۔ اس کے بعد کہانیوں کی جانب بڑھے۔ سونا چاندی احمد اقبال ابتدائی صفحات پر بہت اچھی کہانی لے کر آئے اور ایڈوکیلٹن پر تو سونا جیسے ڈاکو کا کردار وردیہ اور اس کی بیوی چاندی کا حسن سلوک دل کو بھاس گیا۔ خونی تصویر میں تو پر ریاض صاحب نے بڑی عمدگی سے آرلین کی اداکاری اور فنکاری کو پیش کیا۔ اچھی کہانی تھی۔ خون ناحق بابر نعیم صاحب کی مختصر مگر عبرت اثر داستان تھی۔ آخر کار مسجاک اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ لیکن مجھے امید ہے کہ محی الدین معاشرتی رویوں اور برائیوں پر مبنی کوئی کاٹ دار کہانی ضرور لے کے آئیں گے۔ سکندر عظیم کی خود کردہ کہانی میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ لالچ کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ مریم کے خان صاحب کی چہرہ شناس پڑھ کے کسی کی چہرہ شناسی یاد آگئی۔ بہر حال آخر کار جان جیسا سفاک اور بے رحم مجرم اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ شکار کہانی بے مقصد سی لگی۔ اس کے بعد آوارہ گرد کی جانب اپنے قدم بڑھائے۔ لیتق شاہ کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ یہ کہانی آہستہ آہستہ بین الاقوامی رخ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ بیوی کہانی میں ایس انوار نے 20 سال پرانے قتل کا بڑی کامیابی سے سراغ لگایا۔ سرورق کا پہلا رنگ لہو رنگ شروعات تو بہت اچھی تھیں لیکن ایڈوکیلٹن متاثر کرنے میں بالکل ناکام رہا۔“

واہ کینٹ سے بلقیس خان کی دل سوزی ”5 جون کی پُر بہار شام جب مارگلہ سے آتی بیٹکی ہواؤں نے جون کی گرمی کو مارچ اور اپریل کے موسم میں بدل ڈالا پھر یوندا باندی شروع ہو گئی تو ایسے سہانے موسم میں اپنا پیارا جاسوسی ملا۔ محفل میں حاضر ہوئے تو اعجاز احمد راحیل کا نام جگمگا رہا تھا۔ اب تک ان کے تین عدد خط سسٹنس والے کو ملا کر پڑھ چکی ہوں۔ دراصل پہلے خطوط پڑھتی ہی نہیں تھی اور اب شوق پیدا ہوا تو کچھ مخصوص تبصرے ہی پڑھتی تھی۔ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ اعجاز احمد تو حساس اور وفا شعاروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جو اب نایاب ہوتا جا رہا ہے بہت خوب۔ بے حد جاندار تحریر ہے آپ کی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی الجھنیں دور کرے۔ نادر سیال، آپ کی آنکھوں کا جھلکین پانی سید حادل پر گرا ہے اور دل داغ دار میں ایک اور داغ کا اضافہ ہوا ہے، کیوں، کب اور کیسے جیل میں ہو۔ بتایا ہی نہیں۔ اچھی سوچ اور اچھے دل کا مالک ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ قید و بند میں بھی قلم اور کتاب سے رشتہ رکھا ہے۔ کاش، میرے بھائی، میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کے لیے کچھ کر سکتی۔ طاہرہ گلزار! ہمایوں سعید تو پہلے ہی خود پسندی کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ آپ نے بانس پر چڑھا دیا۔ اب کون اتارے گا اسے؟ شوکت شہر یار! آپ کا ذکر خیر بھول گئی تھی۔ پٹھان ہوں نا، دوسرے منیر نیازی سے بھی کوئی رشتہ بنتا ہے جی تو ہمیشہ دیر کر دیتی ہوں۔ باقی رہی سپر ہٹ کے روکھے پھلکے ہونے کی بات تو جب ہم جیسے محفل میں آتے ہیں نا تو سپر ہٹ ”سٹ“ ہو جاتے ہیں۔ یہ انگریزی والا Sit نہیں ہے اس کو چک 36 کی پنجابی والا سٹ پڑھا جائے عام پنجابی میں اسے سٹ کہتے ہیں۔ ابن شمشاد، ساگر تلکوکر، محب وطن، صفدر معادیہ روی، سانول اور طاہرہ کے تبصرے خوب تھے، مظہر سلیم، لکشم، نادر سیال، عرفان راجہ، اعظم خان اور مرتضیٰ احتشام کے خط بھی عمدہ تھے۔ مرحا گل، ہمدردی کا شکریہ، طویل انتظار سے پہلے آپ کی سن لی گئی، انعام کی حق دار ہوئیں مبارک ہو۔ حسب معمول آوارہ گرد سب سے پہلے پڑھی، لیتق شاہ کی دلہن داستان کے بعد چرائوں میں روشنی نہ



رہی، اس دفعہ قسط بے جان تھی۔ محی الدین نواب کی مسیحا علاج مریض ثابت ہوئی۔ ہلالہ اور بنت قاطمہ کے ساتھ بہت برا کیا گیا۔ آخری رنگ پہلے نمبر پر رہا۔ کاشف زبیر کی خواب سراب فکر انگیز تحریر ہے ان لڑکیوں کے لیے جو شوبز کی چکا چوند سے متاثر ہو کر اپنی اور خاندان کی عزت خاک میں ملا دیتی ہیں۔ عادل شریف آدمی تھا مگر بیوی کو اتنی ڈھیل دینا سمجھ میں نہیں آتا۔ ان مردوں سے باز پرس کی جائے گی جو اپنی عورتوں کو بے لگام چھوڑتے ہیں۔ انوار صدیقی کی لہورنگ نے آخر تک الجھائے رکھا۔ احتشام رشتوں کو پامال کرنے والا بدکار شخص تھا، برجیس برابر کی ذستے دار ایسی عورت جو ایک گناہ کو چھپانے کے لیے مسلسل گناہ کرتی ہے اور پھر دونوں ہی حرام موت مرتے ہیں۔“

سرگودھا سے اسد عباس کی درخواست ”خلاف توقع جاسوسی اس بار 4 تاریخ کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل والے صاحب حسینہ کو ترجمہ نظر سے گھورتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ سب سے پہلے خطوط کی محفل پر نظر ڈالی۔ ساہیوال سے اعجاز احمد صاحب اس بار اول تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ لمبے عرصے بعد پرانے تبصرہ نگار مظہر سلیم ہاشمی بھی محفل میں نظر آئے۔ ولیم جناب! زیادہ تر تبصروں میں نواب صاحب کی مسیحا کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ شاید لوگ بھول گئے ہیں کہ یہ وہی نواب صاحب ہیں جنہوں نے دیوتا جیسا شاہکار ناول لکھا تھا۔ میرے خیال میں دیوتا میں مسیحا سے زیادہ ماورائی چیزیں شامل تھیں لیکن افسوس آج ہم نے یہ دتیرہ بنالیا ہے کہ اگر کوئی سینئر تبصرہ نگار کسی اسٹوری پر تنقید کرتا ہے تو ہم بھی اس اسٹوری پر تنقید کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ بہر حال اگر کچھ لوگوں کو مسیحا پسند نہیں آئی تو وہ رائٹر کو ہٹ کر نابند کر دیں۔ تنقید اگر مثبت انداز میں کی جائے تو وہ اصلاح کا سبب بنتی ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، پہلے صفحات پر احمد اقبال بزدل میاں کے ہمراہ موجود تھے۔ کہانی میں بزدل اور توپ صاحب کے مکالمے بہت محفوظ کرتے ہیں۔ کہانی کا انجام توقع کے برعکس تھا۔ خونی تصویر میں ڈیوڈ صاحب نے کس چالاکی سے ہاکس کو اپنی راہ سے ہٹا دیا۔ خون ناحق، مختصر مگر پراثر۔ الفریڈ بھائی کو قتل کرنے کے بعد بھی پھانسی کے پھندے سے بچ نہیں سکا۔ دوسری وصیت کو پڑھنے کے لیے دماغ پر بہت زیادہ زور دینا پڑا۔ خود کردہ، میں ایس نے پلان تو بہت اچھا بنایا تھا تاہم اپنی ہی غلطی سے پھنس گئی۔ بیوی اس ماہ انگریزی تراجم میں ٹاپ پر رہی۔ جو نے چنگی بجاتے ہی 20 سال پرانا کیس حل کر ڈالا۔ خلاف توقع برناڈیٹ قاتل ثابت ہوئی۔ پتا نہیں انگریز جاسوس اتنے چالاک کیوں ہوتے ہیں۔ (چالاک نہیں ذہین کہیں) سرورق کے رنگوں میں انوار صدیقی صاحب پہلے رنگ کے ساتھ حاضر تھے۔ کہانیاں کا موضوع اچھا تھا، تاہم احتشام احمد کا قتل معما ہی رہا۔ خواب سراب، کاشف زبیر اس بار اپنے قلم کا جادو نہ چلا سکے۔ کہانی کا ٹاپک بہت پرانا تھا۔ اس موضوع پر وہ سیکڑوں کہانیاں لکھ چکے ہیں جناب کچھ تبدیلی لائیے۔ عوام تبدیلی چاہتی ہے۔“ (بھیج دیں)

مرحاکل کی حاضری درابن کلان سے ”اس بار سرورق قیامت خیز تھا۔ نشلی آنکھوں والی حسینہ کو ایسا کرٹ لگا کہ گردن دو حصوں میں بٹ کر رہ گئی اور اس میں نکلتا ہوا شخص جس کے ناپاک عزائم گھوڑے نے عین آنکھ کے اوپر پاؤں رکھ کر مٹی میں ملا دیے جس سے وہ کچھ جتاتی ہوئی نظروں، طنزیہ مسکراہٹ لے کر رہ گیا اور حسینہ کی بالی فاتحانہ عزائم کے ساتھ کھڑی رہی۔ جلد ہی محفل میں پہنچ کر دم لیا۔ ذرا دکھری ٹائپ کے تھے آخر سے اپنا نام دیکھنا شروع کیا تھا خطوط میں کہ اپنا نام قرعہ اندازی کی زینت بنا چکا تھا۔ یقین نہ آیا۔ سب سے پہلے آوارہ گرد کو رونق بخشی جس کا انعام اس صورت میں ملا کہ بیگم صاحبہ کی داستان ختم ہوئی شکر خدا کا، ہمیں تو جون والی قسط سے پتا چل گیا تھا کہ شہزی لیتق شاہ کا بھائی ہے۔ بچھڑا ہوا بھائی۔ شاید دوسرے قارئین کو پتا نہیں چلا ہے۔ خود شہزی کو بھی نہیں ہے۔ حالانکہ لاکٹ اور تصویر والی بات سے ساری بات پتا چل گئی حالانکہ عبدالرب بھٹی صاحب کو اتنی جلدی لاکٹ والی بات منظر عام پر نہیں لانی چاہیے تھی۔ اول خیر کی سزا پر کافی دکھ ہوا۔ کہانی میں میرا فیورٹ کردار اول خیر ہے اس کے دم سے کہانی میں رونق ہے۔ مسیحا کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ چہرہ شناس میں اس طرح کھوئے کہ گرمی کا احساس نہ ہوا۔ مریم کے خان کی کہانی ہو اور ہمیں پسند نہ ہو یہ تو ہونیں سکتا سو بیٹ رہی۔ انوار صدیقی کا رنگ لہورنگ اف کیا بات تھی اس کہانی میں جیسے کشکول دوبارہ آگئی ہو ساجد تو پورے کا پورا شیخ حامد تھا وہی حقارت، وہی انداز سب کچھ ویسا ہی تھا عنبرین دوسری شبیم تھی برجیس کی طرح روبی اسپیکٹر سراج بس کیا بتائیں، نہایت شاندار اسٹوری تھی۔ مزہ دو بالا کر گئی۔ دوسرا رنگ کوئی خاص تاثر نہ دے سکا۔ اس ماہ انوار صدیقی نے میلا لوٹ لیا۔ احمد اقبال میرے فیورٹ ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ پہلے صفحہ پر صائمہ بزدل مزہ دے گئے۔“

یہ سید محی الدین اشفاق کی توصیف ”دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہوں۔ ٹائٹل گرل کی آنکھوں میں کرب نظر آیا مگر ساتھ کھڑے اعجاز احمد راحیل نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ مبارک باد جناب۔ یار آپ کی یادوں والی بات سے میں متفق ہوں۔ ادارے میں انکارے کی خوشی ایسی لگی جیسے حکومت نے سرکاری ملازمین کی تنخواہ میں سو فیصد اضافہ کر دیا ہو۔ طاہرہ گلزار بھی اب بہت اچھے تبصرہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہو گئی ہیں۔ سجاد خان اور نادریاں خدا آپ کو جلد از جلد رہائی دلوائے، آمین۔ زدیا اعجاز وہ سرخی مائل دانت والی خوفناک حسینہ آپ ہی تو تھیں۔ جان جاناں ولیم، بلقیس خان کا تبصرہ جاندار تھا۔ محفل میں پرانے دوست نظر نہیں آئے۔ شاید سب کو گرمی لگ گئی ہے۔ (اللہ نہ کرے) سونا چاندی میں احمد اقبال نے یادگار کرداروں سے یادگار ملاقات کروادی۔ اس کو پہلا نمبر دیتا ہوں۔ آوارہ گرد میں ڈاکٹر بھٹی کا قلم جو بن پر ہے۔ زہرہ بانو کی داستان ختم ہوئی اور آوارہ گرد کی آوارہ گردی دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔ بیگم صاحبہ نے اول خیر کو گروپ سے نکال دیا ہے مگر شہزی کی بات مان کر اس کی برتری کیل دادا کو دکھا دی۔ اسپیکٹر اور بی ایس ایس کا مقابلہ دیکھنے کو بے چین ہوں۔ لہورنگ کی تعریف تو دور کی بات اس پر تبصرہ کرنے کو بھی دل نہیں چاہا۔ اگلے سچ میں ایسی تمہارے ذہن کو بوجھل کر دیتی ہیں۔ کاشف زبیر صاحب ہمیشہ کی طرح خواب سراب میں بھی چھائے رہے۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

محمد صفدر معاویہ، خانیوال۔ عبدالبہار رومی انصاری، لاہور۔ ابن شمشاد، کراچی۔ سعد عباس، ضلع انک۔ رضوان سلطان خولی کرپڑی، کراچی۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو پو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)

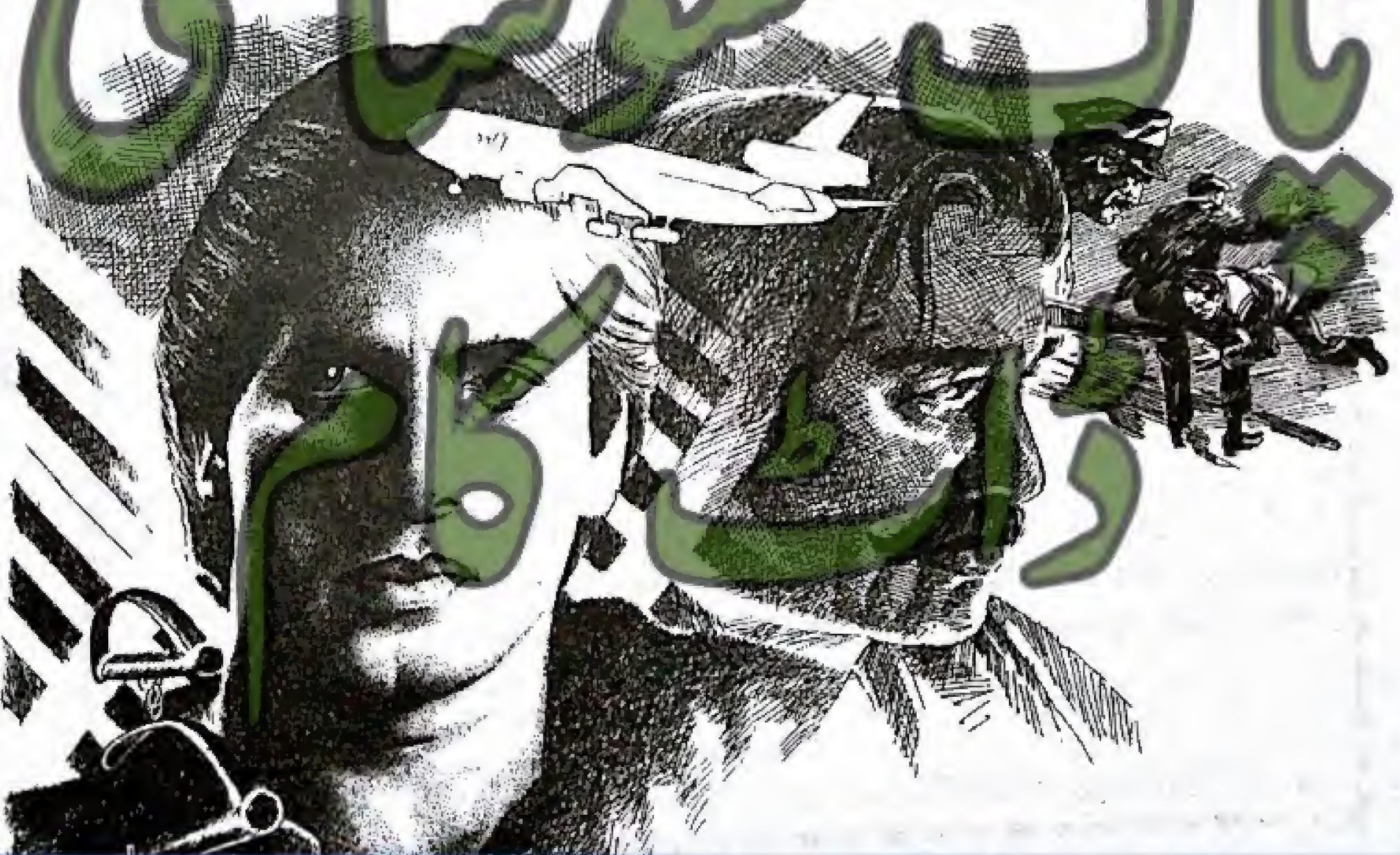


[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوٹ ہو اور سینے میں درد مند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پہاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیر داری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سُطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور  
دل گداز داستان...





WWW.PAKSOCIETY.COM





یہ نومبر کی ایک نہایت خوشگوار شام تھی۔ میرے وطن کی شام... میرے بچھڑے دیس کی شام۔ اس شام میں میری جنم بھوی کے سارے کھیتوں کھلیانوں اور پھلوار یوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ گلی کوچے، بستیاں، دریا، پہاڑ، میدان اور سبزہ زار سب کی مہک اسی شام میں شامل تھی۔

اٹرپورٹ سے باہر نکلتے ہی میں نے اپنے دونوں بازو فضا میں پھیلائے۔ ایک بھرپور انگڑائی لی اور اس انگڑائی کے بعد ڈھیر ساری تازہ ہوا اپنے سینے میں بھر لی۔ میں ابھی ابھی ڈنمارک سے لاہور آنے والی فلائٹ سے اترا تھا اور مختلف مراحل سے گزر کر اٹرپورٹ سے باہر آیا تھا۔ میں غالباً دس بارہ سال کا تھا جب آخری بار امی ابو کے ساتھ پاکستان آیا۔ اب میری عمر 23 سال تھی یعنی اپنے وطن کی زمین پر میرے قدم کم و بیش تیرہ سال بعد پڑے تھے۔

میں چچا کے گھر جا رہا تھا۔ یہ گھر دراصل ہمارا آبائی گھر بھی تھا۔ وہاں قدم قدم پر میرے بچپن کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ گھر لاہور سے پندرہ بیس میل دور ایک قصبے نما گاؤں میں واقع تھا۔ چچا کی بیٹی کی شادی تھی۔ پروگرام کے مطابق مجھے 14 نومبر کو لاہور پہنچنا تھا لیکن میں 12 نومبر کو ہی آ گیا تھا۔ میں چچا اور ان کی فیملی کو سر پر آ کر دینا چاہتا تھا۔ آج میری چچا زاد فائزہ کی سنگتی کی رسم تھی اور میں اس موقع پر چچا کے گھر کی خوشیوں کو دو بالا کرنا چاہتا تھا۔

اٹرپورٹ سے نکل کر میں سامان والی ٹرالی دھکیلتا ہوا ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔ ارد گرد موجود کئی خواتین و حضرات نے مجھے توجہ سے دیکھا۔ اس توجہ میں یقیناً پسندیدگی کی جھلک بھی موجود تھی۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں۔ تاہم حقیقت یہی ہے کہ میں چھٹ قدم کا ایک جاذب نظر نوجوان تھا۔ اکثر لوگ بالخصوص نوجوان خواتین میری شخصیت سے متاثر ہوتی تھیں۔ میں ایک چیمپئن ہوں۔ آپ مجھے یورپی چیمپئن بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کس چیز کا چیمپئن؟ فی الحال یہ جان لیجیے کہ میری فیلڈ کا تعلق مارشل آرٹ یعنی لڑائی مار کٹائی سے ہے۔ اپنے خالی ہاتھوں سے میں چار پانچ لڑاکو افراد کا بھرتا بہ آسانی بنا سکتا ہوں۔ پڑھنے والے سوچیں گے کہ اگر میں واقعی یورپی چیمپئن تھا تو پھر بہت سے لوگ مجھے شکل و صورت سے جانتے ہوں گے کیونکہ کھیل کسی بھی قسم کا ہو ہر جگہ دیکھا جاتا ہے لیکن ایک مشہور و معروف شخص ہونے کے باوجود مجھے صورت سے بہت کم لوگ پہچان پارہے تھے۔ ایسا کیوں تھا اس کی وضاحت بھی میں جلد ہی کر دوں گا۔

طویل عرصہ یورپ میں رہنے کے باوجود میری اردو بہت اچھی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے گھر میں ہمیشہ اردو ہی بولی اور پڑھی گئی۔ میں نے ٹیکسی والے سے اپنی منزل کا کرایہ طے کیا اور سوار ہو گیا۔ ٹیکسی لاہور کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی ملتان روڈ پر آ گئی اور پھر میرے آبائی گاؤں مرادپور کی طرف بڑھنے لگی۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں تیرہ برس بعد پاکستان آیا تھا۔ اس میں صرف ایک استثناء موجود ہے۔ قریباً ساڑھے تین سال پہلے بھی میں والدہ کے ساتھ صرف تین دن کے لیے پاکستان آیا تھا اور ایک شادی میں شرکت کی تھی لیکن وہ سب کچھ تو ایک دھندلے خیال کی طرح جیسے جاگی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھا ہو مگر اب جو کچھ تھا وہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ یہ دیسی شام کی دیسی خوشبو ہوا کے ساتھ میرے سینے میں داخل ہو رہی تھی اور روئیں روئیں میں سرایت کر رہی تھی۔ میں ہر چیز کو بے پناہ دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ گاہے بگاہے میں ٹیکسی ڈرائیور سے مختلف سوالات بھی کر رہا تھا۔ جن کے دلچسپ جوابات مجھے مل رہے تھے۔ اس نے اپنا نام غار بتایا تھا۔ کچھ چیزیں مجھے حیران بھی کر رہی تھیں، مثلاً ٹریفک کی بد نظمی، دھواں، انکروچ مینٹ، شور بہر حال یہ سب کچھ میرے وطن کا حصہ تھا اور یہ جیسا بھی تھا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ اب ہم لاہور سے باہر نکل کر ہائی وے پر موجود سفر تھے۔ یہ ملتان روڈ سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی سڑک تھی۔ دونوں طرف کھیت تھے اور اردو، مالٹے وغیرہ کے باغات تھے۔ کہیں کہیں دکانوں اور گھروں کی روشنیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ ٹیکسی کی رفتار اب بڑھ گئی تھی۔ مناظر تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان ہی مناظر میں ایک ایسا منظر بھی میرے سامنے آنے والا ہے جو مجھے سرتاپا دہلا دے گا اور پاکستان میں میری یہ نہایت خوشگوار آمد ایک تکلیف دہ کیفیت میں ڈھل جائے گی۔

اچانک ہی مجھے لگا کہ ٹیکسی کی رفتار قدرے سست ہو گئی ہے۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا۔ یہ ایک موڑ تھا اور یہاں سڑک بھی کچھ خراب تھی۔ آگے جانے والی گاڑیاں سست روی سے گزر رہی تھیں مگر بات صرف اتنی ہی نہیں تھی۔ یہاں کوئی حادثہ بھی ہوا تھا۔ میں نے ایک کار کی ہیڈ لائٹس میں دیکھا کہ سڑک پر کچھ شیشے بکھرے پڑے تھے۔ تب میری نگاہ سڑک کے نشیب میں واقع کھیتوں اور کچے راستے کی طرف گئی۔ میں ٹھٹک گیا۔ یہاں ایک موٹر سائیکل سوار خون میں لت پٹ پڑا تھا۔ یقیناً وہ بے ہوش تھا



جا چکا ہوتا۔ مجھے اس کے رویتے پر بے حد تعجب ہوا۔ میں نے یہ تو سن رکھا تھا کہ پاکستان میں قانون کی عمل داری کا معیار وہ نہیں جو یورپی ممالک میں ہے اور اس حوالے سے لوگوں کے رویتے بھی قدرے مختلف ہیں لیکن جو کچھ میں یہاں جائے حادثے پر دیکھ رہا تھا وہ ششدر کر دینے والا تھا۔

میں نے ڈرائیور کو آواز دی تو وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے اتر آیا۔ ہم نے کوشش کر کے زخمی کو اٹھایا اور اوپر سڑک تک لے آئے۔ اس دوران میں دو تین راگبیر ارد گرد نظر آئے۔ انہوں نے زخمی کو ٹیکسی میں ڈالنے میں ہماری مدد کی۔ یہ دیہاتی ہی تھے۔ درمیانی عمر کے ایک تومند شخص سے میں نے پوچھا کہ قریب ترین اسپتال کہاں ہے۔ اس نے ایک قریبی جگہ کا نام بتایا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ ”بھائی صاحب! آپ ہمارے ساتھ ہی بیٹھ جائیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔“

وہ پہلے تو ہچکچایا پھر حوصلہ کر کے ہمارے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ میں نے پچھلی نشست پر بیٹھ کر زخمی کا سر اپنی گود میں لے رکھا تھا۔ اس کے زخم سے بہنے والا خون میری پیٹھ کو تر کر رہا تھا۔ وہ بہت گہرے سانس لے رہا تھا۔ عمر بیک تیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ قبول صورت تھا۔ وہ کسی ماں کا بیٹا تھا، کسی بہن کا بھائی تھا اور ہو سکتا ہے کسی بیوی کا شوہر ہو۔ اس کے پیارے اس پر ٹوٹنے والی آفت سے بے خبر اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔

”جلدی چلو یار۔“ میں نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس نے رفتار کچھ اور تیز کر دی۔ اس کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ وہ مجھ سے خفا ہے لیکن وہ اس خفگی کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ موقع ہی ایسا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ گاڑی بھگائے چلا جا رہا تھا۔ قریباً چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ نیم دیہی علاقے کا ایک چھوٹا سا اسپتال تھا۔ طبی سہولتیں بس گزارے لائق ہی تھیں۔ بہر حال عملے نے زخمی کو فوراً ایمرجنسی والے کمرے میں پہنچایا اور طبی امداد دینا شروع کر دی۔ میں اور ڈرائیور برآمدے میں کھڑے تھے۔ ہمارے ساتھ آنے والا مدد گار دیہاتی بھی پاس ہی موجود تھا۔ ڈرائیور نے مجھ سے ہولے سے کہا۔

”باؤجی! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں نکل جانا چاہیے۔“

مگر صاف پتا چلتا تھا کہ یہ حادثہ ابھی دو چار منٹ پہلے ہی ہوا ہے۔ گری ہوئی موٹر بائیک کی ہینڈ لائٹ ابھی تک روشن تھی اور پچھلا پہیہ بھی گھوم رہا تھا۔ سڑک پر چلنے والی گاڑیاں ناہموار سڑک پر اچھلتی کودتی گزرتی چلی جا رہی تھیں۔ کوئی رک نہیں، کسی نے زخمی کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس سب ایک ہر اس آمیز جلدی میں نظر آتے تھے۔ ہماری ٹیکسی بھی جائے حادثہ کے پاس سے گزری۔ میں نے ڈرائیور کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسے کوئی اٹھاتا کیوں نہیں؟“

ڈرائیور نے جلدی جلدی گیسر بدلتے ہوئے کہا۔ ”جو اٹھائے گا مصیبت میں پڑ جائے گا۔ ابھی کوئی پولیس موبائل یا ایسولینس آجائے گی، خود ہی اٹھالے گی۔“

”یار کیسی بات کر رہے ہو، پتا نہیں موبائل یا ایسولینس کب آئے گی؟ اس بے چارے کو تو فوری مدد کی ضرورت ہے۔“

”کوئی کر دے گا نامد باؤجی۔“ ڈرائیور نے کہا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکلنے کی فکر میں تھا۔

میں نے کہا۔ ”کوئی اور کیوں؟ ہم کیوں نہیں، تم گاڑی روکو۔ ہم اسے دیکھتے ہیں۔“

ڈرائیور پریشان لہجے میں بولا۔ ”باؤجی... لگتا ہے آپ پہلی بار پاکستان آئے ہیں۔ یہ یہاں کا رواج نہیں ہے۔ جو زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچاتا ہے عام طور پر وہی پھنستا ہے۔“

”یار! کیا بول رہے ہو، تم گاڑی روکو۔ میں کہتا ہوں گاڑی روکو۔“ میرے تحکمانہ لہجے نے درمیانی عمر کے ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور سڑک سے اتر کر نشیب کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ زخمی نو جوان تھا۔ اس نے شلوار قمیص اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ مجھے اس کا ہیلمٹ کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک ٹائک ابھی تک موٹر بائیک کے نیچے پھنسی ہوئی تھی۔ موٹر بائیک کا پچھلا حصہ ٹوٹا ہوا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کسی گاڑی نے ٹکر ماری ہے۔ میں نے بائیک کا انجن بند کر کے بائیک کو اٹھایا اور دوسری طرف پھینکا۔ مضروب کی سفید شلوار لہو رنگ ہو رہی تھی۔ وہ یکسر بے ہوش تھا۔ میں نے ٹیکسی کی طرف دیکھا وہ سڑک پر تھی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ وہ مجبوراً کھڑا ہے۔ اگر اس نے مجھ سے پندرہ سو روپے کرایہ وصول نہ کرنا ہوتا تو کب کا



ابھی اس کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ شلواری قمیص والا ایک نیم شیم ڈاکٹر ہمارے پاس آن کھڑا ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”اس بندے کو آپ لے کر آئے ہیں یہاں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ کی گاڑی سے زخمی ہوا ہے یہ؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں ڈاکٹر، ہم گزر رہے تھے۔ یہ پہلے سے سڑک پر پڑا تھا۔“

ڈاکٹر نے مجھے سر تاپا گھورا پھر ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”یہ تمہاری ٹیکسی ہے؟“

ٹیکسی ڈرائیور نے اثبات میں جواب دیا۔ ڈاکٹر تومند دیہاتی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں بھی ان کے ساتھ آیا ہوں جی۔“ دیہاتی نے جواب دیا۔

ڈاکٹر بولا۔ ”آپ تینوں ابھی یہیں رہیں۔ زخمی کی حالت ٹھیک نہیں۔ ہم نے پولیس کو بلا دیا ہے۔ وہ آپ سے دو چار سوال کرے گی پھر آپ جا سکیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! اگر ہمارا پولیس سے ملنا ضروری ہے تو پھر آپ انہیں ذرا جلدی بلا لیں۔ مجھے ایمرجنسی میں کہیں پہنچانا ہے۔“

اس کا معنی خیز فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ ”ایمرجنسیاں ہی کام خراب کرتی ہیں۔“ کہیں اس کا یہ فقرہ ڈرائیور اور میری طرف تو اشارہ نہیں کر رہا تھا۔

چند منٹ بعد پولیس پارٹی بھی پہنچ گئی۔ ان میں ایک فریبہ اندام اے ایس آئی تھا۔ ساتھ میں ایک حوالدار ٹائپ شخص اور دو ہیڈ کانسٹیبل تھے۔ بظاہر وہ میرے اور ڈرائیور

ٹار کے ساتھ عزت سے پیش آئے لیکن اس عزت کے پیچھے شکوک کے سائے بھی موجود تھے۔ اے ایس آئی نے مجھ سے جھگڑے لہجے میں سوالات کیے۔ میں کہاں سے آیا تھا؟

کہاں جا رہا تھا؟ ہم نے زخمی کو کہاں دیکھا؟ اس کی موٹر بائیک کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ہمارے ساتھ آنے والے...

...راٹھور سے بھی دو چار سوال پوچھے۔ جس دوران میں اے ایس آئی ہم سے یہ سوالات کر رہا تھا، حوالدار اور ایک کانسٹیبل احاطے میں کھڑی ٹیکسی کا آگے پیچھے سے معائنہ کر رہے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور

ٹار سے کاغذات طلب کیے تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے ان کے حوالے کر دیے۔

اے ایس آئی اپنی ڈائری پر کچھ اندراجات وغیرہ

...

...

...

...

...

کرنے لگا۔ میں نے گھڑی دیکھی اب آٹھ بجنے والے تھے۔ چچا کے گھر نو بجے کے قریب رسم نمٹ گئی تھی۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ ”محترم! مجھے کہیں جلدی پہنچانا ہے۔ اگر آپ نے مجھ سے مزید کچھ پوچھنا ہو تو میں فون نمبر دے دیتا ہوں۔ آپ اس پر مجھ سے رابطہ کر لیجیے گا۔“

وہ ایک دم سچ لہجے میں بولا۔ ”آپ ذرا بریک پر پاؤں رکھو۔ ابھی بڑے تھانیدار صاحب آرہے ہیں۔ وہی فیصلہ کریں گے کہ تم دونوں کو جانا ہے یا رکھنا ہے۔“

مجھے تاؤ آ گیا میں نے کہا۔ ”یہ آپ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں۔ ہم مجرم نہیں ہیں۔ ہم نے ایک شہری کی مدد کی ہے اور ایسے وقت میں کی ہے جب کوئی دوسرا نہیں کر رہا تھا۔ ہم نے اسے اسپتال پہنچایا ہے۔ آپ نے جو کچھ ہم سے پوچھنا تھا، پوچھ لیا ہے۔ اب براہ مہربانی ہمیں جانے دیں۔“

اے ایس آئی نے ڈائری بند کر کے میز پر رکھی اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”نئے نئے آئے ہوتا۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں نیا نیا آیا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ قانون کیا ہے۔“

”اور ہم تو یہاں آلو چھو لے بیچ رہے ہیں۔ کیا خیال ہے؟“ اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”یہ آپ کس طرح بات کر رہے ہیں؟“ میں نے ذرا تنک کر کہا۔

”اچھا اب بات کرنا بھی مجھے آپ جناب سے سیکھنا پڑے گا؟“ وہ پھنکارا۔

ہمارے درمیان دو تین تلخ جملوں کا تبادلہ مزید ہوا۔ اسی دوران میں حوالدار اور کانسٹیبل ٹیکسی کا معائنہ کر کے اندر آ گئے۔ حوالدار نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”سر! تیسرا بندہ کہاں ہے؟“

تیسرے بندے سے اس کی مراد ہمارے ساتھ آنے والا دیہاتی تھا۔ وہ واقعی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پولیس والوں نے اسے احاطے میں مادھر ادھر دیکھا لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ موقع دیکھ کر نکل گیا تھا۔ اے ایس آئی کا

پارا کچھ اور بھی چڑھا ہوا نظر آنے لگا۔ حوالدار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اے رمضان علی کہیں یہ دونوں بھی رفو چکر نہ ہو جائیں۔ ویسے بھی بڑی چھیتی ہے ان باؤ صاحب کو۔ ان کو ذرا اندر والے کمرے میں لے جاؤ اور آرام سے بٹھاؤ۔“

حوالدار توند منکاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس کے

...

...

...

...

...

...

...

...



بولی۔ ”تم نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ تم نے جان بوجھ کر مارا ہے اسے۔ تم کہیں... تم اسی کے آدمی ہو... وہ ہمیں برباد کر دینا چاہتا ہے۔ ہمیں مار دینا چاہتا ہے لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی... اور ہوا تو جان دے دوں گی اپنی۔“ وہ ہجانی انداز میں بولتی جا رہی تھی۔

اے ایس آئی نے اسے بمشکل پیچھے ہٹایا۔ لڑکی نے لال بھوکے چہرے کے ساتھ میری اور ڈرائیور... کی جانب تھوک دیا۔

پتا نہیں کیسا لاؤ پھڑک رہا تھا اس کے اندر۔ وہ شکل صورت سے تو ایسی نہیں لگتی تھی۔ وہ مسلسل جنونی انداز میں بولتی چلی جا رہی تھی۔ دو زس اسے سنبھال کر دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ وہاں سے اس کی روتی کراہتی ہوئی آواز آئی۔ ”وہ کہاں ہے؟ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں، پلیز مجھے اس کی شکل دکھا دیں۔“

ایک نرس بولی۔ ”بی بی، اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسے لاہور بھجوا رہے ہیں۔ ابھی ایس بی لینس آ جاتی ہے پھر اسے دیکھ لیتا۔“

ڈرائیور کے ہونٹ بالکل خشک ہو رہے تھے۔ وہ بار بار شکوہ کناں نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اب میرا دل بھی گواہی دینے لگا تھا کہ ہم راہ چلتے ایک سنگین چکر میں پھنس گئے ہیں۔ اگر واقعی مضروب کو کچھ ہو جاتا تو ہم شدید مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ جہاں تک مجھے علم تھا ایکسیڈنٹ کی صورت میں تو فوراً ضمانت وغیرہ ہو جاتی ہے لیکن اگر یہ بات نکل آئے کہ جان بوجھ کر ٹکر ماری گئی ہے تو پھر یہ نہایت سنگین کیس بنتا ہے۔

میں نے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔ اس کا سانولا چہرہ جیسے اندرونی جوش سے تھمنا لگا۔ حوالدار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”یہ تو اور ہی چکر نکل آیا ہے بھی۔“

حوالدار نے بھی مونچھوں کو تاؤ دے کر اٹھاتی انداز میں سر ہلایا۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ ”میں ایک... فون کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”ٹیلی فون بھی کروا لیتے ہیں۔ ذرا چھری کے نیچے سانس تو لولا صاحب۔“ اس کے تیور اب ضرورت سے زیادہ خطرناک نظر آنے لگے تھے۔

”یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔“ میں دل ہی دل میں پکارا۔ ڈرائیور بھی ہٹکا بکا نظر آ رہا تھا۔ وہ زخمی کو جائے حادثے سے اٹھانے سے ڈر رہا تھا لیکن یہ توقع یقیناً اسے بھی نہیں تھی کہ صورت حال ایسا سنگین رخ اختیار کر لے گی۔

مجھے بے تزنگے کانشیل چلے آرہے تھے۔ ڈرائیور کا رنگ بالکل زرد ہو گیا۔ حوالدار نے مجھے بازو سے تھاما اور بولا۔ ”باؤ جی! جیتی کا کام شیطان کا ہوندا ہے۔ آپ ڈرائیور چل کر تشریف رکھیں۔“

www.paksociety.com ”پر کیوں؟“

اے ایس آئی پھنکارا۔ ”زخمی کا کوئی پتا نہیں کہ کب اللہ بلی ہو جائے۔ وڈے تھانیدار صاحب کو تم دونوں سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔“

میں نے حوالدار کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تم لوگوں کو بتایا ہے کہ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ میں اپنا فون نمبر، ایڈریس، شناختی کارڈ سب کچھ آپ لوگوں کو دے دیتا ہوں لیکن میں یہاں رک نہیں سکتا۔“

حوالدار نے بدتمیزی کے انداز میں کہا۔ ”رکیں گے تو اب آپ کے بڑے بھی۔ چلو اندر۔“

میں نے غصے سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹایا۔ ”ڈونٹ ٹچ می۔“ میرے منہ سے بے ساختہ جھلائی ہوئی آواز نکلی۔

وہ بولا۔ ”اس انگریزی کا ڈراڈا کسی اور کو دینا باؤ۔ سیدھی طرح اندر چلو۔ نہیں تو بے عزتی ہو جائے گی۔“ ”کیا کرو گے تم؟“ میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ اے ایس آئی نے آگے بڑھ کر مجھے زور سے دھکا دیا۔ ”زبان مت چلاؤ، جو کہہ رہے ہیں وہ کرو۔“

اس نے دوسرا دھکا دیا تو میں دیوار سے جا لگا۔ دماغ میں چنگاریاں سی بجھ گئیں لیکن میں جانتا تھا یہ میری کیٹیگری کے لوگ نہیں ہیں۔ میں کسی کو ایک ہاتھ بھی مار دیتا تو اس کے لیے اٹھنا محال ہو جاتا۔ میں نے خود پر ضبط کیا اور انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو سب انسپکٹر، تمہیں اس کے لیے جواب دینا پڑے گا۔“

اے ایس آئی کی آنکھوں سے جیسے خون ٹپکنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، ایک لڑکی تیزی سے اندر آئی۔ وہ شلوار قمیض میں تھی۔ ایک شال نے اس کے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا مگر یہ شال اس کے جسم اور دلکشی کو چھپانے میں تقریباً ناکام تھی۔ لڑکی کے گھنے بالوں کی کچھ لٹیں شال سے نکل کر اس کے حسین چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ بے حد پریشان دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اور ڈرائیور کو دیکھ کر وہ سیدھا ہماری طرف آئی۔ جو کچھ اس نے کہا مجھے اس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس نے جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا اور مجھے جھنجھوڑ کر



سارا اگا پچھا پتا کر لیتے ہیں۔“ حوالدار نے خطرناک لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کو دھکا دیا۔

اس بے چارے کی ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑا کر دروازے کی دہلیز سے نکرایا اور اوندھے منہ گرا۔ اس کی ٹاک پر چوٹ لگی اور تیزی سے خون رستا شروع ہو گیا۔ حوالدار نے اسے اوپر تلے کئی تھپڑ مارے۔ وہ دہشت زدہ انداز میں چلانے لگا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر حوالدار کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس پر عمل مستعمل ہو کر مجھ پر پل پڑا۔ مجھے ان سے ایسی لاقانونیت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ شاید میں نے جس طرح اے ایس آئی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کی تھیں وہ اس کے لیے رنج کا باعث بنی تھیں۔ میری گردن پر دو زوردار جھانپڑ پڑے پھر اے ایس آئی نے میرے پیٹ پر لات رسید کی۔ یکا یک مجھ پر ٹکوں اور ٹھوکروں کی بارش ہو گئی۔ غالباً وہ لوگ سمجھے ہوں گے کہ میں ابھی ڈرائیور کی طرح فرش پر گر کر روتا چلانا شروع کر دوں گا۔ ان بے چاروں کو خبر نہیں تھی کہ یہ سب کچھ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں ایک پروفیشنل فائٹر تھا۔ میرا جسم اس سے کہیں زیادہ تکلیف جھیل سکتا تھا۔ دوسری طرف اگر میں ان پر جوابی وار کرتا تو شاید یہ لوگ چند سیکنڈ میں چوٹیں کھا کر تتر بتر ہو جاتے۔ بہر حال میں ایسا کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ شاید یہی نہیں سکتا تھا۔ میں اپنے ساتھ جو وعدے لے کر یہاں آیا تھا وہ مجھے پابند کرتے تھے کہ میں ان پر جوابی حملہ نہ کروں۔

میری جیکٹ پھٹ گئی۔ نچلے ہونٹ سے بھی خون رسنے لگا۔ انہوں نے اپنے طور پر مجھے اچھی طرح ٹھیک کر لیا تو اے ایس آئی نے میرا پھٹا ہوا گریبان پکڑا اور باہر کی طرف دھکا دیتے ہوئے بولا۔ ”چل بیٹھ گاڑی میں۔ نہیں تو یہیں پرنگا کر دوں گا۔ کوئی معافی نہیں پولیس پر ہاتھ اٹھانے والے کے لیے۔“

میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر ضبط کرتے ہوئے اے ایس آئی کی ہدایت پر عمل کیا۔ ڈرائیور مجھ سے پہلے ہی باہر نکل کر پولیس موبائل کی طرف جا چکا تھا وہ لوگ اسے مارتے ہوئے وہاں تک لے گئے تھے۔ مجھے بھی دھکے دیتے ہوئے پولیس موبائل کے اندر پہنچا دیا گیا۔ ارد گرد کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے چکرارے تھے۔ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ صورت حال اتنی تیزی سے خراب ہو جائے گی۔ میں فی الحال اپنے اور اپنے چچا کی فیملی کے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے

اس سے پہلے کہ اے ایس آئی ہمیں دوبارہ اندرونی کمرے میں بھیجنے کا حکم جاری کرتا! اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف اس کا کوئی افسر تھا۔ ”ہیلو سر! قادر بول رہا ہو... جی جی سر... روڈ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ جی ٹھک ہو رہا ہے کہ یہی لوگ بندے کو ٹکر مار کر یہاں لائے ہیں۔ ٹیکسی کے بمپر پر ڈینٹ بھی نظر آ رہا ہے... جی سر... ایک لڑکی بھی یہاں آئی ہے جی... وہ بھی کچھ واویلا کر رہی ہے۔ آپ یہاں آئیں تو پھر بات کھلے گی... اوکے سر۔“ بات ختم کرنے کے بعد اے ایس آئی نے ایک بار پھر آتشیں نظروں سے مجھے گھورا اور بولا۔ ”معاملہ کافی لمبا لگ رہا ہے باؤ جی اور اس کڑی کا کیا چکر ہے، اس کی بھی ابھی کچھ سمجھ نہیں آئی؟“

حوالدار نے مونچھوں کو تاؤ دے کر عام سے انداز میں کہا۔ ”دھمکی وغیرہ کا چکر ہے جی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں باؤ صیب اور ڈرائیور کی سانجھے داری ہو۔“ اس نے سانجھے داری پر زور دیا۔

”بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ”میں ابھی ابھی ڈنمارک سے آیا ہوں۔ آتے ساتھ ہی میں نے ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور سے سانجھے داری کر کے اس بندے کو ٹکر ماری ہے اور پھر خود ہی اسے اٹھا کر یہاں بھی لے آیا ہوں... زبردست۔“

اے ایس آئی بولا۔ ”بندے کو یہاں لے آنا تمہیں بے گناہ ثابت نہیں کرتا ہے۔ موقع پر اور لوگ بھی تو موجود تھے اور ان میں سے یہ دو تین بندے تمہارے ساتھ بھی آئے ہیں۔“

”کون سے دو تین بندے؟“

”جواب غائب ہو گئے ہیں۔“ اے ایس آئی نے اپنی ٹھوڑی کھجا کر کہا۔

”دو تین بندے نہیں تھے، وہ صرف ایک بندہ تھا اور اسے ہم خود اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ہمیں اسپتال کے راستے کا پتا نہیں تھا۔“ میں نے ترخ کر کہا۔

”یہ تو تم کہہ رہے ہونا، سچ کیا ہے یہ ہمیں پتا ہے اور جو نہیں پتا وہ بھی چل جائے گا۔“ پھر وہ حوالدار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”چلو بھئی، ان دونوں کو بٹھاؤ گاڑی میں۔“

ڈرائیور نے گھگھیا کر کہا۔ ”میں بالکل بے تصور ہوں سر جی۔ میرا اس بندے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ میں تو ڈرائیور ہوں۔“

”اوئے چل باہر، گاڑی میں بیٹھ۔“ اٹھانے جا کر تیرا



”ہاں جی پر میرا چالان ہو گیا تھا۔ چالان کی پرچی میں نے چھوٹے تھانیدار کو دے دی ہے۔“

”اور لائنس؟“

”لائنس بھی دے دیا ہے جی۔“

”پھر کوئی فکر نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اسی دوران میں ہمیں حوالات کی سلاخوں کے اندر سے احاطے میں روشنی دکھائی دی۔ یہ ڈرائیور ٹارکی ٹیکسی تھی جو اب اندر داخل ہو رہی تھی۔ اسے ایک ہیڈ کانسٹیبل چلا کر لایا تھا۔ ٹیکسی برآمدے کے قریب رک گئی۔ بلب کی روشنی میں، میں نے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ ٹیکسی کا اگلا بھر ایک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور سامنے والی جالی بھی مڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہ سب کچھ پہلے تو نہیں تھا۔ غصے سے میرے جسم میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ خبیث اسے ایس آئی نے اپنا کہا سچ ثابت کرنے کے لیے اور ہمیں مزید پھنسانے کے لیے ٹیکسی کو خود نقصان پہنچایا تھا۔ شکر ہے کہ ڈرائیور نے یہ سین نہیں دیکھا ورنہ وہ مزید دہشت زدہ ہو جاتا۔ اسے دیکھ کر تو پہلے ہی ایسا لگتا تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔ اب مجھے اپنے سامان کی فکر ہونے لگی۔ یہ کافی قیمتی سامان تھا اور ٹیکسی کی ڈکی میں پڑا تھا۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ہماری پولیس اپنے قبضے میں آنے والی اشیاء کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے۔ ان میں یقیناً جاندار اشیاء بھی شامل تھیں۔ جیسے وہ بھینس، جس کے تھن سے بے ڈھنگے طریقے سے کھینچ کھینچ کر زبردستی اس کا دودھ نکالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔

ڈرائیور نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ”آپ اپنے کسی رشتے دار یا واقف کار کو فون کریں جی۔ نہیں تو یہاں ہمارا حال بہت برا ہو جاتا ہے۔“

”فون کیسے ہوگا، تمہارا فون تو لے لیا ہے انہوں نے اور میرے پاس ہے ہی نہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہر کام روپے دے کر ہو جاتا ہے جی۔ آپ اس سنتری سے بات کرو۔ ابھی کوئی انتظام کر دے گا۔“

”بھئی مجھے تو یہاں کے طور طریقے پتا نہیں۔ نیا نیا آیا ہوں، تم ہی کوشش کر کے دیکھو۔“

ڈرائیور نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور پھر بڑی عاجزی سے سنتری کو آوازیں دیں۔ ”سنتری جی...“

ڈرائیور ایک منٹ بات سنو جی۔“

سنتری نے بالکل کان نہیں دھرے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ایسی داد فریاد ایسی جگہوں پر ہر وقت کا معمول

اپنی خاموشی اور بے عملی کو برقرار رکھا۔ ”اوئے، ایسے ڈیلے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتا ہے، نیچی کر آئیں، نیچی کر۔“ حوالدار نے میرے بال پکڑ کر میرے سر کو جھٹکا دیا۔

میں نے ہونٹ سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔ ”یہ جو کچھ ہو رہا ہے اچھا نہیں ہو رہا۔ اس کے لیے تم لوگوں کو جواب دینا پڑے گا۔“

”اوئے دے لیں گے جواب بھی تجھ وڈے لاٹ صاب کو۔“ حوالدار نے زہر خند لہجے میں کہا اور مجھے ایک اور جھانپڑ رسید کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن ایک ہیڈ کانسٹیبل نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

”جانے دو جی، کافی ہو گئی ہے۔“ اس نے اپنے حوالدار سے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم پولیس اسٹیشن میں تھے۔ یہ جگہ اپنی مثال آپ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہم ایک سرکاری دفتر میں نہیں کسی چودھری کے ڈیرے پر آگئے ہیں۔ احاطے میں بوہڑ کے ایک بڑے درخت کے نیچے ایک بہت بڑی چار پائی کچھی ہوئی تھی۔ ایک جانب تین چار گھوڑے بندھے نظر آ رہے تھے۔ احاطے میں دستی نکلے کے قریب ایک بھوری بھینس بندھی ہوئی تھی اور ایک اہلکار غلط وقت پر بھونڈے طریقے سے اس کا دودھ دوہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یقیناً یہ بھینس کسی مقدمے میں نلوٹ ہو کر یہاں آئی تھی اور اب تھانے کے اہلکار مالک کے خرچے پر اس کا دودھ وغیرہ نوش کر رہے تھے۔ کافی بڑا تھانہ تھا۔ چھ سات کمرے ہوں گے۔ ایک بڑے کمرے میں بجلی کا ہیٹر جل رہا تھا اور میز پر کاغذات وغیرہ بکھرے ہوئے تھے یقیناً یہی ایس ایچ اوصاحب کا کمرہ تھا لیکن وہ تھانے میں موجود نہیں تھے۔ مجھے اور ڈرائیور کو ایک غلیظ سے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ یہاں پہلے سے تین حوالاتی موجود تھے۔ ایک بے چارہ پرانی (چاول کی چھال) پر الٹا لیٹا تھا یقیناً اسے خوب مار لگائی گئی تھی اور وہ سیدھا لیٹنے کے قابل نہیں تھا۔

ڈرائیور کی حالت بری تھی۔ میں نے اس کا کندھا تھپک کر اسے تسلی دی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے پتا ہے جو کچھ ہوا ہے میری وجہ سے ہوا ہے لیکن تم اب تسلی رکھو۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں غریب بندہ ہوں جی۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”رجسٹریشن ہے نا تمہارے پاس؟“



ہوتی ہے۔ اس لیے تھانے کا عملہ اس پر زیادہ توجہ نہیں دیتا۔  
ڈرائیور... قریباً دس منٹ تک وقفے وقفے سے  
سنتری کو بلاتا رہا لیکن اس نے گھورنے اور بڑبڑانے کے سوا  
اور کچھ نہیں کہا۔ اس دوران میں کسی کمرے سے گاہے  
بگاہے کسی ملزم کے رونے چلانے کی آوازیں بھی آتی رہیں۔  
بالآخر سنتری نے ڈرائیور پر تھوڑا سا ترس کھایا اور بیزار سے  
انداز میں ہماری طرف آیا۔

”یہ کیا چاؤں چاؤں لگا رکھی ہے؟“ وہ اکھڑے لہجے  
میں بولا۔

ڈرائیور نے سلاخوں کے ساتھ منہ لگایا اور سنتری کے  
ساتھ تھوڑی دیر کھسر پھسری۔ ڈرائیور کا انداز بے حد التجا کا  
تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور اپنے ہاتھ کی مٹھی میں کچھ لے کر  
میرے پاس آیا۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ ایک بوسیدہ سا  
موبائل فون تھا۔ وہ مجھے لے کر حوالات کے ایک نمبٹا  
تاریک گوشے میں چلا گیا۔ لرزتی آواز میں بولا۔ ”لو جی،  
جلدی سے کر لو فون جس کو کرنا ہے لیکن آواز ذرا نیچی ہی  
رکھنا۔“

میں یہاں بالکل نو وارد تھا۔ چچا کے سوا کس کو فون  
کر سکتا تھا مگر چچا کے گھر اس وقت منگنی کی رسم چل رہی تھی۔  
مجھے بالکل مناسب نہیں لگا کہ میں اس وقت اس مصیبت کی  
اطلاع انہیں دوں پھر میری نظر برآمدے کے وال کلاک پر  
پڑی۔ اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ دیہات اور  
قصبات میں یہ وقت سونے کا ہوتا ہے۔ عین ممکن تھا چچا کے  
گھر بھی تقریب ختم ہو چکی ہو۔ میں نے چچا کا نمبر ملا یا۔  
دوسری طرف چار پانچ دفعہ بیل ہوئی پھر چچا کی بھاری آواز  
ابھری۔ ”کون؟“

”چچا! میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔“  
”ہاں شاہ زیب پتر، کیا حال ہے؟ کب پہنچ رہے ہو  
پاکستان؟“

میں نے کہا۔ ”چچا! میں پاکستان پہنچ گیا ہوں اور  
یہاں پہنچتے ہی ایک... چھوٹی سی مشکل ہو گئی ہے میرے  
ساتھ۔“

”کک... کیا کہہ رہے ہو... میں سمجھا نہیں؟“  
میں نے مختصر الفاظ میں چچا کو بتایا کہ میرے ساتھ  
یہاں کیا اور کس طرح ہوا ہے۔ چچا ہٹا ہٹا سے سن رہے تھے  
جب اچانک سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے دوبارہ کال ملانے  
کی کوشش کی۔ نیٹ ورک میں خرابی آرہی تھی۔ کال نہیں مل  
رہی تھی۔ ٹار نے میرے ہاتھ سے فون سیٹ لیا اور خود نمبر

ملانے کی کوشش کی۔ اس مرحلہ کوشش کامیاب رہی لیکن آواز  
اب بھی صاف نہیں آئی۔  
ٹار ہیلو ہیلو کر رہا تھا جب اچانک ایک گرج دار آواز  
نے ہمارے کانوں کے پردے پھاڑ دیے۔ ”اوئے... یہ  
کیا کر رہا ہے تو؟“

ٹار سرتاپا لرز گیا۔ اس نے سہم کر آہنی سلاخوں کی  
طرف دیکھا بلکہ ہم دونوں کی نظر ایک ساتھ ہی سلاخوں پر  
پڑی۔ وہاں ہمیں ایک ہٹا کٹا پولیس افسر نظر آیا۔ اس کے  
جبرے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ سخت گیر چہرہ تھمٹایا  
ہوا تھا۔ میں نے فوراً اندازہ لگالیا کہ یہی اس تھانے کا ایس  
ایچ او ہے اور اسپتال میں اے ایس آئی قادر نے اسی سے  
بات کی تھی۔ یہ شخص نہ جانے کب خاموشی سے یہاں آ کر  
کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے ٹار کو فون پر ہیلو ہیلو کرتے دیکھ لیا تھا  
اور اب سخت طیش میں نظر آتا تھا۔

بہر حال چند سیکنڈ بعد جب وہ دوبارہ بولا تو اس کے  
لہجے میں طیش کے بجائے تحمل نظر آیا۔ اس نے ڈرائیور کو  
مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ادھر لاؤ یہ فون۔“

ٹار آگے بڑھا اور لرزتے ہاتھ کے ساتھ فون سیٹ  
ایس ایچ او کی طرف بڑھا دیا۔ اب حوالدار رمضان اور  
اسسٹنٹ سب انسپکٹر قادر بھی ایس ایچ او کے پیچھے آ کر  
مؤدب کھڑے ہو گئے تھے۔

ایس ایچ او نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔ ”جناب کی  
تلاشی نہیں لی گئی تھی؟“

”لی تھی جناب، کہیں نیفے شیفے میں چھپا رکھا ہوگا۔“  
ڈرائیور نے کانپ کر کہا۔ ”نہیں سر جی... میں  
نے... میں نے...“

”کیا میں، میں کر رہا ہے؟“ سب انسپکٹر گرجا۔  
”وہ جی... میں نے... ذرا سنتری صاحب کی منت  
کی تھی۔ ضروری بات کرنی تھی۔“ ٹار نے ایک طرف  
کھڑے سنتری کی طرف اشارہ کیا۔

دبلا پتلا سنتری فوراً مگر گیا کہ اس نے کوئی موبائل دیا  
ہے۔ الٹا وہ غصہ دکھانے لگا کہ اس پر الزام لگایا جا رہا ہے۔  
اس دوران میں لہبا تڑنگا ایس ایچ او حوالات کا  
دروازہ کھلوا کر اندر آ گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے نرم لہجے  
میں کہا۔ ”اگر آپ کو کوئی ضروری بات کرنی ہی تھی تو سب  
انسپکٹر سے کہتے، وہ آپ کو لینڈ لائن پر کال کروا دیتا۔  
میرے تھانے میں اس طرح کا گھپلا ہو، میں کبھی برداشت  
نہیں کرتا۔ آئندہ آپ کو احتیاط کرنا ہوگی۔“



”جی سر... جی سر۔“ غار ہکلا یا۔ وہ ایس ایچ او کے شائستہ لہجے پر قدرے متحیر بھی نظر آ رہا تھا۔  
 ”اب آپ ذرا... مرغابن جائیے۔“ ایس ایچ او نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور غار کا رنگ فق ہو گیا۔ میں بھی ہکا بکا رہ گیا۔

ایس ایچ او دوبارہ بولا۔ ”جناب نے سنا نہیں، میں نے عرض کیا ہے کہ مرغابن جائیے۔“

ڈرائیور غار ایک دم ایس ایچ او کے پاؤں پر گر پڑا۔  
 ”مجھے معاف کر دیجیے جی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اپنے بچوں کے صدقے مجھے...“ اس کا فقرہ ادھور رہ گیا۔ ایس ایچ او نے وہ کیا جس کی توقع ہمیں ہرگز نہیں تھی۔ کم از کم مجھے اور غار کو تو بالکل بھی نہیں تھی۔ اس نے غار کی شلوار کے نیچے پر ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اس کی شلوار نیچے گرا دی۔ اہلکار غار پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے۔ وہ گر گیا۔ لمبی قمیص کی وجہ سے وہ مکمل برہنہ ہونے سے بچ گیا تھا لیکن اس کی مکمل ستر پوشی بھی نہیں رہی تھی۔ وہ دوہائی دے رہا تھا۔  
 ”خدا کے لیے معاف کر دو، خدا کے لیے۔“

میں اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت کھڑا رہا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ انسانیت کی یہ تذلیل میری برداشت سے باہر تھی۔ مزید تکلیف کی بات یہ تھی کہ اس تذلیل کی کوئی بڑی وجہ بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ جھیلنا چاہا لیکن جھیل نہیں سکا۔ میں جھپٹ پڑا۔ میں نے غار کو اہلکاروں کی بے رحم ضربوں سے بچانے کی کوشش کی۔ میں اس پر گر پڑا۔ میں نے اسے ڈھانپ لیا۔ اس کے جسم پر آنے والی تمام چوٹیں میں نے اپنے جسم پر لیں۔ چوٹیں ہر طرف سے لگ رہی تھیں۔

”پیچھے ہٹ جاؤ... پیچھے ہٹ جاؤ۔“ میں دھاڑا لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔

میں ان لوگوں پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ اگر میں نے ہاتھ اٹھایا تو ان کو کاری ضربیں آئیں گی اور ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ایک آدھ کا کام ہی تمام ہو جائے۔ انہیں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کس مصیبت کو دعوت دے رہے ہیں۔ وہ اپنے حریف کی طاقت سے ناواقف تھے۔

دھینکا مشتی کے دوران میں غار اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی شلوار پاؤں سے نکل چکی تھی۔ تاہم لمبی قمیص نے اسے گھٹنوں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ میں اسے اپنے جسم کی آڑ فراہم کرتا ہوا حوالات کے دروازے کی طرف آ گیا۔ مجھے

تھانے دار کے ہاتھ میں اس کا سرکاری پستول نظر آ رہا ہے۔ اس نے پستول کا دستہ پورے زور سے غار کے سر پر مارا۔ دوسرا وار وہ غالباً مجھ پر کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ یہ کافی شدید دھکا تھا اور شاید تھانے دار کو اس کی توقع بھی نہیں تھی۔ وہ آڑتا ہوا سادیوار سے نکل آیا اور کھانے کے برتنوں پر جا گرا۔

صورت حال سنگین تر ہو گئی۔ اے ایس آئی نے بھی پستول نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی نہایت ناخوشگوار واقعہ پیش آ جاتا ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے، رک جاؤ۔“

اس آواز نے جادو کا سا کام کیا۔ نہ صرف اے ایس آئی ٹھٹک گیا بلکہ مجھے اندھا دھند مارنے والے بھی بدک گئے اور ہاتھ روک لیے۔ میں نے غار کو بدستور اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے رکھا تھا۔ وہ بے چارہ سر پر کٹنے والی چوٹ کی وجہ سے نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کا پورا چہرہ خون سے رنگین نظر آنے لگا تھا۔

حوالات سے باہر چھریرے جسم والا ایک دراز قد پولیس افسر کھڑا تھا۔ میں دیکھتے ہی جان گیا وہ ایس پی تھا۔ وہ درمیانی عمر کا نوجوان تھا اور اس نے پی کیپ پہن رکھی تھی۔

”یہ کیا تماشا ہے قیصر چودھری؟“ اس نے غار کے پھٹے ہوئے سر کو دیکھ کر بارعب لہجے میں پوچھا۔

”تماشا آپ کے سامنے ہی ہے جی۔“ تھانے دار نے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ میرا دھکا کھا کر وہ کھانے کے برتنوں پر گرا تھا اور شاید اسٹیل کے جگ کا کنارہ اس کی ٹھوڑی پر لگا تھا۔ یہاں کٹ آنے کی وجہ سے خون رسنے لگا تھا۔

اب عملے کے دو چار مزید افراد لاک اپ کے اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بازوؤں سے جکڑ لیا اور گھسیٹ کر آہنی سلاخوں کے ساتھ لگا دیا۔ ایک نئے کٹے پولیس والے نے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی لگائی اور ہتھکڑی کا دوسرا سرا آہنی سلاخوں سے منسلک کر دیا۔ میرا پہلے سے زخمی ہونٹ مزید زخمی ہو چکا تھا اور چہرے پر مزید چوٹیں بھی آئی تھیں۔

تھانے دار نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ایس پی کو مخاطب کیا۔ ”سر! یہ خطرناک شخص ہے۔ اس نے حوالات سے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔ مجھ پر حملہ کیا ہے۔ پستول چھیننا چاہ رہا تھا مجھ سے۔“



”یہ غلط ہے جناب! ایسا کچھ نہیں ہوا یہاں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اور یہ ٹیکسی ڈرائیور بے قصور ہیں۔ ہمارا گناہ صرف اتنا ہے کہ ہم ایک بے ہوش زخمی کو اٹھا کر اسپتال لائے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو شاید وہ وہیں پڑا پڑا مر جاتا۔“

”یہ بکو اس کر رہا ہے سر۔“ تھانے دار نے ہانپتے لہجے میں کہا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے حاجی نذیر صاحب کی بیٹی اسپتال پہنچی تھی۔ اس نے چلا چلا کر کہا ہے کہ ان لوگوں نے لڑکے کو جان بوجھ کر ٹکر ماری ہے۔ اسے جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔“

ایس پی نے کہا۔ ”چلو، اس بات کا فیصلہ تو عدالت میں ہو جائے گا لیکن یہاں لاک اپ میں جو کچھ ہوا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

تھانے دار نے ایک کپڑے سے اپنی خون آلود ٹھوڑی پونچھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے ذمے دار بھی یہی لوگ ہیں۔ اگر پٹنل میرے ہاتھ سے نکل جاتا تو یہاں باقاعدہ پولیس مقابلہ ہو جاتا تھا۔“ اس کے ساتھ ہی وہ ایک بار پھر مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے مجھے دوزوردار تھپڑ مارے اور میرا گریبان پھاڑ دیا۔ اس موقع پر ایس پی تیزی سے آگے آیا اور اس نے تھانے دار کو مزید کارروائی سے روک دیا۔

”اسٹاپ اٹ، کنٹرول یور سیلف۔“ اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

تھانے دار ہانپتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ ٹھوڑی سے بہنے والے خون نے اس کی وردی کو داغ دار کر دیا تھا۔ انہی خون جیسی سرخی اس کی آنکھوں میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ایس پی اسے لے کر حوالات سے باہر نکل گیا۔ میں سلاخوں کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔ میرا ایک ہاتھ تھکڑی میں تھا۔ ٹارنیم بے ہوشی کی حالت میں ٹھنڈے فرش پر لیٹا تھا۔ حوالدار کی ہدایت پر دو حوالاتی اسے پھونٹ میں لانے کے لیے اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگے۔ دیگر عملہ خونخوار نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا۔ ایک حوالاتی نے کوشش کر کے ٹار کی شلوار اس کی برہنہ ٹانگوں پر چڑھا دی۔ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا میرے لیے بے حد خیر خیز تھا۔ مجھے صرف دو باتوں سے تھوڑی سی تسلی ہو رہی تھی۔ پہلی یہ کہ ایس پی پڑھا لکھا شخص تھا اور قدرے مختلف لگ رہا تھا۔ دوسری یہ کہ چچا حفیظ کو میری مصیبت کی خبر ہو چکی تھی اور یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ میں کس تھانے میں ہوں۔

قریباً ایک گھنٹے کے بعد تھانے کے احاطے میں کسی

گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر اور گزری اور پھر مجھے حوالات کی سلاخوں کی دوسری جانب چچا حفیظ کی صورت دکھائی دی۔ ان کے ساتھ ایک اور ٹیم ختم شخص بھی تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا یہ دوسرا شخص ہمارا ایک دورکار رشتے دار اور ہائی کورٹ کا وکیل تھا۔۔۔۔۔ میری حالت دیکھ کر چچا کا رنگ کچھ اور بھی زرد ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔

”یہ کیا ہو گیا شاہ زیب پتر؟“ انہوں نے لرزاں لہجے میں کہا اور سلاخوں کے اندر سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے خون آلود کپڑوں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ اسی زخمی کا خون تھا جسے ہم نے اسپتال پہنچانے کا گناہ کیا تھا۔

وکیل کا نام عبداللہ تھا اس نے چچا کی موجودگی میں ہی مجھ سے سارا ماجرا سنا۔ اس کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی۔ اس نے کہا۔ ”اگر معاملہ صرف ٹکر والا ہوتا تو میں کل ہر صورت تمہاری ضمانت کروالیتا لیکن اب لڑکی کے بیان اور انسپٹر کے زخمی ہونے کی وجہ سے معاملہ کچھ ٹیڑھا ہو گیا ہے پھر بھی میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ لڑکی کون ہے؟ میرے تو فرشتے بھی اسے نہیں جانتے اور یہ جو لڑکا ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوا ہے، یہ کون ہے؟“

وکیل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تھوڑا بہت اس بارے میں پتا ہے۔ جو لڑکی وہاں اسپتال میں آئی تھی اس کا نام عاشرہ نذیر ہے۔ وہ ایک مقامی زمیندار حاجی نذیر کی بیٹی ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے ایکسیڈنٹ میں زخمی ہونے والا لڑکا عارف اس کا ماموں زاد ہے اور شاید منگیتر بھی۔“

”لڑکی نے اسپتال آتے ساتھ ہی یہ کیوں کہہ دیا کہ ہم نے لڑکے کو جان بوجھ کر ٹکر ماری ہے؟“ میں نے پوچھا۔ وکیل کی طرح میں بھی بہت تھم آواز میں بول رہا تھا۔

”اس کا ٹھیک جواب تو وہی دے سکتی ہے لیکن اس سے یہ خیال ذہن میں ضرور آتا ہے کہ ہو سکتا ہے یہ واقعی ایکسیڈنٹ کا کیس نہ ہو۔ کسی نے دشمنی نکالنے کے لیے جان بوجھ کر عارف کو ٹکر ماری ہو۔ سنا ہے کہ لڑکی جوان اور خوبصورت ہے۔ یہ کوئی رشتے کا تنازعہ بھی ہو سکتا ہے۔“

چچا حفیظ کی آنکھوں میں کڑواہٹ لیتے ہوئے خوف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے متوحش نظروں سے میرے چہرے کی چوٹوں کو دیکھا اور بولے۔ ”شاہ زیب پتر! تجھے کیا ضرورت پڑی تھی یہاں آتے ساتھ ہی پرانے پھلے میں ٹانگ اڑانے کی؟“



میں نے کہا۔ ”چچا! وہ بندہ سڑک کے کنارے مر رہا تھا۔ گاڑیاں گزرتی جا رہی تھیں کوئی اسے اٹھا نہیں رہا تھا۔ وہ چند منٹ اور وہاں پڑا رہتا تو پھر اسپتال بھی نہ پہنچ پاتا۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جس پر مجھے شرمندگی ہو۔“

”لیکن شاہ زیب پترا یہ پولیس والوں کے ساتھ ہاتھ پائی تو غلط ہوئی ہے نا۔ یہ پاکستانی پولیس ہے رائی کا پہاڑ بناتی ہے اور یہاں تو انسپکٹر زخمی بھی ہوا ہے۔ یہ بڑا ڈنگا بندہ ہے یہ ہمیں سخت مصیبت میں ڈال دے گا۔“

میں نے فرش پر کراہتے ہوئے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ ”میں نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا چچا۔ بس اس بے گناہ کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ لوگ اسے وحشیوں کی طرح مار رہے تھے۔ میں اس کے اوپر گر گیا۔ یہ چوٹیں جو مجھے لگی ہیں آپ کے سامنے ہیں۔“

چچا پریشان لہجے میں بولے۔ ”یہ تو تم کہہ رہے ہو ناں، وہ تو کہہ رہے ہیں کہ تم نے اسلحہ چھیننے اور حوالات سے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔ تمہانے دار کی وردی پر خون بھی لگا ہوا ہے۔“

”یہ چوٹ میں نے اسے نہیں لگائی ہے چچا۔ میں نے اسے بس پیچھے دھکیلا تھا۔ وہ برتنوں پر گرا اور کسی برتن کا کنارہ اس کی ٹھوڑی پر لگا اور جو اسلحہ چھیننے والی بات ہے وہ بھی سفید جھوٹ ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“

”ایسے معاملوں میں صرف قسموں سے کام نہیں چلتا۔ شہادتوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔“ ایڈووکیٹ عبداللہ نے ذرا بچھے لہجے میں کہا پھر تسلی دینے والے انداز میں بولا۔ ”بہر حال کل میں پوری کوشش کروں گا کہ ضمانت ہو جائے۔“

میں نے چچا سے معذرت کی کہ میری وجہ سے انہیں ایک مصیبت سے دوچار ہونا پڑا ہے اور وہ بھی خوشی کے موقع پر۔

چچا بہت فکر مند نظر آتے تھے۔ پتا نہیں انہوں نے میری معذرت سنی بھی یا نہیں۔ میں نے وکیل کو اپنے اس سامان کے بارے میں بتایا جو ٹیکسی کی ڈکی میں پڑا تھا۔ اس نے اس سامان کی تفصیل مجھ سے پوچھی اور ایک کاغذ پر لکھ لی پھر بولا۔ ”تمہانے والوں نے بھی سامان کی لسٹ بنائی ہوگی۔ میں اسے اس لسٹ سے ملا لیتا ہوں۔ اللہ کرے زیادہ فرق نہ ہو۔“

مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر چچا اور وکیل تیزی

جاسوسی ڈائجسٹ

سے باہر چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد میں ان کی گاڑی اشارت ہونے کی آواز سن رہا تھا۔ لگ رہا تھا وہ کسی سے ملنے گئے ہیں۔ اب رات کے بارہ کا عمل ہو چکا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی اور اس سردی نے حوالات کی دیواروں اور برہنہ فرش کو کچھ اور ناقابل برداشت بنا دیا تھا۔ تینوں حوالاتی ٹھہرے سبے لاک اپ کی دیواروں سے لگے بیٹھے تھے۔ شارک روٹ کے بل فرش پر پڑا تھا۔ اس کے زخمی سر پر ایک میلی سی پٹی باندھ دی گئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے ہوئے کراہ رہا تھا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے میں ڈرائیور کو اس چکر سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اگر کوئی جھوٹا الزام اپنے سر لیتا پڑا تو وہ بھی لے لوں گا۔ میں پیچھے ہٹنے والا بندہ نہیں تھا۔ اگر کسی کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا تو پھر آخری حد تک جاتا تھا۔

رات کے قریب ڈھائی بجے کا عمل ہو گا جب ایک گاڑی تیزی سے تمہانے کے احاطے میں داخل ہوئی۔ آواز سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی گاڑی ہے جس پر چچا حفیظ اور ایڈووکیٹ پولیس اسٹیشن آئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک چودھری نما بارعب شخص کے ساتھ لاک اپ کی طرف آئے۔ چودھری کے ساتھ دوسرے بندے کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ یہ وہی بندہ تھا جو ہمیں جائے حادثے پر ملا تھا اور جس کو ہم نے اسپتال کا راستہ جاننے کے لیے اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھالیا تھا۔ اسپتال میں پولیس کو دیکھنے کے بعد یہ شخص وہاں سے کھسک گیا تھا۔

چچا حفیظ کی پریشانی میں اب تھوڑی سی کمی دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”شاہ زیب یہ وہی ہے ناں جس نے تمہیں اسپتال کا راستہ بتایا تھا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چچا حفیظ نے کہا۔ ”یہ گھبرا کر اسپتال سے نکل گیا تھا پر اب پھر آ گیا ہے۔ یہ عدالت میں گواہی دے سکتا ہے کہ وہاں موٹر پر اصل معاملہ کیا ہوا تھا۔“

اس شخص نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ میں نے چچا سے پوچھا۔ ”آپ اسے لے کر کہاں سے آئے ہیں؟“

چچا کے بجائے ایڈووکیٹ نے جواب دیا۔ ”ہم موقع پر گئے ہوئے تھے جہاں یہ روڈ ایکسپنڈنٹ ہوا ہے۔ وہاں پاس ہی دو تین دکانیں اور ایک چھوٹی بستی ہے۔ تم اسے چھوٹے سائز کا گاؤں بھی کہہ سکتے ہو۔ یہ اس گاؤں کے چودھری ہیں۔“ اس نے سرخ سفید رنگت والے بارعب



فحش کی طرف اشارہ کیا پھر دیہاتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ کرم داد ہے، اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اسے ڈھونڈنے میں چودھری صاحب نے ہماری مدد کی ہے۔“

چچا حفیظ نے کہا۔ ”ایک اچھی گل اور بھی ہے۔ پتا چلا ہے کہ لاہور کے اسپتال میں زخمی لڑکا ہوش میں آ گیا ہے۔ اللہ سونے سے امید ہے کہ وہ بچ جائے گا۔ عبد اللہ کہہ رہا ہے کہ اگر تھانے دار قیصر سے معاملہ ہو جائے تو کل کچہری سے تمہاری ضمانت ہو سکتی ہے۔“

”تھانے دار سے معاملہ... میں سمجھا نہیں؟“

”پتر، اس کے پاس وردی ہے، اختیار ہے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس معاملے کو سیدھا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے راضی کر لیا جائے۔“

”کس طرح راضی کر لیا جائے؟“ میں نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

”تم... اس کے سامنے معافی کے دو بول، بول دینا۔ باقی گل بات چودھری صاحب خود ہی کر لیں گے۔“

چچا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

میں نے بگڑ کر کہا۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا چچا۔ میں کس بات کی معافی مانگوں؟ معافی تو ان پولیس والوں کو مانگنی چاہیے۔ انہوں نے دو شریف شہریوں کو پریشان کیا ہے، بے وردی سے مارا پیٹا ہے اور یہ سب اس لیے کہ ہم نے ایک شدید زخمی شہری کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔ ٹھیک ہے ہمیں شاباش نہ دو، ہماری حوصلہ افزائی نہ کرو لیکن اس طرح معافیاں تو نہ منگو اؤ ہم سے۔“

چچا حفیظ نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”پتر! تم جہاں سے آئے ہو وہاں یہ رواج ہوں گے، یہاں نہیں ہیں، خدا کا شکر کرو کہ بندے کی حالت اسپتال میں چٹکی ہو گئی ہے اور یہ چودھری بشارت بھی ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ نہیں تو کام بہت بگڑ جاتا تھا۔“

میں اندر سے بری طرح تپ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”لیکن میں انسپکٹر سے معافی نہیں مانگوں گا۔ جب میرا قصور ہی کوئی نہیں تو معافی کس بات کی؟ یہ تو اپنے آپ سے جھوٹ بولنا ہے اور میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

چچا حفیظ کے چہرے پر ناگواری کے آثار نظر آئے۔ انہوں نے کہا۔ ”شاہ زیب! تم نے پہلے بھی جلد بازی کر کے معاملہ بگاڑا ہے، اب اور من مانی نہ کرو۔ میں جیسا کہہ رہا ہوں ویسا تمہیں کرنا پڑے گا۔ تم صرف معافی مانگ لو باقی بات ہم کر لیں گے۔“ چچا روانی میں کہہ گئے۔

”باقی بات کیا؟“ میں نے پوچھا۔

چودھری نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا اور سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”تھانے دار اور چھوٹے تھانے دار کو کچھ دینا دلانا بھی پڑے گا۔ ان لوگوں کے ہاتھ میں قلم ہے۔ دو چار سخت لفظ بھی انہوں نے رپورٹ میں لکھ دیے تو بات مہینوں اور سالوں تک چلی جائے گی۔“

میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ ”تو آپ لوگ رشوت کی بات کر رہے ہیں؟“

چچا حفیظ نے اپنا نیت بھرے غصے سے کہا۔ ”تم ان باتوں میں دخل نہ دو جن کا تمہیں پتا نہیں۔ جب یہاں کچھ دن رہ لو گے پھر اپنی مرضی کر لیتا۔ ابھی جو کہتے ہیں وہ کرتے جاؤ۔ صبح سات بجے پیشی کے لیے روانگی ہے۔ اس سے پہلے پہلے معاملہ ٹھیک ہو جانا چاہیے۔“

”میں نے صاف کہہ دیا ہے، میں کسی سے معافی نہیں مانگوں گا اور میں نے کسی کو رشوت بھی نہیں دی۔ آپ میری بات ایس پی صاحب سے کروائیں وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات سنیں گے۔ وہ یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“ میں نے کہا۔

ایڈووکیٹ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”تم ایس پی تبریز کی بات کر رہے ہو۔ تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ وہ بہت اچھے افسر ہیں لیکن یہاں بات اچھے برے کی نہیں۔ یہ دیکھنا ہے کہ کس کا اختیار زیادہ ہے اور کوئی بڑا افسر ہوتے ہوئے بھی بے اختیار ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

”قیصر چودھری ویسے تو صرف انسپکٹر ہے لیکن اس کی اصل اتھارٹی شاید ایس پی سے بھی زیادہ ہے، اس کا پیچھا بڑا مضبوط ہے۔ وہ ایک بہت با اثر شخص کا خاص آدمی ہے۔“

”کون شخص؟“ میں نے پوچھا۔

ایڈووکیٹ بس لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے صاف دیکھا کہ چچا حفیظ کے چہرے پر بھی رنگ سا آ کر گزر گیا ہے اور صرف چچا حفیظ ہی نہیں ان کے ساتھ آنے والے چودھری کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

”شاہ زیب! میرا مشورہ ہے کہ تم فی الحال سوال جواب میں زیادہ وقت ضائع نہ کرو۔ ابھی تمہارے لیے اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ انسپکٹر کی بیک بڑی ٹکڑی ہے۔ اگر ہم نے اس کی ناراضگی دور نہ کی تو بڑی سخت مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ تمہارے چچا جو کہہ رہے ہیں وہ بات سونی



ایک دو فقروں نے میرے سینے میں سلگتے انگاروں کو کچھ اور بھی تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ چچا بڑے التجائیہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”بچے جناب، نیا نیا آیا ہے۔ نا سمجھ ہے، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیتا ہے آپ سے۔“

تھانے دار کی دھیمی مگر نہایت کاٹ دار آواز سنائی دی۔ ”میں نے اس کی معافی کا اچار ڈالنا ہے۔ معافی مانگنی ہے تو عدالت میں جا کر مانگے۔ میں تو قانون کا نوکر ہوں جو قانون کہتا ہے وہ میں نے لکھ دیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”ایسا نہ کہیں قیصر صاحب۔ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بچوں سے غلطی ہو جاتی ہے۔ بڑے معاف کرتے ہیں۔“ چچا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

چودھری بشارت مدد کرتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو جی قیصر صاحب! ہم تو جانتے ہیں ناں آپ کو۔ کبھی چوں چراں کی ہمت نہیں کرتے آپ کے سامنے۔ اب یہ منڈا انجانے میں غلطی کر بیٹھا ہے، آپ وڈا پن دکھائیں، معاف کر دیں۔“

گفتگو وضاحت سے ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ تاہم یہ بات واضح تھی کہ چچا وغیرہ تھانے دار کی منت سماجت میں مصروف ہیں۔

کچھ دیر بعد چچا حفیظ اور وکیل میرے پاس آئے۔ چچا کی آنکھوں میں نمی تھی۔ میرے سامنے پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔ ”دیکھ تھانے دار کے سامنے کوئی غلط سلسلہ بات منہ سے نہ نکالنا۔ میرے کہنے کی لاج رکھ لینا۔ اس سے معافی کے دو بول، بول لینا، باقی ہم سنبھال لیں گے۔“

چچا کی بے چارگی اور ڈرائیور کی بے بسی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں رضامندی کے انداز میں خاموش رہا۔ ایک ہیڈ کاسٹیل نے میری ہتھکڑی کھول دی۔ میں چچا اور ایڈووکیٹ کے ساتھ لاک اپ سے نکل کر اس کے دفتر نما کمرے کی طرف بڑھا جہاں اس تھانے کا حاکم انسپکٹر قیصر براجمان تھا۔ بجلی کے ہیٹر نے کمرے کو نیم گرم کر رکھا تھا۔

میز کے سامنے صرف دو کرسیاں تھیں، جن میں سے ایک پر چودھری اور دوسری پر سب انسپکٹر قادر بیٹھا تھا۔ انسپکٹر قیصر کی ٹھوڑی پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ پرانی طرز کے ٹیلی فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے سرخ چہرے پر غصے کی تمنا ہٹ تھی اور لہجہ نرم ہونے کے باوجود اپنے اندر زہر چھپائے ہوئے تھا۔ وہ ریسیور... کان سے

مدد درست ہے۔ تمہیں قیصر صاحب سے معافی مانگ لینی چاہیے۔ باقی ہم سنبھال لیں گے۔“ پھر وکیل مزید دھیمی آواز میں بولا۔ ”وہ کہتے ہیں تاکہ وقت پڑنے پر لوگ گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں سیدھا سیدھا چلنے والا شخص تھا۔ میری عمر کا زیادہ حصہ ڈنمارک جیسے ملک میں گزرا تھا۔ کئی ایک معاشرتی خامیوں اور اخلاقی برائیوں کے باوجود وہاں عدل و انصاف کا بول بالا تھا۔ شہریوں کو مثالی حقوق حاصل تھے۔ ان لوگوں نے اسلام کے ہی کچھ سنہری اصولوں کو اپنا کر اپنی زندگیوں کو آسان اور خوبصورت بنا رکھا ہے۔ عدل و انصاف کا رویہ بھی ان سنہری اصولوں میں سے ایک ہے۔ میں نے اب تک یہی کچھ دیکھا تھا لیکن اب جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ مجھے ایک ایسے شخص سے معافی مانگنے کا کہا جا رہا تھا جسے مجھ سے معافی مانگنی چاہیے تھی بلکہ جسے اپنی نوکری کا خطرہ لاحق ہو جانا چاہیے تھا۔

اگلا آدھ گھنٹا اسی بحث و تکرار میں گزر گیا۔ آخر چچا حفیظ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ پتر شاہ اگر تو مجھے اپنا چاچا سمجھتا ہے اور تیرے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی عزت ہے تو میری بات مان لے۔ معافی مانگنے سے تو چھوٹا نہیں ہو جائے گا لیکن ہم سب ایک بڑی مصیبت سے بچ جائیں گے۔ یہ دیکھ... میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔“

چچا کے بندھے ہوئے ہاتھ دیکھ کر میں تڑپ گیا۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے پھر میری نظر ٹھنڈے فرش پر کراہتے ہوئے زخمی ثار پر پڑی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اگر یہ معاملہ مزید بگڑ گیا تو اس بے چارے کو بھی سخت رگڑے لگیں گے۔ میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے چچا کے سامنے نیم رضامندی ظاہر کر دی۔

چچا اور عبداللہ دوسرے کمرے میں تھانے دار کی طرف چلے گئے۔ چودھری بھی ان کے ساتھ گیا۔ چودھری کا پورا نام بشارت گوندل تھا۔

میری ٹانگیں مسلسل کھڑے رہنے سے اور سردی کے سبب اکڑ گئی تھیں کیونکہ ہتھکڑی کی وجہ سے میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک بے دم ہو چکا ہوتا لیکن میرے لیے یہ سب جھیلنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کسی قریبی کمرے سے تین چار افراد کے بولنے کی مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ کوئی کوئی فقرہ میری سمجھ میں آ بھی رہا تھا۔ ایسے میں

جاسوسی ڈائجسٹ



معافی مانگ لو قیصر صاحب سے۔ یہ چاہیں تو ابھی پولیس مقابلے کا کیس بن سکتا ہے نمبر پر۔ دفع 333 وغیرہ لگ گئی تو دن میں تارے نظر آجائیں گے ہم سب کو۔“

چچا حفیظ نے مجھے ٹھوکا دیا۔ میں کسی اور ٹائپ کا بندہ تھا۔ تھانے دار قیصر چودھری جیسے لوگ میرا کچھ بگاڑ سکتے تھے اور نہ مجھے مرعوب کر سکتے تھے لیکن یہاں صورت حال کچھ اور ہو گئی تھی۔ میری وجہ سے کچھ اور لوگ سخت پریشانی میں گرفتار ہو رہے تھے جن میں چچا حفیظ اور ڈرائیور شام سرفہرست تھے۔ میں نے دل پر جبر کیا اور خود کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ”جو کچھ ہوا غلط ہوا۔۔۔ آئی ایم سوری انسپکٹر۔“

اس کا چہرہ کچھ اور تہمتا گیا۔ اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”واہ۔۔۔ زبردست۔۔۔ یہ کیسا لفظ ایجاد کیا ہے انگریزوں نے سوری۔۔۔ کمال کا لفظ ہے۔ بندے کی اکڑ بھی نہ ٹوٹے اور معافی تلافی بھی ہو جائے۔ واہ۔۔۔ سوری۔“ اس نے ہاتھ نچا کر کہا۔

چچا نے ایک بار پھر مجھے ٹھوکا دیا اور غصے بھری سرگوشی میں بولے۔ ”سیدھی طرح کہو نا۔۔۔ معاف کر دیں۔“ میرے دماغ میں چٹکاریاں سی بھر گئیں لیکن میں نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میں نے انسپکٹر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جو کچھ ہوا میں اس کے لیے معافی مانگتا ہوں۔“

”کس سے؟“ انسپکٹر قیصر نے ڈھٹائی سے پوچھا۔ وہ ذلیل کرنے پر تگتا ہوا تھا۔

میرا جی چاہا کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس پر پل پڑوں۔ اس پر گھونے برساتا جاؤں اور کہتا جاؤں تم سے۔۔۔ تم سے۔۔۔ تم سے کہیں۔

لیکن میں جانتا تھا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میرے سامنے وعدوں کی ایک زنجیر تھی۔ میں نے حتی الامکان برداشت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“

وہ ایک دم بھٹک کر میری طرف آیا۔ اس نے اپنے شائستہ لہجے کو خیر باد کہا اور میرا گریبان پکڑ کر پھینکا۔ ”اسی طرح بک بک کرنا جس طرح کر رہا تھا۔ بلانا اپنے کسی لاٹ صاحب کو جس کے سامنے مجھے اپنے کرتوتوں کا جواب دینا ہے۔۔۔ بلانا اب۔“ اس نے میرے پٹے ہوئے گریبان کو جھنجھوڑ کر مزید پھاڑ دیا۔

چودھری بشارت جلدی سے ہمارے درمیان آیا۔

لگائے ہوئے بولا۔

”چلو کوئی بات نہیں جناب عالی۔ آپ کے کوٹھے کی لڑکی ہے تو ہمارے سر آنکھوں پر۔ مجھے پتا ہوتا تو کل ہی چھوڑ دیتے اسے لیکن اب بھی کوئی بات نہیں صبح تک محترمہ آجائیں گی واپس آپ کے کچر خانے پر۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ آپ بے فکر رہیں۔ نہیں جی نہیں۔۔۔ آپ اتنا پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ چھوٹی موٹی شرارت سے کیا بگڑ جاتا ہے ایسی ہونہار کڑیوں کا اور آپ کی یہ بادشاہ زادی تو دیکھنے میں ہی بڑی ہیوی ڈیوٹی لگتی ہے۔۔۔“

تھانے دار کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کسی قریبی چوکی میں کسی طوائف زادی اور دو تماش بینوں کو پکڑ کر بند کیا گیا ہے اور یہ واقعہ پچیسویں رات پیش آیا ہے۔ شاید طوائف زادی کے ساتھ کسی بہکے ہوئے اہلکار نے دست درازی کی ہے یا پھر اس سے بھی آگے گیا ہے۔ اب ایس ایچ او طوائف زادی کے وارث کو ٹھے دار کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی اسے یہ بھی باور کروا رہا تھا کہ لڑکی کی رہائی کے لیے اسے نقد کی صورت میں بھی کچھ نہ کچھ خرچ دینا پڑے گا۔

بات لمبی ہوتی جا رہی تھی بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر بات لمبی کر رہا ہے۔ شاید ہمیں اس طرح اپنے سامنے کھڑا کر کے اور انتظار کروا کے اسے مزہ آرہا تھا۔ یہ کوٹھے دار یا دلال اس کا پرانا واقف کار لگتا تھا۔ لڑکی والی بات چیت کے بعد اس نے کسی متنازعہ پلاٹ کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ اسے ہماری موجودگی کی جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ خدا خدا کر کے اس کی یہ فون کال ختم ہوئی اور اس نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ چچا حفیظ نے جو الفاظ پچھلے پندرہ بیس منٹ سے اپنے ذہن میں جوڑ رکھے تھے وہ تھانے دار کے سامنے ادا کر دیے۔

چچا نے کہا۔ ”جناب! یہ اپنی غلطی کو مان رہا ہے۔ آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔“

تھانے دار نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”کیا بات کر رہے ہو بزرگو! میں ایک دو ٹکے کا تھانے دار اور یہ سر جی آئے ہیں ڈنمارک سے۔ پتا نہیں کتنا پڑھے ہوئے ہیں اور کن کن پڑھے لکھوں سے رابطے ہیں جناب کے۔ میری موت آئی ہے کہ میں ان سے معافی منگواؤں؟“

”چلو جی غصہ تھوک دو صاحب۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی شرمندہ ہو رہے ہیں۔“ چودھری بشارت نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو



اس نے ایک بار پھر انسپکٹر کی منت سماجت کی۔ وہ اپنے کپڑوں سے باہر ہو رہا تھا۔ پھر دباڑا۔ ”تو جانتا نہیں ہے مجھ کو۔ تیرے جیسے میرے پیشاب کی دھار میں بہہ جاتے ہیں۔۔۔“ فقرے کے آخر میں اس نے بلا دریغ مجھے ایک گالی سے نواز دیا۔

میرا پیمانہ صبر لبریز ہونے لگا۔ سر سے پاؤں تک جیسے ایک برق کوند گئی۔ میں نے کچھ کہنے کی غرض سے منہ کھولا تھا لیکن چچا شاید میرے منہ کھولنے سے پہلے ہی میرا ارادہ بھانپ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے میرا منہ ڈھانپ لیا اور مجھے زور سے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولے۔ ”چپ۔۔۔ چپ ایک لفظ نہیں کہنا۔۔۔ چل نکل اب یہاں سے۔۔۔ نکل۔“ انہوں نے مجھے اپنی اوٹ میں لے لیا۔ شکر کا مقام تھا کہ عین اس وقت تھانے دار کے فون کی گھنٹی بج اٹھی اور وہ ذرا ٹھٹھک کر فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ چچا اور عبداللہ وغیرہ مجھے پھر لاک اپ کی طرف لے آئے۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ شاید معافی مانگنے کے بعد میں گھر جاسکوں گا۔ مجھے پھر لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد تھانے دار کے کمرے کی طرف سے ایک بار پھر گفت و شنید کی آوازیں آنے لگیں۔ اب غالباً لین دین والا معاملہ طے ہو رہا تھا۔ میں اندر سے بے طرح امل رہا تھا۔ پتا نہیں کہ ٹھوڑی پر لگنے والی ایک چوٹ کے عوض اس راشی تھانے دار نے چچا سے کتنی رقم وصول نہ تھی۔

رات کے قریب ساڑھے تین ہو چکے تھے۔ یہ سرد رات کچھ زیادہ ہی طویل محسوس ہو رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد تھانے دار کو کسی واردات کی اطلاع ملی اور وہ جیپ پر بیٹھ کر کہیں چلا گیا۔ تاہم چچا حفیظ اور عبداللہ بدستور تھانے میں ہی موجود رہے۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ تھانے دار کے واپس آنے پر پھر میرا اور اس کا سامنا ہو جائے اور وہ میرے ساتھ کوئی بدسلوکی کرے۔

خدا خدا کر کے اجالے کی جھلک نظر آئی۔ چچا نے میرے اور تھانے دار کے لیے حلوہ پوری اور چنے کا ناشا لاک اپ میں بھجوا دیا۔ یہ ناشا جوں کا توں پڑا رہا بعد میں میرے اصرار پر تینوں حوالاتیوں نے یہ ناشا کیا۔

پرودگرم کے مطابق سات بجے کے قریب ہمیں ضلع کچہری لے جانے والی گاڑی تھانے پہنچ گئی۔ اس میں کسی دوسرے تھانے کے چار حوالاتی اور بھی تھے۔ ایک حوالاتی کی ناک سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ آدھ پون گھنٹے کے سفر

کے بعد ہماری گاڑی لاہور میں داخل ہوئی اور پھر کچہری پہنچ گئی۔ اب ایڈووکیٹ کا کام تھا۔ اس نے اپنا کام بڑے اچھے طریقے سے کیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ لڑکی یا اس کے وارث کچہری میں موجود ہوں گے جس نے اسپتال میں ہم دونوں پر دانستہ نکر مارنے کا الزام لگایا تھا مگر یہ خدشہ غلط ثابت ہوا۔ ڈرائیور تھار کا لائسنس بج کو پیش کیا گیا اور مختصر کارروائی کے بعد ہم دونوں کی ضمانت ہو گئی۔

چچا کے علاوہ میرا چچا زاد بھائی ولید اور دو تین دیگر عزیز بھی کچہری میں موجود تھے۔ سب نے مجھے فردا فردا گلے لگایا اور پھر پرائیوٹ گاڑی میں بٹھا دیا۔ تھار کو ابھی تک ٹیکسی واپس نہیں ملی تھی۔ میرا سامان بھی تھانے میں ہی تھا۔ میں نے تھار کو ہر طرح تسلی دی اور وکیل سے کہا کہ وہ جلد از جلد سپرداری کروا کے تھار کی ٹیکسی اس کے حوالے کر دے۔ آئندہ پیشی پر بھی میں نے اسے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ کرائے کے علاوہ میں نے مرہم پٹی اور ٹیکسی کی مرمت کے لیے چار ہزار روپے اسے نقد دیے۔ وہ دعائیں دیتا رخصت ہوا۔ ہم لاہور سے واپس چچا کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

چچا کے گھر میں رونق تھی۔ چچی آمنہ بھی تھانے کچہری کا سن کر بے حد پریشان تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ مجھ سے شفقت کی تھی۔ وہ دیر تک مجھے گلے سے لگائے کھڑی رہیں۔ چچا کے صرف دو ہی بچے تھے۔ ایک فائزہ جس کی شادی ہو رہی تھی اور دوسرا ولید جو قریباً میرا ہی ہم عمر تھا۔ انہوں میں آکر میں جیسے کل رات والے دکھ بھول سا گیا لیکن سینے کے اندر سلگنے والی آگ مسلسل اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ جیسے بادلوں کے اندر گاہے بگاہے بجلی چمک جاتی ہے اسی طرح دو مناظر بار بار آنکھوں کے سامنے آتے تھے اور دل میں خنجر سا گھونپ دیتے تھے۔ ایک تھار کے نیم برہنہ ہونے کا منظر اور دوسرا وہ منظر جب میں نے پھرے ہوئے تھانے دار سے معافی مانگی اور اس نے مجھے گالی دی۔

اگلے پانچ چھ دن رشتے داروں اور واقف کاروں سے ملنے ملانے میں گزر گئے۔ گھر میں بھی خوب گہما گہمی رہی۔ اس گھر سے میرے بچپن کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ اُن دنوں میں بھی اپنے والدین کے ساتھ یہیں رہتا تھا۔ ہم بچے اس وسیع گھر میں آنکھ میچولی کھیلتے تھے۔ احاطے میں دوڑتے بھاگتے تھے، باغیچے کے درختوں پر چڑھتے



”سے۔“

ابھی چند سیکنڈ پہلے ہم نے گلی میں کسی گاڑی کے انجن کی مدھم سی آواز بھی سنی تھی۔ ولید اپنی گرم چادر درست کرتا ہوا باہر گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”حاجی نذیر صاحب کی گاڑی ہے۔ اس میں وہی لڑکی ہے جس نے اس دن اسپتال میں تمہیں برا بھلا کہا تھا۔“

”تمہارا مطلب ہے حاجی صاحب کی بیٹی؟“

”ہاں، وہ ملنا چاہ رہی ہے تم سے۔“

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پچھلے چھ سات دنوں میں، میں نے کئی بار اس لڑکی اور اس کے رویتے کے بارے میں سوچا تھا۔ اگر وہ یہاں نہ آتی تو شاید ایک دو دن میں، میں خود اس سے ملنے کی کوشش کرتا۔ میں ولید کے ساتھ باہر آگیا۔ ایک ٹویوٹا کار میں پچھلی نشست پر وہی خوب روڑکی موجود تھی جو اس رات اسپتال میں مجھ پر بے طرح برسی تھی۔ سیاہ گرم چادر میں سے اس کے چہرے کی ایک سائڈ دکھائی دے رہی تھی۔ ناک میں شاید چاندی کا چھوٹا سا کوکا جگمگا رہا تھا۔ گاڑی کا ڈرائیور ایک طرف مودب کھڑا تھا۔

میں قریب پہنچا تو لڑکی نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی حسین آنکھوں میں حزن و ملال کی کیفیت نظر آئی، وہ بولی۔ ”میرا نام عاشرہ ہے۔ میں حاجی نذیر صاحب کی بیٹی ہوں۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو دو منٹ کے لیے گاڑی میں بیٹھ جائیں۔“

میں ذرا سا ہچکچایا پھر اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ میرے پاؤں زمین پر تھے یوں میں اگلی نشست پر بیٹھے ہونے کے باوجود لڑکی کی طرف دیکھ بھی سکتا تھا۔

”جی فرمائیے۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک دم نمی آگئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اس روز میری طرف سے آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی۔ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ فکر مارنے والے آپ نہیں تھے۔ آپ نے تو عارف کو بچانے میں مدد کی تھی۔ اگر آپ اسے اسپتال نہ پہنچاتے تو... اللہ جانے کیا ہو جاتا۔“ میں نے دیکھا دو آنسو اس کے شفاف رخساروں پر لڑھک گئے۔

میں نے کہا۔ ”چلو، آپ کو غلطی کا احساس ہو گیا۔ جلد بازی میں جو رویہ دکھایا جاتا ہے وہ اکثر غلط ہی ہوتا

تھے اور پرندوں کی طرح کپے کپے پھل کھاتے تھے۔ میری دونوں بہنیں بھی اس کھیل کود میں میرے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔ اس گھر میں آکر وہ ساری سنہری یادیں تازہ ہو گئیں۔ چچا نے اس گھر کو حال ہی میں رنگ و روغن کروایا تھا۔ باغیچے کی تراش خراش درست کی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے اس آبائی عمارت کو بڑی اچھی طرح سنبھال رکھا ہے۔

گھر کے پچھواڑے ایک کارخانہ نما جگہ تھی۔ ہمارے دادا کے زمانے میں یہاں سردیوں کے موسم میں بڑے بڑے کڑا ہوں میں گڑ تیار ہوتا تھا اور تہواروں یا تقریبات پر میدے اور بوندی کے لڈو بنتے تھے لیکن اب یہاں باقاعدہ بیکری کا سامان تیار ہوتا تھا۔ یہ اعلیٰ کوالٹی کا سامان نہ صرف لاہور شہر میں سپلائی کیا جاتا تھا بلکہ لاہور کے ایک اچھے علاقے میں بیکری کے سامان کی ایک شاندار دکان بھی تھی جس کی دیکھ بھال ولید کرتا تھا۔

چچا کے گھر گزرنے والے پانچ چھ دنوں میں، میں نے صاف محسوس کیا کہ چچا کچھ پریشان ہیں۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید مقامی تھانے دار سے جو آن بن ہوئی تھی اس کا اثر ہے لیکن پھر محسوس ہوا کہ کوئی اور بات ہے۔ شاید کوئی کام کاج کا مسئلہ ہے۔ میں نے اس بارے میں ولید سے بھی ٹوہ لی۔ اس نے بھی یہ بات تسلیم تو کی کہ اب دو تین مہینوں سے پریشان ہیں لیکن کیوں؟ اس بارے میں وہ بھی الجھن میں تھا۔ میں نے سوچا کہ عین ممکن ہے یہ بھی کوئی لڑائی جھگڑے کا معاملہ ہو۔ ولید طبیعت کا بہت خیز تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ چچا گڑبڑ والی باتیں اس سے چھپا لیتے ہیں۔

تھانے سے واپسی کے تیسرے دن مجھے میرا وہ سامان بھی واپس مل گیا جو ٹیکسی کی ڈکی میں رکھا گیا تھا۔ حسب اندیشہ اس میں سے دو تین قیمتی چیزیں غائب تھیں۔ غائب ہونے والی چیزوں میں ایک لیڈیز گھڑی بھی تھی جو میں نے... فائزہ کو دیگر تحائف کے ساتھ دی تھی۔ بہر حال وکیل کے بقول اس سلسلے میں صبر و شکر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

ایک دن سردی معمول سے کچھ زیادہ تھی۔ شام سے پہلے ہی ہلکی سی دھند چھانا شروع ہو گئی تھی۔ میں اور ولید گھر کی وسیع و عریض بیٹھک میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ ہمارے سامنے کونکوں کی انگلیٹھی دکھ رہی تھی۔ اتنے میں گھر کا کام کرنے والی ماسی اندر آئی اس نے ولید سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ولید پتر! گاڑی میں کوئی لٹنے آیا ہے تم



نذیر کی بیٹی ہے۔ اپنے شوق کی وجہ سے لاہور میں کسی جاب کے لیے جاتی ہے اور اس کا ماموں زاد عارف غالباً اس کا سنگیتر ہے۔

”یار ولید! میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس لڑکے عارف سے ایک بار ملا جائے۔“ میں نے کہا۔

”کیوں؟“

”بس بڑی الجھن سی ہو رہی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں... تجسّس پیدا ہو رہا ہے۔“

”وہ جنرل اسپتال میں ہے۔ کل میرے ساتھ شہر چلنا مل لیں گے اس سے۔“ ولید بولا۔

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے چچا حفظ کے کھانسنے کی مسلسل آواز آنے لگی۔ چچی آمنہ پکار کر بولیں۔

”ولید! اپنے ابا جی کی دوائی دیکھنا کہاں ہے۔“ ہم دونوں چچا کو دیکھنے ان کے کمرے کی طرف چلے گئے۔

☆☆☆

اگلے روز میں ولید کے ساتھ جنرل اسپتال پہنچا۔ عارف سے ملاقات ہوئی۔ حادثے کی رات بھی اسے دیکھا تھا لیکن وہ افراتفری کا عالم تھا۔ آج دھیان سے دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا ایک خوش رو نو جوان تھا۔ شلواری قمیص پہنے بستر پر نیم دراز تھا۔ مضافاتی علاقے کا رہائشی ہونے کے باوجود پڑھا لکھا نظر آتا تھا۔ طبی امداد کے دوران میں اس کا سر مونڈ دیا گیا تھا اور کپٹی کے قریب دس پندرہ ٹانگے نظر آرہے تھے۔ ایک ہاتھ پر بھی آٹھ دس دن پرانا زخم تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اسے جائے حادثہ سے اٹھا کر اسپتال پہنچانے والا میں ہوں تو اس کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ ”بہت شکریہ۔“ اس نے بس اتنا ہی کہا۔

میں نے کہا۔ ”پار! آپ پڑھے لکھے نظر آتے ہو۔ آپ کو ہیلمٹ ضرور پہننا چاہیے۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید یہ حادثہ اتنا سنگین ثابت نہ ہوتا۔“

”ہو ہی جاتا تو اچھا تھا۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”کیا مطلب؟“

”گگ... کچھ نہیں۔“ وہ ایک دم پڑمردہ دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگا کہ اپنی جان بچ جانے کی اسے کوئی خوشی ہی نہیں۔ اس کے چہرے پر غم و اندوہ کی کیفیت جیسے نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اور ولید اس کے لیے پھل وغیرہ لے کر گئے تھے۔ اس نے ہمارے لیے جائے منگوائی۔

باتیں کرتے کرتے وہ اچانک سسک پڑا۔ کراہ کر

”میں جانتی ہوں، آپ کو اس خدا ترسی کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ آپ کے ساتھ مار پیٹ ہوئی، آپ کو حوالات میں رات گزارنا پڑی۔ اب بھی ایک دو پیشیوں کے بعد آپ کی خلاصی ہوگی۔“ اس کے لہجے میں ہمدردی آمیز دکھ تھا۔

”ایک انسانی جان بچ گئی، اس کے عوض یہ سب، کچھ معنی نہیں رکھتا۔“ میں بولا۔ ہمارے درمیان چند جملوں کا تبادلہ مزید ہوا پھر میں نے کہا۔ ”عاشرہ صاحب! آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھوں، اگر آپ برانہ مانیں؟“

”پوچھیے۔“ وہ ذرا توقف سے بولی۔

”اس رات آپ کے شدید غصے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو کسی پر شک تھا۔ آپ کا خیال ہے کہ عارف کی بائیک کو کسی نے جان بوجھ کر ٹکرا رہی ہے، آپ کا... ایسا کون دشمن ہے جو اس حد تک جاسکتا ہے؟“

عاشرہ کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”سوری شاہ زیب صاحب! میں آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔“ اس کے چہرے پر کرب کے آثار صاف دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا۔ ”اچھا... یہی بتا دیجیے کیا اب آپ کا شک رفع ہو چکا ہے... میرا مطلب ہے، جان بوجھ کر ٹکرا مارنے کے حوالے سے؟“

”جج... جی ہاں... وہ بس ایک غلط فہمی تھی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ بہت کچھ چھپا رہی ہے۔

عین اس وقت میری نگاہ اتفاقاً اس کی کلائی پر پڑی۔ دودھیا جلد پر ایک دو نیل تھے اور کٹ کا نشان تھا۔ یوں لگا کہ دو چار روز پہلے کا بچ کی چوڑیوں نے ٹوٹ کر اس کی کلائی زخمی کی ہے۔ شاید اس سے کھینچا تانی ہوئی تھی۔ یہ منظر بس ایک سیکنڈ کے لیے دکھائی دیا پھر اس کی گرم شال نے کلائی کو ڈھانپ لیا۔

عاشرہ نامی لڑکی تو معافی ستانی کر کے چلی گئی لیکن میرے ذہن میں کئی سوال چھوڑ گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں اور ولید پھر بیٹھک میں گرم انگلیٹھی کے پاس آ بیٹھے اور اس لڑکی کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ ولید اس کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ اس علاقے کے ایک بڑے زمیندار حاجی



میرے تجسس کا بڑھ جانا ایک فطری عمل تھا۔ میں کافی حد تک عارف کو اپنے اعتماد میں لے چکا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میرے اور اس کے درمیان جو بات چیت ہو رہی ہے وہ ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گی۔ شاید وہ بھی ایک ایسی کیفیت میں تھا جب بندہ دیوار سے بھی بات کرنے کو تیار ہو جاتا ہے تاکہ اس کا غم ہلکا ہو سکے۔

میرے اصرار پر اس نے ایک بھاری بھر کم سیاسی شخصیت کے بیٹے کا نام لیا۔ اس سیاسی شخصیت کا نام میں نے ڈنمارک میں بھی اکثر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر سنا تھا۔ عطا اللہ داراب صاحب خود تو عملی سیاست میں نہیں تھے لیکن پس پشت رہ کر وہ سب کچھ کر رہے تھے۔ آسان لفظوں میں کہا جائے تو یوں ہوگا کہ عطا داراب نامی یہ بندہ ان لوگوں میں سے تھا، جو کنگ نہیں ہوتے... کنگ میکر ہوتے ہیں۔ عطا داراب صاحب ایک بڑے صنعت کار تھے اور اب بڑے زمیندار بھی بنتے جا رہے تھے۔ عام طور پر لوگ پہلے زمیندار ہوتے ہیں پھر صنعت کار بنتے ہیں لیکن یہاں معاملہ دوسری طرح کا چل رہا تھا۔ بیٹے کا نام بھی میں نے کافی سنا ہوا تھا لیکن اس وقت اس کی صورت ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ یقیناً یہ بہت بڑے لوگ تھے۔ کچھ دیر کے لیے میں بھی گم سم رہ گیا۔ مجھے اس بات پر سخت حیرانی بھی ہو رہی تھی کہ وہ لوگ جو قوم کے رہنما کہلاتے ہیں اور عوام کو عدل و انصاف مہیا کرنے کے ذمے دار ہوتے ہیں، خود ایسی من مانیوں میں ملوث ہیں۔ اگر کہیں ڈنمارک میں اس طرح کی صورت حال ہوتی تو ایک طوفان برپا ہو گیا ہوتا۔

میرے کریدنے پر عارف نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اسے جان سے مارنے کی کوشش کرنے والے داراب نیکی کے آدمی تھے۔ وہ عرصے سے دھمکی آمیز رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ آخر انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اس کارروائی کے بعد حاجی نذیر کے گھر والے اور خاص طور سے ان کی بیٹی عاشرہ اتنے ہراساں ہوئے ہیں کہ ان کی ہر بات ماننے کو تیار ہو گئے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ ”ہر بات ماننے سے تمہاری کیا مراد ہے عارف؟“

وہ کچھ دیر ہچکچاتا رہا پھر اشکبار لہجے میں بولا۔ ”وہ خبیث شکیل داراب، عاشرہ پر بہت عرصے سے نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ عاشرہ کو حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزمانے کے لیے تیار ہے اور... میرا خیال ہے کہ وہ کامیاب ہو چکا ہے۔ پہلے شکیل کا باپ اس شادی پر راضی

بولا۔ ”اس دنیا میں کمزور بندے کی کوئی زندگی نہیں۔ اسے مر ہی جانا چاہیے۔ میں بھی مر ہی جاتا تو اچھا تھا۔“ میں نے اسے کریدنا چاہا لیکن وہ کچھ بھی بتانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ”عارف! تمہاری باتیں سن کر پتا نہیں کیوں لگ رہا ہے کہ وہ شک درست ہی ہے۔“

”کون سا شک؟“

”یہی کہ اس رات تمہاری بائیک کو جان بوجھ کر ٹکر ماری گئی تھی۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی خاموشی گواہی دینے لگی کہ وہ میری بات کی تائید کر رہا ہے۔ ولید تو کچھ دیر بیٹھ کر اپنی شاپ کو دیکھنے چلا گیا لیکن میں وہیں عارف کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا۔ اسے اعتماد میں لیتا رہا۔ میں نے اسے اس رات والا واقعہ بھی بتایا جب عاشرہ حادثے کے بعد اسپتال پہنچی تھی اور اس نے بڑے جذباتی انداز میں مجھے اور ڈرائیور کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ عاشرہ کا نام سننے کے بعد عارف کے چہرے پر کرب کے آثار بڑھ گئے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سارا معاملہ کسی ”رشتے“ کا ہے۔ کوئی اور بھی تھا جو عاشرہ کو حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اس حوالے سے عارف کو مزید کریدا تو اس بار اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ جیت گئے ہیں۔ میں ہار گیا ہوں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا... کچھ نہیں۔“

”کیا تم ان لوگوں کی بات کر رہے ہو جنہوں نے تمہیں مارنے کی کوشش کی؟“

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ”وہ بڑے زور والے ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اپنے حق میں کر لیا ہے۔ اب... اب وہ بھی مجھے دھمکا رہی ہے۔ اس نے بھی اپنا نفع نقصان دیکھ لیا ہے۔ اچھا تھا میں مر ہی جاتا... مجھے نہ اٹھاتے آپ وہاں سے۔“

”کون ہے وہ، جو اس طرح تم سے دشمنی چکا رہا ہے؟“ میں نے اپنائیت سے اپنا ہاتھ اس کے زخمی ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

عارف کے چہرے پر سایہ سالہرا گیا۔ وہ بولا۔ ”وہ بہت زور والا ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں اس کے۔ پتا نہیں کیوں اللہ نے اس کی رسی اتنی لمبی کی ہوئی ہے۔“

میری نگاہوں کے سامنے وہی منظر گھوم گیا جب میں نے ایسی ہی بات عبداللہ کے منہ سے سنی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی ایسا ہی سایہ لہرایا تھا اور قریباً یہی الفاظ اس نے بھی کہے تھے۔



نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حاجی نذیر اس کا ہم پلہ نہیں۔ بے شک حاجی نذیر بھی ایک بڑا زمیندار ہے لیکن عطا داراب جیسے شخص کے لیے تو وہ ایک معمولی خاندان کا حقیر سا بندہ ہی ہے۔ وہ صرف اس لیے راضی ہوا ہے کہ بیٹا اس رشتے پر اڑا ہوا ہے۔

”تمہارا مطلب ہے کہ عاشرہ اور شکیل داراب ایک ہونے والے ہیں؟“

”ہونے والے نہیں، سمجھو کہ ہو چکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے ایک دو ہفتے کے اندر ہی ان کا نکاح ہو جائے گا۔ جہاں تک میری اطلاع ہے یہ شادی لاہور میں ہی بڑی سادگی سے ہوگی۔ گئے چنے افراد کو بلایا جائے گا۔“ عارف کی آواز دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”سادگی سے کیوں؟ دھوم دھام سے کیوں نہیں؟“

”ایسے لوگ دھوم دھام سے تو پہلی شادی ہی کرتے ہیں۔“

”کیا مطلب... یہ اس کی پہلی شادی نہیں ہے؟“

”نہیں اس کی پہلی شادی دس بارہ سال پہلے ہوئی تھی۔“

”لیکن... جہاں تک میرا اندازہ ہے شکیل داراب کی عمر اتنی زیادہ نہیں۔ چھبیس ستائیس کا ہوگا۔“

”اس کی پہلی شادی بڑی چھوٹی عمر میں ہو گئی تھی۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں۔ پہلی بیوی سے بچہ کوئی نہیں۔ یہ بہانہ بھی مل گیا ہے اس کو۔ دیے کوئی بہانہ نہ سمجھی ہو تو بھی یہ لوگ اپنا کام تو کر ہی گزرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد یہ تیسری شادی کرے اور یہ شادی بغیر کسی بہانے کے ہی کر لے۔“ عارف کی آواز طیش اور دکھ کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

میں کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔ ”عارف! تم اپنے حق کے لیے لڑتے کیوں نہیں ہو؟“

”کس کے لیے لڑوں؟ کس کے بھروسے پر لڑوں؟“

”عاشرہ کے لیے لڑو، اس کے بھروسے پر لڑو۔“

اس کے ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ کھیل گئی۔

”آپ باہر کے ملک سے آئے ہونا۔ آپ نہیں جانتے یہاں اپنے حق کے لیے لڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے اور پھر عطا داراب... شکیل داراب جیسے لوگوں سے لڑنا تو سمجھو ممکن ہی نہیں اور جو تم عاشرہ کی بات کر رہے ہو وہ بھی اب ممکن نہیں۔ وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی ہے۔ میرے اور اپنے خاندان

کی زندگی اور عزت کی خاطر اس نے مجھ سے ہر نامہ توڑ لیا ہے۔“

”کیا اس طرح ناتے توڑ لینے سے ٹوٹ جاتے ہیں؟ کیا وہ تمہیں بھول پائے گی؟ کیا تم اس کو بھول پاؤ گے؟ تم اسے کیوں ایک چھوٹی زندگی شروع کرنے دے رہے ہو؟ تم کسی پرانے دور کے جاہل قبیلے کے فرد نہیں ہو۔ جو کچھ بھی ہے، یہ ایک آزاد ملک ہے۔ یہاں عدالتیں ہیں، ادارے ہیں، آزاد پریس ہے، الیکٹرانک میڈیا ہے۔“

”سب کچھ ہے لیکن عام بندے کی شنوائی نہیں ہے۔“ عارف نے دھکی لہجے میں کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ابھی خود بتایا ہے کہ حادثے والی رات تمہارے اور ڈرائیور کے ساتھ کیا ہوا؟ اور میرے خیال میں تم نے کم ہی بتایا ہے۔ اس سے زیادہ ہوا ہوگا۔ کیا تم اس کے لیے انصاف لے سکے ہو؟ اور یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے جہاں شکیل داراب جیسے لوگوں سے سامنا ہو وہاں کسی کا کچھ نہیں ہو سکتا۔“

میں کچھ دیر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”اگر میں اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد کرنا چاہوں تو؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”نہیں بھائی، اب مجھے معافی دے دو۔ تم نے پہلے ہی میرے لیے اتنا دکھ اٹھایا ہے کہ میں اپنے سینے پر پہاڑ جیسا بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔ میں تمہیں کسی اور مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ تم یہاں نئے نئے آئے ہو۔ پہلے کچھ دن یہاں رہ کر یہاں کی اونچ نیچ سمجھ لو۔ عطا داراب اور شکیل جیسے نورانی چہرے والوں کے اندر کی کالک دیکھ لو پھر اس قسم کی باتیں کرنا۔“

میں نے دل میں سوچا۔ ”تب تک تو تمہارے لیے بہت دیر ہو چکی ہوگی عارف احمد۔ تمہاری عاشرہ ایک دو بچوں کی ماں بن چکی ہوگی۔“ پھر میرے ذہن میں عاشرہ کی زخمی کلائی آئی۔ کسی نے اس کی چوڑیاں توڑی تھیں اور شاید اس پر سختی بھی کی تھی۔ وہ کون ہو سکتا تھا، کہیں وہ عارف ہی تو نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ کسی غصے بھری جذباتی ملاقات میں اس نے عاشرہ کے ساتھ ایسا کیا ہو؟ لیکن وہ تو زخمی حالت میں یہاں اسپتال میں پڑا تھا وہ یہ کیسے کر سکتا تھا۔ تو کہیں اس کا ذمے دار وہی شکیل داراب تو نہیں تھا؟ بہت سے سوالات ذہن میں اٹھ رہے تھے۔

میں عارف کے پاس کچھ دیر مزید بیٹھا اور اس سے



گے۔

”پالتو... کیا مطلب؟“

”قیصر بھی ان کرائے کے لوگوں میں سے ہے جو داراب فیملی کے لوگوں کے اشاروں پر دم ہلاتے ہیں۔“ انسپکٹر قیصر کی کرخت صورت میری نگاہوں میں گھوم گئی اور وہ سب کچھ بھی یاد آ گیا جو اس نے ایکسڈنٹ والی رات ہم سے کیا تھا۔ سینے میں پھر چنگاریاں سی پھوٹ گئیں۔

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”تو کیا قیصر جیسے لوگوں کی وجہ سے تم سب اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہو اور تمہارے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اسے ہونے دیتے ہو۔ ولید! میں نے تو سنا تھا کہ تم بڑے سچے کھرے بندے ہو۔ زیادتی نہیں سہتے اور فوراً زیادتی کرنے والے کا گریبان پکڑتے ہو۔“

”یہ تو میں کرتا ہوں۔“ ولید دھیرے سے مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں چیتے جیسی چمک ابھری، وہی چمک جو بلا جھجک خطرات کا سامنا کرنے والے لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ اس نے اپنی پی کیپ اٹھائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو آؤ۔“ اس نے کہا۔

”کہاں؟“

”جہاں تم کہہ رہے ہو۔“

ہم کچھ دیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر دفتر سے باہر نکل آئے۔ باہر دسمبر کی سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہم سوزوکی کار میں آ بیٹھے۔ ولید بولا۔ ”ایک بات میں تمہیں ابھی بتا دوں۔ ہماری کوشش سے ہونا ہونا کچھ نہیں۔“

”یہ تو کھیلنے سے پہلے ہی ہار ماننے والی بات ہے۔“ ”اگر تم اسے کھیل سمجھ رہے ہو تو یہ ہے بڑا خطرناک... لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، حاجی نذیر صاحب کچھ نہیں سنیں گے؟“

”مجھے لگتا ہے شاہ زیب وہ سن ہی نہیں سکتے۔ ان میں داراب فیملی نے اتنی سکت ہی نہیں چھوڑی ہوگی۔“

”تو پھر ہم ڈائریکٹ عاشرہ سے بات کریں گے۔ اگر وہ اس معاملے میں اسٹینڈ لینے کو تیار ہوگئی تو ہم آگے تک جائیں گے۔ قانون کی مدد لیں گے۔ پریس تک اور میڈیا تک بات پہنچائیں گے۔ وہ عاقل بالغ لڑکی ہے۔ اپنا اچھا

تسلیم تشفی کی باتیں کرنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں نا انصافی برداشت کرنے والا شخص نہیں تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافی سے زیادہ کسی دوسرے سے ہونے والی نا انصافی مجھے تکلیف دیتی تھی۔ میں مار دھاڑ کی جس فیلڈ میں گیا تھا اور آج جس مقام پر تھا اس کی بنیادی وجہ ایسی ہی ایک نا انصافی تھی جو کسی دوسرے کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بدلا تھا اور کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ اسپتال سے میں سیدھا ولید کی شاپ پر پہنچ گیا۔ یہ کافی بڑی شاپ تھی اور پورے علاقے میں بیکری کے سامان کے لیے مقبول تھی۔ ہم شاپ کے پچھلے حصے میں واقع چھوٹے سے دفتر میں بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے وہ سب کچھ ولید کے گوش گزار کیا جو مجھے عارف سے معلوم ہوا تھا۔

میں نے ولید سے کہا۔ ”یار! میں نے اس کی جان بچانے میں مدد کی ہے لیکن وہ اتنا دکھی ہے کہ زندگی اسے بوجھ لگ رہی ہے۔ میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہ رہا ہوں۔“

”کیا کرنا چاہ رہے ہو؟“

”کیوں نا ہم حاجی نذیر صاحب سے ملیں اور ان کو بتائیں کہ عاشرہ اور عارف ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اگر عاشرہ کی شادی اس کی مرضی کے بغیر ہوگئی تو دونوں کی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔“

ولید کے ہونٹوں پر چمکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو شاہ زیب بھائی، حاجی نذیر کو ان باتوں کا پتا نہیں ہوگا۔ اسے سب پتا ہوگا لیکن عاشرہ کی طرح وہ بھی مجبور ہو گیا ہوگا۔“

”یار! وہ کوئی غریب غریب تو نہیں جسے کوئی چودھری یا وڈیرا دھمکا کر اپنی مرضی پر چلا لے گا۔ وہ علاقے کا ایک بڑا زمیندار ہے۔“

”زمیندار تو ہے لیکن عطا داراب اور کلیل داراب وغیرہ کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ کلیل داراب بہت بڑی مچھلی ہے اور حاجی نذیر اس کے مقابلے میں بہت چھوٹی مچھلی ہے۔“

”کچھ بھی ہے یار لیکن میں ایک بار حاجی نذیر صاحب سے ضرور ملنا چاہوں گا۔“

”خوانخواہ بھڑوں کے جھتے میں ہاتھ نہ ڈالو۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ ایس ایچ او قیصر جیسے پالتو ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے اور ہمارا جینا حرام کر دیں



برا سمجھ سکتی ہے۔ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی جاسکتی اور مجھے لگتا ہے کہ شاید اس کے ساتھ زبردستی ہو بھی رہی ہے۔ میں نے اس کے جسم پر تشدد کے نشان دیکھے ہیں۔“

”شاہ زیب تم جو کچھ کہہ رہے ہو اپنی جگہ درست ہے اور ہو سکتا ہے کہ زبردستی کے بارے میں جو اندازے تم لگا رہے ہو وہ بھی ٹھیک ہوں لیکن یہاں وہ کچھ نہیں ہوگا جو تم آج تک باہر کے ملک میں دیکھتے آئے ہو۔ یہ پاکستان ہے اور یہاں رسموں، رواجوں اور پابندیوں کا گورکھ دھندا کچھ زیادہ ہی ہے۔ اگر تم عاشرہ کے لیے کچھ کرنا چاہو گے تو مجھے یقین ہے کہ سب سے پہلے عاشرہ ہی تمہاری مخالفت کر دے گی۔“

”کیا مطلب؟“

”ظاہر ہے کہ وہ رشتوں، رواجوں اور مجبوریوں میں جکڑی ہوئی لڑکی ہے۔ اپنی اور اپنے خاندان کی بدنامی نہیں چاہے گی اور پھر جب واسطہ عطا دار اب جیسی نیلی سے پڑا ہو تو کیا نہیں ہو سکتا۔ پریس، میڈیا، عدالتیں ہر جگہ ان لوگوں کا زور چلتا ہے۔ عطا دار اب کا بیٹا ٹھیکل ایسے معاملوں میں باپ سے دو ہاتھ آگے ہے۔“

”اچھا یار! تم ڈرانے والی باتیں ہی کرو گے یا کوئی اچھا رخ بھی دکھاؤ گے تصویر کا۔“ میں نے کہا۔

”میں تو تمہارے پیچھے چل پڑا ہوں۔ جہاں کہتے ہو چلے جاتے ہیں۔ پہلے تم عاشرہ سے بات کر کے ہی دیکھ لو۔ پتا چل جائے گا کہ وہ اس معاملے میں کسی طرح کا اسٹینڈ لے بھی سکتی ہے یا نہیں۔“

”اس سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیسپس میں۔ میری معلومات کے مطابق اسی سال گرمیوں میں اسے وہاں ٹیچر ار کی جاب ملی ہے۔ اگر اس پر پہرے وغیرہ نہیں بٹھا دیے گئے تو وہ یقیناً آج کل بھی یونیورسٹی جا رہی ہوگی۔“

”اس کا پتا کیسے چلے گا؟“

”ابھی چل جاتا ہے۔“ ولید نے کہا اور اپنے سیل فون سے کسی کو کال کرنے لگا۔ یہ ولید کی کوئی فرینڈ تھی اور پنجاب یونیورسٹی میں ایم ایس سی کر رہی تھی۔ ولید نے اس سے بات کی تو پتا چلا کہ عاشرہ آج بھی یونیورسٹی آئی ہوئی ہے لیکن دو چار دن میں وہ یہ جاب چھوڑ رہی ہے۔

بات ختم کر کے ولید بولا۔ ”چلو، یہ سنہری موقع ہے۔ ابھی اس سے مل سکتے ہیں۔“

ہم بیکری کی کشادہ پارکنگ سے نکلے اور ولید کی سوزوکی کار میں پندرہ بیس منٹ کے اندر نہر کنارے نیو کیسپس میں پہنچ گئے۔ کیسپس اور اس کے گرد و نواح سے میری بھی کچھ حسین یادیں وابستہ تھیں۔ جب میں پچھلی دفعہ آیا تھا تو صرف تین دن کے لیے پاکستان رکا تھا لیکن 72 گھنٹے یعنی تین دنوں میں ہی ایک ایسے حسین چہرے سے میری راہ و رسم بڑھی تھی جس کے خدو خال، دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے پچھلے ساڑھے تین برسوں میں جب بھی اس چہرے کو یاد کیا تھا، دل میں ایک عجیب سی کک جاگی تھی، میٹھی میٹھی، نہ بہت دھیمی نہ بہت تیز... درد کی ایک ایسی دلگداز لہر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ یہ معاملہ ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ ابھی کچھ باقی ہے... ابھی کچھ نہ کچھ باقی ہے ورنہ دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جانے کے بعد حسین چہروں اور مسکراہٹوں کے جھرمٹوں میں رہنے کے باوجود میں نے اس طرح اسے یاد نہ کیا ہوتا۔ میری سماعت اور میری نگاہیں اس کی تلاش میں بھٹکی نہ ہوتیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین سا تھا کہ وہ پھر ملے گی اور پتا نہیں کیوں یہ بھی یقین سا تھا کہ وہ بھی مجھے یاد کرتی ہوگی۔

نیو کیسپس اور نہر کے گرد و نواح کو دیکھ کر کئی بھولے سرے مناظر آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ یہاں ہم دونوں نے گاڑی روکی تھی۔ یہاں ہم گھاس پر بیٹھے تھے۔ یہاں سے ہم نے انرجی ڈرنک پیے تھے اور پھر یہاں سے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اس بے مثال چہرے سے میرے رابطے کا واحد ذریعہ بس ایک سیل فون نمبر تھا۔ تین ساڑھے تین برسوں میں، میں نے شاید سیکڑوں بار اس نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام ہوا تھا۔ پھر میں نے ڈنمارک سے پاکستان کال کر کے ایک پاکستانی دوست کی مدد حاصل کی تھی اس نے مجھے پتا کر کے بتایا تھا یہ نمبر سرگودھا کے کسی اللہ رکھا کے نام پر رجسٹرڈ ہے یعنی ٹائیکس ٹائیکس ہو گیا تھا۔

میں اپنے خیالوں سے اس وقت چونکا جب ولید نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھو شاہ زیب! میرا خیال ہے کہ محترمہ کلاس روم سے نکل رہی ہیں۔“

میں نے چونک کر دیکھا۔ سرو کے دراز قد پودوں کی دوسری جانب ایک برآمدے میں عاشرہ کا اجلا اجلا چہرہ نظر آیا۔ تین چار اسٹوڈنٹس اس کے ارد گرد تھے۔ وہ سینے سے ایک فائل لگائے ان سے باتیں کرتی ہوئی ایڈمنسٹریشن



سے کہا۔

”پہلے بتاؤ کس نے ملنا ہے؟“ ولید کا پارا چڑھنے

لگا۔

”چودھری صاحب نے... وہ سامنے گاڑی میں بیٹھے ہیں۔“ مزید ترشی سے جواب دیا گیا۔ ولید اور میں نے یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر کھڑی ایک سفید کار کی طرف دیکھا۔ کار کے قریب ہی ایک دراز قد شخص کھڑا نظر آیا۔ مجھے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ وہی دیوہیکل تھانیدار قیصر چودھری تھا۔ رگوں میں خون سنسنا سا گیا۔ وہ گالی یاد آگئی جو اس کی گندی زبان سے نکلی تھی اور میرے کانوں تک پہنچی تھی۔

قیصر اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ ایک اور پولیس والا بھی سادہ لباس میں اس کے پاس کھڑا تھا۔ ذہن میں پہلا خیال یہی ابھرا کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ شاید یہ لوگ عاشرہ کی نگرانی کر رہے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے اتنی بے رخی کے ساتھ بولی تھی۔

میں اور ولید مونچھوں والے سادہ پوش اہلکار کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھے اور پھر قیصر کے پاس پہنچ گئے۔ وہ حسب سابق بڑی ملائمت سے بولا۔ ”السلام علیکم جناب! کیا حال چال ہیں؟“

”بالکل ٹھیک۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”آپ سے ایک دو باتیں کرنی ہیں۔ کیا آپ گاڑی میں تشریف رکھیں گے؟“

”کیا یہاں کھڑے ہو کر بات نہیں ہو سکتی؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر ہو سکتی تو میں آپ سے یہ گزارش ہی کیوں کرتا۔“ اس نے کہا۔ اس کی تھوڑی کے کٹ پر ابھی تک میڈیکل ٹیپ لگی ہوئی تھی۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک پولیس موبائل کھڑی تھی۔ اس میں عملے کے باوردی افراد موجود تھے۔ دو تین مسلح بھی تھے۔ میں اب تک قیصر کی فطرت کو کافی حد تک جان گیا تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے ولید کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں اس سے کہا کہ ہمیں گاڑی میں بیٹھ جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی میں... کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

ولید نے قیصر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میری گاڑی ادھر سڑک پر کھڑی ہے۔“

”کوئی بات نہیں برادر۔ گاڑی کوئی بندہ لے آتا

بلاک کی طرف جا رہی تھی۔ چہرے پر وہی حزن و ملال کی کیفیت تھی جو پچھلی ملاقات میں نظر آئی تھی۔

میں اور ولید تیزی سے آگے بڑھے۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر بری طرح چونک گئی۔ ایک سیکنڈ کے لیے یوں لگا جیسے وہ مجھے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا چاہتی ہو لیکن میں نے یہ موقع نہیں دیا۔

”السلام علیکم... کیسی ہیں آپ؟“

”وعلیکم السلام... آپ یہاں؟“ وہ ذرا پریشان لہجے میں بولی۔

”بے وقت تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے ایک بہت ضروری بات کرنا تھی آپ سے۔ اگر آپ چند منٹ مجھے دے سکیں۔“

اس نے کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح ارد گرد دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کچھ نادیدہ نگاہیں اسے دیکھ رہی ہیں پھر خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”کہیے... کیا کہنا ہے آپ کو؟“

”میں چند منٹ اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے وضاحت کی۔ یہ بات کہتے ہوئے میری نظر اتفاقی طور پر اس کی گردن کے نچلے حصے پر پڑی۔ وہاں بھی مجھے ایک ہلکے سے نیل کے آثار نظر آئے۔ میرے ذہن میں اس کی کلائی کے نیل تازہ ہو گئے۔

میری گزارش سن کر اس کی خوبصورت پیشانی پر ناگواری کی شکن ابھری۔ ”سوری، میرے لیے یہ ممکن نہیں۔“ اس نے کہا۔

”لیکن...“

”ویری سوری شاہ زیب صاحب۔“ اس نے بے رخی سے میری بات کاٹی۔ ”میں بات نہیں کر سکتی۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

مجھے ایسے رویے کی توقع نہیں تھی۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کیا کروں کہ اچانک کسی کا ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا میرے سامنے کھنی مونچھوں والا ایک تیس پینتیس سالہ شخص کھڑا تھا۔ اس نے شلوار نہیں پہن رکھی تھی۔

”السلام علیکم سر!“ اس نے بھاری آواز میں کہا پھر اپنے سیاہی مائل ہاتھ سے مونچھیں سہلا کر کہنے لگا۔ ”آپ ذرا میرے ساتھ آئیں، کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”کون ملنا چاہتا ہے؟“ ولید نے ذرا تنک کر پوچھا۔

”یار آپ آؤ تو سہی۔“ مونچھوں والے نے ترشی



ہے۔ آپ مجھے چالی دے دیجیے۔“ قیصر نے شائستہ لہجے میں کہا۔ تاہم اس لہجے کے نیچے چھپی ہوئی زہریلی پھنکار کو بھلا کون محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے ایک لمحے کے لیے لگا کہ ولیڈ بھڑک اٹھے گا اور ساتھ چلنے سے صاف انکار کر دے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور چابی قیصر کے ایک ماتحت کے حوالے کر کے گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ایک سادہ پوش اہلکار جس نے اپنی قمیص کے نیچے یقیناً کوئی ہتھیار لگا رکھا تھا ہمارے ساتھ ہی پچھلی نشست پر براجمان ہو گیا۔ قیصر نے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھالی اور کار تیز رفتاری سے ایک جانب روانہ ہو گئی۔ پولیس موبائل ہمارے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے قیصر سے پوچھا۔

”یہ آپ لوگ کہاں لے جا رہے ہیں ہمیں؟“

”زیادہ دور نہیں حضور والا۔ بس ایک لوکیشن دکھانی ہے آپ کو۔“

”کون سی لوکیشن؟“

”جہاں فلم ہیرا رانجھا کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ فردوس اور اعجاز وغیرہ پر سین کچھ اتر کے گئے تھے۔“

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”سمجھ تو اس خاکسار کو بھی کئی باتوں کی نہیں آرہی۔“

مثلاً یہ کہ آپ جناب کو جنرل اسپتال جا کر محترم عارف صاحب سے ملنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں تک گٹ مٹ کرنے کی کیا لوڑ پڑ گئی تھی اور پھر یونیورسٹی جا کر آپ نے حاجی صاحب کی بیٹی سے ملنے کی زحمت کیوں فرمائی ہے؟ اگر وہ آپ کو ایسی ہی اچھی لگی تھی تو ہمیں حکم کیا ہوتا، ہم اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ ویسے مجھے لگ رہا ہے آپ اپنے لیے نہیں کسی اور کی خاطر اس سے ملنا چاہ رہے تھے؟“

”فضول کی باتیں نہ کرو انسپکٹر۔ یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”واہ ذاتی معاملات... پرسنل لائف...“

پرائیویسی... کیسے کیسے لفظ گھڑے ہوئے ہیں ان پڑھے لکھے لوگوں نے۔ ذاتی معاملات کی چادر اوڑھ کر اندر جو بھی گند مارتے رہو کوئی آپ کو پوچھنے والا نہیں۔“

میں نے بمشکل اپنے غصے پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”انسپکٹر! بہتر یہ ہے کہ کام کی بات کرو۔“

”گستاخی معاف جناب! آپ خود ہی بات کو دوسری

طرف لے گئے۔ میں نے تو آپ کو کام کی بات ہی بتائی تھی کہ آپ کو ہیرا رانجھا فلم کی ایک لوکیشن دکھانے لے جا رہا ہوں۔ جناب نے زیادہ عرصہ ملک سے باہر گزارا ہے لیکن ہیرا رانجھا تو باہر کی دنیا میں بھی دیکھی گئی تھی۔ اس میں ایک کردار سہتی کا بھی تھا۔ میں اس وقت آپ کو ہیرا رانجھا سے زیادہ سہتی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ آپ نے بھی یقیناً فلم میں دیکھا ہوگا کہ سہتی کے پیٹ میں ہمدردی کی مروڑ اٹھی تھی۔ اس نے فی سبیل اللہ ہیرا اور رانجھے کو ملانے کی کوشش کی تھی نتیجہ کیا نکلا، ہیر بھی ماری گئی اور رانجھے کا بھی بولورام ہو گیا۔ سہتی بہر حال بچ گئی لیکن ہر دفعہ تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ جب ہیرا رانجھے پر فلم بنے تو اس میں وہ دونوں تو زندہ رہیں لیکن بے چاری سہتی ماری جائے۔“

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ خطرناک تھا نیدار بڑی معنی خیز باتیں کر رہا تھا۔ غالباً وہ عارف اور عاشرہ کو ہیرا رانجھے سے تشبیہ دے کر مجھے سہتی کی جگہ دے رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی جان سے مار دینے کی دھمکی بھی میرے کانوں تک پہنچا رہا تھا۔ یہ عجیب سا بندہ تھا۔ قد کاٹھ غیر معمولی تھا لیکن شکل و صورت سے بہت سخت گیر نہیں لگتا تھا۔ بات چیت کا انداز بھی شائستہ تھا اور اپنی گفتگو میں تعلیم یافتہ لوگوں جیسے الفاظ استعمال کرتا تھا لیکن ذرا سا غور کرنے پر پتا چل جاتا تھا کہ اس بظاہر بااخلاق تھانے دار کے لہجے کے نیچے نیلی آگ کا دریا بہہ رہا ہے۔ زمین کے نیچے دبی ہوئی ایک ایسی بارود دی سرنگ جو کسی بھی وقت پھٹ سکتی ہے۔

کاراب تیز رفتاری سے چلتی ہوئی شہر سے باہر آ چکی تھی۔ ہم ملتان روڈ پر سفر کرتے ہوئے کافی آگے نکل آئے تھے۔ یہ ایک بالکل سنسان ذیلی سڑک تھی۔ کہیں کہیں امرود اور کینو وغیرہ کے باغات نظر آرہے تھے۔ ایک کچے راستے پر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ قیصر نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھیے جناب! یہ وہ تاریخی درخت ہیں جہاں ہیرا رانجھا کی شوٹنگ ہوئی تھی۔“

اس نے شوٹنگ کے لفظ پر خاص طور سے زور دیا اور مجھے ایک بار پھر چونکنے پر مجبور کیا۔

چند سیکنڈ بعد پولیس موبائل میں سے تین اہلکار نکلے اور چوکس کھڑے ہو گئے۔ وہ موبائل میں سے کسی شخص کو نکلنے کا کہہ رہے تھے مگر وہ نکل نہیں رہا تھا۔ حوالدار رمضان ہماری طرف آیا اور انسپکٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”وہ باہر نہیں نکل رہا ہے جناب۔“

انسپکٹر باہر نکلا اور ہم دونوں کو بھی اپنے ساتھ آنے کا



# کیا آپ

## لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدا را۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

### المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دھکی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

اشارہ کیا۔ ہم پولیس موبائل تک پہنچے۔ وہاں ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ہمیں موبائل کے فرش پر ایک شخص ہتھکڑی میں جکڑا نظر آیا۔ یہ وہی حوالا تھی تھاجے چند روز پہلے میں نے تھانے کے لاک اپ میں اوندھا لیٹے دیکھا تھا۔ اس بے چارے کو اتنی مار لگائی گئی تھی کہ وہ سیدھا لیٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب بھی وہ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل پولیس موبائل کے سخت فرش پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ دہشت سے ہلدی ہو رہا تھا اور آنکھوں میں دنیا جہاں کی منت سماجت سمی ہوئی تھی۔

وہ انسپکٹر کو دیکھ کر گھگھایا اور اس نے اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ مائی باپ ہو صاحب۔ میں ساری زندگی آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔ مجھے معاف کر دیں... مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے اپنا اگلا دھڑکاڑی کے پچھلے حصے سے باہر نکالا اور اپنا سر انسپکٹر کے گھٹنوں سے رگڑنے کی ناکام کوشش کی۔

انسپکٹر نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ”کلمہ پڑھ لو میرے بچے، اس وقت میں تجھے اس سے بہتر مشورہ اور کوئی نہیں دے سکتا۔“

وہ بے چارہ پوری جان سے تڑپ گیا۔ ”خدا کے لیے نہیں... خدا اور رسول کے لیے بس ایک دفعہ میری جان بخش دیں پھر آپ جو کہیں گے، میں کروں گا جو آپ کہیں گے۔“ وہ باقاعدہ روتے لگا۔ وہ چوبیس پچیس سالہ نوجوان تھا لیکن اس وقت کسی بچے کی طرح اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے لیے کسی بچے ہی کی طرح بلک رہا تھا۔

انسپکٹر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تو اب بات نہیں مان رہا تو کل کیسے مانے گا۔ میں تجھ سے گزارش کر رہا ہوں کہ کلمہ پڑھ اور تو اس سے انکار کر رہا ہے۔“ وہ ایک بار پھر دلہوز انداز میں منت سماجت کرنے لگا۔ حوالدار نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ ”سر مجھے تو لگتا ہے کہ یہ مسلمان ہی نہیں۔ اگر اس کو کلمہ آتا ہوتا تو ضرور سنا دیتا۔“

انسپکٹر نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ”ویسے اب تھوڑا تھوڑا شک مجھے بھی ہو رہا ہے۔ اس کا نام راجو ہے نا... اور ایسے نام تو اکثر ہندوؤں کے ہوتے ہیں۔ راج کمار سے راجو یا پھر راجیش سے راجو وغیرہ ویسے اگر یہ ہندو ہے تو پھر تو اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا۔“

”آپ کا کیا مطلب ہے جناب؟“ حوالدار نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔



”بھئی ہندو برادری کے لوگوں کے لیے میرے دل میں بڑی نرمی ہے۔ تین چار سال پہلے جب میں سندھ کے اندرونی علاقے میں تھا، دو مہاشوں نے بڑے سخت وقت میں میری یادگار مدد کی تھی۔“

حوالدار نے تھپی انداز میں سر ہلایا۔ انسپکٹر نے راجو کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا سراو پر اٹھایا اور بڑے پیار سے پوچھا۔ ”جناب ذرا ٹھیک ٹھیک ارشاد فرمائیں کہ آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟“

وہ زار و قطار روتے ہوئے بولا۔ ”مم... میں کچھ بھی نہیں ہوں مائی باپ۔ آپ جو کہیں میں وہی ہوں۔ بب... بس میری جان بخش دیں۔ میں اور میرے بچے آپ کو زندگی بھر دعا کریں دیتے رہیں گے۔“ اس نے ایک بار پھر اپنا سر قیصر کے گھٹنوں سے رگڑنے کی کوشش کی اور اس بار کسی حد تک کامیاب رہا۔

قیصر دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”یعنی اگر میں آپ جناب کو راجیش کہہ کر بلاؤں تو آپ کو کوئی اعتراض وغیرہ تو نہیں ہوگا؟“

”نہیں مائی باپ! آپ جو مرضی کہہ کر بلائیں۔ مجھے اپنا کتا کہہ لیں۔ آپ کا جو دل چاہے کہہ لیں۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ زندگی بھر آپ کا غلام رہوں گا۔“ اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ خوف کی زیادتی سے کبھی اس کا چہرہ ہلدی ہو جاتا تھا۔ کبھی امید کے سبب آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔ راجو نامی یہ شخص شکل و صورت سے کوئی شریف آدمی تو نہیں لگتا تھا لیکن کوئی بہت بڑا مدد معاش یا خطرناک شخص بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پتا نہیں اپنے کس گناہ کے پاداش میں وہ اس وقت قیصر جیسے خطرناک پولیس افسر کے ہتھے چڑھا ہوا تھا۔

اگلے ایک دو منٹ میں ولید اور میں نے راجو کی منت سماجت و گریہ و زاری کے اندوہناک مناظر دیکھے۔ وہ زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ آخر قیصر کا رویہ کچھ بدلا ہوا نظر آیا۔ اس نے گھٹنے کی ہلکی سی ٹھوکر سے راجو کا سر پیچھے ہٹایا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے، آپ ایک موقع کا کہہ رہے ہیں تو میں ایک موقع آپ کو دے دیتا ہوں لیکن آئندہ کی کیا گارنٹی ہے؟“

راجو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کئی سکینڈ تک وہ کوشش کے باوجود بول نہیں سکا۔ تب اس نے ہتھکڑی لگے ہاتھوں کے ساتھ اپنا اگلا دھڑکاڑی کے پچھلے حصے سے آگے کی طرف گرایا اور انسپکٹر قیصر کے پاؤں چومنے کی کوشش

جاسوسی ڈائجسٹ

کی۔

”مائی باپ! آپ جو گارنٹی کہیں میں دے دیتا ہوں۔ میرے مکان کی رجسٹری رکھ لیں۔ مم... میرے بیوی بچے ضمانت کے طور پر رکھ لیں۔ آپ جو کہیں...“ وہ بے ربط انداز میں بولتا چلا گیا۔

آخر قیصر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”وعدہ کرتے ہو کہ آئندہ وہ نہیں کرو گے جو اب تک کرتے رہے ہو؟“

”سو جان سے وعدہ کرتا ہوں سرکار۔ بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“ راجو کی ہچکی بندھ گئی۔

قیصر نے ایک ہیڈ کاسٹیل کو اشارہ کیا۔ اس نے پتلون کی جیب سے ایک لمبی سی چابی نکالی اور راجو کی ہتھکڑی کھول دی۔ وہ موبائل سے نیچے اترا۔ اس نے پہلے حوالدار کے اور پھر قیصر کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ شاید ان کے تلوے چاشنا شروع کر دیتا۔

یہ ایک مجھے قیصر کی آنکھوں میں درندگی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے اچانک اپنا سرکاری پستول نکالا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر دو گولیاں راجو کے سینے میں اتار دیں۔ دھماکوں سے میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ اپنی ہی نگاہوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ راجو پشت کے بل گرا۔ اس کی آنکھیں خوف اور حیرت کے سبب پھٹی ہوئی تھیں۔ خون تیزی سے اس کے دھاری دار سوئٹر کورٹین کرنا چلا گیا۔ قیصر نے جیسے انسان کو نہیں کسی مکھی کو مارا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر وہی سفاک مسکراہٹ سج گئی۔ دم توڑتے راجو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”راجو، راجیش! حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آئندہ کے لیے نیک چلنی کا وعدہ تم سے اس جہنم کے لیے نہیں آئندہ جہنم کے لیے لیا تھا۔ تمہارے مذہب میں تو دوسرے جہنم کی گنجائش موجود ہے نا۔“

راجو سوال کرنے یا جواب دینے کے قابل کہاں تھا ورنہ وہ اس سے پوچھتا۔ ”راجو، راجیش کا نام تو تم نے خود میرے منہ میں ڈالا۔ ورنہ میں تو جیسا بھی تھا، مسلمان ہی تھا۔“

ایک بار پھر میرا جی چاہا کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس خون آشام پولیس افسر پر ٹوٹ پڑوں لیکن اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا میرے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ کچھ مجبور یوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ میں ولید ہی کی طرح ساکت و جامد کھڑا رہا۔ ہمارے ارد گرد کم از کم تین باوردی



کو بھی...“ حوالدار نے مٹی نیز انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نہیں نہیں، اتنی جلدی ٹھیک نہیں۔ شکل و صورت سے شاہ زیب صاحب سیانے بندے لگتے ہیں۔ ابھی نئے تشریف آور ہوئے ہیں۔ انہیں سوچنے سمجھنے کا کچھ موقع دینا چاہیے۔ امید ہے کہ کچھ لوگ ان کو سمجھانے بجھانے کی کوشش بھی کریں گے۔ ان میں ان کے چاچا محترم حفیظ صاحب بھی شامل ہوں گے۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”جناب عالی! اللہ آپ کی عمر بھی کرے۔ ایسا کیجیے گا کہ یہاں جو کچھ ہوا ہے سب سے پہلے اپنے چچا حضور کے گوش گزار ہی فرمائیے گا۔ وہ آپ کے کان مبارک میں ضرور کچھ مفید باتیں ڈالیں گے۔“ راجو ٹھنڈا ہو چکا تھا اس پر ایک بوسیدہ چادر ڈال دی گئی۔

میرے اندر ایک لاداسادہک رہا تھا۔ اگر میرے ضبط کا بند ٹوٹ جاتا تو کچھ بہت خطرناک ہو سکتا تھا۔ کچھ ایسا جو یہ لوگ زندگی بھر یاد رکھتے اور جس کی یاد بھی انہیں تھر تھر کانپنے پر مجبور کر دیتی۔

اسی دوران میں ہماری سوزوکی کار بھی موقع پر پہنچ چکی تھی۔ اسے ایک اہلکار ہی چلا کر یہاں لایا تھا۔ قیصر نے بڑی خندہ پیشانی سے میری جانب دیکھا اور بولا۔ ”بیجے سرکار! آپ کی سواری تشریف لے آئی ہے۔ اب بیٹھے اور ہمیں موقع دیجیے کہ ہم آپ کو خدا حافظ کہہ سکیں۔“

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ یہ شخص ابھی تک پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ہاں اتنا پتا چل گیا تھا کہ یہ خطرناک ہے لیکن کتنا؟ یہ طے ہونا ابھی باقی تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ولید کے ساتھ سوزوکی کار کی طرف بڑھا۔ قیصر نے کہا۔ ”ہیرا نجما کی لوکشین آپ نے ملاحظہ فرمائی ہے۔ ہیرا نجما میں ان دونوں کی ہمدرد سکتی زندہ رہی تھی لیکن ضروری نہیں کہ وہ ہر بار زندہ ہی رہے۔“

میں اور ولید گاڑی میں آ بیٹھے اور گاڑی تیزی سے روانہ ہو گئی۔ گاڑی سے دس گنا رفتار کے ساتھ میرا ذہن بھاگ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو کچھ ہم نے اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھا، وہ کسی سنسنی خیز ایکشن فلم کا حصہ ہی لگتا تھا۔ ایک زندہ سلامت بندہ ہمارے سامنے خون اور مٹی میں لت پت ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

میں نے کہا۔ ”ولید یار! یقین نہیں آ رہا کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان لوگوں کے حوصلے تو بہت بڑھے ہوئے ہیں۔“

اہلکاروں کے ہاتھوں میں آٹومینک رائفلیں تھیں۔ ان کا رخ ہماری طرف تو نہیں تھا لیکن کسی بھی وقت ہو سکتا تھا۔

حوالدار آگے بڑھا اور اس نے ایک پستول دم توڑتے راجو کی مٹھی میں تھما دیا۔ (پستول ایک رومال میں لپیٹا ہوا تھا) پھر اس نے پستول کا رخ پولیس موبائل کی طرف کر کے دوبار ٹریگر دبا یا، دھماکوں سے شعلے نکلے۔ ایک گولی گاڑی کی باڈی میں لگی دوسری نے ایک کھڑکی کا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ حوالدار نے یہ سارا کام بالکل عام سے انداز میں کیا۔ جیسے یہ اس کے لیے کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا ہو۔

قیصر نے عجب سفاک نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”چلو بھائی جان، اب آپ کی باری ہے۔“

میرے سر سے لے کر پاؤں تک چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ مجھے لگا کہ ایک سیکنڈ کے لیے میرے چہرے کا رنگ بدلا ہے۔ یہ شخص کیا کہہ رہا تھا۔ کیا یہ ہمارے بارے میں بھی کوئی خطرناک ارادہ رکھتا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اتنا بڑا اقدام ہمارے خلاف کیسے کیا جاسکتا تھا؟ لیکن یہ دیوانہ پن بھی تو ہو سکتا تھا اور دیوانے پن کے لیے کسی دلیل یا وجہ کی ضرورت کہاں ہوتی ہے۔

دو تین سیکنڈ میں درجنوں سوالات ذہن میں اٹھے اور اوجھل ہوئے۔ شاید میرے چہرے پر لہرانے والے رنگ کو قیصر کی عقابی نگاہوں نے بھی نوٹ کر لیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ ”گھبرا کیں نہیں جناب! میں مارا ماری کی نہیں ”بات چیت“ کی بات کر رہا ہوں۔ ہم خاکساروں کی یہ ہمت کہاں کہ آپ کو انگلی بھی لگائیں۔ گولی شولی تو بہت دور کی بات ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا۔ تم لوگ قانون کے محافظ ہو اور تم نے ہماری آنکھوں کے سامنے ایک جیتے جاگتے بندے کو پولیس مقابلے کے ڈرامے میں مارا ہے۔“

”تو یہ ہماری غلطی ہے نا۔ اب آپ جناب اس قتل کے چشم دید گواہ بن گئے ہیں۔ کل کلاں آپ کی کھوپڑی میں کیڑا رینگ گیا اور آپ نے عدالت میں جا کر گواہی دے دی تو ہم بے چارے تو بے موت مارے گئے نا۔ کیوں بھی رمضان علی؟“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ یہ ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے، ہو سکتا ہے کہ میڈیا والوں کے پاس جا پہنچیں یا پھر کچھری سے ہمارے خلاف پرچے کا آرڈر شاڈر کر دالیں۔ یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں جی۔ میرا تو خیال ہے جی کہ ان دونوں



پہل تھی۔ کانوں میں ابھی تک ان دو گولیوں کے دھماکے گونج رہے تھے جو حیرت زدہ راجو کے سینے پر چلائی گئی تھیں۔ چند لمحے پہلے اس بے چارے سے آئندہ ٹیک چلنی کا وعدہ لیا گیا تھا لیکن بقول قیصر یہ وعدہ اگلے جنم کے لیے تھا۔ قانون کے محافظوں کی طرف سے ایسی دیدہ دلیری میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

www.paksociety.com

ٹھیک دو گھنٹے بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے احاطے میں موجود تھا اور ایڈووکیٹ عبداللہ کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ہمارے سامنے چائے کی پیالیاں پڑی تھیں اور ایش ٹرے میں سگریٹس کی رائی تھی۔ عبداللہ نے لاہور کے نواح میں ہونے والے جعلی پولیس مقابلے کی روداد بڑی تسلی سے سنی تھی۔ دھچکا تو اسے ضرور پہنچا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ اس قسم کی خبریں اب عام لوگوں کے علاوہ قانون دانوں کے لیے بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ مجھے حیرت ہوئی جب اپنی گفتگو میں عبداللہ نے بھی تقریباً وہی باتیں کہیں جو راستے میں ولید نے کہی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”کچھ نہیں ہو پائے گا شاہ زیب۔ یہ قیصر جیسے لوگ تو کٹھ پتلیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی ڈوریاں اوپر سے ہلائی جاتی ہیں اور جو ڈوریاں ہلانے والے ہوتے ہیں وہ اپنی کٹھ پتلیوں کی پوری پوری حفاظت بھی کرتے ہیں۔ تم تو صرف زبانی کلامی گواہ ہو، اگر تم نے اس سارے واقعے کی وڈیو بھی بنالی ہوتی اور اس وڈیو میں دو چار گواہیاں بھی شامل کر لی ہوتیں تو اس سے بھی قیصر اور اس کے ٹولے کو کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔“

”تمہارا مطلب ہے ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے؟“

”کر سکتے ہیں لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ الٹا یہ ہوگا کہ تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو کسی چکر میں پھنسا دیا جائے گا۔ تم راجو کو بھول جاؤ گے اور اپنی پڑ جائے گی۔ وہ کیا کہتے ہیں... تجھے پرانی کیا پڑی اپنی نیڑ اور ویسے ایک بات میں تمہیں اور بتاؤں بھی راجو جیسے لوگوں کو ٹھکانے لگا دینا ٹھیک ہوتا ہے۔ ان کا جرم بالکل ثابت ہو رہا ہوتا ہے لیکن عدالتی کارروائیوں اور قانون کی خامیوں کا سہارا لے کر یہ لوگ بچ جاتے ہیں اور پھر سے اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔“

”لیکن سوال تو یہ ہے اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ جس شخص کو گولی سے اڑایا جا رہا ہے یہ واقعی مجرم ہے اور پھر یہ قانون پڑھانے والے ادارے، یہ سارا عدالتی نظام

”میں نے تمہیں غلط تو نہیں کہا تھا نا کہ یہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہے۔ یہ لوگ حد سے گزرے ہوئے ہیں۔ ان کا مقابلہ تب تک نہیں ہو سکتا جب تک خود بھی حد سے نہ گزرا جائے۔ ایسا سین دیکھ کر جب میرے جیسے کسی بندے کا میٹر گھومتا ہے نا تو پھر بچ بچ کا پولیس مقابلہ ہو جاتا ہے۔“ اندرونی تپش سے ولید کا چہرہ تھمتار ہا تھا اور گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔

گاڑی چلاتے چلاتے اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک پستل نکال لیا۔ پھنکارتے لہجے میں بولا۔ ”قیصر جیسے لوگوں کو کوئی قانون نہیں پکڑ سکتا۔ ان کا بس یہی ایک سیدھا سادہ علاج ہوتا ہے۔“ میں نے دیکھا ولید کی آنکھوں میں شعلے سے لپک گئے۔

”نہیں یار! اس کو نیچے رکھو۔“ میں نے پستل اس کے ہاتھ سے لے کر دو بارہ سیٹ کے نیچے گھسا دیا۔ ”ہم کوئی ڈاکو نہیں ہیں ولید جو پولیس مقابلہ کریں گے۔ ہم شریف شہری ہیں اور بات صرف یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک بندے کو غیر قانونی طور پر جان سے مارا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجرم ہی ہو لیکن جس طرح اسے مارا گیا ہے یہ کسی طور بھی ٹھیک نہیں تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ ٹھیک تھا؟“

”تو جو حادثے کی رات تمہارے ساتھ ہوا وہ ٹھیک تھا؟ اگر نہیں تھا تو ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ معافی ہی مانگنا پڑی تھی نا۔“

”وہ میری ذات کا معاملہ تھا۔ یہ کسی اور معاملہ ہے۔ میں اس بارے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ ایک شریف شہری کی حیثیت سے، قانون کے دائرے میں رہ کر مجھے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔“

”تو کیا کرو گے بھائی؟“

”میں دیکھوں گا کہ قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے۔“

اچانک ولید کو زور سے بریک لگانا پڑے۔ سامنے چوک کا اشارہ بند ہو گیا تھا۔ ہم تو رک گئے لیکن ہمارے پیچھے آنے والی دو تین گاڑیاں فرارے بھرتی ہوئی سنگٹل کر اس کر گئیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ان میں ایک ایسی موٹر سائیکل بھی تھی جس پر تین پولیس اہلکار بیٹھے تھے۔

ولید نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”لو دیکھ لو، یہ ہے ہمارے ہاں کا قانون۔ اگر سنگٹل کی خلاف ورزی پر روکنے والا کوئی نہیں تو پھر سنگٹل توڑنے کی آزادی ہے۔“

میں خاموش رہا۔ میرے ذہن میں کچھ اور طرح کی جاسوسی ڈائجسٹ



مقابلے کی پٹی چلنا شروع ہو گئی تھی جو چینل کی معلومات کے مطابق کوئی دو گھنٹے پہلے لاہور کے مضافات میں ہوا تھا۔ بتایا جا رہا تھا کہ پیشی پر جاتے ہوئے راجو نامی غنڈا پولیس کی حراست سے فرار ہوا۔ بعد میں پولیس مقابلہ ہوا۔ راجو کے مددگار تین افراد بھاگنے میں کامیاب ہوئے جبکہ راجو موقع پر مارا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

عبداللہ نے بیزاری سے ریمورٹ اٹھایا اور ٹی وی بند کر دیا۔ وہ اصل موضوع سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سگریٹ کے دو گہرے کش لے کر دھواں ایک جانب چھوڑا اور ٹھہرے انداز میں بولا۔ ”تمہارے گھر اور تمہاری آبائی زمین کا مسئلہ ہے، کچھ لوگ اسے خریدنا چاہتے ہیں بلکہ یوں کہہ لو کہ زبردستی خریدنا چاہتے ہیں۔“

”کون لوگ؟“ میں چونک گیا۔ ”سمجھو کہ یہ لوگ بھی داراب فیملی کے کارندے ہیں۔ یہ چکر پچھلے چھ مہینے سے چل رہا ہے۔ ابھی تو یہ لوگ پیار و محبت سے کام لے رہے ہیں لیکن زیادہ دیر تک ایسا نہیں ہوگا۔ اگر کئی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو انگلیاں میڑھی کر لی جائیں گی۔“

”تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے؟“

”قریباً دو مہینے پہلے اس بارے میں چچا حفیظ نے مجھے خود سب کچھ بتایا ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے وہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں۔ ہر مصیبت، پریشانی سے اپنے گھر والوں کو دور رکھتے ہیں۔ اب بھی وہ یہ سب کچھ اپنے اوپر لیے ہوئے ہیں۔ ولید کے کانوں میں بھنک بھی نہیں پڑنے دی انہوں نے... وہ جانتے ہیں، وہ مرنے مارنے پر اتر آئے گا اور معاملہ بہت خراب کر لے گا۔ مجھے بھی انہوں نے رازداری کی سخت شرط کے ساتھ چٹائی تھی۔“

میری نگاہوں میں اپنے آبائی گھر کا منظر گھوم گیا۔ وہاں کے ایک ایک چپے پر ہماری یادیں نقش تھیں۔ یہ ساری قریباً دو ایکڑ جگہ تھی۔ اندازاً ڈیڑھ کنال میں ہمارا وہ پرانا حویلی نما مکان تھا جہاں ہم نے تایا اور چچاؤں کے ساتھ اپنا بچپن گزارا تھا۔ مکان کے عقب میں وہ جگہ بھی جہاں دادا کے زمانے میں سادہ اور باداموں والا گڑ تیار ہوتا تھا اور دیہاتی سوغاتیں بنتی تھیں۔ اب وہاں بیکری کا کام چل رہا تھا۔ آگے کی قریباً ڈیڑھ ایکڑ زمین پر ایک باغ اور دو تین کھیت تھے جو اب چچا نے ٹھیکے پردے دیے تھے۔ یہ ساری جگہ ہم سب کو اور خاص طور سے چچا حفیظ کو بہت عزیز تھی کیونکہ بانی بھائیوں کے بکھر جانے کے باوجود وہ یہیں

کس کام کا؟ اور تم بھی کس کام کے؟“

عبداللہ کے چہرے پر غصے کا رنگ سالہرا گیا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ میری بات کا جواب سخت انداز میں دے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور لمبی سانس لے کر بولا۔ ”میرا خیال ہے شاہ زیب! تمہیں پرانے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کے بجائے پہلے اپنے ارد گرد بھی دیکھنا چاہیے۔ م... میرا مطلب ہے...“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے لگا کہ وہ شاید بے دھیانی میں ضرورت سے کچھ زیادہ کہہ گیا ہے۔

میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ارد گرد سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

وہ پہلے تو کچھ تذبذب میں رہا پھر پہلو بدل کر بولا۔ ”شاہ زیب تم کئی دن سے یہاں ہو، کیا تم نے چچا حفیظ کے سلسلے میں کوئی خاص بات نوٹ کی ہے؟ میرا مطلب ہے ان کی کوئی پریشانی وغیرہ؟“

میں نے چونک کر کہا۔ ”ہاں، کچھ کم صم تو ان کو دیکھا ہے میں نے...“

”وجہ نہیں پوچھی؟“

”دو تین بار پوچھا بھی لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔“

عبداللہ نے سگریٹ سلکاتے ہوئے کہا۔ ”ایک دو بار میرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ اس بارے میں ولید سے بات کروں لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ وہ بہت تیز مزاج کا ہے۔ اپنے غصے کی وجہ سے وہ کئی دفعہ اپنا اچھا بھلا کام بگاڑ بھی چکا ہے اور یہ بات ایسی ہے کہ میں کم از کم اس سے تو شیر نہیں کر سکتا۔“

”کوئی لڑائی جھگڑے والا معاملہ ہے؟“

”لڑائی جھگڑے والا ہوتا تو میں اس کو خود ہی نبھانے کی کوشش کرتا مگر بات کچھ اور ہے... تم پڑھے لکھے اور سمجھ دار ہو۔ اگر تم وعدہ کرو کہ بات اپنے تک رکھو گے تو میں تمہیں اس بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔“

میں نے عبداللہ کو پوری پوری تسلی دی کہ یہ بات ہم دونوں کے درمیان رہے گی اور اگر میں نے اس سلسلے میں چچا سے بات کی بھی تو اس طرح کروں گا جیسے مجھے از خود کوئی جانکاری حاصل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اس سے یہ وعدہ بھی کیا کہ اس کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔

اسی دوران میں نے اپنے رکھے ٹی وی پر اس پولیس



لگایا کہ بات حاجی نذیر اور اس کی بیٹی کے بارے میں ہو رہی ہے۔ یہ پتا بھی چلا کہ حاجی نذیر صاحب چند دن پہلے لاہور کے پنجاب کارڈ یا لوجی میں ایڈمٹ ہوئے تھے اور ان کی اسٹوگرانی ہوئی ہے۔

بات ختم کر کے عبداللہ نے ٹھنڈی سانس لی اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”وہی ہونا جس کا اندیشہ تھا۔ داراب فیملی کے لوگ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر حد تک جاتے ہیں۔ بس کار گیری یہی ہے کہ قانون ان کو پکڑ نہیں سکتا اور عدالتیں ثبوت اور گواہوں کے بغیر بے بس ہو جاتی ہیں۔ پتا ہے پچھلے دنوں کیا ہوا ہے؟“

میں سوالیہ نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنے کالے کوٹ کا کارڈ درست کرتے ہوئے بولا۔ ”حاجی نذیر صاحب کو درمیانے درجے کا اٹیک ہوا ہے اور اس اٹیک کی وجہ پتا ہے کیا ہے؟ ایک فائل... جو ایک سرکاری دفتر میں کہیں فائلوں کے نیچے دبلی پڑی ہوگی دس پندرہ سال سے۔ داراب فیملی کے وکیلوں نے اس فائل کو باہر نکال لیا ہے اور جھاڑ پونچھ کر کسی میز پر سجایا ہے۔“

”کیسی فائل؟“

”ایک پرانے مقدمے کی۔ حاجی نذیر کی ایک شوگر مل بھی ہے۔ اس شوگر مل میں ایک بوائلر پھٹ گیا تھا۔ بوائلر پھٹنے سے تین افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ ان میں شوگر مل کی مزدور یونین کا جنرل سیکریٹری بھی تھا بعد میں یہ شور اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ سازش ہے۔ جنرل سیکریٹری کے ساتھ ایک طرح سے حاجی نذیر اور اس کے بیٹے کی دشمنی چل رہی تھی۔ اس شخص کو اسی دشمنی میں قتل کیا گیا ہے۔ ڈیڑھ دو سال کے بعد نا کافی شہادتوں اور گواہوں کی عدم موجودگی کے سبب یہ کیس سرد خانے میں چلا گیا لیکن اب اس باسی کڑی کو پھر... ابال دیا گیا ہے اور کیس کو بنا سنوار کر اس میں نئی جان ڈال دی گئی ہے۔ اس کیس کے ری اوپن ہونے پر ہی حاجی نذیر صاحب نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا اور خرابیاں خرابیاں دل کے اسپتال پہنچ گئے۔ ان کے اسپتال پہنچنے کا نتیجہ پتا ہے کیا نکلا؟“

”کیا نکلا؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے صحافی دوست کی اطلاع کے مطابق دو تاریخ کو سہ پہر چار بجے حاجی صاحب کی بیٹی عاشرہ از خود شکیل سے ملنے اس کے شیخوپورہ والے ریٹ ہاؤس میں پہنچی۔ وہ ایک عام سی نیلی مہران کار میں گئی جس کی کھڑکیوں پر بلاسٹڈر لگے ہوئے تھے۔ وہ قریباً دو گھنٹے یعنی شام سات

پر مقیم رہے تھے۔ ایک دم میرا دل بھر آیا۔ میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ چچا نے پورے گھر کو رنگ و روغن کیوں کروایا ہے۔ کیوں وہ کھوئے کھوئے سے اس کے درود یوار کو دیکھتے اور راہداریوں میں گھومتے رہتے ہیں اور آج کل ان کی روز بروز گرتی صحت کا اصل سبب کیا ہے؟

میں نے کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا یہ بالکل ہی اندھیرنگری اور چوپٹ راج ہے؟ کیا یہاں سرے سے کوئی قانون ہے ہی نہیں۔ وہ چچا کی جگہ ہے، اس جگہ کو ان کی مرضی کے بغیر کیسے خریدا جاسکتا ہے؟“

”جو لوگ خریدنے والے ہیں، ان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ خرید سکیں۔ کیا تمہارے سامنے انہوں نے حاجی نذیر جیسے بندے کو گھسنے ٹکسنے پر مجبور نہیں کیا۔ اسے تیار نہیں کر لیا کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ شکیل داراب کے ہاتھ میں دے دے۔ شاید تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا۔ اگلے مہینے کی دس بارہ تاریخ کو عاشرہ اور شکیل داراب کا نکاح ہو رہا ہے۔“

میں سشدر رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ یہ معاملہ اتنی جلدی طے پا جائے گا۔ میں تو وہاں اسپتال میں عارف کو بہت حوصلہ اور تسلی دے کر آیا تھا۔ میں نے اسے باور کرایا تھا کہ اس کی آواز عاشرہ اور حاجی نذیر کی فیملی تک پہنچانے کی کوشش کروں گا اور اس زبردستی کی شادی کو روکانے کے لیے جو بھی ہو سکا کروں گا۔

”تمہیں کیسے پتا ہے کہ اگلے مہینے یہ شادی ہو رہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کنفرم اطلاع ہے۔ ویسے اب یہ شادی ہو ہی جائے تو بے چاری عاشرہ کے لیے اچھا ہے اور اس کے گھر والوں کے لیے بھی۔“ عبداللہ کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ایک بھید سا تھا۔

”تم پہیلیاں کیوں بکھوار ہے ہو، کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟ حاجی نذیر اور عاشرہ نے اتنی جلدی ہتھیار کیسے ڈال دیے؟“

”یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ سوچو، انہوں نے اتنی جلدی ہتھیار کیسے ڈالے اور اگر وہ اتنی جلدی ہار مان سکتے ہیں تو پھر چچا حفیظ بے چارے کہاں تک مزاحمت کر سکتے ہیں۔“

اس دوران میں عبداللہ کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور آٹھ دس منٹ تک بات کی۔ دوسری طرف غالباً اس کا کوئی صحافی دوست تھا۔ میں نے اندازہ

جاسٹوسس ڈائجسٹ



بچے تک اس ریٹ ہاؤس میں رہی ہے اور اس بارے میں اب بہت سی چہ میگوئیاں بھی گردش کر رہی ہیں۔“

”کیسی چٹکیاں؟“

عبداللہ نے سگریٹ کا ایک لمبیل کش لینے کے بعد کہا۔ ”کسی کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ اس پر بات کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لیتا چاہیے۔ بہر حال جو معلومات گردش کر رہی ہیں ان کے مطابق عاشرہ نے شکیل سے مل کر اس سے خود معاملات طے کیے ہیں اور اس سے نکاح پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ معاملہ طے ہونے سے پہلے ان دونوں کے درمیان جھگڑا وغیرہ بھی ہوا تھا۔ ایک موقع پر عاشرہ بڑے غصے میں شکیل کے دفتر سے باہر نکلی تھی اور اپنی مہر ان گاڑی میں آئی تھی لیکن کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اندر چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ واپس آئی تو شکیل بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ نہ صرف اسے گاڑی تک چھوڑنے آیا بلکہ اس نے اپنے گاڑی والی ایک گاڑی عاشرہ کے ساتھ بھی بھیجی تاکہ وہ اسے مراد پور تک پہنچا سکیں۔“

میں نے گہری نظروں سے عبداللہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے شروع میں یہ کیوں کہا کہ اب عاشرہ، شکیل سے شادی کر رہی ہے تو اچھا ہے؟“

عبداللہ کے ہونٹوں پر پھسکی سی مسکراہٹ کھیل گئی، بولا۔ ”تم بات تاڑ جاتے ہو۔۔۔ میرا خیال ہے بات وہی ہے جو اب تمہارے دماغ میں بھی آرہی ہے۔ وہاں عاشرہ کو بڑی بے چارگی کے عالم میں کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر معاملہ طے کرنا پڑا ہے۔ اللہ کرے ہمارا اندازہ غلط ہو لیکن لگتا ہے کہ وہ شادی سے پہلے ہی... شادی شدہ ہو گئی ہے۔ شکیل جیسے گھاگ کاروباری لوگ نو نقد نہ تیرہ ادھار پر یقین رکھتے ہیں۔“ عبداللہ کے لہجے میں تاسف کی جھلک تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے وہ نشانات گھوم گئے جو عاشرہ کے دو دھیا جسم پر موجود تھے اور جن پر اتفاقاً ہی میری نظر پڑی تھی۔ خاص طور سے گردن کا نشان گواہی دیتا تھا کہ وہ کسی کی آتشیں دست درازی کا شکار ہوئی ہے۔

”اوہ گاڑ۔“ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ نہ جانے ان لمحوں میں کیوں مجھے لگا کہ میں دورِ حاضر کے کسی ملک میں نہیں قدیم زمانے کی کسی اندھی تہذیب میں رہنے والا شخص ہوں۔ جہاں عیار عقل نے سو بھیس بدل رکھے ہیں اور نت نئے طریقوں سے جبر اور مجبوری کی تاریخ رقم کر رہی ہے۔

عبداللہ کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”شاہ زیب! میری بات کا برانہ

جاسوسی ڈائجسٹ

ماننا۔ میں اسی لیے تمہیں کہتا ہوں کہ پرانے پھندوں میں ناگ اڑانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میرے خیال میں تو حاجی نذیر کی بیٹی کے ساتھ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو چکا ہے۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ ان کی شادی ہو جائے اور جلد سے جلد ہو جائے۔“ میں سنانے میں تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوگا اور اتنی جلدی ہوگا۔

عبداللہ نے نیا سگریٹ سلاگاتے ہوئے کہا۔ ”اللہ نہ کرے... اللہ نہ کرے... میرے منہ میں خاک۔ ہم پر بھی اس طرح کی کوئی آفت آجائے۔ میرا مشورہ تو چچا حفیظ کے لیے یہی تھا کہ ان لوگوں سے متھا لگنا اور ٹین شین پالنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ وہ لوگ مارکیٹ کے مطابق جگہ کی معقول رقم دے رہے ہیں بلکہ شاید وہ زیادہ بھی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ ایسے میں بہتر ہے کہ یہ کڑوا کھونٹ بھریا جائے اور جگہ بیچ کر فوراً ہی کہیں اور جگہ خرید لی جائے۔ ولید کی بیکری شاپ بھی ابھی کرائے کی جگہ پر ہے۔ ڈھائی تین کروڑ میں اسے شاپ کے لیے اچھی جگہ مل سکتی ہے۔ مکان بنا کر باقی رقم کسی بینک میں جمع کر دے لیکن...“

”لیکن کیا؟“

”چچا اس جگہ پر ایسے دھنسنے ہوئے ہیں جیسے بوڑھے پیپل کی جڑیں زمین میں اندر تک چلی جاتی ہیں۔ جب وہ وہاں سے جانے کے بارے میں سوچتے ہیں تو ان کے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے اور بات صرف چچا ہی کی نہیں چچی کو بھی اس گھر سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔“

”وہ دونوں وہیں لپے بڑھے، وہیں جوان ہوئے، وہیں پر انہیں محبت ہوئی اور ان کی شادی بھی ہوئی پھر باقی بھائی تو ایک ایک کر کے دوسری جگہوں پر آباد ہو گئے لیکن چچا حفیظ نے اپنے حصے کی جائداد میں یہی جگہ رکھی۔ ان کی ساری عمر یہیں پر گزری ہے۔ میں جانتا ہوں یہاں کی ایک ایک اینٹ سے انہیں پیار ہے۔“ میں نے دل گیر لہجے میں کہا۔

”لیکن میرا خیال ہے اب اس پیار کے خاتمے کا وقت آ گیا ہے۔ جو بڑے بڑے مگر مجھ اس جگہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں، وہ اسے حاصل کیے بغیر نہیں رہیں گے، بہت مشکل ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ان مگر مچھوں کے کوئی نام بھی ہیں یا صرف مگر مجھ ہی کہتے ہیں انہیں؟“

وہ بولا۔ ”مگر مجھ نمبر ایک تو وہی لالہ نظام چودھری ہے۔ یہ شکیل داراب کے خطرناک گماشتوں میں سے ایک



تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ عشا کے بعد سے اپنے ایک ہم عمر دوست کے ساتھ بیٹھے تھے اور یہ شخص جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس شخص نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر پکڑی اور بال قدرے لمبے تھے۔ وہ دونوں بیٹھک میں بیٹھے حقہ گڑ گڑا کر مسلسل باتیں کر رہے تھے۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ پروگرام کل تک ملتوی کر دوں کہ اچانک مجھے لگا کہ چچا کا دوست اٹھ کر جانے والا ہے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے چچا اور ان کے دراز گیسو دوست کو بیٹھک سے نکل کر احاطے کی طرف جاتے دیکھا۔ جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ دونوں ہی کہیں جا رہے ہیں۔ رات کے اس پہر اتنی سردی میں وہ کہاں کا ارادہ رکھتے تھے؟ میں نے شلوار قمیض پر چادر کی بکل لپیٹی اور چپل پہن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں احاطے کی نیم تار کی میں داخل ہوئے تو میں بھی خاموشی سے ان کے عقب میں چل پڑا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بیرونی پھانک کی طرف جانے کے بجائے باغ کی طرف جا رہے ہیں پھر مجھے ایک اور چیز نظر آئی۔ باغ کے اندر شاید کہیں تھوڑی سی آگ بھی جل رہی تھی۔ آگ تو نظر نہیں آئی لیکن سرخ روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ حویلی کے باقی حصے پر مکمل سناٹے کا رواج تھا۔ زنانہ حصے میں فقط ایک بلب کی مدھم روشنی موجود تھی۔ چچا اور ان کا دوست ٹھہرے ہوئے اوس زدہ باغ میں داخل ہوئے تو میں بھی احتیاط سے درختوں کے اندر چلا گیا۔ یہاں کیوں اور امروہ کے بہت سے کوتاہ قد درخت موجود تھے۔ میں نے ان درختوں کے اندر سے ایک عجیب منظر دیکھا۔ آگ کے دوالاؤ روشن تھے۔ ایک چھوٹا اور ایک قدرے بڑا، بڑے الاؤ کے پاس ایک لڑکی، لڑکا ڈرے سہے سے بیٹھے تھے۔ نہ جانے کیوں ان کے لباس کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ شاید ایک آدھ دن پہلے ہی۔ دونوں لباس اور صورت سے غریب طبقے سے لگتے تھے بلکہ کافی زیادہ غریب۔ لمبے بالوں والے شخص نے ان دونوں کے پاس جا کر کچھ کہا اور دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ چچا حفیظ کا ایک اعجاز نامی ملازم بھی یہاں موجود تھا۔ اعجاز حجام کا کام بھی کرتا تھا۔ اعجاز اور لمبے بالوں والے شخص نے الاؤ کے سامنے دو تین بڑی بڑی چادریں اس طرح تان دیں کہ لڑکی لڑکا نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

چچا حفیظ اور لمبے بالوں والا شخص کچھ دور جا کر چھوٹے الاؤ کے پاس بیٹھ گئے۔ چچا حفیظ تو حقہ گڑ گڑانے لگے جبکہ لمبے بالوں والا ایک مالا نکال کر کچھ پڑھنے میں مصروف

ہے۔ بے حد چال باز اور زہریلا شخص ہے۔ زمیندار اور کاشت کار اس کی صورت دیکھ کر جل تو جلال تو پڑھنے لگتے ہیں۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو داراب فیملی کے ذاتی منصوبوں کے لیے مختلف جگہیں اور رقبے حاصل کرتے ہیں۔ دھن دھاندلی، دھونس سب کچھ چلاتے ہیں یہ لوگ۔ لالہ نظام نامی یہ بندہ خود بھی کروڑ پتی بن چکا ہے۔ لاہور میں دو تین پلازوں کا مالک ہے۔ مزے کی بات یا پھر کہہ لو کہ سر پینے کی بات یہ ہے کہ لالہ نظام چودھری اپنے محترم و معظم ایس ایچ اوقیصر چودھری کا سر ہے۔

”تم تو کہتے ہو کہ یہ بہت بڑے لوگ ہیں، پھر یہ اس دوا یکر جگہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہوئے ہیں؟“

عبداللہ نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”نمک معمولی سی چیز ہے لیکن ہزاروں لاکھوں روپے سے پکا ہوا کھانا بھی دس بیس روپے کے نمک کی وجہ سے بے کار ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال تم لوگوں کی دوا یکر زمین کی ہے۔ داراب فیملی کے لوگ یہاں ایک بڑی رہائشی اسکیم بنا رہے ہیں۔ مین سے لے کر پیچھے تک وہ سیکڑوں ایکڑ رقبہ حاصل کر چکے ہیں۔ بس فرنٹ پر دو تین لوگ ہیں جن کی دو دو تین ایکڑ زمین ہے۔ یہ زمین اسکیم میں شامل نہ ہوئی تو یہ لوگ اسے اپنے پروجیکٹ میں ٹاٹ کا پیوند سمجھیں گے۔“

عبداللہ کی باتیں سن کر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ شخص جس کو تھپک تھپک کر میں نے اپنے اندر سلا رکھا تھا کسمسا کر بیدار ہو رہا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان کافی دیر تبادلہ خیال ہوا۔ ذہن میں سیکڑوں اندیشے اور دوسو سے لے کر میں عبداللہ کے پاس سے اٹھ آیا۔ میں سب سے پہلے چچا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ کی بات بار بار میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

”پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کے بجائے اپنے گھر کو دیکھو شاہ زیب۔“

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اگر چچا کی روز بروز گرتی صحت اور پریشانیوں کا سبب یہی زمین والا معاملہ تھا تو پھر اس مسئلے کو سمجھنے اور اس کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

رات بڑی سردی تھی۔ تاریکی نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ قریباً گیارہ بجے کا عمل تھا۔ دیہاتی علاقوں میں یہ وقت مکمل خاموشی اور دیرانی کا ہوتا ہے۔ اکثر لوگ اپنے بستروں میں دبک چکے ہوتے ہیں۔ مجھے بھی نیند آنے لگی تھی مگر میں جاگ رہا تھا۔ میں چچا حفیظ سے کھل کر بات کرنا چاہتا



ہو گیا۔ یکا یک مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ چادروں کے پیچھے اونچل لڑکی، لڑکا یونہی نہیں بیٹھے ہوئے بلکہ وہ لیٹے ہوئے ہیں اور شاید نئے نئے لیٹے دو لہا دلہن کی حیثیت سے قربت کے لمحات گزار رہے ہیں۔ یہ سب کچھ بے حد انوکھا اور تحیر خیز تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ سب کچھ کسی جادوؤں نے یا سفلی عمل کا حصہ ہے۔ میں چچا حفیظ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ پختہ عقیدہ رکھتے تھے اور توہمات سے دور تھے پھر یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا اور کیوں؟ لمبے بالوں والا شخص مسلسل اپنی مالا کو گردش دینے میں مصروف تھا۔

قریباً ایک گھنٹا اسی عالم میں گزارا۔ سرد تاریکی میں پنجنوں کے بل بیٹھے بیٹھے میرا جسم اکڑنے لگا تھا۔ یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں کوئی اس طرف آنہ جائے۔ بالآخر یہ امتحان ختم ہوا۔ میں نے دیکھا کہ غریب صورت لڑکے نے سامنے والی چادر ہٹائی اور نچل نچل سا لمبے بالوں والے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لڑکی ابھی تک الاؤ کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ایک لمبے گھونٹ میں چھپا لیا تھا۔ تب الاؤ کی مدھم روشنی میں مجھے وہ فرش بستر بھی دکھائی دیا جس پر لڑکا، لڑکی موجود رہے تھے۔ دراز بالوں والا آگے بڑھا، اس نے گھاس پر بچھا ہوا بستر نکال دیا اور ایک طرف رکھ دیا۔ اس نے دلہن نما لڑکی کی چوڑیاں اتروائیں، اس کے گہنے اتروائے جو غالباً پتلے وغیرہ کے تھے پھر اس نے لڑکی کی کلائیوں سے پھولوں کے گجرے بھی اتروائے۔ یہ سب چیزیں اس نے تہ شدہ بستر کے اندر رکھیں۔ میری نگاہ الاؤ کی دوسری جانب ایک چھوٹے سے گڑھے پر پڑی۔ یہ گڑھا شاید دو تین گھنٹے پہلے ہی کھودا گیا تھا۔ اطراف میں تازہ مٹی نظر آتی تھی۔

دراز گیسو شخص نے بستر کو دیگر اشیاء سمیت بڑی احتیاط سے گڑھے میں رکھوا دیا۔ پھر اس نے اعجاز کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا، اس نے گردن کے پیچھے سے لڑکے کے کچھ بال قینچی کی مدد سے کاٹ لیے۔ پھر یہی عمل اس نے لڑکی کے ساتھ دہرایا۔ تاہم لڑکی کے بال چاروں طرف سے کاٹے گئے اور اس بے چاری کو تقریباً مونڈ کر رکھ دیا گیا۔ وہ شرم و حیا سے سکڑی سنی بیٹھی رہی۔ یہ سارے بال اور لڑکے کے بال اکٹھے کیے گئے اور انہیں بستر کے ساتھ ہی گڑھے میں رکھ دیا گیا۔ پھر اعجاز نے نیچے کی مدد سے گڑھے پر مٹی ڈالنا شروع کر دی۔

چچا نے لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ چچا کی مدھم آواز ہوا کہ دوش پر تیر کر میرے کانوں تک بھی پہنچی۔ وہ اس سے کہہ رہے تھے۔ ”مجھے معاف کرنا ہنی، یہ ہماری مجبوری

تھی۔ تم نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے اور تم نے بھی۔“ انہوں نے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے واسکٹ کی جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور لڑکے کے حوالے کیے۔ اس کے بعد سب لوگ پھاٹک کی طرف چلے گئے۔ بڑا الاؤ پانی کے چھینٹے دے کر بجھا دیا گیا۔ بس چھوٹا الاؤ جلتا رہا اور لمبے بالوں والا شخص اس کے پاس بیٹھ کر کچھ پڑھتا رہا۔

یہ بات میری سمجھ میں اچھی طرح آگئی تھی کہ یہ کوئی جھاڑ پھونک کا عمل ہوا ہے اور عین ممکن ہے کہ اس کا تعلق چچا کی اس پریشانی سے ہو جس نے انہیں گھیرا ہوا ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ شدید پریشانیاں راسخ العقیدہ لوگوں کو بھی شدید واہموں کے سپرد کر دیتی ہیں۔

اگلے روز چچا حفیظ سے میری ملاقات ہوئی۔ تاہم میں نے رات والے واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اشارہ تک نہیں دیا۔ میں نے بیکری کے کام کی اور پھر زمین کے ٹھیکے کی بات چھیڑ دی۔ باتوں باتوں میں، میں نے وہ کہہ دیا جس کے لیے میں موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”چچا! مجھے پتا چلا ہے کہ اس علاقے میں کوئی بڑی رہائشی اسکیم بن رہی ہے اور کچھ لوگ ارد گرد کے رقبے خرید رہے ہیں؟“

چچا کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ انہوں نے کہا۔ ”ہاں کچھ ایسا سلسلہ چل رہا ہے لیکن جو بیچنا چاہے گا وہی بیچے گا۔ ہم تو نہیں بیچیں گے۔“

”آپ سے کسی نے رابطہ نہیں کیا؟“

”ہاں، کچھ دن پہلے ایک بندہ آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ یہ ہماری آبائی جگہ ہے۔ ہمارے چند بزرگوں کی قبریں بھی ہیں یہاں۔ ہم نے اسے فروخت نہیں کرنا۔“ چچا نے گول مول سا جواب دیا۔

چچا اس موضوع سے جان چھڑانا چاہتے تھے لیکن میں مسلسل ان کے کان کھاتا رہا۔ وہ واضح طور پر اپنی پریشانیاں چھپا رہے تھے۔ مجھے ان پر بے حد ترس آیا۔ وہ سب کچھ اپنے اوپر لیے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اکلوتے بیٹے ولید کو بھی بے خبر رکھا ہوا تھا۔

اس نئے چکر کا علم ہونے کے بعد عاشرہ اور اس پر ہونے والے جبر کا واقعہ تو وقتی طور پر میرے ذہن سے نکل گیا۔ اگلے چھ سات روز میں، میں نے کچھ بھاگ دوڑ کی۔ میں نے عبداللہ کو اپنے ساتھ ملایا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ اگر ہم یہ جگہ نہ بیچنا چاہیں تو اس کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ ایسی بات ہرگز نہیں تھی کہ اگر دو تین شہریوں کا یہ



میں نے اسے سرتا پا دیکھا اور غصے سے کہا۔ ”ولید! تم نے نشہ کر رکھا ہے؟“

پہلے تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرایا پھر وہ ایک دم بے پروا نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے پر ندامت کے بجائے غصے کی سرخی پھیلتی چلی گئی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔ تب میری نگاہ ایک اور چیز پر پڑی اور میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ ولید نے شلواریں اور چڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی جیکٹ کی ایک جیب مجھے غیر معمولی طور پر پھولی نظر آئی۔ میں نے اس کی جیب ٹٹولی، اس نے ایک دم میرا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔ میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ اس کی جیب میں وہی پسل موجود تھا جو چند روز پہلے میں نے اس کی کار میں نشست کے نیچے دیکھا تھا۔

”یہ سب کیا ہے ولید؟“ میں نے تلملا کر پوچھا۔  
اس کا چہرہ انگارے کی طرح دھک رہا تھا۔ پھنکار کر بولا۔ ”شاہ زیب! یہ مارا جائے گا۔ میں تمہیں لکھ کر دیتا ہوں یہ مارا جائے گا۔۔۔ میں مار دوں گا اسے۔“  
”کس کی بات کر رہے ہو؟ کون مارا جائے گا؟“  
”یہی کمینہ قیصر چودھری۔ اس کی موت میری گولی سے ہونی ہے۔ سیدھی مانتے پر ماروں گا، سیدی اس جگہ۔“  
اس نے انگلی سے اپنی پیشانی کو چھو کر بتایا۔  
”ہوا کیا ہے یار؟ کچھ پتا تو چلے؟“  
”وہ رذیل کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ اب میں اسے بتاؤں گا کہ جب شریف آدمی بد معاشی پر اترتا ہے تو پھر اس جیسے تھانے دار کا کیا حشر ہوتا ہے۔“

ولید کا انداز خطرناک سے خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے غیظ و غضب کو الکحل کی گرمی نے دو آتشہ کر دیا تھا۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ جو باتیں اب تک چچا حفیظ اور عبداللہ تیز مزاج ولید سے چھپا رہے تھے وہ اس کے علم میں آگئی ہیں۔ اگر ساری نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور آگئی ہیں۔

میں نے اس کے دماغ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب رہا۔ میں نے اصرار کر کے پوچھا تو اس نے انکشاف انکیر لہجے میں مجھے وہی کچھ بتایا جو مجھے کئی دن پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ”لالہ نظام نامی بندہ زبردستی ہماری یہ آبائی جگہ خریدنا چاہ رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ بد فطرت شخص رشتے میں ایس ایچ او قیصر چودھری کا سر ہے اور دراصل قیصر ہی وہ شخص ہے جو بار بار اس کے والد (چچا حفیظ) سے رابطہ کر رہا ہے اور زمین بیچنے کا تقاضا

پانچ چھ ایکڑ رقبہ اسکیم میں شامل نہ ہوتا تو اسکیم کو کسی طرح کا نقصان پہنچتا۔ اتنے بڑے پراجیکٹ کے لیے اس ٹکڑے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بس اتنا تھا کہ اسکیم کی باؤنڈری دال میں ایک جگہ تھوڑا سا خم آ جاتا تھا اور بڑے لوگ ایسے خم برداشت نہیں کرتے۔ نہ باؤنڈری والے میں نہ اپنی گردنوں میں۔ وہ ضد بنا لیتے ہیں اور اسے پورا کرنے کے لیے ہر حد تک جاتے ہیں۔ ان چھ سات دنوں میں مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ فی زمانہ ہمارے جیسے ملکوں میں انصاف کا حصول کتنا مشکل ہے۔ آگے جانا تو دور کی بات ہے پہلا قدم اٹھانا ہی دشوار ہو رہا تھا۔ کہیں بدنیت پنواری بیٹھا تھا، کہیں تنگ مزاج تحصیل دار، کہیں کرپٹ ایم پی اے اور کہیں قیصر چودھری جیسا خود سرافسر۔ آج کے صرف ایک شخص ایسا تھا جس نے کچھ توجہ سے ہماری بات سنی لیکن عملی طور پر وہ بھی بے بس نظر آیا اور یہ تھا جواں سال ایس پی تبریز۔

میں ایک سینئر وکیل سے مل کر بات کو گھرواپس آیا تو چچا حفیظ دوا کھا کر سو گئے تھے۔ چچی نے مجھ سے کھانے کا پوچھا اور شکوہ کیا کہ میں نہ جانے کہاں بھاگا بھاگا پھر رہا ہوں۔ چچا زاد بہن فائرہ نے بھی اسی طرح کا گلہ شروع کر دیا۔ وہ سب اس بات سے بے خبر تھے کہ اس گھر پر کیا مصیبت آئی ہوئی ہے۔ جس طرح کی صورت حال تھی عین ممکن تھا کہ ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر ان لوگوں کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے نکلنا پڑتا اور فائرہ بے چاری جو بائل کے اس پیارے آنگن سے شہنایوں کی گونج میں رخصت ہونے کا سوچ رہی تھی۔ اس رخصتی سے پہلے ہی زبردستی یہاں سے نکال دی جاتی۔

میں نے چچی سے پوچھا۔ ”ولید کہاں ہے؟“  
وہ بولیں۔ ”کہہ رہا تھا سر میں درد ہے۔ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔“

میں برآمدے سے گزر کر ولید کے کمرے تک پہنچا۔ دو تین بار دروازے پر دستک دی آخر اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟“

وہ جان چکا تھا کہ دروازے پر میں ہوں پھر بھی دروازہ کھولنے سے ہچکچا رہا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ کافی تاخیر سے اس نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک ناگوار بو میرے نھنوں سے ٹکرائی اور مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ولید نے شراب پی رکھی ہے یا شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے تک بھی پی رہا تھا۔ بہر حال کمرے میں کسی طرح کا کوئی ثبوت دکھائی نہیں دیا۔



کر رہا ہے۔“ یہ باتیں بتاتے ہوئے ولید کی آنکھوں میں دکھ آمیز طیش کی لالی تھی جسے شراب کی لالی نے دوچند کر دیا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ”مجھے اب پتا چلا ہے شاہ زیب بھائی کہ اباجی کی صحت روز بروز خراب کیوں ہو رہی ہے۔ یہ خبیث تھانے دار جونک کی طرح ان کو چمٹا ہوا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ، اباجی کس طرح کے بندے ہیں۔ کیا انہوں نے بھی جادو ٹونے اور جھاڑ پھونک والی باتوں پر یقین کیا ہے۔ کیا وہ ایسی باتیں کرنے والوں سے جھگڑ نہیں پڑا کرتے تھے؟“

”ہاں ایسا ہی تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”اب دیکھو، وہ اس قدر پریشان ہیں کہ ان جیسا بندہ بھی ایسی چیزوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا ہے۔ مجھے اتنا دکھ ہوا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ شاید تمہیں بھی سن کر حیرانی ہو۔ کچھ دن پہلے وہ ایک عامل سے ملے ہیں۔ وہ ہمارے گھر بھی آیا تھا۔ اس نے اباجی سے کافی روپے بٹورے ہیں اور جھاڑ پھونک کا عمل بھی کیا ہے۔“

”کیسا عمل؟“ میں نے جانتے بوجھتے پوچھا۔

ولید کچھ دیر تو تذبذب میں رہا پھر اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اس نے کہا کہ عامل نے اباجی کو بتایا کہ اگر کوئی شریف پاک دامن لڑکی شادی کے بعد اپنی پہلی رات اس گھر میں گزارے اور پھر اس کی سہاگ رات کی نشانیاں یہیں پر کسی گڑھے میں دفن کرنے کے بعد خاص وظیفہ پڑھا جائے تو یہ جگہ محفوظ ہو سکتی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق اباجی نے یہ سب کچھ کیا۔ انہوں نے بڑی رازداری کے ساتھ اعجاز کو یہ سب کچھ بتایا اور اس نے قرہی مچی بستی سے ایک ایسا جوڑا ڈھونڈ نکالا جس کی آٹھ دس روز میں شادی ہونے والی تھی۔ ان کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا گیا کہ وہ نکاح کے بعد حویلی میں رات گزاریں۔

ولید نے مجھے وہ سب کچھ بتایا جو میں ایک رات خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر چکا تھا اور جس نے مجھے حیرت کے دریا میں غوطے دیے تھے۔ میں نے ولید سے پوچھا کہ اسے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس نے باغ میں وہ گڑھا خود دیکھ لیا تھا۔ شک ہونے پر اس نے وہ گڑھا کھودا تو اس میں سے بستر اور دوسری چیزیں نکلیں۔ اس کے ساتھ ہی کٹے ہوئے بال اور ایک کینچی بھی ملی جو شاید غلطی سے گڑھے میں چلی گئی تھی۔ یہ کینچی دیکھنے کے بعد ولید کو اعجاز پر شک ہوا۔ اس نے سختی کے ساتھ اعجاز سے پوچھ کچھ کی تو اس نے سب کچھ بتا دیا۔ بعد میں طیش سے بھرے ہوئے ولید نے پہلے والدہ اور پھر والد سے بات کی، اسے سب کچھ

معلوم ہو گیا۔ اس کے بعد آج شام پھر اہوا ولید تھانے پہنچا۔ وہاں تھانے دار قیصر سے تو اس کی ملاقات نہیں ہوئی تاہم قیصر کے حوالدار سے اس کا سامنا ہوا۔ دونوں میں سخت تلخ کلامی اور گالم گلوچ بھی ہوا۔ اب تلملایا ہوا ولید آبلہ پا پھر رہا تھا اور اپنے اندر کی آگ کو جام سے بھجانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ابھی میری اور ولید کی گفتگو جاری تھی کہ کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور مجھے چچا حفیظ کی صورت نظر آئی۔ ان کا چہرہ غصے سے لال بھوکا ہو رہا تھا۔ انہوں نے غضب ناک نظروں سے ولید کو دیکھا اور گرجے۔ ”اپنا اوچھا پن دکھا دیا تا تو نے... اپنی مرضی کر لی نا؟ تو ہے ہی لعنتی۔ تجھ سے ایسی ہی امید تھی۔“

ولید بھی دھاڑا۔ ”ہاں... میں ہوں لعنتی اور میں وہی کچھ کروں گا جو میرے دل میں آئے گا۔ میں جان لے لوں گا اس کہنے کی۔“

چچا حفیظ آگے بڑھے اور انہوں نے ایک زنائے دار تھپڑ ولید کے گال پر رسید کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پھنکارے۔ ”تو ٹھیک ہے، ماردے اس کو اور اس سے پہلے ہم کو ماردے۔ ہماری ہڈیاں بوڑھی ہو گئی ہیں۔ اب پولیس کی مار سہنے اور جیلیں کاٹنے کے لائق نہیں ہیں ہم۔ پہلے ہمیں گولی مار۔“

اس کے ساتھ ہی چچا حفیظ نے دیکھ لیا کہ ولید کی جیکٹ کی سائڈ والی جیب میں پستول ہے۔ انہوں نے جھپٹ کر پستول نکال لیا اور اسے ولید کے ہاتھ میں تھاتے ہوئے بولے۔ ”چل مار گولی پہلے اپنے اس منحوس باپ کو۔ مار... مار... پھر جا کر اپنی ماں کو مارنا اور پھر بہن کو بھی ختم کرنا، نہیں تو وہ دونوں ذلیل ہو جائیں گی تھانوں کے اندر۔“

چچا حفیظ کا پورا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا اور غیظ و غضب کے سبب گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں انہیں افیک ہی نہ ہو جائے۔ میں نے پستول ان کے ہاتھ سے لیا اور انہیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہی وقت تھا جب گھر سے باہر پولیس موبائل کا تیز سائرن سنائی دیا۔

چچا حفیظ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے زرد رنگ لہرایا گیا۔ وہ ایک سیکنڈ خاموش رہے پھر کراہتی ہوئی آواز میں ولید سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”لے اب کر لے بد معاشی۔ لڑ لے پولیس والوں کے ساتھ... تیرے ایک تھپڑ کے بدلے انہوں نے تیری ساری ہڈیوں سے گوشت الگ کر دیا تا تو نام بدل دینا میرا۔“



آپ اندر جائیں۔ ہم بات کر رہے ہیں ناں۔“  
تھانے دار طنزیہ انداز میں بولا۔ ”آہوجی، آپ  
اندر جاؤ۔ آپ کے یہ بر شیر جوان پتر بات کر رہے ہیں ناہم  
سے۔ ان کے ہوتے ہوئے آپ کو منت تر لے کرنے کی کیا  
ضرورت۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اے ایس آئی  
کو اشارہ کیا۔ وہ دو تین سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس  
بار چچا حفیظ سامنے آگئے۔ انہوں نے قیصر کی ٹھوڑی کو ہاتھ  
لگایا۔ ”ہماری بڑی بے عزتی ہوگی پتر۔ تم... تم بس ایک  
منت کے لیے ایک طرف ہو کر میری بات سن لو۔“

چچا منت کر کے قیصر کو ایک طرف لے گئے اور بڑے  
التماس بھرے لہجے میں اس سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ وہ  
لوہے کا ٹھن بنا کھڑا تھا۔ اس کا عملہ دزدیدہ نگاہوں سے چچی  
کے علاوہ ڈری سہی فائزہ کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ میں نے  
ان دونوں کو زبردستی زنان خانے کی طرف بھیج دیا۔ چچا حفیظ  
اور قیصر میں بات لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ بات لمبی ہونے سے  
یہ امید پیدا ہونے لگی کہ شاید بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے  
پھر میں نے دیکھا چچا حفیظ تیزی سے زنان خانے کی طرف  
گئے۔ کچھ دیر بعد وہ پلٹے تو ان کے ہاتھوں میں ایک موبائل  
فون تھا۔ یہ شاید فائزہ کا فون تھا۔ چچا نے اس پر ایک نمبر  
پریس کیا۔ کسی سے ٹھوڑی سی بات کی پھر کانپتے ہاتھوں سے  
یہ فون قیصر کی طرف بڑھا دیا۔ قیصر فون پر بات کرنے لگا۔  
آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن قیصر کے انداز سے صاف  
ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دوسری طرف سے بولنے والے شخص کو  
اہمیت دینے پر مجبور ہے۔ اس نے ایک دو بار اثبات میں بھی  
سر ہلایا اور ٹھوڑی سی بات بھی کی پھر اس نے بڑی ناگواری  
سے بات ختم کرنے کے بعد فون سیٹ چچا حفیظ کی طرف  
بڑھا دیا۔

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ٹھیک ہے  
بزرگو! آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔ ہم آپ کے خادم تو بس تھپڑ  
شہد کھانے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اپنے پتر جی سے  
پوچھ لیں اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو میں اپنا منہ بھی حاضر کر دیتا  
ہوں اس کے تھپڑوں کے لیے۔“

اس کے زہریلے لہجے نے چچا کو ایک بار پھر لرزادیا۔  
انہوں نے قیصر کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگایا۔ ”کیسی بات کر رہا ہے  
پتر، آپ تو حاکم ہو۔“

”حاکم آپ ہو چا چا جی۔ کسی بھی وقت ہماری بیٹی  
اترنا سکتے ہو اور پیٹ بھی... چلیں ٹھیک ہے پھر ملاقات  
ہوگی۔“

ولید سینہ تان کر آگے بڑھا۔ شاید وہ باہر نکلنا چاہ رہا  
تھا۔ میں نے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا اور  
دھکیل کر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ اس سے پہلے کہ  
وہ کچھ سمجھتا میں نے اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند  
کر دیا۔ برآمدے کی طرف سے چچی آمنہ کے رونے  
چلانے کی آوازیں آرہی تھیں یقیناً انہیں بھی اندر ہونے  
والے ہنگامے کا پتا چل گیا تھا۔ میں نے چچا حفیظ کو ساتھ لیا  
اور برآمدے میں آگیا۔ چچی کے علاوہ فائزہ بھی ڈری سہی  
کھڑی تھی۔ بیرونی پھانک دھڑا دھڑ بجا جا رہا تھا۔ چچا حفیظ  
لڑکھڑاتے ہوئے میرے ساتھ چل دیے۔ ہم نے پھانک کا  
چھوٹا سا دروازہ کھولا۔ لمبا ترنگا قیصر چودھری اور اس کا عملہ  
تیزی سے اندر آگیا۔ قیصر ہمیشہ کی طرح پرسکون نظر آ رہا تھا  
مگر آنکھوں میں قہر کی بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ ساتھ میں  
حوالدار بھی تھا۔ اس کے گریبان کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے  
اور چہرہ ایک طرف سے سرخ تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ  
تھانے میں ولید اور حوالدار کے درمیان صرف رخ کلامی ہی  
نہیں ہوئی تھی ہاتھ پائی بھی ہوئی ہے اور شاید ولید نے یہ فاش  
غلطی بھی کی ہے کہ حوالدار پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ اس نے یقیناً  
اپنے لیے بڑی مشکل پیدا کر لی تھی۔ شاید گھاگ حوالدار نے  
اسے جان بوجھ کر مشتعل کیا تھا۔

”کدھر ہے وہ آپ کا بد معاش پتر؟ اسے تھانے  
لے جانا ہے۔“ قیصر چودھری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

چچا حفیظ نے لرز کر کہا۔ ”نہیں تھانے دار پتر، اس کی  
غلطی کی سزا ہم سب کو نہ دو... میں... میں خود اسے چھتر  
ماروں گا۔ وہ... معافی مانگے گا تم سب سے، ہاتھ جوڑ کر  
معافی مانگے گا۔“

”معافی تو اس نے مانگنی ہی ہے بزرگو اور چھتر شتر  
مارنے کا بھی بڑا تسلی بخش انتظام ہے ہمارے پاس۔ آپ  
اسے بس ہمارے ساتھ رخصت کر دیجیے۔“

میں نے دیکھا ایک طرف سے چچی آمنہ تڑپ کر  
آگے بڑھیں اور انہوں نے تھانے دار قیصر کے سامنے ہاتھ  
جوڑ دیے۔ ”نہ میرا پتر، وہ تو بچہ ہے، بے عقل ہے۔ اس کی  
طرف سے ہم تجھ سے معافی مانگتے ہیں۔ اس کی بہن کی  
برات آنے والی ہے کچھ دنوں میں... اس کے ساتھ کوئی  
اونچ نیچ ہوگئی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں  
گے۔ اس کی غلطی کا جو ہر جانہ کہو ہم دے دیتے ہیں۔“

چچی اشک بار آنکھوں کے ساتھ قیصر کی منت سماجت  
کرنے لگیں۔ میں نے چچی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”چچی!



ہو جائے گا۔“

چچا کی باتوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اندرونی طور پر خود کو کافی مضبوط محسوس کر رہے ہیں۔

چچا کے کہنے پر میں نے ولید کے ساتھ ایک طویل نشست کی اور اسے سمجھا بھجا کر کچھ ٹھنڈا کیا۔ چچا نے پرسوں کا کہا تھا لیکن وہ اگلے روز ہی شام کو اسلام آباد چلے گئے۔ وہ اپنے ساتھ بہت سادہ سی کچی اور باداموں و کشمش والا گڑ بھی لے کر گئے تھے۔ قیصر چودھری کے ساتھ ولید نے جو جھگڑا کیا تھا اس کی وجہ سے چچی آمنہ کے ہونٹ ابھی تک سوکھے ہوئے تھے۔ فائزہ بھی پریشان نظر آتی تھی۔ اس کی شادی کے دن قریب آ رہے تھے لیکن گھر میں خوشی کا ماحول کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چچا کی واپسی کا انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں عاشرہ والا معاملہ بھی کبھی کبھی بجلی کی طرح کوند جاتا تھا۔ عبداللہ نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ وہ بے چاری بن بیاہی ہوئی بن چکی ہے اور اب کلی طور پر شکیل اور اس کی زور آور فیملی کے رحم و کرم پر ہے۔ میرے ذہن میں بار بار ویران آنکھوں اور غمزہ چہرے والے عارف کا تصور بھی ابھرتا تھا۔ میں نے حادثے والی رات اس کی جان بچائی تھی لیکن وہ کہتا تھا کہ میں نے اسے مرنے دیا ہوتا تو اچھا تھا۔ میں اسپتال میں اس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ اس کے لیے جو کچھ ہو سکا ضرور کروں گا لیکن میرے کچھ سوچنے یا کرنے سے پہلے ہی حالات کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک بااثر گھرانے کی تعلیم یافتہ عاقل بالغ لڑکی کو اس طرح مجبور و بے بس کیا جاسکتا ہے۔ میں اس بارے میں عبداللہ سے بھی مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

چچا حفیظ کی واپسی دوسرے روز شام کو ہوئی۔ ان کا چہرہ دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مطمئن واپس آئے ہیں۔ ان کے سنجیدہ چہرے کے نیچے دبی دبی خوشی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ واپس آنے کے بعد وہ دیر تک زنان خانے میں رہے پھر بیٹھک میں آئے اور مجھے اور عبداللہ کو بتایا کہ ان کا سفر بڑا کامیاب رہا ہے۔ وہ کھل کر نہیں بتا رہے تھے لیکن ان کے لب و لہجے سے پتا چل رہا تھا کہ آج شاید کئی ماہ کے بعد وہ پہلی بار قدرے سکون محسوس کر رہے ہیں۔

اگلے روز شام کو فائزہ کی مایوں کی رسم ہونا تھی۔ چچا نے اعلان کیا کہ یہ رسم حویلی کی چھت پر شامیانوں کے

میں نے چونک کر قیصر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک برقی سی تھی اور ایسی ہی برقی اس کے لہجے میں بھی کوند رہی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس خطرناک تھانے دار نے یہ سب کچھ ہضم نہیں کیا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا کوئی بہت سنگین رد عمل ظاہر کرے۔

قیصر چودھری اپنے عملے سمیت واپس چلا گیا۔ چچا حفیظ برآمدے سے گزر کر اندرونی حصے میں پہنچے۔ انہوں نے بند کمرے کا دروازہ کھولا اور ایک بار پھر ولید پر برس پڑے۔ انہوں نے اسے بے نقط سناٹیں اور کہا کہ وہ اپنی بے وقوفی کی وجہ سے بنے بنائے کام کا بیڑا غرق کرنے والا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ”اللہ سائیں ہم پر کرم کر رہے ہیں۔ ہماری مصیبتیں دور ہونے کی امید بن رہی ہے اور تم اپنی خردماغی کی وجہ سے نئی مصیبتیں ہمارے گلے میں ڈال رہے ہو۔“

ولید باپ کے ادب کی وجہ سے خاموش تھا ورنہ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے چیخ رہا ہے اور قیصر اور اس کے ماتحتوں کے خلاف غصے سے بھرا ہوا ہے۔ یہ ہنگامہ ذرا کم ہوا تو میں اور چچا حفیظ بیٹھک میں آ بیٹھے۔ چچا بدستور بول رہے تھے۔ ”تم لوگ ابھی بچے ہو۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ تمہیں پتا نہیں قیصر چودھری کا کتنا مضبوط ہے۔ یہ بڑے زہریلے لوگ ہیں۔ ہمارا ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ سو چو جب حاجی نذیر جیسے لوگ ان کا ایک جھٹکا نہیں سہہ سکتے تو ہم کس باغ کی مولیٰ ہیں۔“

اس دن چچا حفیظ نے کھل کر مجھے زمین والے معاملے کی ساری روداد سنائی اور بتایا کہ ان کی پریشانیوں کی بنیاد کیا ہے۔ یہ سب کچھ مجھے پہلے سے معلوم تھا تاہم میں نے ایسے ہی سنا جیسے پہلی بار سن رہا ہوں۔ چچا حفیظ نے اسلام آباد کے ایک بااثر شخص اخلاق پراچہ کا نام لیا اور بتایا کہ اللہ نے شاید اس شخص کو ان کے لیے رحمت کا فرشتہ بنایا ہے۔ وہ اس سلسلے میں دل و جان سے مدد کر رہا ہے اور امید پیدا ہو گئی ہے کہ ان کی زمین اسکیم میں آنے سے بچ جائے گی۔

اخلاق پراچہ کا نام چچا حفیظ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی لیا تھا جب انہوں نے پھرے ہوئے قیصر چودھری کو فون کر دیا تھا۔ اب اندازہ ہوا کہ وہ فون بھی اسی اخلاق پراچہ نامی شخص کا تھا۔ چچا نے مجھے اس کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ تاہم مجھے اپنے طور پر ہی اندازہ ہوا کہ وہ کوئی نیک نام بیوروکریٹ ہے۔

چچا حفیظ نے کہا۔ ”میں پرسوں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ اللہ سوچنے سے بڑی امید ہے کہ یہ معاملہ ٹھیک

جاسوسی ڈائجسٹ



بڑھنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے کمر سے تھام کر اپنی ہانہوں میں جکڑ لیا۔ مجھے ایک طرف چچا حفیظ نظر آئے۔ انہیں تین چار افراد نے تھام رکھا تھا۔ وہ خود کو چھڑا کر آگ کی طرف جانا چاہ رہے تھے۔ وہ دلدوز انداز میں چچی کا نام لے رہے تھے۔

”آمنہ اندر ہے... مجھے چھوڑ دو... آمنہ اندر ہے۔“

انہیں تھامنے والے شاید جانتے تھے کہ اب اندر جانا بے سود ہے اور یہ واقعی بے سود ہی لگتا تھا۔ دروازوں کے اندر آگ کے پھنکارتے ہوئے مہیب شعلوں کے سوا اب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حویلی کے دو تین ملازم اور ارد گرد کے چند ہانسی قریبی جو ہڑ سے ہالیاں بھر بھر کر آگ پر ڈال رہے تھے لیکن یہ آگ ایسے بجھنے والی کہاں تھی۔ چچا حفیظ زمین پر بچھاڑیں کھانے کے بعد نیم بے ہوش سے ہو گئے تھے۔ کئی افراد نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ ولید کی بھی بری حالت تھی۔ میں کوشش کر کے ڈیوڑھی کی طرف سے ایک ادھیڑ عمر ماسی کو شعلوں سے نکال لایا تھا اور اب سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا تھا پھر میری ٹانگوں میں سے جان جیسے ختم ہو گئی۔ میں پنجوں کے تل زمین پر بیٹھ گیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ میرے چاروں طرف جیسے کھرام مچا ہوا تھا۔ لوگ بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ہر طرف رونے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

”یہ سب کیا ہوا... یہ سب کیسے ہوا ہے؟“ اور جب یہ سوال میرے ذہن میں ابھرا تب نہ جانے کیوں اس وقت ایک چہرہ بھی تصور کے پردے پر ابھرا آیا۔ یہ چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ قیصر چودھری کا چہرہ تھا۔ وہ بہت زہریلی نظروں سے چچا حفیظ کی طرف دیکھ رہا تھا پھر میری سماعت سے اس کے فقرے کی بازگشت نکرائی۔ اس نے تیزابی لہجے میں کہا تھا۔ ”چلیں ٹھیک ہے پھر ملاقات ہوگی۔“

اجانک ولید میری طرف آیا اور مجھے دونوں کندھوں سے جھنجھوڑ کر بولا۔ ”دیکھ لپانا تم نے... یہی ہونا تھا... یہی ہونا تھا... یہ کسی اور نے نہیں کیا۔ یہ اسی گتے کینے کا کام ہے۔ اس نے برباد کر دیا ہے ہمیں۔ اس نے ہمیں جیتے جی مار دیا۔ میں نہیں چھوڑوں گا اسے۔ اس کا خون پی جاؤں گا۔ میں ان سب کے ٹکڑے کر دوں گا... ابھی، اسی وقت...“ وہ جیسے غیظ و غضب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

ابھی ثبوت کوئی نہیں تھا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل بھی کہہ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا، سچ ہے۔ اس حویلی کو آگ حادثاتی طور پر نہیں لگی تھی۔ اس کے پیچھے کسی کا ہاتھ تھا۔ اس

اندر ہوگی۔ دراصل وہ ایک پرانی تقریب کی یاد تازہ کرنا چاہتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کچھ پرانی تقریبوں کی یاد تازہ کرنا چاہتے تھے۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے تو حویلی میں ہونے والے کئی فنکشن گھر کی وسیع چھت پر ہوئے تھے۔ ہم لوگ اسے بہت انجوائے کرتے تھے۔ دوپہر سے ہی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ قہقہے لگائے گئے، شامیانے تانے گئے، بہت تھوڑی تعداد میں مہمان بلائے گئے تھے لیکن سب قریبی تھے۔ رات دس گیارہ بجے تک ہلا گھارا۔ قانزہ کے لیے مایوں کی چھوٹی موٹی رسمیں ادا کی گئیں۔ کھانا وغیرہ کھانے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ہم دو تین کزن کچھ دیر دیکھی ہوئی انگلیٹھی کے قریب بیٹھے رہے اور اس گھر سے وابستہ بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔

بارہ بجے کے قریب سب سونے کے لیے چلے گئے اور قریباً ایک بجے کے قریب وہ واقعہ ہو گیا جس نے سب کچھ تہ و بالا کیا اور ہمارے اس حویلی نما مکان میں قیامت صغریٰ برپا کر دی۔

میں اوپر تلے ہونے والے دو یا تین دھماکوں کی وجہ سے بیدار ہوا تھا۔ ولید بھی میرے قریب ہی پٹنگ پر سو رہا تھا۔ وہ بھی ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ہم دونوں ننگے پاؤں ایک ساتھ کمرے سے باہر نکلے۔ کیجا منہ کو آگیا۔ زنان خانے کا بیشتر حصہ آگ کی لپیٹ میں تھا پھر ایک اور دھماکا ہوا۔ آگ کسی طوفانی ریلے کی سی تیزی سے مردانے حصے کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔

”میرا خیال ہے کہ گیس کے سیلنڈر پھٹ رہے ہیں۔“ ولید چلا کر بولا۔

یقیناً یہ گیس سیلنڈر ہی تھے۔ بیکری کا کام زنان خانے کے بالکل عقب میں ہوتا تھا۔ وہاں پکانی کے کام کے لیے گیس کے سیلنڈر رکھے گئے تھے۔ اچانک میری نگاہوں نے ایک دلدوز منظر دیکھا۔ شاید میرے لفظوں میں وہ سکت نہ ہو کہ میں اس منظر کی ہولناکی کو بیان کر سکوں۔ میں نے قانزہ کو دیکھا۔ اس کے بالوں اور سارے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ دوسری منزل پر تھی۔ دیوانہ وار چلاتی ہوئی بالکونی کی طرف آئی۔ اس نے چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن بالکونی کے جنگلے میں ہی کہیں اٹک گئی۔ اسی دوران میں بالکونی کا جلتا ہوا بہت بڑا چھجا ایک دھماکے سے بالکونی پر گرا اور سب کچھ آگ کے بے اماں الاؤ میں گم ہو گیا۔

ولید ”قانزہ... قانزہ!“ پکارتا ہوا شعلوں کی طرف



کے پس منظر میں کسی کی درندگی پہنکار رہی تھی... اور اس کے ڈانڈے کسی کی ہوس سے اور سازش سے جڑے ہوئے تھے۔ ایک ولید دیوانہ وار بیرونی پھانک کی طرف دوڑا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی جیب میں بھرا ہوا پستول موجود ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھانک پار کر گیا۔ میں سب کچھ بھول بھال کر اس کے پیچھے لپکا۔

”رک جاؤ ولید... رک جاؤ۔“ میں پکار رہا تھا۔

ہم دونوں آگے پیچھے دوڑتے حویلی سے نکلے۔ وہ قصبے کی گلیوں میں اندھا دھند بھاگتا ہوا اس چوراہے کی طرف جا رہا تھا جہاں قصبے کا تھانہ واقع تھا۔ میرے اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ بہت تیز دوڑنے کے باوجود میں اس کے قریب پہنچ نہیں پارہا تھا۔ لوگ گلیوں میں بھاگتے ہوئے جائے وقوعہ کی طرف جا رہے تھے۔ ہم مخالف سمت میں بھاگ رہے تھے۔ دور کہیں فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن بھی سنائی دے رہے تھے۔ وہ نہ جانے اب یہاں کیا کرنے آرہی تھیں۔ ولید دیوانہ وار بھاگتا تھا ان کے عین سامنے پہنچا تو ایک گاڑی گیٹ سے نکلتی دکھائی دی۔ یہ کھلی چھت والی پولیس جیب تھی۔ میں نے دور سے دیکھ لیا اس میں انسپکٹر قیصر چودھری موجود تھا پھر وہی ہوا جس کا بدترین اندیشہ میرے ذہن میں موجود تھا۔ پولیس پارٹی کو دیکھتے ہی ولید نے انہیں للکارا۔ اس کی آواز چنگھاڑ سے مشابہ تھی۔ اس چنگھاڑ میں اپنی ماں اور بہن کی اندوہناک موت کا غم کسی برق کی طرح کوند رہا تھا۔ اس نے جیب کے رخ پر دو فائر کیے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا صرف ایک ہیڈ کاسٹیل کے کندھے پر گولی لگی تھی۔ لگتا تھا کہ دوسری طرف پولیس پارٹی بالکل تیار بیٹھی تھی۔ انہوں نے فوراً جوابی فائر کیے۔ دھماکوں سے شعلے نکلے۔ میں نے دیکھا، گولیاں ولید کے سینے میں لگیں۔ اس کا متحرک جسم ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف آیا پھر ایک دیوار سے ٹکرا کر وہ پہلو کے بل کچھڑ میں گر گیا۔ میری آنکھیں جیسے پتھر اکڑ رہی تھیں۔ میں بھاگتا ہوا ولید تک پہنچا۔ اس کا سینہ خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ وہ شاید آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔

”ولید... ولید...“ میں دلدوز آواز میں پکار اٹھا۔

میں نے اسے جھنجھوڑا۔

یہی وقت تھا جب قیصر چودھری کے ساتھی جیب سے کود کر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ کسی نے رائفل کے وزنی دستے سے میرے سر کے عقب میں ایک طوفانی ضرب لگائی تھی۔ یہ ایسی بھیاں ضرب تھی کہ اپنے اندر غیر معمولی برداشت

رکھنے کے باوجود میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ دوسری ضرب میرے سر پر کنپٹی کی طرف لگی۔ میں اوندھے منہ گرا۔ کوئی نصف درجن الپکار مجھ پر چٹ گئے۔ مجھے لگا میرا سینہ اور چہرہ سرد کچھڑ میں لتھڑے گئے ہیں۔ وہ لوگ چلا رہے تھے اور میرے بازو پشت کی طرف موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید ہتھکڑی پہنانا چاہتے تھے۔ ضبط کی ایک حد ہوتی ہے اور میرے اندر یہ حد ختم ہو رہی تھی۔ میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔

”شاہ زیب! ایک بار تمہیں ہتھکڑی لگ گئی تو پھر شاید کبھی کھل نہ سکے گی۔ یہ لوگ تمہیں بھی کسی ہیرا نجھایا سوہنی مہینوال والی لوکیشن پر لے جا کر پولیس مقابلے کا شکار بنا دیں گے۔“

دل کے اندر سے ہی دوسری آواز آئی۔ ”لیکن

تمہارے وعدے شاہ زیب، تمہارے ارادے، تمہارا عہد نامہ کہ تم کبھی اپنے ماضی کی طرف نہیں پلٹو گے۔ کبھی اس خونریزی کی طرف نہیں جاؤ گے جس نے تمہارے شب و روز کو بھورنگ کیا تھا۔“

پہلی آواز نے دوبارہ کہا۔ ”لیکن وہ سب کچھ تو زندگی سے مشروط تھا اور یہاں تو شاید زندگی ہی ختم ہونے والی ہے۔“

اور پھر یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے فائر کی تصویر ابھری۔ اس نے مایوں کا زرد جوڑا پہنا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر شکنوں کی مہندی تھی۔ وہ اپنی معصوم آنکھوں میں حسین سپنے سجائے چچا کی حویلی میں کسی خوش رنگ تلی کی طرح چکرار ہی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے اس تلی کے پر ہی نہیں اس کا کوئل جسم بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا... طیش کی ایک فلک بوس لہر میرے اندر سے اٹھی اور ضبط کے بندھن میں ان گنت دراڑیں پڑ گئیں۔ میں نے سرد کچھڑ میں اوندھے پڑے پڑے گرانڈیل قیصر چودھری کی طرف دیکھا۔ وہ خود پر ٹوٹنے والی آفت سے بے خبر تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا، آج کی رات، اس تاریک کھلی میں اس کا سامنا کس شخص سے ہونے والا ہے۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا۔

**خونریزی اور بربریت کے خلاف**

**صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ**

**باقی واقعات آئندہ پڑھیے**



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



# سراغ

تنویر ریاض

کبھی کبھی وہ حرکتیں وبالِ جان بن جاتی ہیں... جن کے کرنے سے کسی دوسرے کو خاص فرق نہ پڑتا ہو... لیکن ایسا سوچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں... وہ خوش حال تھی... کامیاب سیاست دان اور سوشل ورکر تھی... مگر ایک مشکل تھی... جو اس کی جان کی دشمن تھی...

مغرب کے ماحول اور مزاج میں کسی ناقابلِ برداشت وبائی و غذائی قابض...

ورکس نامی یہ ریسٹورنٹ عام طور پر اتوار کے روز بند ہوتا تھا لیکن دسبر کی اس پنج بستی شام میں اس کا میز مائن فلور مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور عملے کے تمام افراد ایک پُر تکلف ضیافت کی تیاری میں مصروف تھے جو لولائیبرک کے اعزاز میں دی جا رہی تھی۔ وہ حال ہی میں سٹی کیشن کی نشست پر دوبارہ منتخب ہوئی تھی اور اس ضیافت کا اہتمام ریسٹوران کے سب سے زیادہ تجربہ کار اور ماہر شیف پارکرزیڈ کے سپرد تھا جو سر پر ہیڈ فون لگائے، مائیکرو

# پاک سوسائٹی



PAKSOCIETY.COM

جاسوسی ڈائجسٹ 55 جولائی 2015ء



فون کے ذریعے کچن اسٹاف کو ہدایات دے رہا تھا۔ مسز لیبرک کا شمار ان سیاست دانوں میں ہوتا تھا جو کئی محفلوں میں تنقید اور مذاق کا نشانہ بننے کے باوجود ہمیشہ بھاری اکثریت سے انتخابات میں کامیابی حاصل کر لیا کرتے تھے۔ وہ جب بھی کسی عوامی اجتماع میں شرکت کرتی تو اپنی فصیح و بلیغ تقریروں کے ذریعے ناقدین کا منہ بند کر دیتی اور دلیلوں سے ثابت کرتی کہ اس پر لگائے گئے الزامات جھوٹے اور بے وزن ہیں۔

لیکن مقامی لوگ جو باقاعدگی سے اخبار پڑھتے اور سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے، انہیں معلوم تھا کہ مسز لیبرک کا انتخاب سیاسی فریب دہی کی ایک اور مثال ہے۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ جس گروپ نے اس ضیافت کا اہتمام کیا ہے وہ موقع پرست تاجروں اور سرمایہ کاروں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے یہ قدم صرف اس لیے اٹھایا ہے تاکہ اس سخت گیر عورت کی حمایت حاصل کی جاسکے۔ مہمانوں میں شہر کی سرکردہ شخصیات شامل تھیں جن میں سٹی منیجر، سٹی کمیشن کے چیف اراکین، بورڈ آف ایجوکیشن کا چیئرمین اور بزنس گروپ کے تین اراکین خاص طور پر قابل ذکر تھے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز آمدی ڈی بومن کی تھی جسے اس ضیافت میں مدعو کیا گیا بلکہ اسے مسز لیبرک کے بالکل برابر میں بائیں جانب نشست دی گئی۔ وہ یونیورسٹی میں پوٹیکل سائنس کا پروفیسر تھا جسے حالیہ انتخابات میں مسز لیبرک نے شکست دی تھی۔ اس کے بالقابل مسز لیبرک کا بھتیجا ہنری بیٹھا ہوا تھا جو سٹی کمیشن میں ڈائریکٹر فنانس تھا اور مسز لیبرک کی دائیں جانب برابر میں اس کی سیکریٹری ایسٹریڈ کینس بیٹھی ہوئی تھی جس کے ساتھ وہ زر خرید غلاموں جیسا سلوک کیا کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ اس کی سیکریٹری اپنے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ اس کی اطاعت شعاری بھی کرتی رہے۔

مسز لیبرک نے اپنے کیریئر کا آغاز کاؤنٹی سوشل سروسز میں ایک سماجی رضا کار کے طور پر کیا اور اب بھی اس نے اپنا آدھا وقت اس کام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اسے شروع سے ہی اپنی چیزیں بھول جانے کی عادت تھی لہذا یہ بھی ایسٹریڈ کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ صرف پرس ہی نہیں بلکہ لیپ ٹاپ، نظر کا چشمہ، بالوں کا برش، کریڈٹ کارڈ اور کھانوں کی فہرست جن سے مسز لیبرک کو الرجی ہے، ہمیشہ اپنے ساتھ لے کر چلے۔

دائیں بائیں بیٹھے مہمانوں سے باتیں کرنے کے

ساتھ ساتھ ہنری اپنی عقابی نگاہوں سے مسز لیبرک کے سامنے رکھے ہوئے کھانوں کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ وہ مسز لیبرک کے مرحوم بھائی کا بیٹا تھا اور عرصہ دراز سے سٹی کمیشن میں ٹیکس کے ماہر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس وقت تک مسز لیبرک نے سیاست میں حصہ لینا شروع نہیں کیا تھا۔ اس مقام تک پہنچنے میں اس کی اپنی محنت و صلاحیت کا دخل تھا اور اس ترقی میں اس کی پھوپھی نے کوئی مدد نہیں کی تھی۔ اسی لیے مسز لیبرک اس کے ساتھ اپنی سیکریٹری جیسا سلوک نہیں کرتی تھی اور شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اس کی تمام جائیداد اور اثاثوں کا متوجع واحد وارث تھا۔

کھانا شروع ہو چکا تھا اور گوشت کے پارچے چبانے کے دوران مسز لیبرک اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں ایسٹریڈ اور ہنری کی جانب جملے پھینکتی رہی۔ اس کا نشانہ دراصل بائیں جانب بیٹھا ہوا سیاسی حریف تھا جس نے مسز لیبرک کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور خاموشی کے ساتھ اپنی پلیٹ سے کھیلتا رہا۔ شیف پارکر ریڈ کو بھی آخری آرڈر دیے ہوئے کئی منٹ گزر چکے تھے۔ بیشتر مہمان کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور پیروں نے ان کے سامنے سے خالی برتن اٹھانا شروع کر دیے تھے۔

کھانے کے بعد تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مہمانوں نے اپنی کرسیاں کھسکا کر آرام دہ پوزیشن اختیار کر لی تاکہ سکون سے تقاریر سن سکیں۔ میز کے ایک کونے پر بیٹھے ہوئے ویڈیو کیمرامین اور رپورٹر نے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کیمرے اور نوٹ بک سنبھال لی اور کارروائی ریکارڈ کرنے کے لیے مستعد ہو گئے۔

یہ ہنری ہی تھا جس نے سب سے پہلے نوٹ کیا کہ اس کی پھوپھی کسی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش بگڑنے لگے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ لیا۔ اس کے حلق سے کسی جانور جیسی غراہٹ نکل رہی تھی۔ وہ ایسی آوازیں نکال رہی تھی جس سے لگتا تھا کہ اسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ اسی اثنا میں دوسرے لوگوں کی توجہ بھی اس جانب مبذول ہو گئی۔ ہنری پہلے ہی اپنے سیل فون سے نوگیارہ کوفون کر چکا تھا۔

چند ہی لمحوں میں ریستوران کا میز ناٹن فلور بد نظمی اور افراتفری کا منظر پیش کرنے لگا۔ سبھی مہمان یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ مسز لیبرک کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا بڑی مشکل سے کچھ لوگوں نے راستہ بنایا اور اسے فرش پر لٹا کر اس کی سانس کی نالی سے غذا نکالنے کی کوشش کرنے



ہوئے کہا۔ ”یہ ڈاکٹر ہرمن بولڈیک کون ہے؟“  
”چلفونٹ اسپتال کا پیتھالوجسٹ۔“

”کیا ان دنوں وہ موت کا سبب دریافت کرنے والے ڈاکٹر کے طور پر کام کر رہا ہے؟“

”نہیں ویسے تو یہ کام میڈیکل آفیسر ہی کا ہے لیکن حال ہی میں اس کی آنکھ کا آپریشن ہوا ہے۔ اس لیے یہ ڈتے داری ڈاکٹر ہرمن کو سوئپ دی گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مرنے والی کو کئی چیزوں سے الرجی تھی۔“

”کیا مونگ پھلی کے علاوہ اور بھی ایسی اشیا ہیں؟“

”ہاں اور ان اشیا کی فہرست مرنے والی کی سیکریٹری مس کینس نے اسپتال والوں کو دی ہے اور ضیافت سے ایک روز قبل وہ یہ فہرست ریسٹوران کی انتظامیہ کو بھی دے چکی تھی۔“

اس فائل میں بھی اس فہرست کی نقل موجود تھی۔ ڈونلڈ

نے اسے دیکھنے کے بعد کہا۔ ”مسز لیبرک کو سویا بین سے بھی الرجی تھی جبکہ آج کل اس کا استعمال عام ہے۔“

”ممکن ہے لیکن ریسٹوران والے اپنے اشتہار میں خاص طور پر واضح کرتے ہیں کہ وہ اپنے کھانوں میں مونگ پھلی یا سویا بین کا تیل استعمال نہیں کرتے۔“

”کیا اس ضیافت میں شریک کوئی اور شخص بھی بیمار ہوا؟“ ڈونلڈ نے پوچھا۔

”بظاہر تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ اس فائل

میں ان چوبیس مہمانوں کی فہرست موجود ہے جو اس ضیافت میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مرنے والی نے جو کچھ کھایا پیا، اس کی تفصیل تمہیں اس فائل میں مل جائے گی۔ محکمہ صحت نے سوموار کی سہ پہر سے کارروائی شروع کی۔

اس وقت تک ضیافت میں استعمال ہونے والے تمام برتن دھوئے جا چکے تھے اور بچا ہوا کھانا بھی کوڑے میں پھینک دیا گیا۔ انہوں نے اس کے کچھ نمونے حاصل کر لیے ہیں تاہم مونگ پھلی یا سویا بین کا استعمال ان کے قواعد کی خلاف ورزی نہیں ہے۔“

ڈونلڈ نے اس مرتبہ غور سے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ

پڑھی اور بولا۔ ”اس بات کے کیا امکانات ہیں کہ یہ مونگ پھلی یا سویا بین سے الرجی کے بجائے زہر دینے کا کیس ہے؟“

”ہمارے پاس اس بارے میں بہت کم معلومات

ہیں اور ڈاکٹر نے اس موت کا سبب الرجی قرار دیا ہے۔

یہاں تک کہ اس نے خون یا معدے میں موجود اجزاء کے

لگے تاکہ اسے ہوش میں لایا جاسکے۔ اسی وقت سیکریٹری ایسٹرڈ نے چلاتے ہوئے کہا کہ اس کی مالکن کو کھانے میں کوئی ایسی چیز دی گئی ہے جس سے اسے الرجی ہے۔ ٹی وی کیمرامین نے فوراً ہی یہ منظر اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیا جبکہ اس کے ساتھی نیوز رپورٹر نے درجنوں تصاویر بنالیں۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں فوری طبی امداد دینے والا عملہ پہنچ گیا۔ انہوں نے مسز لیبرک کو آکسیجن لگائی اور ایسولینس میں منتقل کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد دوسرے مہمان ادنیٰ آواز میں اس واقعے پر تبصرہ کرنے لگے۔

میزبان گروپ کے صدر کو افسوس تھا کہ وہ اس اہم موقع پر تقریر کرنے سے محروم ہو گیا۔ اب اس کی نظریں شفاف پلاسٹک باکس میں رکھے ہوئے اس ایوارڈ پر جمی ہوئی تھیں جو مسز لیبرک کو پیش کیا جانا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ عورت زندہ نہ ہوتی تو اس ایوارڈ پر کسی دوسری شخصیت کا نام

کندہ کروانا پڑے گا۔ [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

کاؤنٹی چیف سراغ رساں تک اسٹیمپی کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا جب فرٹ ڈونلڈ اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس نے وردی کے بجائے ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ اسٹیمپی نے اسے غور سے دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم اس لیے بھی سراغ رساں سارجنٹ بننا چاہتے ہو تاکہ اس وردی سے نجات مل جائے لیکن وہ منزل ابھی دور ہے۔“

”میں جم جا رہا تھا جب مجھے تمہارا فون ملا۔“ فرٹ نے صفائی پیش کی۔

”میں نے تمہیں اس کیس کے سلسلے میں بلایا ہے اور میرے خیال میں یہ ممکنہ طور پر قتل کا کیس ہے۔“

”کیا میں مرنے والے کا نام جان سکتا ہوں؟“

”سٹی کمشنر مسز لیبرک۔“

”میرا خیال ہے کہ اس کی موت کوئی ایسی چیز کھانے

سے ہوئی جس سے اسے الرجی تھی۔“

”پوسٹ مارٹم رپورٹ یہی بتاتی ہے لیکن ریسٹوران

کے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے کھانوں میں مونگ پھلی یا اس

سے بنی ہوئی کوئی چیز استعمال نہیں کرتے۔ ان بیانات کی

روشنی میں قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مسز لیبرک کی موت ایک

حادثہ نہیں ہے۔“

اسٹیمپی نے اسے ایک فائل پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”اس

میں تمام رپورٹیں موجود ہیں۔ تم انہیں ایک نظر دیکھ لو۔“

ڈونلڈ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پر سرسری نگاہ ڈالتے



نمونے بھی نہیں لیے۔“

ڈونلڈ نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے پاس اس کے علاوہ کیا معلومات ہیں؟“

”مسز لیبرک کی عمر چون سال، غیر شادی شدہ اور تنہا رہتی تھی۔ اسے باپ سے ورثے میں بے پناہ دولت اور جائیداد ملی جو پراپرٹی کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کے رشتے داروں میں واحد زندہ فرد اس کا بھتیجا ہنری ہے جو ان دنوں سٹی فنانس ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہا ہے۔ وہ بھی اس ضیافت میں موجود تھا۔ مسز لیبرک کئی برسوں سے سماجی خدمت کے کاموں میں مصروف تھی اور حال ہی میں چوتھی بار دو سال کے لیے سٹی کمیشن کی رکن منتخب ہوئی تھی۔“

”اس کے دشمنوں کے بارے میں کچھ معلومات ہیں؟“

”تم اخبار تو ضرور پڑھتے ہو گے۔ ایسے لوگوں کے سیاسی حریف ہو سکتے ہیں اور ذاتی دشمنی کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں موجود تینس مہمانوں اور ریسٹوران کے عملے کے نو افراد میں سے کوئی بھی اس کے کھانے میں زہر ملا سکتا ہے۔“

جم جانے کے بجائے ڈونلڈ سٹرکٹ ہیڈ کوارٹر چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر اس نے ایک بار پھر فائل کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ ایک کاغذ پر ان کھانوں کی تفصیل درج تھی جو مسز لیبرک کو دیے گئے تھے۔ ان میں فروٹ کپ، سوپ، بھنی ہوئی چائے، تلی ہوئے مٹر، گوشت کا شوربا، ٹھنڈا پانی اور کافی شامل تھی۔ ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے والا عملہ پہنچا تو اس وقت مسز لیبرک کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ اور ناخن نیلے ہو چکے تھے۔ چہرہ سوج گیا تھا اور گردن پر سرخ دھبے نظر آ رہے تھے۔ جب انہیں مس کینس اور ہنری نے الرجی کے بارے میں بتایا تو انہوں نے فوری طور پر مریضہ کو آکسیجن لگائی اور دوران خون بحال رکھنے کا انجکشن بھی دے دیا۔

اسپتال پہنچنے تک وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ دوسرا انجکشن لگاتے ہی اس کا بلڈ پریشر غیر معمولی طور پر بڑھ گیا اور سانس بند ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے دل کا شدید دورہ پڑا۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکی اور ٹونج کر چوبیس منٹ پر اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے بعد ڈونلڈ نے انٹرنیٹ پر فوڈ الرجی کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور اس ریسٹوران کی جانب روانہ ہو گیا جہاں اس ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

وہاں اس وقت کافی کا دور چل رہا تھا اور دوپہر کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ شیف پارکر زیڈ بھی اس وقت اپنے سفید کوٹ کے بٹن بند کر رہا تھا جب ڈونلڈ اس کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک معمول کی کارروائی ہے۔ اتوار کی شام یہاں جو واقعہ پیش آیا، میں اس کی تفصیل جانتا چاہتا ہوں۔“

”میں تیار ہوں آفیسر۔“ زیڈ نے کہا۔ ”اخبارات میں کچھ غلط تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ اس لیے ہم کسی بھی با مقصد کارروائی کا خیر مقدم کریں گے۔“

اس نے مانیٹر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”محکمہ صحت کے انسپکٹروں نے یہاں کا معائنہ کرنے کے بعد یہ اطمینان کر لیا ہے کہ مرنے والی کو کھانے میں مونگ پھلی یا سویا بین سے بنی ہوئی کوئی چیز نہیں دی گئی تھی لیکن اس کی فہرست میں کچھ دوسری چیزیں بھی شامل تھیں جیسے چاکلیٹ اور کوکوٹ۔“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی سیکریٹری نے ضیافت سے ایک روز قبل ریسٹوران کے کسی فرد کو ان اشیاء کی فہرست فراہم کر دی تھی جن سے مسز لیبرک کو الرجی تھی۔“

پارکر زیڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، یہ فہرست ولڈا کو دی گئی تھی جو مستند غذائی ماہر ہے۔ دراصل میں اور وہ مل کر ہی یہ ریسٹوران چلا رہے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ان لوگوں کو صحت بخش کھانے فراہم کریں۔“ یہ کہہ کر اس نے میز پر سے مینیو اٹھا کر ڈونلڈ کو دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری طرف سے تمہارے لیے ہے۔“

”گزشتہ اتوار کو تم کہاں تھے؟“ ڈونلڈ نے پوچھا۔

”میں اسی جگہ موجود تھا جبکہ ضیافت کا اہتمام میز ناٹن فلور پر کیا گیا۔ مجھے تو طبی امداد کے عملے کے آنے پر معلوم ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ البتہ ولڈا وہاں سرور کر رہی تھی اور اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔“ یہ کہہ کر اس نے مائیکروفون کے ذریعے ولڈا کو بھی وہاں بلا لیا۔ وہ درمیانی عمر کی عورت تھی۔ جب اسے ڈونلڈ کی آمد کا مقصد معلوم ہوا تو وہ اسے کچن کے راستے اپنے دفتر میں لے گئی اور اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہم زیادہ تر کھانے خود ہی تیار کرتے ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی مونگ پھلی یا سویا بین کا استعمال نہیں ہوتا۔ دوسرے کھانوں کے مقابلے میں مونگ پھلی سے الرجی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمارے



”مجھے تم سے گزشتہ اتوار پیش آنے والے واقعے کے بارے میں کچھ سوالات کرنا ہیں۔“

”پوچھو۔“ اس نے شائستگی سے کہا۔ ڈونلر کے سوالوں کے جواب میں اس نے تصدیق کر دی کہ اس ضیافت میں تمام چیزیں اسی نے سرو کی تھیں۔ ”ولڈا صرف جوس، کافی، چائے اور سوپ وغیرہ رکھ رہی تھی جو سب مہمانوں کے لیے ایک جیسے تھے جبکہ وہ ہر نشست سے ملنے والے آرڈر کے مطابق چیزیں پیش کر رہی تھی جب یہ چیزیں کچن سے تیار ہو کر آتیں تو ان پلیٹوں کو ڈھک دیا جاتا تھا جس پر آرڈر دینے والے کی نشست کا نمبر پڑا ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں کھانا سرو کرنے سے پہلے ایک مرتبہ اور چیک کرتی تھی۔ اگر تم چاہو تو میں دکھا سکتی ہوں کہ ہمارے یہاں کس طرح کام ہوتا ہے۔“

ڈونلر اس کے ساتھ میز تائن فلور پر چلا گیا اور جب بلیز نے اسے سسٹم کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو اسے یقین آ گیا کہ پارٹی میں شریک کسی مہمان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کچن یا پیٹری تک رسائی حاصل کرے اور مسز لیبرک کی پلیٹ کا ڈھکنا اٹھا کر اس کے کھانے میں کوئی زہریلی چیز ملا دے۔ اس نے بلیز کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ ولڈا کے دفتر چلا گیا تاکہ ان ملازمین کی فہرست حاصل کر سکے جو اتوار کی شب ڈیوٹی پر تھے۔ اس نے ایک بار پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ تحقیقات محض ایک معمول کی کارروائی ہے لیکن اس مرتبہ ولڈا کی پیشانی پر بل آگئے اور اس کی بھویں تن گئیں تاہم ڈونلر نے اس سے وہ فہرست حاصل کر لی۔

سراغ رساں لیفٹیننٹ سائرس او برن عدالت کے کورٹ روم میں اپنے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنے سیل فون پر سارجنٹ ڈونلر کا پیغام موصول ہوا جو کسی کیس کے سلسلے میں اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ او برن نے جوابی پیغام کے ذریعے اسے مطلع کیا کہ وہ تین بجے کے بعد اس کے دفتر آ سکتا ہے۔ جب ڈونلر اس سے ملنے آیا تو اس کے ہاتھ میں وہ فائل بھی تھی جو اسے انسپری نے دی تھی۔ او برن نے فائل کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد کہا۔

”گویا یہ یقینی نہیں ہے کہ اس کی موت فوڈ الریجی کی وجہ سے ہوئی۔“

”نہیں، لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ یہی کہتی ہے۔“

”تم فوڈ الریجی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”میں نے جو کچھ انٹرنیٹ سے معلوم کیا، اس کے

یہاں اس کا استعمال بالکل نہیں ہوتا۔ اس لیے میں کہہ سکتی ہوں کہ مسز لیبرک کی موت کی وجہ مونگ پھلی سے ہونے والی الریجی نہیں ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ وہ اپنے ساتھ ایسی کوئی چیز لائی ہو۔“

”اناس کے بارے میں کیا کہو گی؟ اسے جو پھلوں کا پیالہ دیا گیا اس میں اناس تھا؟“

”بالکل نہیں، ہمارے فروٹ کپ میں بغیر پیچوں کے سرخ اور سفید انگور، سیب کے چوکور ٹکڑے، چھوٹی نارنگی، کٹے ہوئے آڑو اور ناشپاتی وغیرہ ہوتی ہیں۔ اناس، خربوزہ یا کوئی ایسا پھل مہمانوں کو پیش نہیں کیا جاتا جس سے الریجی کا خطرہ ہو۔“

”مجھے معلوم ہوا کہ تم اس رات سرو کر رہی تھیں؟“

”میں بلیز کی مدد کر رہی تھی۔ وہ کھانا لگا رہی تھی جبکہ میں پانی، کافی، چائے اور دودھ میزوں پر رکھ رہی تھی۔“

”کیا تم دونوں ہی سروں کر رہی تھیں؟“

”ہاں، میں نے ہی بلیز کی ڈیوٹی لگائی تھی کیونکہ وہ مجھ سے بہتر یہ کام کر سکتی ہے اور ویسے بھی اسے اس کا معاوضہ ملتا ہے۔“

”کیا اس ضیافت میں شراب بھی پیش کی گئی تھی؟“

”نہیں، ہمارے پاس اس کا لائسنس نہیں ہے۔“

”کیا یہ ممکن ہے کہ کھانے کی ڈشیں تبدیل ہو گئی ہوں؟“ ڈونلر نے پوچھا۔

”ہم انسان ہیں اور غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے لیکن میں نہیں سمجھتی کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ کیونکہ کچن کو سیٹ نمبر کے مطابق آرڈر دیا جاتا ہے اور اس کی نشست کا نمبر سات تھا۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے کھانے میں کچھ ملا دیا ہو؟“

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر کوئی ایسی چیز اس کے کھانے میں ڈال دی جس سے اسے الریجی ہو سکتی ہے۔ یہ اسی وقت ہوا ہو گا جب کھانا میز پر لگ گیا ہو کیونکہ کوئی بھی مہمان اوپر نہیں جاسکتا۔ کیا تم ہمارے عملے پر شک کر رہے ہو؟“

”بالکل نہیں۔ کیا بلیز آج کام پر آئی ہے؟“ ڈونلر نے پوچھا۔

”ہاں، وہ ڈش روم میں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے بلیز کو اپنے دفتر میں بلایا اور خود باہر چلی گئی۔ ڈونلر نے اپنے لہجے میں نری پیدا کرتے ہوئے کہا۔



”کیا ہو۔“

ہیڈ کوارٹر واپس آتے ہوئے اوبرن راستے میں ورکس ریسٹوران پر ڈنر کے ارادے سے رک گیا جو اس وقت تک تین چوتھائی بھر چکا تھا۔ ان میں زیادہ تر وہ عورتیں تھیں جو کرسس کی خریداری کرنے کے بعد وہاں کچھ دیر سستانے اور کھانا کھانے کی غرض سے آئی تھیں۔ البتہ میز مائن فلور اس وقت بند تھا۔ اوبرن اس سے پہلے بھی چند مرتبہ یہاں کھانا کھا چکا تھا لیکن یہ جگہ اس کے مزاج کے مطابق نہ تھی۔ ہمیشہ کی طرح شیف پارکر زیڈ روٹرم پر کھڑا مائیک کے ذریعے کچن کے عملے کو ہدایات دے رہا تھا۔

اوبرن کو یہ تو معلوم نہیں تھا کہ اسے کن چیزوں سے الرجی ہے لیکن اس کا معدہ مصالحوں دار اور چھٹی اشیا قبول نہیں کرتا تھا لہذا اس نے احتیاطاً اپنے لیے سینڈویچ، سلاد اور پھنے ہوئے گوشت کا آرڈر دیا اور چند منٹوں میں ہی یہ چیزیں اس کی میز پر پہنچ گئیں لیکن اسے محسوس ہوا کہ پارکر زیڈ نے اس آرڈر کے بارے میں ہدایات جاری کرتے ہوئے ایسا انداز اختیار کیا جس میں تنبیہ کا شائبہ جھلکتا تھا۔ اوبرن سمجھ گیا کہ شیف اسے پہچان گیا ہے اور اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنے عملے کو یہ کہہ کر چوکنا کر دیا ہے کہ مرعیوں کے ڈبے میں ایک لومڑی آگئی ہے۔

پارکر زیڈ نے بعد میں اس کا اعتراف کر لیا اور کہا۔ ”عام طور پر اس طرح کی وارننگ اس وقت جاری کی جاتی ہے جب صحافی اور سراغ رساں یہاں آئیں۔ گوکہ ہم سب انہیں دور سے ہی پہچان لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے عام آدمیوں جیسا لباس پہن رکھا ہوتا ہے اور انہی جیسی حرکتیں بھی کرتے ہیں جبکہ اس ریسٹوران میں عام آدمی کا بھی گزر نہیں ہوتا۔“

”اس وضاحت کے لیے میں تمہارا مشکور ہوں۔“ اوبرن نے کہا۔

”جیسا کہ میں آج صبح تمہارے ساتھی کو بھی بتا چکا ہوں کہ اگر اس عورت نے مونگ پھلی یا سویا بین سے بنی کوئی چیز کھائی تھی تو وہ اسے اپنے ساتھ لائی یا اس کے کسی ساتھی نے دی ہوگی۔“

”کیا میں اوپر جا کر ایک جائزہ لے سکتا ہوں؟“ اوبرن نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“ پارکر زیڈ نے کہا اور ایک ویٹر کو اس کے ہمراہ کر دیا جس نے اوبرن کو اوپر لے جا کر وہاں کے سسٹم کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔

مطابق مونگ پھلی کی وجہ سے آدمی سے زیادہ مہلک کیسز میں فوڈ الرجی ہوتی ہے اور ایک حساس شخص دس منٹ سے بھی کم وقت میں مر جاتا ہے۔“

وہ دونوں کافی دیر تک یہ بحث کرتے رہے کہ ڈونلڈ نے ریسٹوران کے عملے سے جو پوچھ گچھ کی تھی، اس کی مزید چھان بین کی جائے یا نہیں۔ اس مرحلے پر مسز لیبرک کی موت ایک جرم سے زیادہ حادثہ معلوم ہو رہی تھی پھر وہ دونوں اس پر متفق ہو گئے کہ اس چھان بین کو فی الحال مرنے والی کے پس منظر تک محدود رکھا جائے۔ اسٹیجی کی دی ہوئی فائل دیکھنے کے دوران اوبرن کے سامنے ڈیرل مجیم کا نام بھی آیا جو محکمہ صحت میں انسپکٹر تھا اور اس نے ضیافت کے اگلے روز ریسٹوران کا دورہ کیا تھا۔ بیس سال پہلے اوبرن نے مجیم کی جڑواں بہنوں کو را اور زورا کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی اور اوبرن کو یقین تھا کہ اس حوالے سے وہ مجیم سے فون یا ای میل کے ذریعے ہی مفید معلومات حاصل کر سکتا ہے لیکن اوبرن نے اس سے ذاتی طور پر ملاقات کرنا مناسب سمجھا اور ٹیلی فون پر تصدیق کرنے کے بعد کہ وہ دفتر میں موجود ہے اور برن اس سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

ڈیرل مجیم کو معلوم تھا کہ اوبرن کس سلسلے میں اس سے ملنے آرہا ہے لہذا وہ پہلے سے ہی ریسٹوران کی فائل کھولے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس نے اوبرن کو دیکھتے ہی کہا۔ ”تم نے ان کا مینیو دیکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ غذا اور علم غذا سے متعلق کسی درسی کتاب کے دو صفحات ہیں۔ اس کے باوجود خلاف ورزیاں عام ہیں۔ مثلاً فریج میں رکھے ہوئے ایلو مینم فوائل میں سے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس طرح ان فوائل میں ہوا کا گزر نہیں ہوتا اور ان میں رکھی ہوئی چیزیں خراب ہو جاتی ہیں۔ کچرے کے ڈھیر کے پاس کا کرویج بھی نظر آئے لیکن اس کے باوجود میں نہیں سمجھتا کہ اس موت کا ہمارے محکمے سے کیا تعلق ہے؟“

”شاید ایسا کچھ نہ ہو لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اشارہ دیا گیا ہے کہ یہ ایک قتل بھی ہو سکتا ہے۔“

”قتل!“ مجیم نے چونکتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ کسی شخص نے اس کے کھانے میں زہر ملا یا ہوگا تو وقت گزرنے کے ساتھ اس کا ثبوت بھی ضائع ہو گیا اور یہ سچ بھی ہو سکتا ہے، اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر اسے کوئی ایسی چیز دی ہو جس سے وہ الرجک تھی لیکن میں نے بعد کے روز معائنے کے دوران وہاں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس میں سویا بین یا مونگ پھلی کا تیل استعمال کیا

جاسوسی ڈائجسٹ



سوانح  
کہہ سکتا ہوں کہ ایسی درجنوں تصویریں بھی شائع نہیں ہوں  
گی جو آؤٹ آف فوکس اور غلط زاویوں سے لی گئی ہوں  
گی۔“

یہ کہہ کر اس نے اخبار کے دفتر فون کر کے قائل روم  
میں جانسن سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ اوبرن کا  
بے تکلف دوست تھا جس کا اندازہ ان دونوں کی ابتدائی  
گفتگو سے ہو گیا۔ جانسن نے وعدہ کیا کہ وہ اس ضیافت میں  
لی جانے والی تمام تصویریں اسے ای میل کر دے گا۔ اسی  
طرح ٹی وی اسٹیشن والے بھی اس پر متفق ہو گئے کہ وہ چار  
بجے تک تمام فوٹیج بھیج دیں گے۔

اوبرن نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی اور جھلاتے  
ہوئے بولا۔ ”ہم ابھی تک ایک ایچ آگے نہیں بڑھ سکے۔  
ہمیں ان لوگوں سے بات کرنا ہوگی جو اس پارٹی میں موجود  
تھے۔“

”ان میں سے ایک یعنی مسز لیبرک کا انتقال ہو چکا  
ہے۔“ ڈونلڈ نے اسے یاد دلایا۔ ”ریستوران کے عملے سے  
میں بات کر چکا ہوں، اب باقی تین مہمان رہ جاتے ہیں  
جن پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔“

اوبرن نے نشستوں کی ترتیب والے چارٹ پر نظر

قتل کے محرکات کا جائزہ لینے کے لیے ضروری تھا کہ  
مسز لیبرک کے پس منظر کو کھنگالا جائے۔ چنانچہ اوبرن اور  
ڈونلڈ اسی کام پر لگ گئے۔ جو کچھ انہیں معلوم ہوا، اس کے  
مطابق مسز لیبرک کا ماضی بے داغ تھا اور اس کے خلاف  
کبھی کسی سنگین جرم کا الزام عائد نہیں کیا گیا اور نہ ہی وہ کسی  
بینک یا ادارے کی مقروض تھی۔ وہ ایک عوامی عہدے پر  
فائز تھی اور اس نے مالی امور میں کبھی کوئی بے قاعدگی نہیں  
کی۔ کئی اخباری مضامین میں اس کے سیاسی کیریئر کے  
نشیب و فراز، سخت گیری، انا پرستی اور ہٹ دھرمی کا حوالہ تو  
ضرور دیا گیا لیکن کسی ذاتی دشمنی یا مخالفت کا کوئی ذکر نہیں  
تھا۔

مسز لیبرک کو اس کے مرنے کے بعد ٹی وی اور  
اخبارات نے نمایاں کوریج دی۔ مسلسل تین روز سے ٹیلی  
وژن کی خبروں میں اس واقعے کی فوٹیج چلائی جا رہی تھی۔  
اخبارات میں بھی اس سے متعلق تصاویر شائع ہو رہی تھیں۔  
اوبرن اپنی میز پر صبح کا اخبار پھیلائے بیٹھا تھا جس میں  
پورے صفحے پر اس واقعے کی تصاویر شائع ہو رہی تھیں۔ اس  
نے دو تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈونلڈ سے  
کہا۔ ”یہ لوگ بار بار انہیں دہرا رہے ہیں لیکن میں یقین سے

جولائی 2015ء کی جولانیاں

خواب صورت کہانیوں کا مجموعہ

سسر ڈائجسٹ



مزید

خطوط کی محفل

محفل شعر و سخن اور

مرزا محمد بیگ کا پر جوش انداز

رات کا مسافر

ساحل سے پیاسے لوٹنے والے ایک مسافر کی لمبی مسافت کا احوال.....  
طاہر جاوید مغل کے قلم سے آخری صفحات پر سوغات

سرشت آدم

ابتدائی صفحات پر العیاس سیتاپوری کے قلم سے ایک اور حقیقت کا احوال.....  
جب ہادی اور ہارون کے درمیان بادشاہت کے احساس نے دوریاں پیدا کر دی تھیں

سودائے جنوں

بغداد توں کا سر کھلنے والے سرفردشوں کی دلیری اور دانشمندی کا امتحان.....  
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے خیالات کی پرواز

ماروی

روحی ہوئی محبوبہ اور پر جوش دلربا کے درمیان الجھے ہوئے مراد کی  
بے بسی کا احوال..... محی الدین نواب کے قلم کا جادو

منظر امار: ڈاکٹر شیر شاہ سید، کاشف ذہیر،  
تنویر ریاض اور فادوق انجم کی دلچسپ تحریریں آپ کی منتظر

اس کے علاوہ

جاسوسی ڈائجسٹ 61 جولائی 2015ء



ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں ان لوگوں سے شروع کرنا چاہیے جو مسز لیبرک کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ دائیں جانب اس کا بھتیجا ہنری لیبرک تھا جو فنانس ڈائریکٹر ہے۔ پہلے اسی سے ملتے ہیں۔“

ہنری کا دفتر سٹی کمیشن کی عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ وہ ان دونوں کو ایک پرائیویٹ روم میں لے گیا اور انہیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم دونوں یہاں کیوں آئے ہو۔ میں نے ہی سب سے پہلے ڈاکٹر کے سامنے شبہ ظاہر کیا تھا کہ میری پھوپھی کی موت کوئی حادثہ نہیں ہے۔“

”کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟“ اوبرن نے پوچھا۔  
 ”نہیں لیکن لگتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا تھا۔ اس پارٹی میں میری پھوپھی مرکز نگاہ تھی اور شہر کے بڑے بڑے لوگ بشمول ان کے حریف بھی اس پارٹی میں موجود تھے لیکن کھانے کے بعد جو ردِ عمل ہوا، وہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ویسے بھی وہ کھانے میں بڑی احتیاط کرتی تھی کیونکہ ہمارے خاندان میں سبھی لوگوں کو فوڈ الرجی ہے۔ میرے والد کو یہ مرض لاحق تھا اور میں بھی مونگ پھلی یا انٹاس سے بنی ہوئی چیز نہیں کھا سکتا۔“

”کیا تم نے اس ردِ عمل سے پہلے یا بعد میں کوئی غیر معمولی چیز دیکھی؟“

”نہیں، جیسے ہی پھوپھی کو دم گھٹنے کا احساس ہوا تو میں نے فوراً ہی نو گیارہ کوفون کر کے اس واقعے کے بارے میں بتایا اور خود نیچے چلا گیا تاکہ طبی عملے کو اپنے ساتھ لاسکوں۔ اس وقت تک ریستوران عام لوگوں کے لیے بند ہو گیا تھا۔“  
 ”تم نے حریفوں کا ذکر کیا، یہ سیاسی ہیں یا ذاتی؟“  
 ڈونلڈ نے کہا۔

”یہ میں نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی کسی ایسے مقامی شخص کو جانتا ہوں جس کے پاس اس قتل کا کوئی محرک ہو۔“  
 ”اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو۔ کسی کے ساتھ ذاتی نوعیت کا تعلق یا حالیہ عرصے میں کوئی علیحدگی؟“

”اگر ایسی کوئی بات ہوگی تو وہ اس کی ذات تک محدود تھی۔ البتہ ہم خیال لوگوں سے اس کے سماجی تعلقات تھے لیکن میں نے کسی کے ساتھ اس کا سنجیدہ تعلق نہیں دیکھا۔“

ہنری سے گفتگو کرنے کے بعد یہ دونوں سراغِ رساں محلی منزل پر واقع مسز لیبرک کے دفتر میں گئے جہاں ان کی

جاسوسی ڈائجسٹ

ملاقات اس کی سیکریٹری ایسٹرڈ کینس سے ہوئی جو غم زدہ صورت بنائے ڈاک دیکھ رہی تھی۔ اوبرن نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا۔ ”اس موقع پر تمہیں زحمت دینے کے لیے معذرت خواہ ہیں تاہم یہ ایک معمول کی تحقیقات ہے اور ہمیں خوشی ہوگی اگر تم چند سوالوں کے جواب دے سکو۔“

کینس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ان کی جانب دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟

”شاید تمہارے علم میں ہو۔“ اوبرن نے کہنا شروع کیا۔ ”کچھ لوگوں کو شبہ ہے کہ اس ضیافت میں کسی نے تمہاری مالکن کو دانستہ طور پر کھانے میں کوئی ایسی چیز دے دی جو اس کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔“

”وہ میری مالکن نہیں تھی۔ میں سٹی کمیشن کے لیے کام کرتی ہوں۔“ ایسٹرڈ کینس نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس دنیا سے جا چکی ہے جبکہ میں اب بھی یہاں موجود ہوں۔“

”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جب اس کی طبیعت بگڑنا شروع ہوئی تو تم اس کے برابر والی نشست پر بیٹھی ہوئی تھیں۔“

”ہاں، یہ درست ہے۔“  
 ”کیا تم نے پہلے بھی اس کی یہ کیفیت دیکھی؟“

”صرف ایک مرتبہ جب اس نے دفتر کی ایک پارٹی میں ایسا بسکٹ کھالیا جس میں مونگ پھلی شامل تھی۔ ہم نے فوراً ہی طبی عملے کو فون کر کے بلایا لیکن ان لوگوں کے آنے تک اس کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ ویسے وہ کھانے کے معاملے میں بہت احتیاط رکھتی تھی اور اس ضیافت سے ایک روز پہلے میں نے ریستوران کی انتظامیہ کو ان اشیاء کی فہرست دے دی تھی جن سے اسے الرجی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی دراز سے ایک کاغذ نکال کر اوبرن کو پکڑا دیا۔ یہ وہی فہرست تھی جس کی نقل اسٹیمی کی بنائی ہوئی فائل میں بھی لگی ہوئی تھی۔

”کیا تم نے ضیافت کے دوران کسی شخص کو اسے کوئی چیز دیتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔ مثلاً چاکلیٹ، ٹافی، چیونگ کم، کریم، چینی یا سلا دوغیرہ؟“

”اس نے صرف بلیک کافی پی تھی جبکہ کھانے کی میز پر سلا دو کی جگہ پھلوں کا پیالہ رکھا گیا تھا۔“

”ریستوران پہنچنے سے پہلے کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔ مثلاً وہ راستے میں کچھ پینے کے لیے رک گئی ہو؟“  
 ”وہ شراب یا سگریٹ نہیں پیتی تھی۔“



لیکن اس کی سیکریٹری نے چلاتے ہوئے کہا کہ اسے الرجی ہوگئی ہے۔“

”سیاسی میدان کے باہر تم اس سے کس حد تک واقف تھے؟“

”ہماری ملاقات ضرور ہوئی تھی لیکن بات چیت کبھی نہیں ہوئی۔“

”یہ واقعہ پیش آنے سے پہلے تم نے کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی؟“ ڈونلڈ نے پوچھا۔ ”کوئی شخص اس کے قریب آیا ہو اور اس کی پلیٹ میں کوئی چیز ڈال دی ہو؟“

”نہیں، میں ویسے بھی اپنی دنیا میں رہتا ہوں اور ادھر ادھر نہیں دیکھتا اور کیونکہ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی اس لیے میں تمام وقت اپنے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ہرب کینن سے گفتگو کرتا رہا جو بزنس ایسوسی ایشن کا صدر ہے۔“

”اگر تمہارا اس سے کوئی جھگڑا نہیں تھا تو اس کے مخالفین کون ہو سکتے ہیں؟“

”ہر وہ شخص جو اس شہر کی ترقی چاہتا ہے۔“ پروفیسر نے اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہر بات کی مخالفت کیا کرتی تھی، چاہے وہ مرکز شہر کی بحالی کا پروگرام ہو یا نئے کاروبار کے لیے چھوٹ، غیر قانونی مٹی آبادیوں کو ہٹانے کی بات ہو یا سٹی چارٹر میں ترمیم کا معاملہ۔“

”کیا تم کسی ایک ایسے مخالف کا نام بتا سکتے ہو جو اسے اس عہدے سے ہٹانا چاہتا ہو؟“

”نہیں، اس کا دفاع کرنے والے بھی بہت تھے۔“ وہ دونوں پروفیسر کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لیچ کے بعد اوبرن نے ڈونلڈ کو ہیڈ کوارٹر چھوڑا تاکہ وہ ایسٹریڈ کینس، ڈاکٹر ہرمن بولڈیک اور ہنری لیبرک کے پس منظر کے بارے میں تفصیلات اکٹھی کرے اور خود وہ اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ اب اسے چیف پیٹھالوجسٹ رچرڈ ویلنٹائن سے ملنا تھا جو موتیا کے آپریشن کے بعد گھر پر آرام کر رہا تھا۔ ستر سال کی عمر میں بھی وہ ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح جاق چوبند تھا۔ اس نے اوبرن کا خوش دلی سے استقبال کرتے ہوئے اس کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

”میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“ اوبرن نے کہا۔ ”صرف تم سے مسز لیبرک کی موت کے بارے میں چند سوالات کرنا چاہتا ہوں جو فوڈ الرجی کی وجہ سے ہوئی۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے بریف کیس سے کاغذات کا ایک پلندا نکال کر ڈاکٹر ویلنٹائن کو پکڑا دیا جس میں طبی عملے

”کیا وہ باقاعدگی سے کوئی دوا لیتی تھی؟“

”میرا خیال ہے کہ نہیں، اسے ڈاکٹروں پر یقین نہیں تھا۔“

”کیا تمہارے علم میں کوئی ایسی بات ہے جو تنازع کی وجہ بن سکتی ہو۔ مثلاً حالیہ دنوں میں اسے کوئی دھمکی یا گناہ خطوط ملے ہوں۔“

”اس نے ہمیشہ ایسے تنازعات کا سامنا کیا۔ وہ فطرتاً جگجگوتھی اور عوامی نمائندہ ہونے کی وجہ سے اس پر تنقید بھی ہوتی تھی۔ میں آئے دن ایسے کئی خطوط اور ای میل دیکھا کرتی تھی جن میں اس پر شدید تنقید اور غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی تھی لیکن مجھے یاد نہیں کہ اسے کبھی کوئی دھمکی ملی ہو۔“

مسز لیبرک کی ذاتی زندگی کے حوالے سے ایسٹریڈ کا جواب بھی ہنری سے ملتا جلتا تھا۔ ”سٹی کیشن کی مصروفیات اور سماجی خدمات کے بعد اس کے پاس پارٹیوں میں جانے کا بالکل وقت نہیں تھا۔ اگر تم چاہو تو میں گزشتہ برسوں میں اس کی مصروفیت کی تفصیل بتا سکتی ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ اوبرن نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ دوسرے دن انہوں نے یونیورسٹی جانے اور مسز لیبرک کے سیاسی حریف پروفیسر ہرمن بولڈیک سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ پندرہ برس قبل جب گریجویٹیشن کر رہا تھا تو اس نے پوٹیکل سائنس میں پروفیسر ہرمن بولڈیک کی کتاب پڑھی تھی۔ اس کی اشاعت کے بعد سے ہی پروفیسر مقامی سیاست میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ابھی تک اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

گوکہ یونیورسٹی میں کرسس کی وجہ سے تعطیلات ہو گئی تھیں لیکن پروفیسر اپنے دفتر میں بیٹھا امتحانی کا پیپا چیک کر رہا تھا۔ اسے ان دونوں کی مداخلت ناگوار گزری لیکن ایک سابق شاگرد ہونے کے ناتے اس نے اوبرن کو برداشت کر لیا۔

”مجھے تمہارے آنے کی توقع تھی۔“ پروفیسر نے کہا۔

”کیا تم واقعی اس واقعے کو قتل سمجھ کر تحقیقات کر رہے ہو؟“

”فی الحال ہم صرف معلومات اکٹھی کر رہے ہیں۔“ اوبرن نے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جب مسز لیبرک کی طبیعت بگڑی تو تم وہاں موجود تھے؟“

”ہاں، میں اس کے بالکل قریب بیٹھا ہوا تھا۔ کھانے کے دوران اس نے اچانک ہی اپنا گلا پکڑ لیا اور مینڈک کی طرح اچھلنے لگی۔ میں سمجھا کہ شاید اس کے گلے میں کچھ پھنس گیا ہے۔ میں نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی



کی رپورٹ، اسپتال کی جاری کردہ رپورٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ شامل تھی۔ ڈاکٹر نے ان کاغذات کا بغور معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ ”اس عورت کو کن چیزوں سے الرجی تھی؟“

اوبرن نے بریف کیس سے وہ فہرست نکالی جو اسے ریستوران سے ملی تھی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ”ناشپاتی، پیئر، برازیل نٹ، پنیر، اطالوی شراب، چاکلیٹ، کوکونٹ، بادنجان، گوشت، مونگ پھلی، انناس، گوبھی کا اچار، سویا بین، سفید شراب۔۔۔۔۔“

ابھی اس نے آدھے نام ہی پڑھے تھے کہ ویلنٹائن نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا اور بولا۔ ”ان سب میں ٹائرا مین ہوتی ہے جو اعصابی نظام کے لیے نقصان دہ ہے۔“

”کیا یہ بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے وہ الرجک ہو سکتی تھی؟“ اوبرن نے پوچھا۔

”الرجک نہیں۔ تم اسے حساسیت کہہ سکتے ہو۔ وہ کون سی دوائیں لے رہی تھی؟“

”جہاں تک میرے علم میں ہے وہ کوئی دوا نہیں لے رہی تھی۔ اس کی سیکریٹری کا کہنا ہے کہ وہ ڈاکٹروں پر یقین نہیں رکھتی تھی۔“

”اگر تم مزید تحقیقات کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ افسردگی دور کرنے والی دوائیں لے رہی تھی۔“

”گو یا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اسے مونگ پھلی سے الرجی نہیں تھی۔“ اوبرن نے پوچھا۔

”میں نے یہ بالکل نہیں کہا۔“ ڈاکٹر کسی اسکول ٹیچر کے انداز میں سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”مونگ پھلی، انناس،

سویا بین وغیرہ الرجی پیدا کرنے والی عام اشیاء ہیں لیکن اس فہرست میں کچھ ایسی اشیاء کے نام بھی موجود ہیں جو یہ دوائیں استعمال کرنے والے شخص کے لیے زہر قاتل ہو سکتی ہیں۔“

”اور ان کی وجہ سے بھی مونگ پھلی جیسا رد عمل ہو سکتا ہے۔“

”نہیں۔“ ڈاکٹر غراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اس بارے میں بالکل بھی شبہ نہیں کہ اس عورت کو مونگ پھلی یا

انناس سے الرجی تھی لیکن اس کی موت کی وجہ ایڈرینالین ہے جو پہلے طبی عملے اور بعد میں اسپتال والوں نے دی، یہ

دوا عام طور پر دوران خون بحال رکھنے کے لیے دی جاتی ہے لیکن اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ مریض نے کھانے

میں کیا لیا تھا ورنہ اس کا رد عمل خطرناک حد تک بلند پریش

بڑھنے کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اسے اپنے پرس میں ڈاکٹروں کی جانب سے جاری کردہ کارڈ رکھنا چاہیے تھا جس پر یہ ہدایت درج ہوتی ہے کہ مریض افسردگی دور کرنے والی دوائیں استعمال کر رہا ہے لہذا اسے ایڈرینالین یا اس سے ملتی جلتی کوئی دوا نہ دی جائے۔“

”ہم نے اس کا والٹ نہیں دیکھا۔“ اوبرن نے اعتراف کیا۔ ”اور میں نہیں سمجھتا کہ عملے یا پوسٹ مارٹم

کرنے والے ڈاکٹر نے بھی اس جانب دھیان دیا ہوگا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ڈاکٹر نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ اپنی دانست میں وہ مسز لیبرک کی موت کا معاملہ کر چکا تھا۔

ڈاکٹر سے ملاقات کرنے کے بعد اوبرن اور ڈونلڈ سر جوڈ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے تین مرتبہ وہ ڈی ڈی ڈی دیکھی جو

ٹی وی اسٹیشن سے موصول ہوئی تھی پھر پچاس سے زیادہ ان تصاویر کا معائنہ کیا جو بینسن نے بھیجی تھیں۔ ڈاکٹر کی باتوں

سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسز لیبرک کے قریب بیٹھنے والا کوئی بھی فرد بہ آسانی اس کے کھانے یا کافی میں مونگ پھلی

یا سویا بین سے بنی کوئی چیز ڈال سکتا تھا جس سے غیر معمولی رد عمل ہوتا اور ہنگامی علاج کی ضرورت پیش آتی۔ قاتل کو

معلوم تھا کہ مسز لیبرک افسردگی دور کرنے والی دوائیں استعمال کرتی ہے اور ہنگامی صورت حال میں دی جانے والی

ایڈرینالین اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔

اگر ڈاکٹر ویلنٹائن کے مفروضہ کو درست مان لیا جائے تو وہ کون سا شخص تھا جسے یہ بات معلوم تھی کہ مسز لیبرک اس

طرح کی دوائیں لے رہی تھی۔ عوامی عہدے پر فائز ہونے کی حیثیت سے یہ ایک فطری امر تھا کہ وہ اپنی بیماری کو

چھپاتی۔ کیا اس کی سیکریٹری کو یہ بات معلوم تھی اور اس نے ممنوعہ اشیاء کی فہرست میں رد و بدل کر دیا تھا۔

ڈونلڈ نے انٹرنیٹ کے ذریعے ڈاکٹر بولڈیک،

ہنری لیبرک اور کینس کے ماضی کے بارے میں جو تفصیلات حاصل کیں ان سے بھی اس کیس کو حل کرنے

میں کوئی مدد نہ مل سکی۔ ایک گھنٹا تک ان کا تجزیہ کرنے اور بحث کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ ابھی تک

موت کا سبب جاننے سے قاصر ہیں۔ پیر کی صبح اوبرن نے

قارنسک لیبارٹری کے انچارج سارجنٹ کارل کوفون کر کے اسے ریستوران پہنچنے کی ہدایت کی اور خود بھی ڈونلڈ کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔ ریستوران کے باہر والی سڑک پر

کرسمس کی خریداری کرنے والوں کا رش تھا۔ سارجنٹ



چیزیں لے گئے۔“

سیکرٹری سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہنری سے ملنے گئے جس سے ان کی ملاقات دروازے پر ہی ہو گئی۔ وہ لہجہ کر کے واپس آیا تھا۔ ڈولنگر نے اس سے بھی یہی کہا۔ ”ہم تم سے مزید کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ صرف دو تین منٹ کی بات ہے۔“ یہ کہہ کر ڈولنگر نے دروازہ بند کر دیا۔

”ہم ابھی تک یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تمہاری پھوپھی کی موت کس طرح واقع ہوئی؟“ اوبرن نے کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کوئی دوا لے رہی تھی؟“

”میں کیا بتا سکتا ہوں۔ یہ بات تم کینس یا اس کے ڈاکٹر سے پوچھو۔ میں اور پھوپھی اتنے قریب نہیں تھے۔“

”میری بات غور سے سنو شاید تمہیں کچھ یاد آجائے۔ ہماری معلومات کے مطابق گزشتہ مئی میں مسز لیبرک نے ایک تقریب میں شرکت کی تھی جہاں مونیگ پھلی سے اسے ری ایکشن ہو گیا اور اسے اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں آکسیجن کے ذریعے اس کی سانس بحال ہو گئی لیکن ڈاکٹروں نے اسے ایڈرینالین نہیں دی کیونکہ وہ کوئی دوا استعمال کر رہی تھی۔ اس کے پرس میں ان اشیاء کی فہرست ہمیشہ موجود رہتی تھی جن سے اسے الرجی تھی۔ تاہم ڈاکٹروں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اسے ایڈرینالین کیوں نہیں دی گئی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اب مجھے یاد آ گیا۔“ ہنری نے کہا۔

”کیا تمہاری پھوپھی نے کوئی وصیت تیار کی تھی؟“

”اس بارے میں تم اس کے وکیل سے پوچھو۔“

”اس نے وصیت کی ہو یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس وقت ممکنہ طور پر تم ہی اس کے واحد وارث ہو۔ گزشتہ اتوار کی ضیافت میں تمہارے پاس اچھا موقع تھا کہ اس کے کھانے میں کوئی ایسی چیز ملا دو جس سے اسے ری ایکشن ہو پھر جب تم نے طبی عملے کو بلایا تو انہیں ان چیزوں کے بارے میں تو بتا دیا جن سے مسز لیبرک کو الرجی ہو سکتی تھی لیکن ان دواؤں سے لاعلم رکھا جو تمہاری پھوپھی استعمال کر رہی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد تم نے پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر سے اشارتا کہا کہ مسز لیبرک کی موت حادثاتی نہیں تھی لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی تھی اور ڈاکٹر نے ڈیجیٹل سرٹیفکیٹ پر دستخط کر دیے تھے بلکہ تمہاری پھوپھی کی تدفین بھی ہو چکی تھی۔“

کارل نے اپنی وین ریستوران کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑی کر رکھی تھی۔ دروازے کے برابر میں ایک لمبا مخروطی شکل کا کوڑے دان رکھا ہوا تھا جس میں سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے پھینکے جاتے تھے۔ کارل نے چار مختلف زاویوں سے اس کی تصاویر لیں اور جب ڈولنگر نے اس کے ڈھکنے پر لگا ہوا بٹن دبایا تو کچرے سے بھری ہوئی بالٹی باہر آگئی جس میں سگریٹ کے ٹکڑے اور راکھ موجود تھی۔ کارل اسے لے کر اپنی وین کے عقبی حصے میں گیا۔ جبکہ اوبرن اور ڈولنگر بھی سردی سے بچنے کے لیے وین کی اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اب انہیں کارل کی رپورٹ کا انتظار کرنا تھا۔

منگل کی سہ پہر وہ دونوں ایک بار پھر سٹی کیشن کے دفتر گئے اور انہوں نے ایسٹریڈ کینس سے تنہائی میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ انہیں مسز لیبرک کے دفتر میں لے گئی۔ جہاں کئی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں لیکن انہوں نے بیٹھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ڈولنگر نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں چند سوالات مزید کرنا ہیں، کیا تم جانتی تھیں کہ مسز لیبرک کوئی دوا لے رہی تھی؟“

”یہ سوال تم پہلے بھی کر چکے ہو اور میں نے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹری علاج پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ اگر وہ کوئی دوا لے رہی ہوتی تو اس کا نسخہ مجھے ضرور دیتی تاکہ میں اس بات کو یقینی بنا سکوں کہ وہ دوا ہر وقت اس کے پرس میں موجود رہے۔“

”کیا گزشتہ اتوار کی شب وہ ضیافت میں اپنا پرس ساتھ لے کر گئی تھی؟“

”نہیں، میں ہی ہمیشہ اس کا پرس سنبھالتی تھی۔“

”اس کے بٹوے میں کیا ہوتا تھا صرف

چابیاں۔۔۔؟“

”اس کے علاوہ بھی بہت کچھ مثلاً سیل فون، لپ اسٹک، لٹو پیپر، چھوٹی ٹارچ، پیپر منٹ، فیتہ، پنسل، کاغذ وغیرہ وغیرہ۔“

”وہ پرس اب کہاں ہے؟“

”جب اس کی موت کا اعلان ہوا تو میں نے وہ اس کے بچتے کودے دیا تھا۔“

اوبرن نے کمرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”کیا وہ یہاں کچھ ذاتی اشیاء بھی رکھتی تھی؟“

”کچھ خاندانی تصاویر، کتابیں، ایک ریڈیو، اسٹیکس، پانی کی بوتل، مسٹر ہنری گزشتہ ہفتے اس کی تمام



جیسے ہی ڈونلڈ نے اپنی بات ختم کی۔ ہنری نے غصے سے کہا۔ ”تم دونوں کا دماغ چل گیا ہے، تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس پر جیوری کے اراکین صرف قہقہے لگا سکتے ہیں۔“

”گزشتہ ہفتے تم نے ہمیں بتایا تھا کہ تم خود بھی موٹنگ پھلی سے الگ ہو۔“ اوبرن نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں۔“ ہنری نے تائید کی۔ ”اس کے علاوہ انسان اور کیوی فروٹ سے بھی مجھے الرجی ہو جاتی ہے۔“

”کیا تم یہ وضاحت کر سکتے ہو کہ اس ضیافت میں تمہارے پاس پلاسٹک کی شیشی میں صاف شدہ اور گاڑھا موٹنگ پھلی کا تیل کہاں سے آیا؟“

ہنری لیبرک یوں ساکت ہو گیا جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا مار دیا ہو۔

”تم صرف طبی عملے کو لینے کے لیے نیچے نہیں گئے تھے۔ بلکہ تمہیں جلد از جلد اس شیشی سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا، جب تم ریستوران کے دروازے پر پہنچے تو تمہاری نظر باہر رکھے ہوئے اس کوڑے دان پر گئی جس میں سگریٹ کے ٹکڑے پھینکے جاتے ہیں۔ تم نے وہ شیشی اس میں پھینک دی۔ تمہیں یقین تھا کہ کسی کا دھیان اس جانب نہیں جائے گا۔ اسی لیے تم نے شیشی پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ لیکن خوش قسمتی سے ہم اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کی بیرونی سطح پر تمہارے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کا نشان بالکل واضح ہے۔ ان کی تصدیق ان نشانات سے بھی ہو گئی ہے جو تم نے کئی سال پہلے سنی فنانس ڈپارٹمنٹ میں ملازمت شروع کرتے وقت ریکارڈ کروائے تھے۔“

ہنری کرسی پر بیٹھ گیا اور مدافعتانہ انداز میں بولا۔

”ہر شخص کو میری پھوٹی سے شکایت تھی کہ وہ مختلف معاملات میں رکاوٹ ڈالتی اور جمود طاری کر دیتی ہے لیکن کسی کو اس کی دیانت داری پر کبھی شک نہیں ہوا جبکہ وہ بہت فریبی اور شیطان صفت عورت تھی۔ اسے گزراوقات کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے پاس کروڑوں کے اثاثے ہیں اور وہ ہاتھ ہلائے بغیر زندگی بھر پر عیش زندگی گزار سکتی تھی لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی اور ہر کام میں ٹانگ اڑا کر اپنا الوسیدھا کرتی رہی۔ جہاں تک میرے علم میں ہے اس نے کوئی وصیت تیار نہیں کی تھی لیکن جب سے وہ سنی کمیشن کی رکن منتخب ہوئی تھی، اس نے مجھے وراثت سے محروم کرنے کی دھمکیاں دینا

شروع کر دی تھیں۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ اس کے کہنے پر عمل کروں۔ پہلے اس نے چھوٹے موٹے مالی مفادات حاصل کیے پھر بڑی بڑی بے قاعدگیاں ہونے لگیں اور نوبت فراڈ تک پہنچ گئی جس میں نقد رقومات کی خرید و برد، سفری الاؤنس کے جھوٹے کلیم، جعلی رسیدیں، عوامی خدمت کے نام پر بے دریغ ذاتی اخراجات وغیرہ شامل تھے۔ اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا تو ایک دن بات کھل جاتی جس کے نتیجے میں صرف میری ملازمت ہی نہیں جاتی بلکہ جیل کی ہوا بھی کھانی پڑتی لیکن اگر میں اس کے ناجائز مطالبے پورا کرنے سے انکار کر دیتا تو وہ مجھے جائداد سے محروم کر دیتی اور سب کچھ وفاہی اداروں کو چلا جاتا۔

”گزشتہ مئی میں جب ایک پارٹی میں بسکٹ کھانے سے اسے الرجی ہوئی اور مجھے اسپتال والوں نے فون کر کے اس بارے میں بتایا تو میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ایک اتفاقی حادثے کے ذریعے اسے راستے سے ہٹانا کتنا آسان اور محفوظ ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے اسے بھاری مقدار میں موٹنگ پھلی کا تیل دینا ہوتا تھا کہ اس حالت میں اسے ایڈرینالین دینا ضروری ہو جائے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسی دوا کس استعمال کرتی ہے جن کے ہوتے ہوئے ایڈرینالین نہیں دی جاسکتی۔“

وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ یہ کرسس جیل میں ہی گزرے گا۔“

”یہ معاملہ مجسٹریٹ اور تمہارے وکیل کے درمیان ہے۔“ اوبرن نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ تمہیں ضمانت پر رہا کر دیا جائے جب تک جیوری تمہارے کیس کی سماعت شروع نہیں کرتی اور یہ کام کرسس اور سال نو کی تعطیلات کے بعد ہی شروع ہوگا۔“

اس کیس کو خوش اسلوبی سے حل کرنے پر ڈونلڈ اور اوبرن کی خوب واہ واہ ہوئی۔ ریستوران کی جانب سے انہیں پیشکش ہوئی کہ وہ مستقل رعایتی نرخوں پر وہاں کھانا کھا سکتے ہیں۔ اس واقعے سے ریستوران کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا تھا ان دونوں سراغ رسانوں نے اصل مجرم کا سراغ لگا کر اس کی تلافی کر دی۔ خاص طور پر شیف پارکر زیڈ تو ان کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ وہ جب بھی کافی پینے وہاں جاتے، وہ انہیں دیکھتے ہی نعرہ لگاتا۔ ”خوش آمدید! آج کی خاص ڈش تمہارے نام۔“ اور وہ دونوں مسکرا کر رہ جاتے کیونکہ انہیں کسی کا احسان لینے کی عادت نہیں تھی۔



وہ جیلی نما زرد رنگ کی انوکھی مخلوق تھی۔ ایلین مخلوق  
یا کچھ اور، اسے کوئی نام دینا بھی مشکل تھا۔ وہ ایک بڑے  
سے ہلکے کے مانند تھی۔ جس میں پھولنے بڑے مزید ہلکے  
ابھر رہے تھے اور ڈوب رہے تھے۔ ان کی تعداد سیکڑوں  
میں تھی۔ جسامت پھوٹی سوزو کی کار سے لے کر بڑے ٹرک  
جیسی تھی۔

زرد جیلی نما مخلوق ناقابل فہم انداز میں متحرک تھی۔  
ہاتھ، پیر، سر، آنکھیں، کچھ بھی نہیں تھا۔ تاہم نہ صرف وہ زندہ

## بد قسمت

بشریٰ امجد

صبر... ہمت اور کردار بڑی چیز ہے... وہ کمانڈر کے فیصلے پر سر تسلیم  
خم کرتا تو جان بچانے کی شاید کوئی صورت نکل آتی... اس کی بزدلی  
اور کم ہمتی نے جان بچانے کا ہر دروازہ بند کر دیا... جبکہ خوش قسمتی  
اس سے ذرا دور منتظر کھڑی تھی...

لحہ بہ لہ سنسنی خیزی کی جانب گامزن ایک اعصاب شکن کہانی کے لرزا خیز موڑ





”مجھے یقین ہے کہ جانے والوں میں میرا نام ٹاپ پر رکھا جائے گا۔“

کمانڈر ہارکنس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”معذرت خواہ ہوں، فینک۔ یہاں کافی افراد ہیں۔ کوئی بھی موت کے منہ میں رکنا پسند نہیں کرے گا۔ اس طرح افراد تفری پھیل جائے گی۔ ہر ایک کی اپنی اہمیت ہے۔ اس اہمیت کی بنیاد پر کوئی بھی دعویٰ کر سکتا ہے۔“ کمانڈر کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ ”میں بھی اس سے مترا نہیں ہوں۔ میرے اوپر بھاری ذمہ داری ہے۔“

”کم آن کمانڈر۔“ فینک کے چہرے نے رنگ بدلا۔ ”میں مشن کو یہاں سے نکال لے جانے کے لیے بہترین انتخاب ہوں اور تم یہ بات جانتے ہو۔“

”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں کمانڈر ہوں اور یہ آسانی یہاں سے نکل سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔“

فینک کے چہرے پر پریشانی نظر آئی اور وہ بحث پر اتر آیا۔ کوپاٹلٹ ڈین میری نے اپنے سینٹر کو بازو سے پکڑ کر وہاں سے ہٹایا۔

”جناب، کمانڈر کی بات صحیح ہے۔“ وہ بولا۔ ”یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ سب کا حق ہے کہ برابر کا چانس لیں۔ سب اپنی اپنی جگہ پر فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کمانڈر اتھارٹی رہا ہے اور اب بھی ہمیں کمانڈر کے فیصلے پر صاف کرنا چاہیے۔“

”کیا رکنے کے لیے رضا کار آگے آئیں گے؟“

فینک ہنس پڑا۔ ”کمانڈر! تم کتنے اور کن افراد کو لے جا سکو گے؟“

”کسی کو رضا کارانہ موت کے لیے طلب نہیں کیا جائے گا۔“ کمانڈر ہارکنس نے جواب دیا۔

”فیصلہ تم کرو گے؟“

”نہیں، فیصلہ میکس کرے گا۔ اس کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ چاہے مجھے ہی کیوں نہ رکنا پڑے۔“ کمانڈر نے سکون سے کہا۔

میکس، تھینا کیمپ کا مین کمپیوٹر تھا۔ محفوظ شب میں ایک سو چالیس افراد کو لے جانے کی گنجائش تھی۔

کمانڈر نے ڈپٹی کمانڈر کو کمپیوٹر آپریٹ کرنے کا اشارہ کیا۔ فینک کا چہرہ مکدر ہو گیا۔ حالانکہ یہ ایک بہترین اور غیر جانبدارانہ فیصلہ تھا۔ قریب اندازی کی طرح۔ ایسا فیصلہ ایک قابل اور مضبوط اعصاب کا کپتان ہی کر سکتا تھا۔ تمام

تھے بلکہ ”تھینا کیمپ“ پر یلغار کر رہے تھے۔ ”گرین“ نامی سیارچے پر واحد زمینی سائنسی اسٹیشن ”تھینا کیمپ“ تھا۔ جو زرد مخلوق کی چڑھائی کو روکنے کے لیے ہر قسم کے جدید ہتھیار بھاری مقدار میں استعمال کر رہا تھا۔ تاہم وہ ایلین کی کون سی قسم تھی جس کی پیش قدمی تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔

بھاری اسلحہ ان کو ٹکڑوں میں تقسیم تو کر دیتا تھا، تاہم نامعلوم نظام کے تحت یہ ٹکڑے از خود مل کر دوبارہ ایک ہو جاتے تھے۔ تھینا کیمپ کا اسلحہ زرد جیلی کی یلغار کو روکنا تو کجا، ان کی پیش قدمی کو سست کرنے میں بھی ناکام نظر آ رہا تھا۔

زرد جیلی دو اسپیس شپس پہلے ہی تباہ کر چکی تھی۔ مکمل تباہی سر پر منڈلا رہی تھی۔ تھینا کیمپ کا کمانڈر ہارڈ ہارکنس بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ اسے جلد ہی کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا تھا۔

ہیوز، چیف ٹیکنالوجی آفیسر تھا۔ اس نے کیمپ کو بچانے کے لیے انتہائی طاقتور حصار قائم کیا تھا۔ یہ حصار ہی امید کی کرن تھا۔ تاہم جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، اسے توقع نہیں تھی کہ حصار زیادہ دیر ان کو محفوظ رکھ سکے گا۔ خود کو دھوکا دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیمپ کی سیکڑوں زندگیاں داؤ پر لگی تھیں، ہیوز نے کمانڈر ہارکنس سے خدشے کا اظہار کر دیا۔

”ہم اس خطرے کو کتنی دیر روک سکتے ہیں؟“

کمانڈر نے ہیوز کی بات سن کر سوال کیا۔

”شاید، تیس منٹ۔۔۔۔۔“ ہیوز نے شانے اچکائے۔

”یا کچھ کم اور زیادہ۔۔۔۔۔ لیکن ایک گھنٹے سے زیادہ روکنا ممکن نہیں ہے۔ ان پر کسی چیز کا اثر نہیں ہو رہا۔“

”ایک، صرف ایک شپ محفوظ ہے۔ بیس کیمپ کے عقب میں۔ ہمیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔“ تھینا، کو خالی کرنا پڑے گا۔“ کمانڈر ہارکنس نے کہا۔

”کمانڈر لیکن ایک بڑا مسئلہ ہے۔“ ہیوز بڑبڑایا۔

”ہاں، میں جانتا ہوں۔ ہم سب محفوظ شب کے ذریعے زمین تک نہیں پہنچ سکتے۔ شب میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ غالباً 20، 25 افراد کو یہیں رکنا پڑے گا۔“ کمانڈر کے چہرے پر کبھیرا تھا۔

”کمانڈر! یقیناً تم فیصلہ کرو گے کہ کون جائے گا، کون یہاں موت کا انتظار کرے گا؟“ سوال پوچھنے والا مارٹن فینک تھا۔ وہ ٹیم کا سینئر پائلٹ تھا۔ اس کی مہارت لا جواب تھی۔ اسی وجہ سے اس کا ٹک نیم ”ایس ہائی“ پڑ گیا تھا۔



تھا۔

☆☆☆

خوش قسمت عملے کو محفوظ شپ پر منتقل کرنے کے احکامات جاری کر دیے گئے۔ ہر فرد اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ دس، پندرہ پونڈ وزن رکھ سکتا تھا۔ وہاں دوست اور رشتے دار بھی تھے۔ جانے والے رہ جانے والوں سے آنکھ نہیں ملا پارہے تھے۔

فینک جانتا تھا کہ اس کا ڈپٹی ڈین، اس کی بہت عزت کرتا ہے۔ تاہم یہ احترام فینک کی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ منسلک تھا۔ فینک، منت سماجت کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ تاہم اس وقت وہ ڈین کیری سے التجا کر رہا تھا کہ وہ اپنی جگہ فینک کو جانے دے۔

”ڈین۔“ وہ گڑگڑایا۔ ”میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھا ہے۔ تم جانتے ہو، میں نے تمہیں سکھانے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ میری فیملی ہے۔ مجھے ابھی بہت کام کرنے ہیں۔۔۔ پلیز ڈین۔“

ڈین، دنگ رہ گیا۔ اسے گمان نہیں تھا کہ فینک اتنی بزدلی کا مظاہرہ کرے گا۔ ”ڈوم لسٹ“ میں فینک جہاں نہیں تھا۔ ڈین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ خوش قسمتی سے کمانڈر ہارکنس نے ڈین کی مشکل آسان کر دی۔

”میں نے سن لیا ہے، تم ڈین سے کیا کہہ رہے تھے۔ شرم آنی چاہیے۔ لگتا ہے کہ تم اکیلے مرنے جا رہے ہو۔ جاؤ نمبر پانچ پر اپنا اسٹیشن سنبھالو۔“

فینک کی آنکھوں میں وحشت تھی، ہر اس تھا۔ ”دیکھو۔“ اس کی آواز گھٹ گئی۔ ”زمین پر میرا خاندان بہت امیر ہے، بہت زیادہ۔ اگر مجھے جانے دو گے تو تمہارے چاہنے والوں کو میں اتنی دولت دوں گا کہ وہ فکر فردا سے آزاد ہو جائیں گے۔“

کمانڈر کی آنکھوں میں نفرت کا تاثر ابھرا۔ ڈین بھی حیران رہ گیا۔ فینک اپنی سطح سے نیچے گر گیا تھا۔

”میرے احکامات کی نفی کرو گے تو میری گولی سے مرو گے۔“ کمانڈر کی پیشانی پر تل پڑ گئے۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

وہاں رہ جانے والوں کی ٹیم بنا کر کمانڈر، جیلی نما مخلوق سے آخری معرکے کی تیاری کرنے لگا۔ اگرچہ وہ انجام سے آگاہ تھا۔

☆☆☆

فینک کے اعصاب جواب دے گئے۔ اسے اپنی

گروپ لیڈرز کو مطلع کر دیا گیا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ فہرستیں فراہم کی گئیں۔

کمانڈر کی ہدایت کے مطابق ڈپٹی نے نام فیڈ کرنے شروع کیے۔ اعصاب کھنچاؤ کا شکار تھے۔ ماحول پر سکوت طاری تھا۔ تمام افراد سینٹرل کنٹرول ایریا میں تھے۔ چند سیکنڈ میں کمپیوٹر نے پرنٹ آؤٹ دے دیا۔ جذبات سے عاری مشین نے زندگی اور موت تقسیم کر دی تھی۔

دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ کیمپ پر رکنے والے کم تعداد میں تھے۔ جانے والے ایک سو چالیس تھے۔ کمانڈر نے رکنے والوں کی فہرست کو ”ڈوم لسٹ“ (doom list) کا نام دیا اور اسے پڑھنا شروع کیا۔ فینک کا نام ڈوم لسٹ میں شامل تھا۔ نیز خود کمانڈر کا بھی۔۔۔ فینک بھڑک اٹھا۔ ”میرے علاوہ کون فلاکی کر سکتا ہے؟“

”ڈین کیری۔“ کمانڈر نے مختصر جواب دیا۔ جن کے نام ”ڈوم لسٹ“ میں نہیں تھے، ان کے چہروں پر زندگی کا رنگ بحال ہو گیا تھا۔

”مجھے یقین نہیں آتا۔“ فینک نے کہا۔ ”تمام اسپیس۔ فلیٹ کا بہترین پائلٹ مرنے کے لیے یہاں رکے گا اور سزائے موت اس بے جان مشین نے سنائی ہے۔ سن لو، میں اسے مسترد کرتا ہوں۔“

”میں نے میکس کا فیصلہ قبول کیا ہے۔“ کمانڈر نے کہا۔ ”تم اپنے کردار کی بہت بڑھکیں مارا کرتے تھے۔ ثابت کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا موقع ہوگا۔“ فینک کے چہرے پر پسینا نمودار ہوا، ہونٹ سختی سے بھنج گئے۔

”آئی ایم سوری، فینک۔“ ڈپٹی ڈین کیری نے اظہارِ افسوس کیا۔

”دیکھو، ناقابلِ شکست ایلینز کے مقابلے میں اب تک ہمارے درجن بھر سے زیادہ لڑاکا مارے جا چکے ہیں۔۔۔ جس پر زرد رنگ کی پچکاری پڑتی ہے وہ 30 منٹ میں زرد بخول میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حوصلہ شکن صورتِ حال ہے۔ وہ بھی اپنی جان بچاؤ کر رہے ہیں۔ سچویشن یہی رہی تو ممکن ہے ہمیں ”میکس“ کو دوبارہ چلانا پڑے اور تم خوش قسمت رہے تو تمہارا نام ”ڈوم لسٹ“ سے نکل سکتا ہے۔“ کیری نے فینک کو سمجھایا۔

فینک نے اپنا بازو ڈپٹی کی گرفت سے آزاد کرایا۔ ”شٹ آپ، ڈین۔“ وہ بولا۔ فینک کچھ سننے کے لیے تیار نہ



”ٹھیک ہے۔“ میری ”اپنا کام کرے گی۔ تم اپنا کرو، دونوں میں سے جو پہلے کامیاب ہو جائے، چوائس کم ہے اور وقت بھی قلیل۔۔۔۔۔ گڈ لک۔“

☆☆☆

اوپن لائنز پر فینک نے اگر کمانڈر کا منصوبہ سنا بھی تھا تو کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ اپنی نشست میں آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ مختلف اسکرینز پر خوفناک لمبلیجی زرد مخلوق کو روکنے کے لیے کمانڈر ہارکنس کی ٹیم ہر ترکیب آزما رہی تھی۔ فینک محفوظ مقام سے ایک طرف لڑائی دیکھ رہا تھا۔

وہ خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ ہیرو بن کر زمین پر اترے گا۔۔۔۔۔ اچانک اسے ڈپٹی کیری کی آواز سنائی دی۔ ”میں، ڈین کیری ہوں، تم مجھے سن رہے ہو؟“

”آہ، ڈین۔۔۔۔۔ کیا مسئلہ ہے؟“

”مجھے اندر آنے دو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

ڈین نے اپنے ہاتھ میں موجود پستل کو دیکھا۔ ”تم مجھے پاگل سمجھتے ہو۔ تم لوگوں نے میری آفر مسترد کر دی تھی۔ اب کیا بات کرنی ہے؟“ فینک کا لہجہ زہر آلود تھا۔ ”تم لوگوں نے میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“

”تمہیں احساس کرنا چاہیے کہ کمانڈر خود ڈوم لسٹ پر ہے پھر بھی ہم دونوں کوئی حل نکال لیں گے۔“ ڈپٹی کیری کی خواہش تھی کہ فینک بات کرتا رہے۔ اگر وہ فینک کو قاتل نہ کر سکا تو اتنی دیر میں ”میری“ اپنا کام کر لے گی۔

”تمام لوگ جانے کے لیے تیار ہیں، انہیں تو اندر آنے دو۔۔۔۔۔“

”اور میں خود باہر آ جاؤں؟“ فینک نے کڑوی آواز میں سوال کیا۔

”نہیں، تم میری جگہ لے سکتے ہو۔“

”دھوکا دے رہے ہو مجھے؟“

”نہیں، میں سچ بول رہا ہوں۔ اس طرح ایک سو چالیس افراد کی جان بچ جائے گی۔“

شب کے نیچے ”میری“ ہارورڈ کے ساتھ مل کر تیزی سے اپنا کام کر رہی تھی۔

”میں کیسے یقین کر لوں؟“ فینک نے اعتراض کیا۔

”تم خود بتاؤ، میں تمہیں کیسے یقین دلا سکتا ہوں؟“

ڈپٹی کیری نے الٹا سوال کر ڈالا۔

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

جان کی فکر پڑی تھی۔ وہ دفاعی ٹیم میں شامل ہونے کے بجائے شب نمبر 3 میں جا پہنچا۔ اسے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جن افراد نے زمین کی جانب سفر کرنا تھا، وہ ابھی شب تک نہیں پہنچے تھے لیکن فلائٹ ڈیک پر اسے عملے کا ایک آدمی مل گیا۔ فینک نے دیوانگی کے عالم میں جو چیز ہاتھ میں آئی، اس کے سر پر دے ماری۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور خواب غفلت میں چلا گیا۔ فینک نے اسے لڑکھڑا کر کوریڈور میں پہنچایا اور دروازے سے باہر نکل کر دیے۔ خود اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اس نے ماسٹر سوئچ کے ذریعے تمام سسٹم لاک کر دیے۔ پائلٹ سیٹ میں بیٹھ کر اس نے منتشر اعصاب کو سنبھالا اور کیونیکیشن کونسل پر ہاتھ مارا۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز شب کے باہر گونج رہی تھی۔

کیمپ ٹھینا کے سینٹرل کمانڈر روم میں کمانڈر ہارکنس اپنی جگہ پر جم رہا تھا۔

”اوکے، ہارکنس۔“ فینک کی آواز آئی۔ آواز میں دیوانگی کی جھلک تھی۔ ”شب تھری میرے کنٹرول میں ہے۔ جب تک میں نہیں جاؤں گا، کوئی بھی نہیں جائے گا۔ سن رہے ہو؟ میں تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں۔“

”فینک، میں سن رہا ہوں۔“ کمانڈر نے دانت پیسے۔ ”حفاظت مت کرو۔ خود پر قابو پاؤ۔ یہ بلیک میلنگ ہے۔ تم میرے احکامات کے پابند ہو۔“

”اوہ، کمانڈر یہاں کون سی عدالت لگی ہے۔“ فینک کی آواز آئی۔ ”میں مروں گا تو سب مریں گے۔“

ہارکنس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سو سے زیادہ افراد کو یہاں سے روانہ کرنا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ناقابل شکست زروائیلینز سر پر تھے۔

”میری کے“ تھینا کیمپ کی انجینئر اسپیشلسٹ تھی۔ ہارکنس نے اس کا بازو پکڑا۔ میری کا نام بھی ڈوم لسٹ میں تھا۔

”میری، فلائٹ ڈیک میں گھسنے کی کوئی ترکیب نکالو۔ فینک کو وہاں سے نکالنا ہے اور جلدی۔۔۔۔۔“

”کمانڈر وقت بہت کم ہے پھر بھی میں کوشش کرتی ہوں۔ مجھے لیزر کٹر کے ساتھ ایک آدمی درکار ہے۔“

”ہارورڈ بہتر رہے گا۔“ ہارکنس نے اشارہ کیا۔

”ایکسیکوزی سر۔“ ڈین کیری نے دخل اندازی کی۔

”میں فینک کو خوب جانتا ہوں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ میں بات چیت کے ذریعے اسے رام کر سکتا ہوں۔“

جاسوسی ڈائجسٹ



اعصاب ٹوٹ گئے، رنگت سفید پڑ گئی۔ اس نے اچانک ڈپٹی پر گولی چلائی پھر گن اپنے سر پر رکھ کر فار کر دیا۔ ہارورڈ نے کیری کو بچانے کے لیے فار کیا تاہم فینک پہلے ہی خودکشی کر چکا تھا۔ [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com) "میری" نے منہ پھیر لیا اور ہارورڈ نے تاسف سے سر ہلایا۔

☆☆☆

خوش قسمت افراد، ڈپٹی کیری کے ساتھ زمین کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔

کمانڈر، ڈوم لسٹ کے افراد کے ساتھ موت سے نبرد آزما تھا۔ اس کا حوصلہ قابل دید تھا۔ وہ سب بہادری کی موت مرنا چاہتے تھے اور شانہ بشانہ کمانڈر کے ساتھ تھے۔

ایلیئرز کے تھے، پسپا نہیں ہوئے تھے۔ نیز آگ کی دھاریں تبدیل شدہ سرخ رنگ کی جلی پر بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ کمانڈر کے خیال میں یہ وقتی مہلت تھی۔

کمانڈر کو فینک اور عملے کے ایک آدمی کی موت کا صدمہ تھا۔ دوسرا میر نے والا وہی تھا جس کے سر پر فینک نے آہنی ضرب لگائی تھی۔ اس کی کھوپڑی چٹخ گئی تھی۔ شپ 3 زمین کی جانب مجوسفر تھا۔ لیکن ایک مسافر کم تھا فینک نے جس آدمی کو مارا تھا اس کی جگہ کوئی اور جاسکتا تھا۔ تاہم کون جانتا؟ یہ معلوم کرنے کے لیے "میکس" کی مدد حاصل کرنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔

"ایک فرد اور بچ سکتا تھا۔" میک نے کہا۔

"ہاں لیکن دیر ہو گئی تھی۔" ہارورڈ نے جوابا کہا۔

میک فلسفیانہ انداز میں مسکرایا۔ "اب تو جلدی نہیں ہے۔" "میکس" سے پوچھا جاسکتا ہے کہ آخری فرد کون ہو سکتا ہے۔ کون خوش قسمت گنجائش کے باوجود جانے سے رہ گیا؟

[www.paksociety.com](http://www.paksociety.com) "کیا فائدہ؟"

"ہاں، دیکھنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔" کمانڈر اداس مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا اور "میکس" کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

ایک سیکنڈ میں کمپیوٹر نے ایک نام ظاہر کر دیا۔

"مارٹن فینک۔"

تینوں نام پڑھ کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

☆☆☆

بربادی یقینی تھی۔ ایلیئرز نے آخری حصار تہس نہس کر دیا تھا۔ دیو قامت زرد بلبلوں سے گڑگڑاہٹ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

کمانڈر ہارکنس کے ذہن میں شرارہ لپکا۔ ایک کارڈ باقی تھا۔ اسے کیوں نہ آزمایا جائے۔

"فار گنز تیار کرو، جلدی۔" وہ دہاڑا۔

آگ پھینکنے والی مخصوص گنیں آنا فانا پہنچ گئیں۔ دائر کینن کے مانند، آگ کے شعلے دور تک جا رہے تھے۔۔۔۔۔ حیرت انگیز منظر تھا۔ ایلیئرز کی یلغار تھم گئی۔ آگ ان کو بدبودار پانی میں تبدیل کر رہی تھی۔ اچانک آگ کی زد سے بچنے والی زرد جلی کارنگ بدل کر نارنجی ہو گیا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز میں ایک اور ناقابل فہم سیٹی نما آواز شامل ہو گئی۔ یلغار رکے ہوئے ایک منٹ ہو چلا تھا۔ یہ نہایت قیمتی مہلت تھی۔۔۔۔۔ سرخ رنگت اختیار کرنے والی جلی پر آگ اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔

کمانڈر نے دوبارہ لیزرافیک کا آرڈر دیا۔

☆☆☆

میری جانتی تھی کہ شپ میں گھسنے سے پہلے وہ سب ایلیئرز کے بلبلوں کے اندر جذب ہو چکے ہوں گے۔ معافاً ایک نے امید کی نئی کرن دکھائی۔ وہ شدد سے پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ہارورڈ اس کی مدد کر رہا تھا۔ بالآخر وہ اپنی مطلوبہ جگہ کاٹ کر شپ میں داخل ہو گئے۔۔۔۔۔ میری نے ڈپٹی کیری کو اشارہ کر دیا تھا۔ کیری کی گفت و شنید تقریباً فینک سے لا حاصل رہی تھی۔ وہ تینوں احتیاط سے شپ نمبر 3 میں پہنچ گئے۔

ہارورڈ نے کیری کو دوسرا کوریڈور استعمال کرنے کو کہا۔ فینک، اسکرینز پر لڑائی کی صورت حال دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً ہارورڈ کی آواز نے اسے ہڑبڑا دیا۔ وہ نہ صرف پلٹا بلکہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے ہاتھ میں گن تھیں۔

فینک، سخت اعصابی کشمکش میں مبتلا تھا۔

"مجھے کوئی نہیں روک سکتا، تم لوگ پاگل ہو گئے ہو۔"

وہ چیخا اور گن سیدھی کی۔

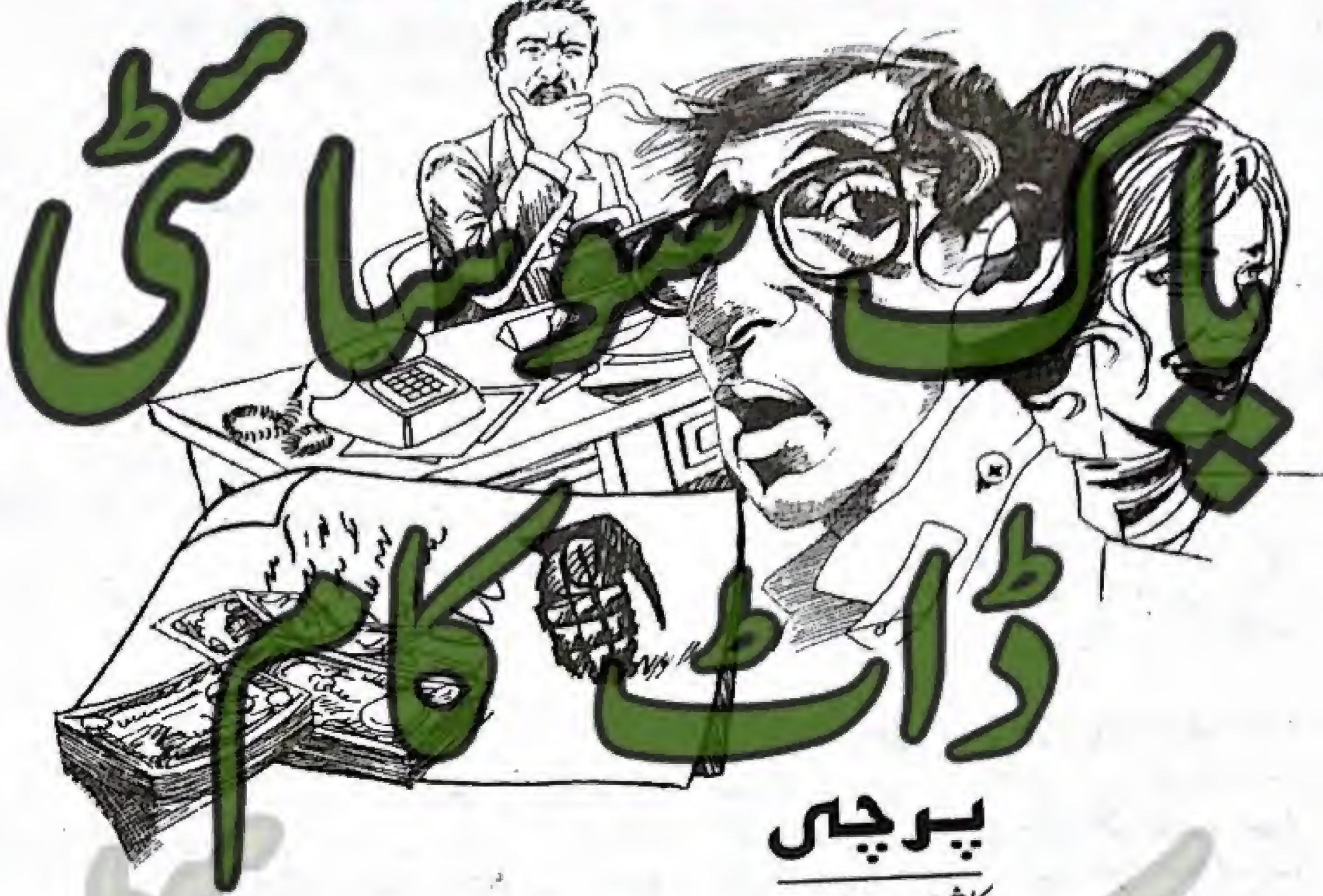
"گن پھینک دو۔" کیری کی آواز دائیں جانب سے آئی۔ فینک حواس کھو بیٹھا، اس نے گردن گھما کر اپنے ڈپٹی کو غیر یقینی انداز میں دیکھا۔ ڈپٹی کیری کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔

پھر وہ ہوا جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ فینک کے

جاسوسی ڈائجسٹ

71 جولائی 2015ء





## پرچی

کاشفِ زیر

کچھ لمحے بڑے کرشماتی ہوتے ہیں... جو چاہا ہو... وہ پل کے پل پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے... جلیل بھی اپنے عزم صمیم کے ساتھ گھر سے نکلا تھا... دوستوں کے عدم استحکام اور سازشی تانے بانوں سے قطع نظر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا جنوں اسے پردر پردہ دستک دینے پر مجبور کر رہا تھا... مخصوص کرداروں کے ساتھ طنز و مزاح کی چاشنی اور دشمنوں کی دل ربا و دل جلی کارروائیوں کے ہمراہ اچھلتا کودتا دلچسپ سلسلہ...

بھتے کی پرچی کا پراسرار معما جسے حل کرنے کا سہرا جلیل کے سر تھا...

میں بروقت چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر میں داخل ہوا جہاں چھوٹے پٹانے پر بد امنی کے آثار نظر آرہے تھے۔ چھوٹا بھائی بڑا کی طرح دار سیکریٹری چیخ مار کر نوجوان اکاؤنٹنٹ کی ہانہوں میں جھول گئی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے ذرا قاصدے پر تھا مگر اسے پکڑنے کے لیے بروقت پہنچا اور اس کا باس یعنی چیف اکاؤنٹنٹ یہ اعزاز حاصل نہ کرنے پر چمیں یہ چمیں نظر آرہا تھا اور منہ میں موجود پان کو ایمر جنسی میں گھونٹ رہا تھا۔ دفتر کا فیجر لڑے کا پرانا مریض تھا اور علیے

جاسوسی ڈائجسٹ 72 جولائی 2015ء



سے چھوٹا بھائی بڑا کا پارٹ ٹو نظر آتا تھا مگر خود چھوٹا بھائی بڑا اس وقت لرزے میں منبر کی کالی کر رہا تھا اور اپنی میز سے ممکنہ حد تک دور ایک کونے میں گھڑا جون کی گری میں دبیر کے جاڑے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ البتہ اس کا چہرہ اسی جان پر کھیل کر میز کے پاس ہی کھڑا تھا۔ جان پر کھیل کر کیوں؟ اس کا علم مجھے ذرا دیر سے ہوا تھا۔

دفتر کی دوسری خاتون ملازم اور واحد ہنسے والی گلو جی اس وقت بھی ہنس رہی تھیں، جب باقی افراد کے رونے کی کسر رہ گئی تھی۔ گلو جی کا اصل نام گل جی تھا مگر گول مٹول ہونے کی وجہ سے گلو جی کہلاتی تھیں۔ ان کا قد پانچ فٹ دو انچ اور وزن ستر کلو گرام تھا اس لیے وہ صرف منہ سے نہیں ہنستی تھیں، ماہرین کے مطابق پانچ فٹ دو انچ قامت پر کسی خاتون کو ساٹھ کلو گرام سے زیادہ وزنی نہیں ہونا چاہیے۔ گلو جی جب ہنستیں تو ان کا اضافی دس کلو گرام وزن جہاں جہاں ہوتا وہیں سے ہنسی میں شریک ہو جاتا۔ یہ منظر قابل دیدہ سہی مگر ناقابل بیان ہوتا تھا۔ دفتر میں جب گلو جی ہنستیں تو کوئی کام نہیں کرتا تھا، سب انہیں دیکھتے تھے۔ اسے حالات کی سنگینی نہیں تو اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت کوئی گلو جی کو ہنسنے ہوئے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ گلو جی بھی ہنس نہیں رہی تھیں۔ وہ بھی اصل میں رورہی تھیں۔

بعض لوگوں کی صورت ایسی ہوتی ہے کہ ہنسنے بھی ہیں تو لگتا ہے رورہے ہیں مگر گلو جی ان خواتین میں سے تھیں جو روتیں تب بھی ہنستی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ دفتر کا واحد فرد جو نارمل دکھائی دے رہا تھا، وہ چہرہ اسی چچا پون تھا۔ اس کا سر چھوٹا بھائی بڑا کی میز کی کھلی دراز پر جھکا ہوا تھا اور وہ کسی چیز کا بہ غور معائنہ کر رہا تھا۔ چھوٹا بھائی بڑا گنگنانے کے انداز میں چلا رہا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا تو وہ کہہ رہا تھا۔

”ابے دور رہ۔۔۔ پھٹ جائے گا۔“

اماں نے جب سے شادی کے لیے ہاں کی تھی، میرا مطلب ہے میری شادی پر نیم رضا مندی ظاہر کی تھی تب سے میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ جلد از جلد جہاں جہاں میری رقم پینسنی ہے نکالوں۔ بد قسمتی سے میرے دو بڑے ناوہندگان چھوٹا بھائی بڑا اور جی تھے۔ دونوں میں مشترک قدر خسیس پن تھا۔ اگر کنجوسی کی عالمی چیمپین شپ ہوتی تو منتظمین مشکل میں پڑ جاتے کہ پہلا انعام ان دونوں میں سے کس کو دیں۔ خود میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ جوئے شیر کہاں سے نکالوں اس لیے ٹاس کر کے چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر کا رخ کیا تھا مگر یہاں حالات خراب لگ رہے تھے۔

میں نے پوچھنے کے بجائے چچا پون کے اوپر سے جھانک کر دراز میں دیکھا اور پھر بھاگنے کا سوچا کیونکہ دراز میں۔۔۔ ایک عدد دستی بم رکھا ہوا تھا۔ مگر پھر خیال آیا کہ بے شک یہ دستی بم ہے مگر از خود پھٹنے سے رہا، ورنہ اب تک پھٹ چکا ہوتا۔ میں نے چھوٹا بھائی بڑا کی طرف دیکھا۔

”سیٹھ، یہ کیا چکر ہے؟“

”تجھے خبر نہیں آتا ہے۔“ اس نے خفگی سے کہا۔

”نظر تو آرہی ہے۔“ میں نے احتیاط سے نزدیک ہو

کر بم کا معائنہ کرنے کے لیے چچا پون کو پیچھے کیا۔ پیچھے ہٹائے جانے پر چچا پون نے یوں سکون کا سانس لیا جیسے وہ اب تک دستی بم پکڑے کھڑا تھا۔ یہ انسان کی شکل و ساز و رنگ کا بم تھا جس کے اوپر ایک کی چین جیسا رنگ تھا۔ ”یہ روسی ساختہ مینڈ گرینڈ ہے۔ مگر فکر مت کرو اس کی پن لگی ہے۔ جب تک اسے نہیں کھینچا جائے گا یہ نہیں پھٹے گا۔“

”تجھے کیسے پتا؟“

میں نے دانت نکالے۔ ”میں جلیل الزماں ہوں۔“

پرچی کہاں ہے؟“

اس بار چھوٹا بھائی بڑا اچھل پڑا۔ ”تجھے معلوم ہے، کہیں تو نے ہی تو نہیں رکھا ہے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں رکھتا تو تمہارے نیچے رکھتا۔ پن نکال کر اور پھر آواز آتی۔۔۔۔۔ یوم۔۔۔ اور اس وقت یہاں تم سب زندہ سلامت نہیں کھڑے ہوتے بلکہ ایک پیس میں بھی نہ ہوتے مگر وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے اگر مجھے میرے واجبات نہ ملے تو انگلی بار میں ہی یہ کام کر جاؤں گا۔“

چھوٹا بھائی بڑا نے چلا کر کہا۔ ”میں تجھے پولیس کے حوالے کر دے گا۔“

”ضرور کرو۔“ میں نے دانت نکالے۔ ”اس سے بم بھیجنے والے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ہاں تم نے اس کو بہت نہیں دیا تو وہ خود آئے گا اور ایسا ہی دستی بم یہاں مار کر جائے گا۔“

چھوٹا بھائی بڑا پھر لرزے لگا۔ ”تو بچ کہہ رہا ہے؟“ میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس کی طرح دار سیکرٹری کو غور سے دیکھا۔ ”اسے کیا ہوا ہے؟“ ”بے ہوش ہے۔“ اسسٹنٹ اکاؤنٹس نے سرور ہجے میں مطلع کیا۔ وہ اسے ”سنجھالے“ ہوئے تھا۔

”اسے کہو ہوش میں آجائے عین ممکن ہے بم بھیجنے والا خود بھی آنے والا ہو۔ آج کل وطن عزیز میں یہی لوگ قول

جولائی 2015ء

73

جاسوسی ڈائجسٹ



کے کئے رہ گئے ہیں، جو کہتے ہیں اسے پورا بھی کرتے ہیں۔  
خالی دھمکی نہیں دیتے اگر رقم نہ ملے تو گولی یا بم مارنے  
آجاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بے ہوشی کی حالت میں دنیا سے  
رخصت ہو جائے۔“

یہ سنتے ہی طرح دار سیکر یٹری کو ہوش آ گیا اور وہ بادل  
ناخواستہ اکاؤنٹس اسٹنٹ کی بانہوں سے الگ ہو گئی۔ اس  
پر زیادہ۔۔ خوشی چیف اکاؤنٹس کو ہوئی تھی اور اس نے  
نارمل انداز میں پان چبانا شروع کر دیا اور فوراً گلو جی کی  
طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ٹھکر کی پن کی اس منزل پر تھا کہ اگر  
اسے بجلی کے کھمبے میں بھی ذرا سی نسوانیت دکھائی دیتی تو وہ  
اسی کے گرد منڈلانا شروع کر دیتا۔ دستی بم کے ساتھ آنے  
والا پرچہ دراز میں بم کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ صبح دفتر آنے کے  
بعد جیسے ہی چھوٹا بھائی بڑا نے دراز کھولی پورے دفتر میں  
سنسنی پھیل گئی۔ پہلے تو چھوٹا بھائی بڑا کی ریلوے انجن کی  
سیٹی نما چیخ نے سارے دفتر کو اس کے کمرے میں جمع کر لیا۔  
خود چھوٹا بھائی بڑا اسی کونے میں جا کھڑا ہوا تھا جہاں وہ اس  
وقت بھی موجود تھا۔ اس کے بعد جس جس نے بم کی زیارت  
کی، اپنی عقیدت کا اظہار اپنے اپنے انداز میں کرنے لگا تھا۔

پرچی اٹھانے کے لیے پہلے بم اٹھانا لازمی تھا اور میں  
سوچ رہا تھا کہ میں کون سا اتنا بڑا ایکسپرٹ ہوں۔۔۔ اگر بم  
اٹھانے سے ہی پھٹ جاتا تو شنو بغیر شادی کے بیوہ ہو جاتی۔  
مگر یہ اچھا موقع تھا چھوٹا بھائی بڑا سے اپنی رقم نکلوانے کا، اس  
لیے میں نے دل کڑا کر کے دستی بم اٹھا لیا۔ فوراً ہی مجھے اندازہ  
ہوا کہ یہ اصلی نہیں تھا۔ اول یہ پلاسٹک کا بنا ہوا تھا دوسرے اس  
کا وزن نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے ٹینس بال سائز اور  
شکل کے کرکیر بھی دیکھے تھے مگر وہ خاصے وزنی ہوتے تھے  
کیونکہ بارودی مواد کسی قسم کا بھی ہو، وزن رکھتا ہے۔ میں نے  
اطمینان کا سانس لیا اور چھوٹا بھائی بڑا کی طرف بڑھا اور اس  
نے چلانا شروع کر دیا۔ ”دور۔۔۔ دور رہ۔۔۔ پاس مت  
آ۔“

میں رک گیا مگر بم ہاتھ میں بال کی طرح اچھالنا  
شروع کر دیا۔ ”پاس نہیں آتا مگر چھوٹا بھائی، تمہیں یاد ہے  
مختلف اوقات میں تم نے مجھ سے کام لیے اور مجھے پوری  
ادائیگی نہیں کی۔ کیوں نا آج اس کا حساب ہو جائے۔ ہو سکتا  
ہے جلد ہی یہ بم بھیجنے والا خود دوسرا بم لے کر آئے اور تم دنیا  
میں نہ رہو۔ میری رقم پھر کون دے گا؟“

چھوٹا بھائی بڑا نہایت ڈھیٹ قسم کے کنجوسوں میں  
سے ایک تھا، اس موقع پر بھی وہ مکر گیا۔ ”کیسا حساب، تیرا

میرا حساب صاف ہے۔“

اب میں بم اچھالتے ہوئے چھوٹا بھائی بڑا کی طرف  
بڑھا اور اس کی حالت خراب ہو گئی۔ حالت باقیوں کی بھی  
اچھی نہیں تھی۔ وہ سب اتنے دم بہ خود تھے کہ کسی نے کمرے  
سے بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ چھوٹا بھائی بڑا نے کانپتی  
آواز میں کہا۔ ”جلیل۔۔۔۔۔ دور رہ۔“

”نہیں چھوٹا بھائی آج میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔“ میں  
نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”مالی مشکلات نے مجھے مجبور کر دیا ہے  
کہ میں کچھ کر گزروں، کیا خیال ہے اس کی پن نہ کھینچ لوں۔“  
چھوٹا بھائی بڑا کی آنکھیں حلقوم سے باہر آ گئی تھیں  
اور اتنی زیادہ باہر آ گئی تھیں کہ مجھے خدشہ ہوا کہ اب ان کی  
واپسی ممکن نہیں ہوگی، کم سے کم کسی سرجن کی مدد کے بغیر یہ  
شاید اپنی جگہ فٹ نہ ہو سکیں۔ مگر ان آنکھوں کے پیچھے اس کا  
ذہن کام کر رہا تھا اور اس نے فوراً کہا۔ ”میرے کو یاد آ گیا  
جلیل تیرے دس ہزار دینے ہیں۔“

”تمہاری یادداشت ٹھیک سے کام نہیں کر رہی  
ہے۔“ میں نے بم اس کے منہ کے عین سامنے اچھالا۔  
”میں ہمار۔۔۔“ اس نے رو دینے والے لہجے میں

کہا۔

”اس میں کم سے کم اتنا ہی اضافہ اور کر لو۔“ میں نے  
بم بلا میں لینے کے انداز میں اس کے سر کے گرد گھمایا تو چھوٹا  
بھائی بڑا نے ہتھیرا ڈال دیے۔

”اچھا بابا اکھائیں ہمار۔۔۔ جلیل تو پکا بلیک میلر  
ہے۔“

”دنیا شرافت کی زبان کہاں سنتی ہے چھوٹا بھائی۔“  
میں نے سرد آہ بھری۔ ”اب اس سے پہلے کہ تمہاری  
یادداشت پھر متاثر ہو یا یہ بم پھٹ جائے میرے واجبات  
ادا کر دو۔“

چھوٹا بھائی بڑا نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا پرس نکالا  
اور اس میں سے پانچ ہزار کے چار اور ہزار کے دس نوٹ دو  
بار گن کر میرے ہاتھ پر رکھے۔ میں نے پہلے نوٹ چیک  
کئے اور انہیں حفاظت سے جیب میں رکھ کر دستی بم چھوٹا بھائی  
بڑا کو تھما دیا۔ اس نے پھر ریلوے انجن کی سیٹی کی چیخ ماری  
اور بم جھٹک دیا۔ وہ اچھل کر نیچر کے قدموں میں جا گرا جو  
لرزنا بھی بھول گیا تھا۔ دم بہ خود ہونے کی وجہ سے اس نے  
آنکھیں گھما کر اشارے سے اتنا لہ کہا۔ طرح دار سیکر یٹری  
اس بار بچ چکے تھے مار کر بے ہوش ہو گئی۔ کیونکہ اس نے انتظار  
نہیں کیا تھا کہ اسٹنٹ اکاؤنٹس اسے ”سنجھال“ سکے۔ یہ



فریضہ چیف اکاؤنٹنٹ نے انجام دیا تھا۔ گلوچی کی خوش مزاجی میں اضافہ ہوا تھا۔ میں نے منیجر کے پیروں سے ہم اٹھایا اور واپس احتیاط سے دراز میں رکھ دیا اور باہر کا رخ کرتے ہوئے بولا۔

”چھوٹا بھائی کسی نے مذاق کیا ہے۔ ہم نقلی ہے۔“

”نقلی ہے۔“ چھوٹا بھائی بڑا بولا اور میز کی طرف لپکا تھا۔ میں وہاں سے نکل آیا۔ عقب سے چھوٹا بھائی بڑا کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ لیکن اس سے پہلے میرے پیچھے کوئی آتا، میں وہاں سے نکل گیا تھا۔ جب سے میں نے اماں کا کام کر کے دیا تھا تب سے اماں کا موڈ خوشگوار تھا اور میری پوری کوشش تھی کہ اس سے پہلے اماں کا موڈ واپس اپنے ٹریک پر آئے میں شنو کو دلہن بنا کر گھر لے آؤں۔ مگر جب میں نے شنو کو دیے ہوئے جہیز فنڈ کا آڈٹ کیا تو انکشاف ہوا کہ اس کا وہی حشر ہوا تھا جو سرکار کے ہاتھوں عوام کے پیسے کا ہوتا ہے۔ فنڈ کا بیشتر حصہ خرد برد ہو گیا تھا اور شنو نے پورا حساب دیا کہ اس نے بیوٹی پارلر، سلمنگ سینٹرز، بوتیک اور شاپنگ پر کب اور کتنا خرچ کیا تھا۔ مجھ پر بجلی سی گری تھی کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ فنڈ نہ صرف شادی بلکہ اس کے بعد ایک درمیانے درجے کے ہنی مون کے لیے بھی کافی ہوگا۔ مگر یہاں بری ایک طرف رہی شادی کے اخراجات بھی پورے ہوتے نظر نہیں آرہے تھے۔

اماں نے واضح کر دیا تھا کہ ان کے بڑے بیٹے کی شادی تھی اس لیے وہ پوری دھوم اور دھام سے کریں گی۔ جیسے حکومت غنیمت کرنے والے سرکاری اعمال کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اسی طرح شنو سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ البتہ میں نے یہ کیا تھا کہ بچ جانے والا فنڈ اس سے واپس لے لیا تھا۔ میرا موڈ دیکھتے ہوئے شنو نے بلاچون وچرا باقی کی رقم میرے حوالے کی اور میں نے اسے اس بینک اکاؤنٹ میں جمع کر دیا جو میں نے شنو سے بھی چھپایا ہوا تھا۔ رقم اب بھی کم تھی اور اس کی کوپرا کرنے کے مشن پر نکلا ہوا تھا۔ چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر میں پیش آنے والے واقعے سے میں نے اندازہ لگایا کہ آج میری قسمت اچھی تھی، اس لیے جی سے ٹرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ممکن ہے وہاں سے بھی کچھ مال نکل آتا۔

مگر جب میں جمن خانے پہنچا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ جی نے جمن خانے کے دروازے پر سبزی کی دکان لگائی ہوئی تھی اور دکان پر خاصا رش بھی تھا۔ کیونکہ صبح کا وقت تھا اس لیے خواتین اہل و عیال کے لیے کدو کر لیے کی شاپنگ کر رہی

پوچھا۔ میں نے چشم عبرت سے وہ وقت دیکھا جب شنو بھی کسی ایسی دکان پر سبزی کی شاپنگ کر رہی ہوگی اور مجھے جھر جھری آگئی۔ خلاف توقع جی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ اس کی ایک وجہ تو اس کے آس پاس موجود کسٹمرز تھے اور دوسرے اسے ایک مددگار کی ضرورت تھی اس لیے اس نے فوراً مجھے سبزی تولنے پر لگا دیا اور خود کیش سنبھال لیا۔ دو آدمیوں کی وجہ سے رش کم ہوا اور مجھے جی سے بات کرنے کا موقع ملا۔ ”یہ تو نے کیا شروع کر دیا ہے؟“

”تو نے دیکھا نہیں، ایک گھنٹے میں دو ہزار کی سیل ہوئی ہے۔ روز دس بارہ ہزار کی سیل ہوتی ہے۔“ اس نے سرور لہجے میں کہا۔ ”ایک مہینے سے دکان چلا رہا ہوں۔ سات آٹھ ہزار کی سبزی ڈلواتا ہوں تو اتنی سیل ہو جاتی ہے۔ کچھ سبزی بچ جاتی ہے اور جو خراب ہو جائے اسے بکروں کو ڈال دیتا ہوں۔ اگر اسی طرح دکان چلتی رہی تو ایک سال بعد سامنے والی بلڈنگ بھی خرید لوں گا۔“

میں ایک بار پھر دنگ رہ گیا۔ ”سبزی بیچ کر؟“

”آج کل اس سے اچھا دھندا کوئی نہیں ہے۔“ جی نے راز دارانہ انداز میں بتایا۔ ”وہ بھی اب سبزی کھانے لگے ہیں جو پہلے مٹن اور چکن سے کم بات نہیں کرتے تھے۔ سبزی کے دام بھی آسمان پر ہیں کوئی بھی سو روپے سے کم نہیں ہے۔ منڈی سے پچاس کی ملے تب بھی سو کی بکتی ہے۔ میں تو کہہ رہا ہوں جلیل اپنے محلے میں دکان لگا لے۔ مال میں ستادلوادوں گا۔“

میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ”لیکن اس کے لیے بھی تو مال چاہیے اور میری جیب خالی ہے۔“

”ادھار پکڑ لے۔“

”لا تو دے دے۔“

جی بدکا۔ ”میں۔۔۔ پر یا میرا ہاتھ تنگ ہے آج کل۔“

”ابھی تو تو سامنے والی بلڈنگ خرید رہا تھا۔“

”وہ مستقبل کا منصوبہ ہے۔“ جی نے چالاکی سے کہا۔ ”ابھی تو میں اس دکان کے لیے لیا ہوا قرض اتار رہا ہوں۔“

”جی بے وقوف مت بنا تو خود دسیوں کو قرض دیتا ہے۔“

”اسی لیے تو خود قرض لینے پر مجبور ہوا۔“ جی نے۔۔۔

برجستہ جواب دیا۔ ”اپنی ساری رقم دوسروں کے پاس ہے۔“

جی نے مجھے لا جواب کر دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا جب



تک اس کی کوٹ نہیں پہنے گی اس سے ایک روپیہ بھی نکلوانا حال تھا۔ گاہکوں کا دوسرا ریلو آ رہا تھا اور اس سے پہلے میں مفت میں پہنتا، میں نے وہاں سے روانگی اختیار کی۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ جی دفع ہو کہنے کے بجائے روکتا رہ گیا تھا۔ آج میں تیس ہزار وصول کر چکا تھا۔ یہ بھی برا نہیں تھا۔ اس وقت راجا یا کیفے ڈی پھوس کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لیے میں نے دکان کا رخ کیا۔ استاد اکرم پولیس، ڈاکٹرز، حکیموں اور پہلوانوں کی مختلف تھراپیوں سے گزر کر اب کہیں جا کر اس قابل ہوا تھا کہ کپڑا ناک کی سیدھ میں کاٹ سکے۔ اگرچہ وہ لیڈ یز سوٹ کی کٹنگ کا ماہر تھا اور اس میں کہیں بھی صراطِ مستقیم نہیں آتا ہے۔ اگر کٹنگ خراب بھی ہو جائے تو اس سے نیا فیشن نکل آتا ہے۔

دو کاری گروں میں سے ایک بھاگ گیا تھا اور دوسرا ہاتھ آیا تھا، استاد فی الحال اسی سے کام چلا رہا تھا مگر اس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ اگر جلد دوسرے کاری گر کا بندوبست نہیں ہوا تو دکان حملے کا نشانہ بن سکتی ہے۔ اس نے بتایا کہ برابر والا لیڈ یز ٹیلر ہے اسے چند دن پہلے عبرت ناک حملے کا سامنا کرنا پڑا جب دو خواتین نے سوٹ لیٹ ہونے کی پاداش میں اسے اسی کے اوزاروں سے زو و کو ب کیا۔ ایک نے قینچی اس کے گولہ میں گھونپ دی اور دوسری نے گرم استری اس کی چاند جیسی سطح رکھنے والے سر پر آزمائی تھی۔ سیزن عروج پر تھا اور کام بہت زیادہ آیا ہوا تھا۔ استاد اکرم نے بتایا کہ اسے سر کھجانے تو کیا جس کا سونا لگانے کا وقت بھی مشکل سے ملتا تھا۔ میں نے استاد سے کہا۔

”کاری گر تم پکڑو۔“

”اس کے لیے بھی تو وقت چاہیے۔“ اس نے فریاد کی۔ ”پہلے گھر میں پڑا تھا تو بیوی کو صورت بری لگتی تھی اب گھرا تہی دیر سے جاتا ہوں کہ وہ صورت بھول جاتی ہے۔“ یہ ایک مصیبت تھی میں کاری گر کہاں سے لاتا۔ مجھے تو اس کام کا ٹھیک سے پتا بھی نہیں تھا۔ سوٹ کے معاملے میں شنو کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری خواتین کا کہاں سے کرتا۔ درحقیقت دکان استاد اکرم ہی چلاتا تھا اور وہی سب دیکھتا تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے اس نے ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ استاد اکرم نے وارننگ دی۔ ”کچھ کر جلیل بھائی، یا خود ادھر آ کر کھڑے ہو اور آنے والی عورتوں سے بات کرو۔ مجھے قینچی گھونپوانے کا شوق نہیں ہے۔ اللہ معاف کرے عورتیں باگل ہوتی جا رہی ہیں۔ جیسے جیسے مہنگائی بڑھ رہی ہے، ان کا کپڑے خریدنے اور سلوانے کا شوق جنون

بنتا جا رہا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی کہ میں جلد کاری گر تلاش کر دوں گا۔ میں باہر آیا تو برابر والی دکان میں خوف و ہراس کا عالم تھا۔ سر پر ٹوپی نما پٹی باندھے اور ترچھا کھڑا استاد کپڑا کاٹ رہا تھا اور اس کے کاری گر سر جھکائے دھڑا دھڑ مشین چلا رہے تھے۔ یہ شاید اگلے حملے کو ٹالنے کی کوشش تھی۔ میں گھر آیا اور راجا کو کال کی۔ اس کی جان پہچان وسیع تھی اور شاید اس میں کوئی کپڑے سینے والا بھی نکل آتا۔ مگر راجا خود چند دن سے اپنے باپ کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا اور وہ رات کو گدھے سے زیادہ اس کی نگرانی کرتا تھا کہ وہ فرار نہ ہو جائے۔ یہ قول راجا کے زندگی میں پہلی بار اسے گدھے سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی تھی مگر یہ اہمیت اسے مہنگی پڑ رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے کال ریسرو کی اور میری بات نے بغیر فریاد کی۔ ”جلیل مجھے ابا کے چنگل سے نکال ورنہ کل پرسوں تک تو میرے انتقال کی خبر سنے گا۔“

”انشاء اللہ۔“ میں نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے اگر اللہ نے چاہا تو۔ ویسے مدعی لاکھ برا چاہے تب بھی کچھ نہیں ہوتا ہے۔“

”جلیل میں شاعری والے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”ہاں عارفہ کے ہوتے ہوئے تجھے خیالی شاعری کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”یہ تو ہم جیسے فارغ لوگوں کا مشغلہ ہے۔“

”جلیل خدا کے لیے۔“

”دیکھ یاران معاملات میں خدا کو درمیان میں مت لایا کر۔ یہ بتا میرا ایک کام کر دے گا تو میں تجھے بچانے کے لیے آتا ہوں۔“

”میں سب کروں گا اگر تو کہے گا تو عارفہ کو بھی چھوڑ دوں گا۔“ راجا بلبلاتا کر بولا۔ عارفہ کو چھوڑنے کی پیشکش سے مجھے اندازہ ہوا کہ راجا کتنے عبرت ناک حالات سے گزر رہا ہے۔

”نہیں یار اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ مجھے بس سلائی کے ایک ماہر کاری گر کی ضرورت ہے۔“

”میں دس لادوں گا۔“ راجا نے دعویٰ کیا۔ ”تو جانتا ہے تیرے بھائی کی ہر جگہ سیٹنگ ہے۔ بس تو مجھے یہاں سے نکال لے۔“

”صبر، میرے چاند ہر چیز میں اتنی جلدی اچھی نہیں ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں تجھے نکالوں اور خود پھنس جاؤں، تیرا ابا میرے گھر آ جائے۔“



کھیل رہا تھا بلکہ اس پرچی سے تھا جو اس کے سامنے میز پر رکھی تھی۔ میں اس کے سامنے بیٹھا تو اس نے پرچی میری طرف سرکا دی۔ میں نے ہاتھ لگائے بغیر پیپر ٹائف سے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس پر نہایت خراب ہینڈ رائٹنگ میں اس سے بھی زیادہ خراب اردو میں لکھا ہوا تھا۔

”چھوٹا بھائی، میرے کو پانچ لاکھ چاہئیں۔ تیرے پاس دو دن کا مہلت ہیں۔ اگر رقم نہیں دیا تو اگلی بار... بم پھینک کر جائیں گا۔ کوئی دوسرا بات نہیں۔ اگر منجور ہے تو دفتر کے دروازے پر سفید رنگ سے او کے لکھ دیتا۔“

میں نے پرچہ ٹائف پیپر سے چھوٹا بھائی بڑا کی طرف واپس سرکا دیا اور سوالات کا آغاز کیا۔ ”سب سے پہلے یہ کس نے دیکھا؟“

”میں نے اور کون دیکھے گا۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”درازا لاک ہوتی ہے؟“

”یہ نہیں ہوتا۔“

”تمہارا کرا لاک ہوتا ہے؟“

”نہیں بس باہر کا دروازہ بند ہوتا ہے۔“

دفتر کا داخلی دروازہ نہایت مضبوط فولادی پلیٹوں کا بنا ہوا تھا کیونکہ دفتر میں ایک بڑی سی تجوری تھی جس میں عام ضرورت کے لیے بیس تیس لاکھ کیش موجود رہتا تھا۔ فیکس اور دوسرے معاملات سے بچنے کے لیے چھوٹا بھائی بڑا عام طور سے نقد ادائیگی وصول کرتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر کا دروازہ بند ہو جائے تو اندر بند کرنے کی ضرورت نہیں تھی ویسے بھی پلائی کا بنا ہوا یہ دروازہ کسی کا ایک منکا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے لاک کرنا بیکار تھا۔ میں نے کہا۔ ”تب چوکیدار کو پکڑو کہ کوئی اندر کیسے آیا اور بم کیسے رکھ گیا؟“

”اس سے پوچھ لیا ہے۔ وہ بولا کہ صبح دروازہ منجر نے کھولا۔ اس کے بعد دس لوگ آیا اور ان میں سے کوئی بھی بم رکھ سکتا ہے۔“

جو دس لوگ آئے، ان میں صفائی والا اور والی، چائے والا، سپلائی والا اور پان والا شامل تھا۔ سب سے آخر میں دوپہر کے کھانے کا آرڈر لینے والا آیا تھا۔ کل تین کردوں کا دفتر تھا۔ ایک میں چھوٹا بھائی بڑا اور اس کی سیکریٹری بیٹھتی تھی جبکہ دوسرے میں منجر اور اکاؤنٹس والے بیٹھتے تھے۔ تیسرا کرا جو ہال تھا وہاں باقی عملہ ہوتا تھا۔ باقی دو کمرے ہال کے ساتھ تھے اور ایک کونے میں چھوٹی سی جگہ دو واش روم بنے ہوئے تھے۔ ایک لیڈیز کے لیے اور ایک جینٹلس کے لیے۔ تمام جگہیں کھلی ہوتی تھیں اور کوئی بھی

”ابا کچھ نہیں کر سکتا۔“

”ابا تو نہیں کر سکتا لیکن اماں تو کر سکتی ہیں، پہلے ہی بڑی مشکل سے وہ میری شادی پر رضامند ہوئی ہیں۔“

”اچھا۔“ راجا نے مردہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن جلیل تو مجھے نکال لے گا نا؟“

”اس کی تو فکر نہ کر۔“ میں نے کہا اور کال کاٹی تھی کہ بیل بجی۔ چھوٹا بھائی بڑا کال کر رہا تھا۔ میں شکر ہو گیا۔ کال ریسیو کی تو چھوٹا بھائی بڑا نے غرا کر کہا۔

”جلیل تو نے اچھا نہیں کیا ہے، تو میرے کو جانتا ہے۔“

”جانتا ہوں لیکن اپنی ہی رقم وصول کر لینا کون سی بری بات ہے۔“

”بم تو نے رکھا تھا۔“ اس نے الزام دیا۔

میں ہنسا۔ ”اچھا ہے سیٹھ اگر تم ایسا سمجھ رہا ہے تو خوش رہو کہ اب تمہیں بھتا دینا نہیں پڑے گا۔“

چھوٹا بھائی بڑا فون پر اچھلا۔ ”دیکھ.... دیکھ تجھے پتا ہے کہ پرچی بھتے کی تھی۔“

”چھوٹا بھائی لگتا ہے آج تم بینک کی طرح اپنی عقل بھی گھر بھول آئے ہو۔ دسی بم کے ساتھ کیا دوا کی پرچی آئے گی۔“

”بم نقلی تھا۔“

”دھمکی کے لیے اصلی بم کون رکھتا ہے۔ اگر تم پن کھینچ کر دیکھ لیتے تو پرچی بھیجنے والے کی ایک آسامی کم ہو جاتی۔ بم بھی مفت میں ضائع ہو جاتا۔“

”جلیل تو سچ کہہ رہا ہے، یہ تیرا کام نہیں ہے۔“ چھوٹا بھائی بڑا کی آواز کانپنے لگی۔ ”کسی نے سچ بھیجا ہے۔“

”میں تمہاری طرف آرہا ہوں لیکن یہ بتا دو تم نے پولیس کو تو نہیں بتایا۔“

”سچ سچ عقل بھول کر نہیں آیا۔“ اس نے غظلی سے کہا۔

”دوسرے تم میرے ساتھ کوئی لفرڈ نہیں کرو گے؟“

میں نے یقین دہانی چاہی۔

”آ جا بابا کوئی لفرڈ نہیں ہوگا۔“

کچھ دیر بعد میں چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر میں تھا جہاں معمول کے مطابق کام ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے بھتے کی پرچی کا تعلق ملازموں سے نہیں تھا اس لیے وہ سب مطمئن تھے کہ ادائیگی سیٹھ کو کرنی ہے۔ تمام تر ٹینشن چھوٹا بھائی بڑا کے منہ پر تھی۔ اس کا تعلق اس بم سے نہیں تھا جس سے وہ اب خود



آنے والا کہیں بھی جاسکتا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”ان دس میں یقیناً میں نہیں تھا تب تم نے میرا نام کیوں لیا؟“

”اپنا گنج گھوم رہا ہے۔“ اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

”اس وقت سمجھ میں نہیں آیا تھا۔“

”چلو اب سمجھ میں آ گیا ہے نا۔“ میں کھڑا ہو گیا۔

”سیٹھ یہ کوئی اور چکر ہے تم استادنی ٹی سے بات کرو۔“

”اس سے بات کیا ہے پر وہ کہتا ہے کہ اس کی ہیڈک نہیں ہے۔“

”تم اسے بھتا دیتے ہو تو اس کا فرض ہے، تمہیں دوسرے بھتا خوروں سے محفوظ رکھے۔“

”ایسا پہلے ہوتا تھا اب تو دس بھتا مانگنے والا ہے بابا۔“

اس نے فریادی لہجے میں کہا۔ ”اگر مانگنے والا جینوین ہے تو دینا پڑتا ہے۔“

”تب دے دو۔“

”پانچ لاکھ۔“ اس نے اپنے ابھرے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ”دے سکتا ہے پر یہ تو معلوم ہو کہ مانگنے والا جینوین ہے۔“

”تب کیا چاہتے ہو؟“

”دیکھ جلیل میرے کو لگ رہا ہے کہ یہ کوئی موقع سے قائمہ اٹھارہا ہے۔ ادھر سب کو پتا ہے کہ استادنی ٹی کا ہولڈ ہے اور کوئی دوسرا بھتا مانگنے نہیں آ سکتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ یہ کوئی فصلی شیرا ہے؟“

”ایک دم، تو سوچ کہ کس میں اتنا جرات ہے؟“

”ٹھیک ہے تب بھتا نہ دو۔“

”اس میں بھی خطرہ ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں اسے پکڑنا چاہتا ہے۔“

”تو پولیس کو بول دو، آج کل دیے بھی پولیس بہت سرگرم ہے۔“

”پولیس والے کون سے کم بھتا خور ہیں۔“ اس نے جل کر کہا۔ ”دیکھ جلیل اگر تو اسے تلاش۔۔۔۔۔“

”مجھے تو معاف رکھو۔“ میں نے کہا۔ ”میں ان چکروں میں نہیں پڑتا۔“

”جلیل میں تجھے فیس دوں گا۔“

فیس کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ رقم کی مجھے اشد ضرورت تھی۔ میں نے چھوٹا بھائی کو ٹالا نہیں تھا، سچ سچ انکار کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بھتا خوری کے پیچھے ایسی مافیائیں ملوث ہیں جن کے سامنے آنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہ آدمی کو ایسے مار دے۔ تھی ہیں جیسے آدمی پھر مارتا

ہے مگر فیس کے لانچ نے میرے رال بنانے والے غدود کی کارکردگی میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے سوچا اور پوچھنے کے بجائے چھوٹا بھائی بڑا سامنا کر دیا۔ ”ٹھیک ہے اگر تم پانچ لاکھ کے آدھے یعنی ڈھائی لاکھ مجھے دیتے ہو تو میں تلاش کر دوں گا۔“

خلاف توقع چھوٹا بھائی بڑا اچھلا نہیں تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ڈھائی لاکھ زیادہ ہے۔“

”پانچ لاکھ سے کم ہے۔“

”دیکھ میں اسے پانچ نہ دے کر رسک لے گا اور تجھے ڈھائی دے گا تو بھی رسک ہے۔“

”دیکھ لو، اگر تم آدھے دے کر آدھے بچا سکتے ہو تو کیا برا ہے اور دوسرا تمہاری جان کی قیمت پانچ لاکھ ہے تو میری بھی ڈھائی لاکھ بن جائے گی۔ رسک میرے لیے بھی ہو جائے گا۔“ میں پھر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھ جا جلیل۔“ چھوٹا بھائی بڑا ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ ”جیادہ جلدی کا نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے مگر جیادہ دیری کا بھی نہیں ہے۔ فیصلہ کر لو کہ وقت تمہارے پاس بھی کم ہے۔“

بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا اور اٹھ کر اپنی تجوری کا ایک خانہ کھولا۔ اس کی تجوری میں دو الگ خانے تھے۔ دونوں الگ الگ کھلتے تھے۔ اس نے ادھر سے ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر میرے سامنے رکھیں اور بولا۔ ”یہ ڈیڑھ لاکھ ہے اگر تیرے کو منظور ہے تو بول، ورنہ جا۔“

مچھلی کے سامنے چار اڈال کر اسے بولا جائے کہ جا تب وہ بھی نہیں جاتی۔ چارے پر منہ مارے بغیر نہیں رہتی ہے۔ مجھے ڈیڑھ لاکھ مل جاتے تو میرا مسئلہ حل ہو جاتا۔ میں نے گڈیوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے منظور ہے۔“

مگر چھوٹا بھائی بڑا نے مجھ سے پہلے گڈیاں اچک لیں اور بولا۔ ”ایسے نہیں پہلے بندہ میرے سامنے آئے گا تب تجھے ڈیڑھ ملے گا۔“

”چھوٹا بھائی ادا نیگی کے معاملے میں تمہارا ٹریک ریکارڈ بہت خراب ہے اور میری قسمت کہ ایک لٹکی دستی بم کے طفیل تم نے میرے پچھلے واجبات ادا کیے۔ اب تم کام ہونے کے بعد مکر گئے تو میں کیا کروں گا؟“

چھوٹا بھائی بڑا نے سوچا اور اپنی قمیص کے گلے میں ہاتھ ڈال کر ایک تعویذ برآمد کیا۔ سیاہ ڈوری سے لٹکا چاندی



بر یانی کے ٹھیلے کا رخ کیا۔ مگر اس کی بارودی بر یانی نے میرا وہ حشر کیا جو نادر شاہ نے دلی کا کیا تھا یا پھر حوالدار نادر شاہ تھانے آنے والوں کا کرتا تھا۔ بر یانی والے کی اصل سیل کولڈ ڈرنک کی ہوتی تھی کیونکہ ایک پلیٹ کھانے والا جب تک دو بوتل پیٹ میں نہیں ڈال لیتا، اسے کسی پہلو چین نہیں آتا تھا۔ بہ زبان شاعر اک آگ سی پیٹ میں لگی ہے۔ یا پھر یہ پہلو سلگتا ہے تو وہ پہلو بدلتے ہیں۔ مجھے بھی دو بوتلیں حلق میں اتارے بغیر چین نہیں آیا اور بر یانی والے کو پیسے دیتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ”مرچوں کے کھیت اپنے ہیں یا چاول مرچوں کے ساتھ اگائے جاتے ہیں اس بر یانی کے۔“

اس نے دانت نکالے اور پیسے وصول کر کے اگلے گا ہک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹھنڈی کولڈ ڈرنک سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ برابر والے ٹھیلے سے کھوئے والی قلفی کھائی تو ذرا سکون ہوا۔ یہ ٹھیلا بر یانی فروش کے بھائی کا تھا۔ دونوں بھائیوں کا بزنس ایک دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔ راجا اور اس کا باپ اس وقت تک گھاٹ سے آچکے ہوتے تھے۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ دکان پر آئیں تو میں جاؤں کیونکہ میرا گھاٹ پر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ڈھائی بجے راجا دکان پر تھا اور گلی کے کونے سے وہ استری کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کا باپ آس پاس ہے یا نہیں۔ میں نے راجا کا نمبر ملایا اور اس نے چونک کر پہلے اندر دیکھا اور پھر موبائل نکالتا ہوا دکان سے ذرا باہر آیا۔ اس نے کال ریسیو کی اور سرگوشی میں بولا۔ ”جلیل کچھ دیر بعد کال کرنا ابا دکان میں ہے۔“

”میں گلی کے کونے پر ہوں اگر تیرا ابا شام تک دکان سے نہ گیا تو کیا میں یہیں بیٹھا رہوں گا۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ شاید ابا کھانا کھانے جائے۔“ راجا نے مردہ لہجے میں کہا۔ ”ویسے تیرا کیا خیال ہے اگر ابا کھانے کے لیے گیا تو مجھے چھوڑ دے گا۔ وہ رات سوتا بھی میری چار پائی کے پاس ہی ہے۔ اگر میں کروٹ بھی لوں تو وہ اٹھ بیٹھتا ہے۔ جلیل تو سوچ نہیں سکتا کہ میں کس مشکل میں ہوں۔“

”راجا ہڈ حرام کہاں مر گیا ہے۔“ پیچھے سے راجا کے باپ کی چنگھاڑتی آواز آئی۔ ”استری تیرا باپ کرے گا؟“

”میں جا رہا ہوں۔“ راجا نے کہا اور فون رکھتے ہوئے عجلت میں اندر چلا گیا۔ فی الحال میرے ذہن میں بھی کوئی ترکیب نہیں آرہی تھی جس پر عمل کر کے میں راجا کو

کے بکس والا تعویذ بہت ہی پرانا تھا غالباً چھوٹا بھائی بڑا کو پیدائش کے وقت پہنایا گیا تھا۔ اس نے عقیدت سے اسے چوما اور میری طرف بڑھا دیا۔ ”جلیل یہ میرے کوماں نے پہنایا تھا جب میں پانچ سال کا تھا۔ تعویذ کا معلوم نہیں پر یہ میری ماں کا نشانی ہے۔ تو بدلے میں اسے رکھ لے۔ چھوٹا بھائی اپنی ساری دولت کے بدلے بھی اسے نہیں دے گا۔“

میں نے تعویذ دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”میں یہ نہیں لے سکتا۔“

وہ خفا ہو گیا۔ ”تو چھوٹا بھائی پر اعتبار نہ کر مگر اس پر کر سکتا ہے۔“

”بات اعتبار کی نہیں چھوٹا بھائی رشتے کی ہے۔ تم ماں کو درمیان میں لے آئے ہو اب میں تعویذ لوں یا نہ لوں اگر تم نے دینا ہے تو دو گے اور نہیں دینا تو تعویذ کے بدلے بھی نہیں دو گے۔“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”تمہارا کام ہو جائے گا لیکن تمہیں میرے کہنے پر عمل کرنا ہے۔“

”تو کیا کہتا ہے۔“ چھوٹا بھائی نے خوش ہو کر کہا۔

”پرسوں صبح دروازے پر سفید رنگ سے اوکے لکھوا دو مگر بہت نمایاں نہ ہو۔ ایسا لگے جیسے کسی بچے نے شرارت میں لکھ دیا ہے۔“

”ہو جائے گا۔“ اس نے کہا تو میں اس کے دفتر سے نکل آیا۔ اب مجھے راجا کو اس کے باپ کی قید سے آزاد کرانا تھا کیونکہ اس سے مجھے دونوں کام لینے تھے۔ سلائی کے ماہر کا تو اس نے وعدہ کیا تھا مگر راجا سے وعدہ جبراً وفا کرنا پڑتا تھا اور دوسرا کام اب چھوٹا بھائی بڑا کو بھستے کی پرچی بھیجنے والے کی تلاش تھی۔ مجھے چھوٹا بھائی بڑا کی بات درست لگ رہی تھی کہ یہ کسی فصلی شیرے کا کام ہے۔ ورنہ آج کل بھتا مانگنے والے اتنے دیدہ دلیر ہو گئے ہیں کہ علی الاعلان مانگتے ہیں اور اپنی شناخت کرا کے جاتے ہیں کہ آدمی کے دل میں کوئی ابہام نہ رہے۔ اس قسم کے پلاسٹک سے بنے اصل نظر آنے والے دستی بم بچوں کے کھلونوں کی دکانوں پر عام ملتے ہیں۔ صرف دستی بم ہی نہیں بلکہ ہر طرح کے پستول اور خود کار رائفلیں ہر سائز میں اور بالکل اصل کے مشابہ نقل ملتی ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ جو چور ڈاکو اصل ہتھیار لینے کی سکت نہیں رکھتے ہیں، وہ ان کھلونا ہتھیاروں سے کام چلاتے ہیں۔ لٹنے والا ان کو اصل سمجھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے اور بلا چون و چرا اپنا سب کچھ لٹیروں کے حوالے کر دیتا ہے۔

لنچ کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے آتش فشاں دلی والی

جاسوسی ڈائجسٹ



جیسے ہی مجھے دیکھا، وہ اٹھ کر بیٹھا اور سرکوشی میں غرایا۔  
”جلیل دفع ہو جا یہاں سے۔“

”ابا اسی نے بچایا ہے۔“ راجا نے اسے مطلع کیا۔  
”بائیک پر یہی آیا تھا اور آواز لگائی تھی ورنہ اس وقت تم  
فرشتوں کو حساب دے رہے ہوتے۔“

راجا کے باپ نے اسے گھورا۔ ”بکواس مت کر۔“  
”اس سے پہلے وہ دوبارہ آئیں، تم دونوں یہاں  
سے نکل جاؤ۔“ میں نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر  
فوت ہونے کا ارادہ ہو تو یہیں بیٹھے رہو۔“

میں نے اشارہ دے دیا تھا اور حسبِ توقع راجا اندر  
سے دوڑتا ہوا برآمد ہوا جب میں بائیک آگے بڑھانے والا  
تھا، وہ اچک کر پیچھے بیٹھ گیا اور میرے کان میں بولا۔  
”جلیل بھاگ لے۔“

میں پہلے ہی ایسی لیئر گھما چکا تھا۔ بائیک نے جھٹکا لیا  
اور راجا پیچھے گرتے گرتے بچا۔ مگر اس نے قطعی برا نہیں منایا  
کیونکہ پیچھے اس کا باپ تھا جو راجا کے فرار پر اس کی  
ولدیت میں نامناسب تبدیلیاں کر رہا تھا۔ جب تک ہم گلی  
کے کونے تک پہنچے تبدیلیوں کی تعداد درجن سے تجاوز کر چکی  
تھی۔ ملا کی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے ہماری دوڑ کیفے ڈی  
پھوس تک تھی۔ اس بھاگ دوڑ میں بائیک کا تو نہیں پتا لیکن  
ہمارا سانس پھول گیا تھا اور ایک ایک کپ دودھ پتی حلق  
سے اتار کر ہمارے حواس ٹھکانے آئے تھے۔ میں نے راجا  
سے کہا۔ ”میں نے اپنا کام کر دیا ہے اب تو میرا کام کر کے  
دے۔“

حسبِ روایت راجا نے عیاری کا مظاہرہ کیا۔ ”تو  
نے کیا کیا۔۔۔۔۔ یہ تو بھٹا مانگنے والوں کا کام تھا۔ اللہ ان کا  
بھلا کرے۔“

”بیٹے اگر میں آ کر تم باپ بیٹے کو نہ بچاتا تو اس وقت  
تو عارفہ تو کیا کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔“ میں نے  
اسے یاد دلایا۔ ”پھر میں ہی تجھے بائیک پر لا کر فرار ہوا اور  
تیرے باپ سے گالیاں کھائیں۔“

راجا قطعی شرمندہ نہیں ہوا مگر بہر حال میرا کام کرنے  
پر راضی ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”یہ تو ہو گیا وہ کام جو تو  
بلا معاوضہ کرے گا۔ ایک دوسرا کام بھی ہے جس میں آمدنی  
کی توقع ہے، اس سے تجھے بھی شیر ملے گا۔“

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اسٹاک مارکیٹ بہت  
گری ہوئی ہے، میں شیر نہیں لوں گا۔“  
”جامل وہ والا شیر نہیں حصے والا شیر۔ تجھے حصہ ملے

وہاں سے نکال سکتا۔ ہاں راست اقدام کیا جاسکتا تھا کہ میں  
بائیک دوڑاتا ہوا لے جاتا اور راجا بھاگ کر پیچھے بیٹھتا اور  
میں اسے دکان سے اس طرح لے جاتا جیسے پر تھوی راج  
سوئبر سے سنجوگتا کو اٹھا کر گھوڑے پر بٹھا کر لے گیا تھا۔ مگر  
اول تو میں پر تھوی راج نہیں تھا۔ دوسرے راجا سنجوگتا نہیں  
تھا اور تیسرے میرے پاس بائیک آدھے ہارس پاؤر کی بھی  
نہیں تھی۔ اگر میں راجا کو لے کر فرار ہونے کی کوشش کرتا تو  
اس کا باپ ہمیں گلی کر اس کرنے سے پہلے پکڑ لیتا۔ بالفرض  
محال میں کامیاب بھی ہو جاتا تو راجا کا باپ سیدھا میرے  
گھر پہنچتا اور اماں کو شادی ملتوی کرنے کا جینوین بہانہ ہاتھ  
آ جاتا۔

www.paksociety.com

ابھی میں وہاں سے روانہ ہونے کا سوچ رہا تھا کہ دو  
خطرناک نظر آنے والے مسٹنڈے راجا کے باپ کی دکان  
میں داخل ہوئے۔ ان کے عزائم دور ہی سے خطرناک نظر  
آ رہے تھے۔ میں ذرا آگے بڑھا تو دکان کے نظر آنے  
والے حلیے سے بھی تصدیق ہو گئی۔ استری والی نیبل الٹی پڑی  
تھی اور تمام ہینگر گرا دیے گئے تھے۔ اندر سے آتی آوازوں  
سے ظاہر تھا کہ آنے والے بد معاش بے جان اشیا کے بعد  
جاندار اشیا پر مشقِ ستم کر رہے تھے اور وہاں جاندار صرف  
راجا اور اس کا باپ تھا۔ آگے آنے پر مزید تصدیق ہوئی۔  
ایک مسٹنڈا راجا کو پچنگ بیگ کے طور پر استعمال کر رہا تھا  
اور دوسرا راجا کے باپ کی گردن دبا کر اسے شیم کرنے کی  
کوشش کر رہا تھا۔ مجھے دوسرے کی کوشش پر کوئی اعتراض  
نہیں تھا جیسا کہ راجا کو بھی نہیں ہوتا مگر راجا میرا دوست تھا  
اور میں اسے یوں مار کھاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دخل در  
معقولات کا نتیجہ میرے حق میں برانکل سکتا تھا اس لیے میں  
نے حکمتِ عملی سے کام لیا اور واپس آ کر بائیک اسٹارٹ کی۔  
ہیلمٹ پہنا۔ نمبر پلیٹوں پر سیاہ شاہ پر چڑھائے۔ بائیک  
تیزی سے دکان کے پاس لا کر روکی اور چلا کر کہا۔

”یہاں سے نکل لو پولیس موبائل آرہی ہے۔“

یہ کہتے ہی میں نے بائیک واپس موڑ کر دوڑا دی اور  
عقبی آئینے میں ان دونوں کو عجلت میں دکان سے نکلتے  
دیکھا۔ انہوں نے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی تھی۔ میں گلی  
کے سرے تک پہنچا اور موڑ کر بائیک روکی۔ اتر کر جھانکا تو وہ  
دونوں دوسرے سرے پر غائب ہو رہے تھے۔ ان کے  
جاتے ہی میں واپس دکان پر آیا جہاں راجا اپنا بگڑ جانے  
والا منہ آئینے میں ملاحظہ کر رہا تھا اور اسے جان بلب باپ کی  
ذرا بھی پروا نہیں تھی مگر اس کے بہ ظاہر دم توڑتے باپ نے



راجا یقیناً مفت میں بیگار کر رہا تھا اور اس کی جیب خالی تھی اس لیے رقم کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ ”مجھے کیا ملے گا؟“

”تو چاہے تو دیہاڑی پر کام کر لے۔ روز کا ایک ہزار ملے گا۔ یا پھر اکٹھا دس ہزار لے لیتا۔“

”پندرہ دیتا ہے تو میں غور کرتا ہوں۔“

پندرہ بھی برے نہیں تھے مگر میں فوراً مان جاتا تو راجا مشکوک ہو جاتا کہ مجھے بڑی رقم مل رہی ہے اس لیے میں خاصی رد و کد اور چیخ کی بعد میں پندرہ پر مان گیا۔ مگر اس پر واضح کر دیا کہ پیسا اس وقت ملے گا جب کام ہو جائے گا کیونکہ مجھے بھی اسی وقت ملے گا۔ راجا نے کام کا پوچھا لیکن میں نے اسے اصل بات نہیں بتائی۔ وہ بھتے اور دستی بم کی دھمکی کا سن کر ہدک سکتا تھا۔ ”تجھے کل صبح سے چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر کی نگرانی کرنی ہے۔ وہاں کون آتا جاتا ہے نوٹ کرنا ہے اور کیوں آتا ہے، یہ بھی جانتا ہے۔“

راجا متفکر ہو گیا۔ ”سارا دن نگرانی کرنی ہوگی؟“

”نہیں کل صرف صبح اس وقت تک نگرانی کرنی ہے

جب تک باہر کے لوگ دفتر میں آتے جاتے رہیں۔“

”دفتر میں تو سارا دن باہر کے لوگ آتے جاتے

ہیں۔“

”میرا مطلب ہے وہ لوگ جو کسی کام سے دفتر میں

آتے ہوں۔“

”جلیل تیرا دماغ چل گیا ہے چھوٹا بھائی کے دفتر میں

کیا کوئی تفریح کرنے آئے گا۔“

”پوری بات تو سن لیا کر۔“ میں نے بھٹنا کر کہا اور پھر

اسے تفصیل سے سمجھایا کہ اسے کن لوگوں کی آمد چیک کرنی

ہے۔ راجا نے سر ہلایا۔

”میں سمجھ گیا، لیکن وہاں سب میرا تھو بڑا پہچانتے

ہیں۔“

”فکر مت کر میں تیرا حلیہ ایسے بدلوں گا کہ تیرا باپ

بھی تجھے پہچان نہیں سکے گا۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ راجا نے خوش ہو کر کہا۔ ”حلیہ

مستقل نہیں ہو سکتا؟“

”ہو سکتا ہے اگر تو اپنے ان بالوں کی قربانی دے

سکے جو کانٹوں والے جانور سے مل رہے ہیں۔“

راجا نے بڑی مشکل سے اسپانگ ہیئر اسٹائل بنایا تھا

اور وہ بادل نا خواستہ ان کی قربانی پر آمادہ ہوا تھا۔ میں اسے

## بچے کا باپ

ایک عورت سے کسی نے پوچھا۔ ”کیا تمہارا بچہ اپنے باپ پر گیا ہے؟“

”خدا کا شکر ہے، نہیں..... ورنہ میرے شوہر تو غصے سے دیوانے ہو جاتے۔“

☆☆☆

چھوٹے بڑے سبھی میچ ہار کر غیر ملکی دورے سے واپس آنے والی ٹیم کے اعزاز میں عشاء یہ دیا گیا اور عشاء یہ کے بعد کیپٹن سے درخواست کی گئی کہ وہ ان اسباب سے آگاہ کرے جن کے باعث ٹیم کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

”کون کہتا ہے ہماری ٹیم کو شکست ہوئی ہے۔“ کیپٹن نے گرج کر کہا۔ ”ہم نے گیارہ میچ کھیلے تھے اور ملکی و غیر ملکی اخبارات گواہ ہیں کہ ہماری ٹیم نے گیارہ میں سے پورے سات عدد ٹاس جیتے تھے۔“

☆☆☆

ایک بوڑھا: ”میرا خیال ہے کہ ٹیلی ویژن، اخبار کی جگہ لے لے گا۔“

دوسرا: ”اتحق کہیں کے، بھلا ٹیلی ویژن سے بھی کوئی کھیاں اڑا سکتا ہے۔“

☆☆☆

ایک محفل میں ایک لڑکی دوسری لڑکی کو اپنی پرانی سہیلی سلٹی سمجھ بیٹھی۔

”سلٹی۔“ اس نے کہا۔ ”اللہ تم کتنی بدل گئی ہو؟ پہلے تم موٹی ہوا کرتی تھیں، اب دہلی ہو چکی ہو۔ پہلے تمہارے بال سنہرے تھے، اب سیاہ ہیں۔ پہلے تمہاری نظر ٹھیک تھی، اب تم چشمہ لگاتی ہو۔ پہلے تم بھدی لگتی تھیں، اب حسین لگ رہی ہو۔“

دوسری لڑکی نے حیرت سے پہلی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میرا نام سلٹی نہیں، شکلیہ ہے۔“

”اوہ، اوہ۔“ پہلی نے ہنس کر دوسری کے خسار پر ہلکی سی چپٹ لگائی۔ ”شریر کہیں کی، تم نے اپنا نام تک بدل لیا ہے۔“

کراچی سے آسیہ مینا کا انکشاف



ایک سیلون لے گیا۔ وہاں اس کی دوسرے اسٹائل میں ہیئر کٹنگ اور شیو بنوائی۔ پھر اس کے بالوں کو ڈائی کرایا۔ ڈل کولڈن کمر میں آنے سے راجا کا ستر فیصد حلیہ ویسے ہی بدل گیا تھا۔ وہاں سے نکلے تو ایک ٹھیلے سے میٹرکس اسٹائل کے سن گلاسز لے کر راجا کو دیے تو حلیے میں تبدیلی نوے فیصد ہو گئی۔ راجا نے آئینے میں خود کو دیکھا اور بولا۔ ”ابا اب بھی پہچان لے گا۔ وہ میرے کپڑوں سے شناخت کر لے گا۔“

ظاہر ہے راجا نے جو پہنا ہوا تھا، وہ اس کے باپ کے گاہکوں کا تھا۔ مجبوراً مجھے راجا خبیث کو دوسرے کپڑے بھی دلوانے پڑے۔ لنڈے سے لی گئی اپورٹڈ جیز اور ٹی شرٹ میں راجا بالکل ہی بدل گیا تھا۔ اس کے بعد اسے پانچ سو بھی دینے پڑے تھے تب اس نے جا کر جان چھوڑی۔ میں نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ ہڈ حرامی بالکل نہیں چلے گی اور مجھے کل بارہ کے بعد کیفے ڈی پھوس میں مکمل رپورٹ چاہیے۔ راجا نے مجھے دو لڑکوں کا پتا بتایا جو سلائی کا کام کرتے تھے اور ان دنوں بے روزگار تھے۔ میں راجا سے نمٹ کر ان کے پاس پہنچا اور ان میں سے ایک مجھے ڈھنگ کا لگا تھا۔ اسے لے جا کر میں نے استاد اکرم کے حوالے کر دیا۔ ”فی الحال اس سے کام چلاؤ اگر بات نہ بنی تو دوسرا تلاش کریں گے۔“

”مجھے کام آتا ہے جی۔“ لڑکے نے احتجاج کیا۔

”اگر آپ نے رکھنا ہے تو ابھی بتادیں۔“

”ابھی سے کیسے بتادیں۔“ استاد اکرم اسے گدی سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ ”پہلے کچھ کر کے تو دکھا۔“

ایک مسئلے سے نمٹ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔

اب دوسرا مسئلہ رہ گیا تھا یعنی چھوٹا بھائی بڑا کا۔ اگلے دن

میں کیفے ڈی پھوس پہنچا تو وہاں راجا کے بجائے اس کا باپ

بیٹھا ہوا تھا اور بد قسمتی سے میں نے اس وقت اسے دیکھا

جب وہ میرے سر پر آ گیا تھا۔ بھاگنے کی گنجائش بھی نہیں

تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ”وہ ولد الحرام کہاں ہے؟“

”کون تمہارا بر خوردار یا گدھا؟“

”دیکھ جلیل میرے ساتھ اڑی بازی نہ کر، ورنہ

میں تیرے گھر پہنچ جاؤں گا۔“ اس نے دھمکی دی تو میں فوراً

سیدھا ہو گیا۔

”خالو ناراض کیوں ہوتے ہو۔ راجا کل شام تک

میرے ساتھ تھا۔ اس کے بعد اسے نادر شاہ لے گیا۔“

”نادر شاہ۔“ راجا کے باپ نے فکر مند ہو کر کہا۔

”مگر کیوں؟“

”یہ تم نادر شاہ سے جا کر پوچھ لو۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے رات تھانے میں اس کا جبری نکاح ہوا ہو نادر شاہ کی دختر بد اختر کے ساتھ اور ویسے بھی اب صرف نکاح ہی باقی رہ گیا تھا۔“

راجا کا باپ خود کسی چکر میں چند دن پہلے تھانے سے

آیا تھا اور دوبارہ اس طرف جانے کے موڈ میں نہیں تھا اس

لیے مجھے برا بھلا کہتا ہوا رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی

نزدیکی میز پر بیٹھا ہوا راجا اٹھ کر میرے پاس آیا تو میں

دنگ رہ گیا۔ راجا کے باپ کیا میں نے بھی نوٹ نہیں کیا تھا

کہ وہ بغل میں بیٹھا ہے اور اس کا باپ اس کا ڈھنڈورا پتا

نہیں کہاں پیٹنے گیا تھا۔ راجا نے دانت نکالے۔ ”تو نے

ٹھیک کہا تھا ابا بھی نہیں پہچان سکے گا۔ مگر یہ تو کیا بکواس کر رہا

تھا کہ تھانے میں میرا جبری نکاح ہو چکا ہے۔“

”اگر ایسا نہ کہتا تو تیرا باپ اتنی آسانی سے جان کہاں

چھوڑتا۔ اب رپورٹ دے فٹافٹ۔“

”پہلے چائے منگوا۔“ راجا نے مطالبہ کیا۔ میں نے

اس کا مطالبہ پورا کیا اور اس نے پہلا گھونٹ لیا اور بولا۔

”چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر میں صبح کے وقت چھ سات افراد

آتے ہیں ایک منٹ۔۔۔۔“ اس نے جیب سے ایک کاغذ

نکالا۔ ”سب سے پہلے ایک مہترانی اپنے میاں کے ساتھ آئی

اور کیا خوب آئی، اس نے جو لباس پہن رکھا تھا۔۔۔۔۔“

”کام کے وقت شعر و شاعری سے پرہیز کیا کر۔“

بادل نا خواستہ راجا نے آگے پڑھا۔ ”اس کے بعد

ایک کباڑی آیا جو روز کی بنیاد پر دفتر میں استعمال ہونے والا

کاغذ، کارٹن اور دوسری چیزیں لے جاتا ہے۔ پھر ایک

چائے والا لڑکا آیا۔ ساڑھے دس بجے سلاز آیا اور اس نے

مال سلائی کیا۔ سب سے آخر میں گیارہ بجے سامنے والے

ہوٹل کا لڑکا آیا۔ وہ لٹچ کا آرڈر لینے آیا تھا۔“

”ان کے پاس اندر جاتے ہوئے سامان کیا کیا

تھا؟“

صفائی کرنے والے جوڑے کے ہاتھوں میں جھاڑو

اور ٹوکریاں تھیں۔ تیلے جیسے میاں نے صرف بنیان اور

شارٹ پہن رکھی تھی البتہ اس کی ترقی پذیر بیوی نے جو

چولی۔۔۔۔۔“

”راجا کام کی بات کر۔“ میں نے پھر بات کاٹی۔

راجا کی بانی رپورٹ کا خلاصہ یوں تھا۔ کباڑی ایک

خالی تھیلا لایا تھا اور بھر کر لے گیا تھا۔ چائے والا لڑکا چینگ

اور کپ لایا تھا۔ سلاز کارٹن میں سامان لایا تھا اور سکندر کی



تھا یا حرام خوری پر اتر آیا تھا۔ بہر حال اس نے مزید میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ”تو نے کل جو خرچ کیا تھا سمجھ لے وہی میرا معاوضہ ہے، مجھے تجھ سے اور کچھ نہیں چاہیے۔“

راجا دفع ہوا تو میں طیش میں چائے کے گھونٹ پیتا رہ گیا۔ اس کے بعد میں چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر روانہ ہوا۔ وہ حسب معمول کرسی پر اکڑوں بیٹھا ہوا پان چبارہا تھا۔ طرح دار سیکریٹری شد و مد سے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیوں خار کھاتی تھی کیونکہ میں جب آتا اس کی تیوری پر بل سے پڑ جاتے تھے۔ حالانکہ میرا اس سے کبھی کسی قسم کا کوئی معاملہ نہیں رہا اور نہ ہی ہمارے درمیان بات ہوئی تھی۔ میں نے چھوٹا بھائی بڑا سے کہا۔ ”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

کی بورڈ پر سیکریٹری کی چلتی انگلیاں رک گئیں۔ غالباً اس کے کان ہماری طرف لگ گئے تھے۔ چھوٹا بھائی بڑا منہ اوپر کر کے غرغرایا۔ ”غرو۔“

”چھوٹا بھائی بات اکیلے میں کرنے کا ہے۔“  
چھوٹا بھائی بڑا نے اپنی سیکریٹری کو دیکھا جو نظر کا اشارہ بھی سمجھتی تھی مگر وہ بادل نا خواستہ اٹھ کر گئی تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ہماری گفتگو سننا چاہتی تھی مگر یہ تجسس ایک فطری چیز تھی۔ غالباً اسے اور دفتر والوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ چھوٹا بھائی بڑا مجھ سے کام لے رہا ہے اور مقصد بھتے کی پرچی بھیجنے والے کا پتا چلانا ہو سکتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے آہستہ سے کہا۔ ”چھوٹا بھائی جب تم کل دفتر آئے تو کیا وقت ہوا تھا؟“  
”دس بجے کا ٹیم تھا۔“

”سپلائر، چائے والا اور لنچ والا تینوں میں سے کون تمہارے سامنے آئے تھے؟“  
”تینوں۔“ اس نے میری بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

”کبارا اٹھانے والا تمہارے کمرے میں آتا ہے؟“  
”نہیں اس کے مطلب کا سامان ادھر واش روم کے سامنے ڈھیر کر دیا جاتا وہ ادھر سے لیتا ہے اور جاتا ہے، کمرے میں نہیں آتا۔“

میرا اندازہ رفتہ رفتہ درست نکل رہا تھا لیکن میں نے اپنا شبہ ظاہر کرنے کے بجائے چھوٹا بھائی بڑا سے پوچھا۔ ”جب تم دفتر میں آئے تو کون کون آچکا تھا؟“

”یہ جینت (زینت)۔“ اس نے اپنی سیکریٹری کی

طرح خالی ہاتھ واپس کیا تھا۔ جبکہ آرڈر لینے والا لڑکا آیا اور گیا خالی ہاتھ تھا۔ راجا سے گفتگو کے دوران میں میرا ذہن اس رپورٹ کا تجزیہ کر رہا تھا۔ سپلائر اور کباری کو میں نے اس سے نکال دیا کیونکہ وہ چھوٹا بھائی بڑا کے کمرے تک نہیں جا سکتے تھے۔ ان کا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ چائے والا لڑکا اور لنچ کا آرڈر لینے والا لڑکا صرف اس صورت اندر جاتے جب چھوٹا بھائی یا اس کی سیکریٹری اندر ہوتے۔ اب صرف صفائی کرنے والا جوڑا بچتا تھا۔ وہ صبح سب سے پہلے آتے تھے اور انہیں ہر کمرے میں جانا ہوتا تھا، کوئی انہیں نہیں روکتا اور نہ چیک کرتا۔ وہ آتے بھی سب سے پہلے تھے۔ راجا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”جلیل یہ کیا چکر ہے جب تک تو مجھے پوری بات نہیں بتائے گا، میں ٹھیک سے کام کیسے کروں گا اور ہو سکتا ہے پھر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے۔“

میں نے سوچا اور راجا کو اصل بات بتادی۔ وہ بھتے کی پرچی اور جعلی دستی بم کا سن کریوں اچھلا جیسے بم اس کے نیچے رکھا تھا۔ ”جلیل تیری عقل گھاس چر نے چلی گئی ہے۔ اس شہر میں ہونے والے ہر پانچ میں سے تین قتل اسی چکر میں ہو رہے ہیں۔“

”یہ وہ چکر نہیں ہے۔ کوئی چھوٹا بھائی بڑا کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”اور وہ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔“ راجا غفلت سے بولا۔ ”اس نے تجھے مرنے کے لیے کیا معاوضہ دیا ہے۔ تیس چالیس ہزار دے دیا ہوگا۔ اتنی رقم کے پیچھے تو موت کے فرشتے کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔“

”راجا میں احمق نہیں ہوں اور نہ ایسا لالچی ہوں کہ موت خرید لوں۔ تو جانتا ہے میں ہمیشہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتا ہوں۔ میں نے چھوٹا بھائی سے کہہ دیا ہے کہ جس وقت مجھے لگا اس معاملے میں سچ سچ کا کوئی بھتا خور ملوٹ ہے، میں پیچھے ہٹ جاؤں گا۔“

”تو پیچھے ہٹ جائے، کیا وہ پیچھے ہٹے گا۔“ راجا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تو نے تو مجھے بھی مراد دیا تھا۔ میں وہاں تین گھنٹے کھڑا رہا اگر پرچی بھیجنے والا دفتر کی نگرانی کرا رہا ہوگا تو کیا اس نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا؟“

”راجا اس میں خطرہ اتنا نہیں ہے۔“ میں نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ کھڑا ہو گیا۔

”جلیل مجھے معاف کر، مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب تو ایسے چکروں میں بھی ہاتھ ڈالنے لگا ہے۔“ راجا سچ سچ ڈر گیا

جاسوسی ڈائجسٹ



طرف اشارہ کیا۔ ”حاجی بھائی (منیجر) اور جمیر الدین (ضمیر الدین چیف اکاؤنٹنٹ) آگیا تھا۔ باقی میرے سامنے آیا۔“

”تب تک تم نے دراز نہیں کھولی تھی۔“

”نہیں ادھر کام کا چیز ہوتا ہے جب کام ہو تو کھولتا

ہے۔“

”چھوٹا بھائی تم نے بھی اپنے طور پر تفتیش کی ہوگی۔ یعنی ان لوگوں سے پوچھ گچھ کی ہوگی جو تم سے پہلے آئے تھے۔ اس کی کیا رپورٹ ہے؟“

چھوٹا بھائی بڑا نے حسین آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”جلیل تو جج جج جج ہیں ہے بالکل اپنا دیسی شراک ہو کر ہے۔“

صبح سے پہلے منیجر حاجی بھائی آیا تھا اور وہی دفتر کھولتا تھا۔ اس کے بعد چیف اکاؤنٹنٹ ضمیر الدین آیا تھا اور تیسرے نمبر پر زینت آئی تھی۔ حاجی بھائی کا کہنا تھا کہ اس کے ساتھ ہی صفائی کرنے والے میاں بیوی آئے تھے اور ضمیر الدین کی آمد سے پہلے انہوں نے پورے دفتر میں جھاڑو پھیر دی تھی۔ ضمیر الدین اور زینت تقریباً آگے پیچھے دفتر میں آئے تھے۔ رپورٹ سننے کے بعد میں نے پوچھا۔ ”چھوٹا بھائی فرض کرو یہ دفتر میں آنے والوں میں سے کسی کا کام ہے تو تمہیں کس پر شک ہے؟“

وہ ہنسی بھرا۔ ”آدمی کس پر شک کرے۔ یہ صفائی کرنے والا میاں بیوی پندرہ سال سے آرہا ہے۔ دفتر سے کبھی ایک روپے کا چیز بھی غائب نہیں کیا۔ کئی بار لوگوں کا پرس، موبائل اور دوسرا چیز ادھر ادھر ہو گیا پر یہ ہمیشہ ایمان داری سے لا کر دیا۔“

مجھے مایوسی ہوئی۔ چھوٹا بھائی بڑا کا شک بھی ان پر گیا تھا مگر ساتھ ہی وہ ان کی صفائی بھی پیش کر رہا تھا اگر چھوٹا بھائی بڑا کو ان پر شک نہیں تھا تو بہت زیادہ امکان تھا کہ اس معاملے میں ان کا ہاتھ نہیں تھا اور نہ چھوٹا بھائی بڑا نہایت شکی طبیعت کا مالک تھا اور غالباً اپنے باپ پر بھی بھروسہ نہ کرتا۔ ایسا شخص جب کسی کی صفائی پیش کرے جبکہ وہ معمول میں زیادہ مشکوک نظر آ رہا ہو تو اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ میں نے کہا۔ ”تم کل نشان لگوادو۔ یہ کام صبح سویرے ہو جانا چاہیے۔ اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ کون اس نشان کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔“

”تو کہاں سے دیکھے گا؟“

”یہ مجھ پر چھوڑ دو۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ میں باہر آیا اور منیجر و حاجی بھائی کے کمرے کے پاس سے

گزر تو سیکریٹری اندرا سسٹنٹ اکاؤنٹنٹ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تمہیں چھوٹا بھائی بلارہا ہے۔“

جب وہ منہ بنائے چھوٹا بھائی بڑا کے کمرے میں جا رہی تھی تو میں مسکراتے ہوئے باہر نکل آیا۔ کیونکہ گزشتہ روز مجھے دلی بریانی کا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے آج میں نے بیچ کے لیے دلی نہاری کا رخ کیا۔ مگر یہاں بھی مرچوں کی شمولیت ہول سیل میں تھی۔ آتش فشاں نہاری افغانی نان کے ساتھ کھا کر اور اوپر سے ایک جگ پانی لی کر میں اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ بائیک پر گھر جاسکوں مگر گھر تو جانا تھا۔ اماں نے کچھ سودا منگوایا تھا اور خبردار کیا تھا کہ شام سے پہلے لا کر دوں ورنہ برے انجام کے لیے تیار رہوں اور فی الحال میرا برا انجام اماں کے ہاتھوں یہی ہو سکتا تھا کہ میری شادی کے لیے ہونے والا راضی نامہ واپس لے لیا جاتا۔ اس لیے میں کسی نہ کسی طرح بائیک چلاتا ہوا گھر واپس پہنچ گیا۔ ویسے تو شہر قاعدہ میں اب صراطِ مستقیم پر سفر کرنا آؤٹ آف فیشن ہو گیا۔ کیونکہ سڑکیں اور گلیاں اس قابل نہیں ہیں۔

جہاں مین ہول نہیں کھلے وہاں بجلی اور گیس والوں نے صرف پبلک کی خاطر گڑھے کھود رکھے ہیں جن میں خلاف محاذ رہ گرتی بھی پبلک ہے۔ سڑکوں کے گڑھے اب کسی توجہ کے لائق نہیں رہے ہاں اگر کوئی سڑک چند میٹرز بھی سلامت ہو تو گزرنے والے شبہ کرنے لگتے ہیں کہ وہ غلطی سے شہر سے باہر تو نہیں نکل گئے۔ راستے میں بچھے فقیروں، اشتہاری حکمیوں، دندان سازوں، پہلوانوں اور حجاموں سے بچ کر ٹکنا آپ کی ذاتی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے کسی پر بھی بائیک چڑھانے کا انجام عبرتناک ہو سکتا تھا۔ کتوں کا ذکر میں نے یوں نہیں کیا کہ وہ بہر حال آپ کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں اور آپ کے ساتھ ریس لگاتے ہیں۔ ایسے میں عموماً بائیک سوار دونوں پاؤں اوپر کر کے بائیک چلانے کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر مجھ میں پاؤں اٹھانے کی سکت بھی نہیں تھی۔

اس لیے جب ایک ناہنجار کتے نے تفریحاً بائیک کے ساتھ ریس لگائی۔ تو میں ایک چلتے پھرتے خیمے میں گھستے گھستے بچا۔ خیمے میں موجود خاتون نے فلک شکاف چیخ ماری حالانکہ میں اس سے کئی انچ کے فاصلے سے گزر چکا تھا۔ اس پر اس کے غیرت مند شوہر نے کتے کی پیروی کی اور ریس کا آغاز کیا تھا کہ کتا خیمے میں گھس گیا۔ اسے نکالنے کے لیے شوہر کو بھی خیمے میں جانا پڑا اور جب تک عقبی آئینے میں خیمہ نظر آتا رہا، اس میں سے کتا اور شوہر کوئی برآمد نہیں ہوا تھا۔



بیوی کچرا کنڈی کی دیوار پر ایک نظر نواز میں لگی ہوئی تھی۔  
میں ایک درخت کے پیچھے سے ان کی نگرانی کر رہا تھا۔  
اگر پرچہ اور جعلی بم رکھنے کا کام ان سے لیا گیا تھا تو  
جلد یا بدیر کوئی ان سے رابطہ کرتا۔ مگر یہ لازمی بھی نہیں تھا۔  
پرچہ بھیجنے والا خود بھی آنکھیں رکھتا ہوگا اور وہ چھوٹا بھائی بڑا  
کے دفتر پر پنا ہوا او کے خود بھی دیکھ سکتا تھا۔ کچرا کنڈی ایک  
چورا ہے پر بھی۔ مگر یہ رہائشی علاقہ تھا اس لیے یہاں ٹریفک کا  
رش بہت کم تھا۔ سامنے سے ایک گاڑی آرہی تھی اور جب وہ  
نزدیک آئی تو میں چونکا کیونکہ اس کی فرنٹ سیٹوں پر دو جانی  
پہچانی شخصیات براجمان تھیں۔ گاڑی چورنگی سے ذرا پہلے  
رکی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھی شخصیت نیچے اتر گئی۔ وہ چورنگی کی  
طرف آنے لگی اور گاڑی مڑ کر واپس چلی گئی۔ میں سوچ رہا  
تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ جب وہ شخصیت اس درخت سے آگے  
نکل جس کے پیچھے میں روپوش تھا تو چند لمحوں کے تذبذب کے  
بعد میں نے فیصلہ کیا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔

میں اب تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ جانے والی شخصیت  
کا موجودہ صورت حال سے کوئی واسطہ بھی تھا یا یہ کوئی اور ہی  
چکر تھا۔ تعاقب کا یہ سلسلہ چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر تک جاری  
رہا اور پھر وہ شخصیت اندر چلی گئی۔ میں کوئٹہ ہوٹل پر رک گیا  
تھا۔ مشکل سے ایک منٹ بعد گاڑی آکر چھوٹا بھائی بڑا کے  
دفتر کے سامنے پارکنگ میں رکی اور اس سے دوسری شخصیت  
اتر کر اندر چلی گئی۔ دس بجے تک چھوٹا بھائی بڑا اور دوسرا عملہ  
آچکا تھا۔ میں اندر پہنچا تو چھوٹا بھائی بڑا ایک ہاتھ سے سر اور  
دوسرے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اکرڈوں بیٹھا ہوا تھا۔  
بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ چھوٹا بھائی بڑا بچپن سے قبض کا  
مریض تھا اور اس پوز کا عادی ہو گیا تھا۔ میں پرچہ دیکھ کر ہی سمجھ  
گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کہاں سے آیا؟“

”ادھر دراز میں رکھا تھا۔“ چھوٹا بھائی بڑا نے مردہ  
لہجے میں کہا۔ ”یہ جو بھی ہے، بہت گھسا پیٹا ہے۔“

زینت ابھی تک کمرے میں نہیں آئی تھی۔ حالانکہ وہ  
دفتر آچکی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا لکھا ہے؟“

”خود پڑھ لے۔“ چھوٹا بھائی بڑا نے پرچہ میری  
طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس بار بھی احتیاط سے پکڑا کہ  
میری انگلیوں کے نشانات نہ آئیں۔ اس پر اسی خراب تحریر  
اور خراب ترین اردو میں لکھا تھا۔

”شاباش تو نے اپنا جان بچا لیا ہے۔ اب پانچ لاکھ  
روپیہ ہزار کے نوٹوں کی گڈیوں میں رکھ کر پیکٹ بنا لے۔  
نوٹ سارے پرانے ہوں۔ ہر گڈی پر بینک کی سیل

میں اس دن ایک کامیڈی سے محفوظ نہیں ہو سکا تھا مگر راہ  
گیر ضرور محفوظ ہوئے ہوں گے۔ صحیح سلامت گھر پہنچا تو  
اطمینان کا سانس لیا۔ سامان اماں کے حوالے کیا اور داد  
چاہی۔ ”دیکھا اماں کیا وقت پر آیا ہوں؟“

”ہاں بیٹا مجھے معلوم ہے کیوں وقت پر آیا ہے۔“  
اماں نے آئینہ دکھایا۔ ”یہ بتاؤ سے کہاں غائب تھا؟“  
”نوکری کی تلاش کرنے گیا تھا۔“ میں نے اندر  
جاتے ہوئے کہا تو عقب سے اماں کی ہنسی سنائی دی تھی۔  
ظاہر ہے انہوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ اماں  
سے بہتر مجھے کون جان سکتا تھا؟

☆☆☆

صبح سویرے منہ اندھیرے یعنی ٹھیک نو بجے میں  
چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر سے کچھ قاصلے پر ایک کوئٹہ ہوٹل میں  
موجود تھا۔ چائے پرائٹھا کا ناشا کرتے ہوئے میں نے نگرانی  
بھی جاری رکھی تھی۔ دفتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں  
نے دیکھ لیا تھا کہ دروازے پر سفید رنگ سے ذرا غیر واضح  
او کے لکھا تھا۔ گویا چھوٹا بھائی بڑا نے میری ہدایت پر عمل کیا  
تھا۔ ٹھیک سوانو بجے حاجی بھائی نازل ہوا اور اس نے دفتر کا  
دروازہ کھولا۔ اسی اثنا میں ایک طرف سے شوخ و چنچل مہترانی  
اور اس کا سنگل پسلی شو ہر نمودار ہوئے۔ بیوی پان سے شوق  
کرتی تھی تو شوہر یقیناً جس پیتا تھا یہ بات دونوں کی شکلوں  
سے عیاں تھی۔ بیوی کے ساتھ شوہر ایسا لگ رہا تھا جیسا ہنڈا  
ففتی کا کئی سال پرانا پہیا کسی نئے چمکتے دسکتے ریڈیل ٹائر کے  
ساتھ لگ سکتا ہے۔ وہ دفتر کے اندر چلے گئے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ عمارت سے نکلے تو مہترانی  
کے شوہر نے غور سے دروازے کو دیکھا اور پھر بیوی کے  
پیچھے باہر آیا۔ اس نے کچرے سے بھری ٹوکریاں اٹھا رکھی  
تھیں۔ وہ روانہ ہوئے تو میں ان کے پیچھے تھا۔ بانیٹ  
میں نے ہوٹل کے پاس ہی چھوڑ دی تھی۔ کل میں نے راجا کو  
ٹوک دیا تھا مگر آج مہترانی کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے  
دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ وہ خاصی آفت قسم کی چیز تھی۔  
اسے دیکھنے والے بہت تھے مگر شوہر کی وجہ سے کوئی پاس  
نہیں آتا تھا۔ وہ اسی چیز کا فائدہ اٹھاتی تھی اور اپنے حسن کی  
نمائش کر کے لوگوں کے دل جلاتی تھی۔ کچھ دور جا کر  
انہوں نے کچرا ایک کچرا کنڈی میں الٹا اور شوہر اس میں سے  
اپنے کام کی چیزیں نکالنے لگا ساتھ ہی اس نے پہلے سے  
جیب میں موجود اور آدھی پی ہوئی سگریٹ نکال کر سلگائی اور  
چند کش لیے۔ میرا اندازہ درست تھا وہ چرس پی رہا تھا۔



ہوئے۔ جلد تجھے بتاتا ہوں کہ رقم کیسے بھیجی ہے۔“  
 چھوٹا بھائی بڑا نے ایک ناقابل بیان لقب دے کر  
 کہا۔۔۔۔۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ رقم کیسے بھیجنا ہے۔“  
 ”چھوٹا بھائی رقم کا بندوبست کرلو۔“ میں نے کہا تو وہ  
 چڑ کر بولا۔

”تو نے اب تک کیا کیا ہے؟“  
 ”میں جو کر رہا ہوں، اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ نکل آئے  
 گا۔ ناکامی یا کامیابی دونوں صورتوں میں تم خسارے میں  
 رہو گے بس خسارے کی مقدار کم زیادہ ہوگی۔“  
 اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اپن کا نصیب ہی ایسا ہے،  
 باپ بولا تھا چھوٹا تو جب چالا کی دکھائے گا تیرے کو نقصان  
 ہوگا۔“

”تو کیا یہ سب تم نے بے وقوفی دکھا کر کیا ہے۔“  
 میں نے کہا۔ زینت اندر آئی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ”اچھا  
 سیٹھ اب میں چلتا ہوں تمہارا کام نہیں ہونے کا ایسا کرو پانچ  
 لاکھ دے دو۔ سمجھ لو جان کا صدقہ نکالا ہے۔ زندہ رہو گے تو  
 ایسے پانچ لاکھ دن میں کماتے رہو گے۔“

چھوٹا بھائی بڑا ذرا حیران ہوا تھا مگر میں اس کے  
 تاثرات پر توجہ دیے بغیر باہر نکل آیا۔ میں نے منجر حاجی  
 بھائی سے ایک بات پوچھی اور اس نے جو جواب دیا، وہ  
 میری توقع کے عین مطابق تھا۔ میں باہر آیا اور پھر سے کوئٹہ  
 ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا۔ دو پہر تک میں وہیں رہا پھر ایک قریبی  
 برگروالے سے برگر لے کر کچ بھگتایا۔ شام کے قریب وہی  
 شخصیت دفتر سے نکلی اور اسی سمت چل پڑی جس طرف سے  
 صبح آئی تھی۔ میں نے بتایا کہ یہ رہائشی علاقہ تھا اور یہاں  
 پبلک ٹرانسپورٹ نہیں چلتی تھی۔ میں نے کچھ دیر بعد بایک  
 اٹھائی اور اپنا مکھڑا ہیلمٹ میں چھپا کر اس کے پیچھے روانہ  
 ہوا۔ مگر فاصلہ رکھا تھا کیونکہ اس نے بہر حال میرا لباس  
 دیکھا ہوا تھا اور مجھے اس سے پہچانا جاسکتا تھا۔ چورگی سے  
 پہلے میں کچرا کنڈی کے پاس رک گیا۔ اس سے اٹھنے والا  
 دھواں مجھے آڑھیا کر رہا تھا۔

حسب توقع دوسری طرف سے گاڑی آئی اور پیدل  
 آنے والی شخصیت اس کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے  
 بایک گاڑی کے پیچھے لگا دی اور تقریباً بیس منٹ بعد گاڑی  
 ایک فلیٹ میں داخل ہوئی۔ میں باہر ہی رک گیا۔ مجھے معلوم  
 کرنا تھا کہ گاڑی میں موجود دو افراد میں سے کون یہاں آیا  
 ہے اور کیا وہ پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ جب گاڑی اندر چلی گئی  
 تو میں بایک سے اتر کر چوکیدار کے پاس آیا اور سوکا ایک

نوٹ ہاتھ میں دبا کر اس سے پوچھا۔ ”یار ایک بات بتا سکتے  
 ہو؟“

”پوچھو۔“ اس نے نوٹ کو تاڑتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ جو ابھی گاڑی اندر گئی ہے، اس میں کون تھا؟“  
 وہ سیانا تھا مگر سوکا نوٹ لے کر اس نے بتا دیا کہ گاڑی  
 میں جانے والے افراد کون تھے اور ان کا آپس میں کیا رشتہ  
 تھا؟ میں سن کر اچھل پڑا اور چوکیدار کو غالباً افسوس ہوا کہ اس  
 نے زیادہ قیمتی معلومات بہت کم قیمت میں بیچ دی تھی۔ واپسی  
 میں ایک بار پھر تذبذب میں پڑ گیا تھا کہ ان دونوں  
 چکروں کا آپس میں کوئی تعلق ہے یا یہ الگ الگ چکر تھے۔  
 میں نے چھوٹا بھائی بڑا کو کال کی۔ اس نے رکھائی سے پوچھا۔  
 ”اب کائے کو کال کرتا ہے؟“  
 ”یہ بتاؤ کہ پرچی والے کی طرف سے اور کوئی پیغام  
 آیا؟“

”نہیں پر تو کیوں۔۔۔۔۔؟“  
 ”چھوٹا بھائی تم کہاں ہو؟“  
 ”دفتر میں۔“

”وہیں رکو، میں آ رہا ہوں اگر میں لیٹ ہو جاؤں تب  
 بھی انتظار کرنا جانا مت۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔  
 چھوٹا بھائی بڑا چلتا رہ گیا تھا کہ کائے کو۔ میں تقریباً ایک  
 گھنٹے بعد اس کے دفتر پہنچا تو وہاں سب بند تھا۔ حد یہ کہ آس  
 پاس کے ہوٹل اور دکانیں بھی بند ہو گئی تھیں کیونکہ یہ دفتری  
 علاقہ تھا اور یہاں جب تک دفتر کھلتے تھے سب کھلتا تھا اور  
 جیسے ہی دفتر بند ہوتے باقی سب بھی بند ہو جاتا تھا۔ فولادی  
 دروازہ چھوٹا بھائی بڑا نے خود کھولا اور کھا جانے والی نظروں  
 سے مجھے دیکھا۔

”میں سوکھ گیا تیرے انتظار میں۔“  
 ”چھوٹا بھائی اگر اللہ نے چاہا تو کل تک وہ بندہ گرفت  
 میں آ جائے گا۔“  
 ”وہ کیسے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے کہا اور اس کے  
 کمرے میں آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کیا کروں گا تو  
 اس نے ہنس کر کہا۔  
 ”تو نے کیا پرچی بھیجنے والے کو اتنا بے وقوف سمجھا  
 ہے۔“

”نہیں میرا خیال ہے، وہ مجبور ہے۔“ میں نے  
 جواب دیا اس دوران میں اپنے کام میں بھی مصروف  
 رہا۔ اپنا کام کر کے میں نے چھوٹا بھائی بڑا کو خبردار کیا۔



گا۔ اسے بولنا اسٹاپ کی طرف پیدل جائے اور جو اس سے روک کر پیکٹ مانگے اسے دے دے۔“  
میں نے پرچہ پڑھ کر اس کی طرف سرکا دیا۔ ”تب تم نے کیا سوچا ہے؟“

چھوٹا بھائی بڑا نے سرد آہ بھری۔ ”اب کیا کرے۔۔۔ برو بردینا پڑے گا۔“

سیکریٹری زینت کان لگائے ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ میں نے میز پر پین ہولڈر سے ایک پین نکالا اور چھوٹا بھائی سے کہا۔ ”پین بڑا اچھا والا رکھا ہے۔“ میں نے کہتے ہوئے اس کا کیپ کھولا۔ ”اوہ یہ تو اسپائی کیلم ہے۔“ میں اٹھ کر سیکریٹری کے پاس آیا اور اس سے کہا۔ ”مجھے کمپیوٹر میں لگا کر اس کی ریکارڈنگ دیکھنی ہے۔“

سیکریٹری کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ بت کی طرح ساکت ہو گئی تھی۔ میں نے پین کی یو ایس بی کمپیوٹر میں لگائی اور چند منٹ بعد اس نے فولڈر کھول دیا۔ میں نے فولڈر میں موجود ریکارڈ شدہ ویڈیو چلائی۔ چھوٹا بھائی بڑا بھی اٹھ کر میرے پیچھے آ گیا تھا۔ میں نے ریکارڈنگ کو تیزی سے چلا کر اس وقت تک پہنچایا جب کیلم میں سیکریٹری نمودار ہوئی جو دراز کھول کر اس میں پرچہ رکھ رہی تھی۔ میں نے حیرت سے چھوٹا بھائی بڑا کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو مس زینت ہیں، لیکن انہوں نے ایک جھوٹ اور بولا ہوا ہے یہ کس نہیں ہیں بلکہ مسز ضمیر الدین بھی ہیں اور لازمی بات ہے کہ دونوں میاں بیوی اس چکر میں شامل ہیں۔“

چھوٹا بھائی بڑا کا غصے سے برا حال ہو گیا تھا، اس نے کھٹی کھٹی آواز میں کہا۔ ”جینت تو نے میرے کو اتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔ میں نے تیرے ساتھ کیا برا کیا تھا؟“

”اس کے شوہر کو بھی بلا لو اور دونوں سے حساب کتاب کرتے رہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پہلے میرا حساب کر دو۔“

”تو ادھر بیٹھی رہ۔“ چھوٹا بھائی نے اسے حکم دیا اور تجوری کھول کر ڈیڑھ لاکھ روپے نکال کر میرے حوالے کیے۔ ”جلیل اب تو جاتیرا کام ختم۔“

”تم نے ٹھیک کہا چھوٹا بھائی۔“ میں نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”اب تمہارا کام شروع ہے۔“

جب میں باہر جا رہا تھا تو چھوٹا بھائی سیکریٹری کو حکم دے رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کو بھی بلائے۔ میں مسکراتے ہوئے باہر نکل آیا۔

”کسی چیز کو مت چھیڑنا بلکہ اب تم بھی چھٹی کرو۔“

چھوٹا بھائی بڑا میرے ساتھ باہر آیا۔ اس نے گیٹ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ”جلیل یہ کیا چکر ہے، تجھے دفتر میں کس پر شک ہے؟“

”کل صبح تک سب سامنے آجائے گا۔ اگر میرا شک غلط نکلا تو میں سوری کر لوں گا اور نا کامی کا اعتراف کر لوں گا۔“

کیونکہ اس کے سوا اور کوئی میرے ذہن میں نہیں ہے۔“

جیسے جیسے میں کڑیاں ملارہا تھا، مجھے لگ رہا تھا کہ ان دونوں معاملات کا آپس میں تعلق ہے۔ دفتر کے یہ دو لوگ ہی اس کھیل کے پیچھے تھے مگر مجھے پکا ثبوت درکار تھا۔ وہاں سے میں دکان پر آیا جہاں استاد اکرم خوش خوش ایک سل جانے والے سوٹ کو استری کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”جلیل بھائی تم اچھا لڑکا لایا کام میں پکا ہے۔“

میں نے دکان میں دیکھا تو مجھے پرانا والا لڑکا نظر آیا۔ ”پر وہ ہے کہاں؟“

”ادھر پیچھے والی گلی میں گیا ہوا ہے۔“ استاد اکرم نے چپک کر کہا تو میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

”تمہارا مطلب ہے جس کا سوٹ لگانے گیا ہے۔“

”ہاں اس کے بغیر کام کیسے کرے گا؟“

”تم لوگ جس بیوی دنیا جہاں کی منشیات استعمال کرو مگر کام میں کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔“

میں نے استاد اکرم سے کہا تھا کہ میں اس مہینے کی آمدنی میں سے کچھ نہیں لوں گا۔ وہ رکھے کیونکہ دکان بھی اسے دوبارہ سے جمانی تھی اور وہ جتنے عرصے بے روزگار رہا تھا اس پر قرض چڑھ گیا تھا۔ میں اگلے مہینے سے اپنا حساب کتاب کرتا۔ اس لیے استاد اکرم کوشش کر رہا تھا کہ اس مہینے

زیادہ سے زیادہ کام لے اور کمالے۔ البتہ میں نے اس سے شنو کے کپڑے سلوا لیے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ سارے سوٹ سردیوں والے تھے اور اب سردی تقریباً جا چکی تھی۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے شادی کے بعد ہی کوئی سوٹ سلوا کر دوں گا۔ شادی تک کوئی فضول خرچی نہیں کرنی تھی۔

☆☆☆

میں تقریباً گیارہ بجے چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر پہنچا اس وقت تک سب آچکے تھے اور اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے۔ میں نے چھوٹا بھائی بڑا سے سلام دعا کی اور صورت

حال کا پوچھا تو اس نے دراز سے ایک پرچہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ اس میں لکھا تھا۔ ”چھوٹا بھائی تم پانچ لاکھ روپیہ اپنی سیکریٹری کو دے کر شام پانچ بجے جب چھٹی ہوتا ہے نیچے

جاسوسی ڈائجسٹ



مندی، کلیسا، سینی گاک، دھرم شالے اور انا تہ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ پورا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہر ناچا بیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو عمرو د کے دماغ کا مجھڑ بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تخیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...









دوسری چیخ ٹھیکہ کے حلق سے برآمد ہوئی تھی، اس چیخ میں دہشت، درد اور کرب تھا پھر وہ ہڈیانی انداز میں بھائی کو پکارنے لگی۔ ”شش..... شوکی..... آہ..... تہ..... تم ظالمو!..... تم نے مم..... میرے بھائی کو..... آہ.....“ فرط غم سے ٹھیکہ ڈھسے گئی۔ میں یہ سب دیکھتا اور سستا ہی رہ گیا حالانکہ یہ میری فطرت کے خلاف تھا۔ ایسے کسی بھی نازک موقع پر میرے جسم کا رُوداں پھڑک اٹھتا تھا مگر یہ سب خلاف توقع اور بہت تیزی سے ہوا تھا۔ ٹھیکہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی، میں سر تا پا خونِ جنوں میں لتھڑ گیا، قانون کے رکھوالوں نے جس طرح اپنی وردی کے طاقت کے نشے میں نہتے مظلوموں پر سفاکی و بربریت کا جو بھیا نک کھیل کھیلا تھا، اس کے سامنے تو مجھے بڑے بڑے مجرم پانی بھرتے محسوس ہوئے، پل کے پل میرے دل و دماغ کی عدالت میں مجھے ارشد اور شوکی سفید کفن پہنے کھڑے دکھائی دینے لگے۔ تب میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا۔

”آج تیرا آخری وقت ہے ڈپٹی۔“ میں دانت بھیج کر بڑبڑایا۔

”کا کے..... اندر کیا ہو رہا ہے؟“ معا مجھے عقب سے اول خیر کی سرسراتی سرگوشی سنائی دی۔ میں نے ہولے سے کہا۔ ”تیرے ڈپٹی نے آج اپنی موت پر دستخط کر دیے ہیں اول خیر۔“

”او خیر.....“ وہ ہولے سے بڑبڑایا۔ اس کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔ دفعتاً مجھے ڈپٹی روشن خان کے ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔

”سر! یہ تو سب ختم ہو گئے، اب لڑکی کو کہاں لے کر جائیں گے۔ اندر ہی گلا دبا کر ارشد کی طرح اس کی لاش بھی کہیں دبا دیں گے۔“

دوسرے نے بھی اپنے ”صاحب“ کو یہی مشورہ دیا۔ ”پرویز ٹھیک کہہ رہا ہے سر! ایک عورت کو ٹھکانے لگانا کون سا مشکل ہے۔“

”کیا یہ مر گیا ہے۔ اس کو دیکھو تو سہی۔“ ڈپٹی کی مکروہ آواز ابھری۔ چند ثانیے کی اس دھڑکتی خاموشی میں مجھے ہر طرف خون اچھلتا دکھائی دینے لگا۔ آواز پھر ابھری۔ ”مر گیا ہے۔ میری گولی اس کے پیچھے کے پار ہو گئی۔“ یہ پرویز تھا۔ ختم ناگ کی طرح جیسے میری آنکھوں کی چلیوں میں ڈپٹی کے بعد پرویز کی شبیہ ثبت ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے اندر چلو، اس کی بہن کو بھی اس کے پاس پہنچا کر دونوں کی لاشیں دور ویرانے میں گاڑ دینا۔“ ڈپٹی

جاسوسی ڈائجسٹ

روشن کی سفاک آواز ابھری اور میرے جیسا مضبوط اعصاب کا انسان بھی اس کھلی بربریت پر ایک لمحے کو تھرا اٹھا۔ ٹھیکہ صدمے اور خوف کے مارے بے ہوش ہو چکی تھی اور یہ لوگ اب اسے اندر لے جا کر بے ہوشی کی حالت میں ہی گلا دبا کر مار ڈالنا چاہتے تھے، اس بربریت پر میرے دل و دماغ کی کیفیت پھرے ہوئے آتش فشاں جیسی ہونے لگی تھی۔ میرا دل خون کے آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا اور مجھے اپنے ہاتھوں پیروں سے شرارے پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ جس بے رحمی اور سفاکی سے انہوں نے ہمارے دو ساتھیوں کو اپنی بربریت کی بھیشت چڑھایا تھا، میں بھی انہیں ایسا ہی جواب دینے کے لیے بری طرح بے چین ہو کے تڑپنے لگا۔ یہ مشکل اپنی کھولتی ابلتی کیفیات پر قابو پائے ہوئے تھا۔

سن گن لینے کے بعد وہ لوگ واپس اندر کی جانب پلٹ گئے تھے، میں نے اول خیر کو قلیل ترین الفاظ میں سارے حالات سے آگاہ کیا اور اپنے خطرناک عزائم سے بھی پھر اندر قدم رکھ دیا۔ چوکیدار سے چھینا ہوا ڈنڈا میرے ہاتھ میں تھا، اگرچہ اول خیر کا دیا ہوا پستول بھی میرے پاس تھا۔ اول خیر نے میرے خطرناک جنوں خیز عزائم جاننے کے بعد کچھ کہنے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ مجھے کسی مصلحت کوئی اور دور اندیشی کے فلسفوں میں الجھانا چاہتا تھا۔

”اول خیر! تم کو لوٹنا ہے تو لوٹ جاؤ۔ میرے کاندھوں پر قرض کا پہاڑ آن پڑا ہے۔ میں تمہاری کسی مصلحت کو آج نہیں سمجھ پاؤں گا۔“ میں نے غراتی ہوئی سرگوشی میں کہا، مجھے ہی نہیں اول خیر کو بھی میری جلتی بلکتی آواز بدلی ہوئی محسوس ہوئی تھی، وہ بولا۔

”خیر کا کا میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ تو تو ایک دم یاری باشی کا نانا تا توڑنے پر تل بیٹھتا ہے۔ میرا کوئی بھی ایسا مشورہ میرے اپنے اور تیری بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔“

”بس اول خیر! وقت کم ہے۔“ وہ میرا اشارہ بھانپ کر بولا۔ ”چل پھر کا کے میرے نال آ۔“ (تیرے ساتھ ہوں)

ہم نیم تاریک احاطے میں آ گئے۔ ہر سو گہری رات کا سناٹا طاری تھا۔ کسی کمرے کی کھڑکی سے روشنی پھوٹ رہی تھی، ہم دونوں تیزی کے ساتھ مرکزی دروازے کی طرف آ گئے۔ خلاف توقع دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ شاید باہر موجود چوکیدار پر انہیں کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا پھر داخلی آہنی گیٹ کو بھی بند ہی سمجھے تھے، اسی لیے اندر کا دروازہ بند



کہ جب میں کسی ایسی وحشت جنوں خیز کیفیات سے دوچار ہونے لگوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت شہزاد احمد خان عرف شہزی کو دروازہ دار آگ میں بھی کود پڑنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ پھر میں نے ڈنڈا پھینک کر پستول ہاتھ میں لے لیا اور دروازے کو دھڑ سے کھول کے اندر جا پڑا۔ وہ دونوں بری طرح ٹھٹکے۔ ایک لمحے کو تو ان کی سمجھ میں ہی نہ آ سکا، یہ ہوا کیا ہے۔ پھر جب تک انہیں اندازہ ہوا کہ وہ اپنے سامنے یقینی موت کو کھڑا دیکھ چکے ہیں، میرے پستول کی نال نے آتشیں قہقہہ اگلا اور دوسری گولی اول خیر کے پستول سے شعلے کی طرح لپکی، دو دھماکے تلے اوپر گونجے اور اس میں ان دونوں شیطانی چیلوں کی چیخیں بھی شامل تھیں۔ ایک سینہ پکڑے اور دوسرا کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا تھا۔ پھر میں ایک دروازے کی طرف لپکا جبکہ دوسرے دروازے کی طرف اول خیر نے اچھل کر دروازے پر ضرب لگائی اور گویا کسی طوفانی بگولے کی طرح اندر جا پڑا مگر میری وحشت خوں رنگ نظروں کی بے قراری کو قرار نہ ملا۔ مجھے وہ صفت ابلیس ڈپٹی روشن کہیں نظر نہ آیا۔ یہ کرا کچھ چھوٹا بھی تھا اور بیڈروم نظر آتا تھا۔ بہت سادہ فرنیچر تھا یہاں..... میں جس تیزی سے گھسا تھا، اسی تیزی کے ساتھ واپس پلٹا۔ کمرے سے نکلا۔ دوسرے کمرے کی طرف لپکا جہاں اول خیر نے پیش قدمی کی تھی، وہاں پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اول خیر کو میں نے ایک دوسرے دروازے پر زور آزمائی کرتے پایا۔ یہ شاید کچن کا دروازہ تھا۔ یہ کمرا نسبتاً بڑا تھا۔ بیڈ کے علاوہ صوفہ بھی رکھا ہوا تھا۔ ایک میز کرسی بھی تھی، ٹھیک اسی وقت کمرے میں عجیب سی بو پھیلنے لگی۔ یہ گیس کی بو تھی، جو عام طور پر چولھے جلانے کی ہوتی ہے۔ میں ابھی تک نہ سمجھ پایا تھا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ اول خیر دور ہٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، مجھے ڈپٹی کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”خبردار! گولی چلانے کی بھیانک غلطی مت کرنا۔ ورنہ سب راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے۔“ اس کی آواز کچن کے اندر سے آتی محسوس ہوئی تھی، میں نے بھویں سیکڑ کر اول خیر کی طرف دیکھا۔ اس نے ہانپتی ہوئی پُر جوش آواز میں کہا۔

”یہ خبیث خطرہ بھانپتے ہی اندر کچن میں چھپ گیا تھا اور چولھے کا برز کھول چکا ہے گولی مت چلانا کا کہ..... اس حرام زادے سے نمٹ لیتے ہیں۔“

میں نے دیکھا کچن کے دروازے پر چوکھٹ سے ڈپٹی روشن خان کا مکروہ چہرہ جھانک رہا تھا۔ اس نے پستول کی نال ہمیں دکھاتے ہوئے اس بار براہ راست مجھ سے

کرنا ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جو کرنا تھا وہ فوراً اور تیزی کے ساتھ کرنے کا متقاضی تھا۔ میں نے دھیرے سے دروازے کو دھکیل کر جھری بنا کے اندر جھانکا۔ یہ نشست گاہ ٹائپ کا بڑا سا کمرہ تھا۔ اندر مجھے ڈپٹی روشن خان اپنے چاروں وحشی کارندوں کی معیت میں دکھائی دیا۔ بے ہوش شکیلہ کو ایک صوفے پر ڈال دیا گیا تھا۔ دو افراد کو ڈپٹی نے حکم دیا کہ وہ جب تک شوکی کی لاش کو باہر موجود کارکی ڈکی میں ڈالیں۔ حکم سن کر وہ پلٹے، میں اور اول خیر فوراً پیچھے ہٹ کر ایک تاریک خلا میں سرگ کے جادے کے تھے۔ وہ دونوں نکلے، وہ شوکی کی لاش کو اٹھا کر گیٹ کی طرف بڑھے۔ وہاں ایک جیب کھڑی تھی، وہ اس کا عقبی دروازہ کھول کر شوکی کی لاش کو اندر رکھنے لگے تھے کہ انہیں احساس ہی نہ ہو سکا میں کب ان کے عقب میں ابھر کر بجلی بن کر ٹوٹا، اول خیر میرے ساتھ پیش قدم تھا، میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کا زوردار وار ایک کے سر پر پڑا، اس کی کھوپڑی چٹخ گئی۔ اس کا ساتھی بری طرح ٹھٹک کر سنبھلا اور بس یہی موقع اسے مل سکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اول خیر کی زوردار لات اس کے سینے پر پڑی، وہ اچھل کر جیب کے کھلے دروازے سے نصف اندر اور نصف باہر جا پڑا، میرا ڈنڈے والا ہاتھ دوبارہ حرکت میں آیا اور اس کی پیشانی پر پڑا۔ اس بار کچھ آواز پیدا ہوئی تھی۔ تسلی تھی ہمیں کہ اندر موجود کسی نے نہیں سنی ہوگی اور اگر سنی بھی ہوگی تو اسے معمول کی کھڑ پٹر سے تشبیہ دی ہوگی۔

یہ کام نمٹانے کے بعد ہم تیزی سے مذکورہ دروازے کی طرف بڑھے۔ اندر جھانکا، ڈپٹی نظر نہ آیا۔ وہ شاید کسی اندرونی کمرے میں چلا گیا تھا جبکہ اس کے دونوں کارندے صوفے پر بے سدھ پڑی شکیلہ کو گھورنے میں مصروف تھے، پھر میں نے ان میں سے ایک کو دوسرے ساتھی سے کہتے سنا۔

”چل یار! صاحب اندر آرام کر رہا ہے۔ اپنا کام نمٹا جلدی سے۔ اس کا بے ہوشی کی حالت میں ہی گلا دبا دے۔“

”یار! یہ زانی تو بڑی مست مست ہے۔ کاش صاحب ادھر نہ ہوتا، تو پہلے..... اس کے امڈتے شباب سے اپنی پیاس بجھاتے۔“

ان دونوں کی بوالہوسی نے میرے دماغ میں سرخ آندھیاں چلا دیں۔ اول خیر کو بھی اس کا یہ خوبی اندازہ تھا



مخاطب ہو کے کہا۔ ”شہزی! مجھے اندازہ ہے تمہارے سر پر خون سوار ہے اس لیے میں اکیلا کیوں مروں؟ تمہیں بھی ساتھ لے کر مروں گا۔“

”ڈپٹی! خود کو ہمارے حوالے کر دے۔ تجھے یہ بچوں جیسی حرکت زیب نہیں دیتی۔“ میں غرایا۔

”کسی بھول یا جوش میں مت رہنا۔۔۔ شہزی! بہت نقصان اٹھاؤ گے۔“ وہ مکروہ آواز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ”ختم سؤر۔۔۔ تو تو خود کو بڑا با اختیار سمجھتا

تھا، اب اس طرح چو ہے کی طرح کچن میں جا گھسا ہے۔ تو

نے بہت پولیس گردی دکھا دی ڈپٹی، بڑے بد معاشوں سے

تیرا پالا پڑتا رہا ہوگا مگر تو شاید یہ بھول گیا تھا کہ ایک شریف

آدی جب بد معاشی پر اترتا ہے تو۔۔۔ پھر اس سے بڑھ کر

کوئی بڑا بد معاش نہیں ہوتا، آج تیرا پالا ایسے ہی ایک

شریف بد معاش سے ہے، باہر نکل۔ ورنہ میری ایک ہی

ٹھوکر کچن کا یہ معمولی دروازہ توڑ ڈالے گی۔“

”وقت ضائع مت کر شہزی! ورنہ اذیت ناک موت

ہم سب کا مقدر بنے گی۔“ وہ بولا۔ اس کی آواز گھٹ رہی

تھی، وہ آگے بولا۔ ”میرا دم گھٹ رہا ہے۔ کیس کچن سے

نکل کر پورے کمرے میں پھیل رہی ہے۔ مرتے مرتے

میری چلائی ہوئی اندھی گولی ہم سب کو جسم کر ڈالے گی۔ وہ

کھانسنے لگا۔ مجھے پہلی بار تشویش کا جھٹکا لگا۔ کیس واقعی کچن

کے دروازے کے رخنوں سے کمرے میں بھرنے لگی تھی،

اور ہمیں بھی گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ میرے کچھ کہنے سے

پہلے ہی اول خیر بول پڑا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں فون کر چکا ہوں کسی وقت بھی میرے ساتھ

یہاں پہنچنے والے ہیں۔ تم سب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اول خیر کے چہرے پر تشویش

جھلکنے لگی۔

”چل کا کے! نکل! اس بد بخت نے مارو اور مر جاؤ

والی خطرناک چال چلی ہے۔“ میں متذبذب تھا۔ دشمن

دیرینہ اور صفت ابلیس دشمن کو اس قدر قریب اور قفسے میں

پاکر چھوڑ دینے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا مگر۔۔۔

”چل کا کا! شکلیہ کو اٹھا، نکل۔۔۔ وہ بد بخت گر گیا

ہے۔“ اول خیر چیخا۔ ہم پلٹے۔ صوفے پر لیٹی شکلیہ کو ہوش

آنے لگا تھا۔ پھلنے والی کیس نے گھٹن کے باعث اسے بھی

ہوش دلا دیا تھا۔ پھر بھی وہ عالم نقاہت میں تھی، میں نے اس

کے نرم و نازک وجود کو اٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا اور باہر کو

لپکے۔ ہمیں یقین تھا ہمارے کمرے سے نکلنے ہی روشن

خان بھی فوراً کچن سے نکلنے کی کوشش کرے گا اور کرتا پڑتا

سہی مکان کے کسی نسبتاً کھلے گوشے کا رخ کرے گا۔ اس

مردود نے ڈبل چال چلی تھی۔ ایک طرف ہمیں نکلنے پر مجبور

کیا تھا دوسرے اس نے اپنے ساتھیوں کو فون کر کے فوراً

وہاں پہنچنے کا کہہ دیا تھا کہ کہیں اس کے کچن سے نکلنے کے

بعد کہیں قریب میں گھات لگا کر نہ بیٹھے ہوں مگر میرے تیزی

سے کام کرتے ذہن رسا میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک

خیال کوندا، باہر آ کر میں نے شکلیہ کو اول خیر کے حوالے کیا تو

وہ تشویش ناک حیرت سے میری طرف نکلتے ہوئے بولا۔

”تو کدھر چلا کا کے؟“

”میں اس خبیث کی چال اسی پر الٹنا چاہتا ہوں۔“

میں دانت پیس کر بولا۔ وہ تجھے روکتا رہ گیا مگر میں طوفانی

گولے کی طرح چلا اور جیسے ہی آہنی گیٹ کے اندر قدم رکھا،

گولی چلنے کا دھماکا ہوا، پتا نہیں کس انداز میں گولی چلائی گئی

تھی مجھ پر یہ میری قسمت۔۔ کہ گولی خطا گئی، میں جھک گیا

اور زمین پر ریٹکتے ہوئے مرکزی دروازے کی طرف بڑھنے

لگا۔ اس وقت مجھے اس ملعون کی آواز سنائی دی۔

”خبردار شہزی! کوئی مہم جوئی دکھانے کی کوشش مت

کرنا، میں تمہاری ایک ایک حرکت دیکھ رہا ہوں۔“

اس نے یقیناً کسی کھلے اور ایسے گوشے سے گولی چلائی

تھی جہاں کیس ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ مکان کی

اوپری منزل کی طرف چلا گیا ہو۔ اگر اس نے کیس بند نہیں

کی تھی تو بھی یہ خطرہ اپنی جگہ موجود تھا کہ وہ دھیرے دھیرے

پورے مکان میں زہر کی طرح پھیل جائے گی۔ اسی وقت

مجھے اول خیر کی چلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہا

تھا۔ گولی کی آواز نے اسے پریشان کر دیا تھا، میں نے چلا

کر اسے گیٹ سے باہر رہنے کا کہا اور خود سینے اور کہنیوں

کے بل ریٹکتا ہوا مرکزی دروازے کی طرف آ گیا اور کھلے

دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ نچلے پورشن میں کیس بھر

چکی تھی، سانس لینا بھی دو بھر ہو رہا تھا۔ میں نے گویا آتش

جنوں میں ایک خوابیدہ جہنم کی جانب پیش قدمی کر ڈالی تھی،

میں اٹھ کر زینے کی طرف لپکا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔

”اوئے شہزی! واپس پلٹ آ۔۔۔ وہ لوگ آرہے

ہیں۔“ اس کی بات پر میں ٹھٹکا۔ اس کی مراد یقیناً روشن کے

ساتھی اہلکاروں سے تھی جنہیں وہ بد بخت فون کر کے بلا چکا

تھا مگر میں اب کہاں پلٹنے والا تھا۔ اوپر کی جانب گھومتے

92 جولائی 2015ء

جاسوسی ڈائجسٹ



شیر کی طرح خونخوار غراہٹ سے اس پر جھپٹا مارا۔ وہ موٹے بھاری بھینسے جیسا تھا۔ میں زیادہ پھرتی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ میں نے اسے دبوج لیا مگر وہ ایک ٹرینڈ پولیس آفیسر بھی رہ چکا تھا مگر ترقی نے اسے کھل بنا دیا تھا، میں نے اس کے چہرے پر گھونسا جڑ دیا۔ اس کے حلق سے ادغ کی آواز خارج ہوئی، اچانک اس نے اپنے پاؤں کا بھاری گھٹنا چلا دیا جو میری ناف پر پڑا۔ ضرب زوردار تھی مگر میرے سر پر سوار خوں ریزی کی آگ میں یہ تکلیف خاکستر ہو گئی، اس نے ایک دم لڑھکنی کھائی اور مجھے خود پر سے نیچے گرا دیا پھر اٹھ کر دوڑا۔ وہ اپنا پستول اٹھانا چاہتا تھا، میں نے لیٹے لیٹے لات چلا دی۔ وہ الجھ کر گرا اور زینے کے سرے پر جا پڑا۔ میں نے بہ سرعت حرکت کی اور پستول چھت کے فرش سے اٹھالیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر زینے کی طرف دوڑا۔ میں اسے بہ آسانی گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی اور میں زیر لب بڑبڑایا۔ ”روشن خان! تو نے تو جیتے جی جہنم کا رخ کر لیا۔“

میں آگے بڑھا..... زینے سے نیچے پے در پے گولیاں برسادیں۔ نیچے گیس پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ہولناک آتشیں جھپک نے جیسے پل کے پل نچلے پورشن کو جہنم زار بنا ڈالا۔ مجھے روشن خان کے ہولناک انداز میں چیخنے کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔

”خس کم جہاں پاک۔“ کہتے ہوئے میں تیزی سے پلٹا۔ چھت کی عجمی سمت ایک سیورج کے پائپ کا سہارا لیتا ہوا نیچے اترا، یہاں تاریکی اور جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا۔ بنگلانما مکان کی کھڑکیوں سے آگ کی زبانیں کسی ڈریکولا کی طرح پلپا رہی تھیں۔ مجھے اول خیر کی فکر ہوئی، کہیں وہ آگ بھڑکتے دیکھ کر میری تلاش میں اندر نہ کود پڑے۔ لہذا میں اسے بلند آواز میں پکارتا ہوا گیٹ کی طرف دوڑا۔ وہ اندر داخل ہونے کے لیے ہی پر تول رہا تھا۔ شکلیہ پورے ہوش میں آچکی تھی اور وہ اسے روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ میری آواز پر دونوں ہی چونک کر میری طرف پلٹے۔ اسی وقت مجھے دور سامنے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ اول خیر مجھے زندہ دیکھ کر میرے ساتھ لپٹ گیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ”او خیر، کا کے..... خڈا کے لیے اس طرح ہاتھ سے مت نکل جایا کر۔“

زینے کی ایک دیوار کے موکے سے میں نے نیچے کھڑے اول خیر سے کہا۔ ”اول خیر! اندر مت آنا، تم شکلیہ کو لے کر عمارت سے دور چلے جاؤ، مجھے اپنا کام کرنے دو۔“

”اوئے نہیں کا کا، تیری جان کو شدید خطرہ ہے۔“ وہ دل دوز لہجے میں بولا۔

”اول خیر! میرا کام مت خراب کرو۔ ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ شکلیہ کو لے کر مکان سے دور ہو جاؤ۔“

www.paksociety.com

جواب میں بھی چیخا۔ ٹھیک اس وقت اوپر سے مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ زینے میں بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے دیوار پر پستول بہ دست سایہ نظر آتا تھا۔ یہ روشن خان تھا۔ وہ اوپر تھا، میں نیچے تھا۔ وہ موقع ملتے ہی مجھے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اسے میری جنوں خیز پیش قدمی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اور وہ مجھے کسی طرح نیچے دھکیلنا چاہتا تھا۔ گیس پھیلی ہونے کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے پر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ میں نے اوپر اندھا قار کر ڈالا۔ وہ شیطانی عفریت کی طرح واپس پلٹ گیا۔ میں تیزی سے زینے چڑھتا ہوا اوپر جا پہنچا۔ میرے تفتہ وجود کا رُواں رُواں جوش غیظ کے مارے بری طرح پھڑک رہا تھا۔ اوپر نسبتاً کھلا گوشہ تھا۔ سامنے صرف دو کمرے نظر آتے تھے۔ ایک بالکونی تھی جو نیچے مکان کے اندرونی گوشے کی طرف بنی ہوئی تھی۔ وہاں رینگ تھی، میری لپکتی جھپکتی مستلاش نظریں تلاش غنیم میں تیزی سے حرکت پذیر تھیں۔ دفعتاً مجھے اپنے دائیں جانب جدھر الٹا بکھرا ہوا تھا، ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔ پھر گولی چلی، شکر تھا کہ میں پہلے ہی محتاط تھا۔ تاریکی میں چمکتے شعلے کی آتشیں جھپک محسوس کرتے ہی میں نے خود کو چھت کے فرش پر گرا دیا۔ ابھی میں زینے کے سرے پر ہی تھا۔ میں نے اس کباڑ پر تلے اوپر دو گولیاں داغ دیں۔ پھر نہ جانے اس نے مجھ پر کون سی بھاری شے دھکیل دی۔ وہ خالی ڈرم تھا جو مجھ سے ٹکرایا۔ نتیجے میں میرے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا۔ میں نے حواس مجتمع رکھے اور چھت کے فرش پر لیٹے لیٹے ڈرم کو لات رسید کر دی، ڈرم جس رفتار سے میری طرف آیا تھا، اسی رفتار سے دور جانے لگا تو میں بھی اس کی آڑ لیتا ہوا نہایت پھرتی کے ساتھ خود کو ڈرم کی طرح فرش پر لڑھکتا چلا گیا اور جیسے ہی مجھے اس ملعون کا سایہ حرکت میں دکھائی دیا، میں نے اس پر ایک اندھی لات چلا دی۔ سب سے پہلے اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر لڑھک گیا اور پھر وہ خود..... میں نے زخمی

”اپنی فطرت ہی کچھ ایسی ہے اول خیر! نکل چل

اب..... وہ مردود جیتے جی واصل جہنم ہو چکا شاید اس کے ساتھی آرہے ہیں۔ میں نے کہا پھر ہم تینوں نے مکان کی



عقبی سمت پہلے دیرانے کی طرف دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

ہم مسلسل کئی بل تک دوڑتے خامسے دور نکل آئے۔ ہمارے عقب میں دور آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر ہم اپنی بے ترتیب پھولی ہوئی سانسیں بحال کرتے رہے۔ پھر کچھ باتیں کرنے کا یا راہو اتو میں نے اور اول خیر نے غم زدہ ٹھیکہ کو تسلیاں دیں۔ اس کے بھائی شوکی کی موت کا ہمیں بھی افسوس تھا۔ تاہم ٹھیکہ کو اس بات کی خوشی بھی تھی کہ میں نے اس کے قاتلوں سے بھی بڑا بھیانک انتقام لیا تھا۔ میں جانتا تھا ٹھیکہ کے سینے میں بھڑکتی انتقام کی آگ قدرے سرد ہوئی ہوگی مگر بھائی کی موت کا دکھ اپنی جگہ تھا۔ اس بد نصیب نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بھائی کو مرتے دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسا جگر پاش منظر تھا اس کے لیے جو یقیناً بھلائے نہیں بھول پاتا..... اس منحوس بگلا نما مکان میں یقیناً سب کچھ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ ہمارے خلاف وہاں کسی ثبوت کی باقیات کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ روشن خان جیسے راتب خور قانون کے رکھوالے جس طرح جرائم پیشہ افراد کے زرخیز بن کے..... راتوں کی تاریکیوں میں بے گناہوں کے ساتھ جعلی مقابلے اور ظلم و بربریت کا کھیل کھیلتے رہے تھے، آج وہ بھی اپنی ہی پولیس گردی کا شکار ہو کے گمنامی کی حرام موت مارے گئے تھے۔

ہم تینوں تاریک اور جھاڑ جھنکاڑ ویرانوں میں گرتے پڑتے بالآخر ٹھیکہ لپائی دے پر آگئے، یہاں سردست دور نزدیک تک کسی رکشے یا ٹیکسی کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ البتہ لوکل مسافر بسوں کی آدک جاوک کے کچھ آثار نظر آتے تھے۔ ایک ایسی ہی مسافر بس میں سوار ہو کے ہم شہر پہنچے اور وہاں سے ایک ٹیکسی میں سرمہ بابا کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ ملازم مجھے بہ خوبی جانتے تھے۔ اس وقت سرمہ بابا اور ان کے دونوں پوتے پوتی دانی اور ہنگی اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ میں نے ان کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور شریفان کو انہیں جگانے سے منع کر دیا۔ البتہ ٹھیکہ کے لیے اسے ایک کمرے کے لیے کہہ دیا جبکہ میں اور اول خیر اپنے کمرے میں آگئے۔ تھوڑا بہت کھانا زہر مار کیا تھا ٹھیکہ ہمارے ہی پاس بعد میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ ایک کرب ناک دکھ سے دوچار تھی مگر بلاشبہ وہ مضبوط اعصاب اور حوصلے کی مالک بھی تھی، میری طرح حالات نے اسے کبھی کم نہیں رگڑا تھا۔ بہت کچھ جاننے پہچاننے وہ بھی لگی تھی۔ نیند لینا ضروری تھا کیونکہ اگلے دن ہمیں وزیر خان اور ثریا کے

سلسلے میں ایک اہم ترین مہم کا آغاز کرنا تھا۔ ٹھیکہ نے خود کو کافی سنبھال لیا تھا اور اس نے کل کی ہمارے ساتھ جانے والی مہم پر شمولیت کا اظہار بھی کیا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور اول خیر اپنے بستروں پر جا لیٹے۔

اگلے روز صبح ناشتے کی میز پر سرمہ بابا سے ملاقات ہوئی۔ دانی اور ہنگی اپنا ناشتا جلدی نمٹا کر ہمیں خدا حافظ کہہ کر اسکول چلے گئے۔ وسیع ڈائننگ لاونچ میں ایل سی ڈی بھی نصب تھی، وہاں سپری دھڑکتی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ بریکنگ نیوز نشر ہو رہی تھی اور ملتان کے قدرے نواح میں واقع اس پتھلے نما مکان میں آتشزدگی، ڈہنی روشن خان سمیت کچھ لوگوں کے جل مرنے کی خبریں اور فوجی وغیرہ دکھائے جا رہے تھے۔ سرمہ بابا بھی چونکے۔ ہم ناشتا کر چکے تھے اور چائے پی رہے تھے، ٹھیکہ بھی موجود تھی۔

”ارے یہ وہی پولیس آفیسر روشن خان تو نہیں.....“ اوہو..... یہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟“ معا سرمہ بابا بولے۔ میں اور اول خیر خاموش تھے۔ میں اس کی حقیقت کے بارے میں سرمہ بابا سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم میں نے اس بات پر معنی خیز مسکراہٹ اول خیر کے چہرے پر ڈالی تھی۔ میری اس مسکراہٹ میں ایک متوقع فتح کی طمانیت تھی، یعنی ہمارا کہیں نام نہیں تھا۔ ایک اینکر پرسن البتہ جائے وقوع کی فوج پر چلا چلا کر اسے روشن خان کی ذاتی دشمنی کا شاخسانہ قرار دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر ہی یہ کلپس چلا تھا۔ اس کے بعد اس کی جگہ دوسری بریکنگ نیوز نے لے لی تھی۔ جو کم از کم ہمارے لیے غیر اہم ہی تھی۔

ٹھیکہ پہلے بھی یہاں رہ چکی تھی۔ جب میں اسے چٹی بائی اور جمعہ خان وغیرہ کے چنگل سے چھڑا کر لایا تھا اور سرمہ بابا کی پناہ میں لا کے رکھا تھا۔ ٹھیکہ سے متعلق میں نے سرمہ بابا کو یہی بتایا تھا کہ اس کے بھائی شوکی کا ایک جائگاہ حادثے میں انتقال ہو گیا اور اب یہ بے چارہ اکیلی تھی۔ میرے حوالے سے سرمہ بابا نے میری بھی کسی بات پر اعتراض نہ کیا تھا بلکہ ٹھیکہ سے اب بھی شفقت سے ہی پیش آتے تھے، بلکہ ٹھیکہ اور سرمہ بابا سمیت ہم اطفال گھر کے ہی تو سب ساکھی تھے۔ بقول آپاجی کے بوڑھے بھی بچے ہی ہوتے ہیں۔

ہمارے درمیان ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی مگر ہم ناشتے کی میز سے اٹھ کر صوفوں پر آکر بیٹھ گئے۔ وہ زیادہ تر اپنی امریکاروانگی اور کاروبار کی ان کی غیر موجودی میں دیکھ



”یہ ہے کون ویسے؟“ میں نے یونہی برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔ سرمہ بابا بولے۔ ”ہے کوئی نو دولتیا قسم کا سیٹھ..... خود کو میرے بیٹے محمود (مرحوم) کا بڑا پرانا اور گہرا دوست کہتا ہے..... مجھ سے کئی بار میرے بیٹے کے حوالے سے کاروباری ڈیلنگ کا کہتا رہا ہے مگر میں جانتا ہوں ہر دو نمبر کام اس کی اٹھائی گیری کے لیے وقف ہو چکا ہے۔“

”تو پھر اس کے ساتھ کاروباری روابط رکھنے میں کیا مصلحت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کسی زمانے میں اس نے کسی اڑیسہ نامی کمپنی میں دس فیصد حصہ داری کی تھی، میرے بیٹے محمود کو بھی اس کی حصہ داری پراکسایا۔ اس نے بھی شروع میں دس فیصد کے شیئرز خرید لیے۔ اس کے بعد جانے محمود کے سر پر کیا شوق چرایا کہ اب پتا نہیں اپنی ذاتی دلچسپی یا پھر کسی کے اکسانے پر ایک دم چالیس فیصد کے شیئرز لے لیے۔ معلوم نہیں اب کہ..... یہ..... کمپنی خسارے میں جا رہی تھی یا پھر اس نے ایک دم عروج حاصل کر لیا تھا، تاہم ہمارا بھی اس ضمن میں اپنی ٹانگ پھنسانا ضروری قرار پایا۔ جس کے لیے ہمیں اس ناہنجار سیٹھ نوید سانچے والا کی ناقابل قبول شکل اور شخصیت کو گوارا کرنا پڑتا ہے۔“

سرمہ بابا کی باتوں سے میرے دور رس وجدانی ادراک رکھنے والے ذہن میں ایک سوالیہ نشان ابھرا کہ اب بھی سرمہ بابا کی اس سیٹھ نوید سانچے والا..... کے ساتھ اس قدر نفرت اور ناگواری کی وجہ اور ہی تھی۔ میری تجسس فطرت نے سرمہ بابا سے استفسار پراکسایا تو میں دانستہ ہلکی اور معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

”میرا خیال ہے یہ ایسی کوئی خاص وجہ تو نہیں..... اس سے آپ کی اس قدر خطی اور نفرت کی، باقی وہ جو دو نمبر کام کرتا ہے وہ اس کا اپنا فعل ہے جس کا وہ خود ذتے دار ہے۔“

”تم بھی بڑے کائیاں ہوشی! میں تو تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔“ وہ بھی یک دم ہلکی ہنسی کے ساتھ بولے۔

”اطفال گھر کے تم سب سے زیادہ ذہین بچے تھے، خیر، تم نے بھی کچھ ایسا غلط اندازہ نہیں لگایا۔ سیٹھ نوید سانچے والا سے میری ناپسندیدگی کی اصل وجہ کچھ اور ہی ہے۔ اب تم سے کیا چھپانا۔“ کہتے ہوئے انہوں نے میرے ساتھ بیٹھے اول خیر کی طرف دیکھا۔ میں ترنت ان کی نظروں کا مطلب بھانپ گیا اور بولا۔ ”بابا! اول خیر کو بھی آپ ایک ہی ۱۰ سے دیکھ سکتے ہیں۔ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔“

بھال کی باتیں کرتے رہے۔ عارفہ اور عابدہ سے متعلق بھی بات ہوئی، شاید ہماری یہاں آمد کی وجہ سے سرمہ بابا کو آج دفتر جانے کی جلدی نہ لگی معاً ان کے سل فون کی گھنٹی گنگنائی۔

”ارے..... یہ اس وقت جمال الدین کیوں فون کر رہا ہے۔“ وہ اپنے بیش قیمت سل فون کے ڈسپلے پر نظر ڈالتے ہوئے خود کلامیہ بڑبڑائے پھر فون کان سے لگا لیا۔

”ہاں! بولو جمال! خیریت.....؟“

جمال الدین کے بارے میں سرمہ بابا مجھے بتا چکے تھے۔ یہ وہی آدمی تھا جو ان کا قابل اعتماد اور جی ایم، پی اے، بیک وقت سبھی کچھ تھا اور گھر میں انکل جمال کے نام سے معروف تھا۔ عارفہ کو بھی اس پر بہت اعتماد تھا۔

”کیوں.....؟ وہ کیوں بھند ہے مجھ سے ملنے کے لیے؟..... میں اس خبیث کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

معاً سرمہ بابا نے ناگوار لہجے میں کہا۔ میں قدرے چونک کر ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ریوٹ اٹھا کر ایل سی ڈی کا دالیم صفر پر کر دیا۔ خاموشی کے باعث سرمہ بابا کے سل سے ان کے جی ایم انکل جمال کی آواز آرہی تھی، تاہم گفتگو زیادہ نہیں سنی جاسکتی تھی۔ ہم خاموش تھے، بابا اس سے باتوں میں مصروف تھے۔

”تو ٹھیک ہے پھر..... آفس میں آگیا ہے تو بیٹھا رہنے دو اسے میرے انتظار میں..... خود ہی دفان ہو جائے گا۔“ وہ بدستور ناگواری سے بولے جا رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے انکل جمال انہیں کسی ایسے شخص سے ملانے کے لیے بھند تھا جن کو سرمہ بابا سخت ناپسند کرتے تھے۔ بالآخر بولے۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر..... میں تو آج دیر سے ہی دفتر پہنچوں گا۔ ایک ضروری کام سے جانا ہے مجھے..... تم ایسا کرو اس سے کہو وہ ادھر ہی آجائے پھر.....“ بادل ناخواستہ یہ کہہ کر انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا اور ہولے سے بڑبڑائے۔

”بدبخت انا ہنجار۔“

”کون؟ انکل جمال؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے سرمہ بابا کی طرف دیکھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”ارے نہیں، شہزی بیٹے! بے چارہ جمال تو میرا لائق اور بڑا فرماں بردار آدمی ہے، میں اس منحوس سیٹھ نوید سانچے والا کی بات کر رہا تھا، مجھے یہ آدمی سخت ناپسند ہے مگر چند کاروباری مصلحتوں اور مجبوری کے باعث اسے کبھی کبھار نہ چاہتے ہوئے بھی بھگتنا پڑتا ہے۔“



”جانتا ہوں میں۔“ وہ ہولے سے مسکرا کر بولے۔  
”پھر چند ثانیوں کی سوچتی ہوئی سی خاموشی کے بعد مختصراً بولے۔

”اس ناہنجار خبیث سیٹھ نوید نے عارفہ کے بیوہ ہوتے ہی اس کا رشتہ مانگا تھا۔“

یہ بتاتے ہوئے سرمد بابا کے چہرے پر ایسے تاثرات اٹھ آئے جیسے انہوں نے کوئی کڑوی گولی نگلی ہو۔

”اوہو.....“ اس بات پر اپنا اختیار میرے ہونٹ دائرے کی صورت میں سکڑ گئے۔ پتا نہیں سیٹھ نوید سانچے والا..... کے اس پروپوزل میں کوئی برائی بھی یا نہیں۔ مجھے اس کا کوئی خاص اندازہ نہیں ہو پایا تھا لیکن اس کی شخصیت بہر حال، بقول سرمد بابا کے دوہرہ تھی۔

میں نے سرمد بابا کی تائید میں کہا۔ ”یہ تو واقعی سیٹھ نوید کی نامعقول سی ہی بات ہے جبکہ وہ دیکھ بھی رہا ہے کہ عارفہ آپ کی بہو کی حیثیت سے ہی رہ رہی ہے۔ بہر حال..... آپ اسے زیادہ گھاس ڈالنے کی کوشش نہ کریں جہاں تک کاروباری مجبوری کا تعلق ہے تو اس حد تک اسے بھگتا یا جاسکتا ہے

”ہاں بیٹے! بس اسی مجبوری کے باعث یہ کڑوی گولی نگلی پڑتی ہے۔“ سرمد بابا تلخ لہجے میں بولے۔

”بلکہ کاروباری مجبوری بھی کیا ہے بس اڑیہ کمپنی والا معاملہ صاف ہو جائے تو میں اس سے ملتا تو درکنار، بات کرنا بھی پسند نہیں کروں گا۔“ میں نے ان کی بات پر تائیداً سر ہلا دیا۔ دل میں یہ سوال پوچھنے کی خواہش ابھری تھی جو اچانک اس دوران میرے ذہن میں ایک تشویش کی لہر کے ساتھ ابھرا تھا میں سرمد بابا سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کاروبار، جانتا تو ان کی ہی ملکیت تھی تو کیا اب بھی ایسا ہی تھا؟ ایسا تو نہیں عارفہ جب امریکا سے صحت یاب ہو کر لوٹے گی تو ایک بار پھر..... اپنے نیک نفس سر کو سیٹھ منظور وڑائچ سے سرمد بابا بنادے گی؟

اس دوران باہر گیٹ پر متعین چوکیدار نے اندر انٹرکام پر سرمد بابا کو سیٹھ نوید سانچے والا کی آمد کی اطلاع دی۔ انہوں نے اسے اندر لانے کا کہہ دیا اور ریسپور رکھ کے بڑبڑائے۔ ”آگیا وہ منحوس۔“

تھوڑی دیر بعد چوکیدار کے ساتھ جو شخص نمودار ہوا تھا، وہ مجھے کہیں سے بھی سیٹھ نہیں نظر آتا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا جو خاکہ تھا، ایک کالے موٹے اور گوندیل عمر رسیدہ آدمی کا تھا مگر میں متوقع سیٹھ نوید سانچے والا کو دیکھ کر

جاسوسی ڈائجسٹ

چونکے بنانہ رہ سکا تھا۔ عمر تو خیر اس کی چالیس پینتالیس سال سے کسی بھی طرح کم نہیں دکھائی دیتی تھی، مگر بہر حال اس کی برسنالٹی پر وجہ تھی۔ دراز قد، چوڑے کاندھے، گورارنگ ٹمر شکل و صورت اس کی وجہ شخصیت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ چہرہ کچھ زیادہ لمبوتر تھا، ناک آگے سے مڑی ہوئی تھی اور آنکھیں بالکل ہی چندی چندی سی تھیں، جن میں مکاری کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ بالی کرپو کٹ تھے اور کنپٹیوں کی طرف سے سفیدی بھلکتی تھی۔ بھویں بھی غیر معمولی طور پر اونچی تھیں اور صاف لگتا تھا کہ وہ بھویں اچکا اچکا کر باتیں کرنے کا عادی تھا۔ اس وقت بھی وہ ہمیں اور بالخصوص سرمد بابا کو دیکھ کر یہی کام کر رہا تھا۔ وہ بہترین تراش کے کوٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔

بادل ناخواستہ سرمد بابا اس سے ملنے کے لیے صوفے سے اٹھنے لگے تو اس نے مکارانہ فروتنی سے انہیں بیٹھے رہنے کا کہا اور بابا نے یہی کیا بھی۔ پھر ہم سے ہاتھ ملایا۔ شکلیہ کو ہولے سے آداب کہا۔ پھر سرمد بابا کے اشارے پر وہ سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ چند لمحوں میں اس نے کچھ عجیب سی مسکراتی نظروں سے ہم تینوں کا جائزہ لیا پھر جیسے ہی سرمد بابا کی طرف دیکھا، انہوں نے گویا جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

”ہاں، کیسے آنا ہوا؟“ ان کے لہجے میں چھپی تلخی کم از کم مجھے تو صاف محسوس ہوئی تھی، سیٹھ نوید اسی مسکراہٹ سے بولا۔

”کچھ کاروباری معاملے کی بات کرنا تھی جو اب بھی ہے اور رازداری کی متقاضی بھی۔“ کہتے ہوئے اس نے دانستہ اشارۃً ہم پر بھی نظر ڈالی تھی۔ اس پر سرمد بابا نے اپنے ہاتھ کا خفیف سا اشارہ ہماری جانب کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ میرے اپنے ہی ہیں۔ تم کھل کر بات کر سکتے ہو۔“ اس پر وہ بولا۔ ”ان حضرات کا تعارف؟“

”میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ تم بات کرو۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ تمہیں جمال نے بتایا ہوگا کہ مجھے کہیں ضروری کام سے پہنچنا ہے۔“ سرمد بابا نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے بہ غور سیٹھ نوید سانچے والا کے لومڑی جیسے لمبوترے اور چندی چندی آنکھوں والے چہرے کا جائزہ لیا۔ سرمد بابا کے بہ دستور روکھے لہجے اور سرد رویے نے اسے بھی یک دم ایک تلخ سی متانت میں مبتلا کر دیا تھا پھر وہ ایک گہری سانس



میرے بیٹے کی بیوہ کی حیثیت رکھتی ہے اور مجھے اس کی یہی حیثیت منظور ہے۔ لہذا ماسٹڈ یور لینگویج..... اسے عارفہ کے بجائے مسز محمود کہہ سکتے ہو تم..... سمجھ گئے۔“ سرمد بابا جیسے ایک دم پھٹ پڑے۔ انہیں شاید سیٹھ نوید کا بار بار عارفہ کہنا برا لگا تھا۔ مجھے کچھ بد مزگی کا احساس ہونے لگا۔ خود مجھے بھی اس مکار آدمی سانچے والا پر اب غصہ آنے لگا تھا۔ وہ آخر اصل بات کرنے کے بجائے ادھر ادھر کی بے پر کی کیوں ہانک رہا تھا۔ یقیناً اس میں کچھ مقصد پوشیدہ تھا۔

بہر حال سیٹھ نوید ہولے سے کھٹکھا کر بولا۔ ”وڑانچ صاحب! دراصل یہ سب باتیں کرنے کا میرا ایک مقصد تھا۔ میں جانا چاہ رہا تھا کہ آپ کے علم میں کیا کچھ ہے؟ کیونکہ آپ کی بیوہ عارفہ..... سوری..... مسز محمود کے امریکا روانگی سے پہلے اس سلسلے میں ان سے میں ایک مینٹگ بھی کر چکا ہوں۔ سردست انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ البتہ میرے استفسار پر انہوں نے مجھے اپنے شوہر کے متعلق اتنا ضرور بتایا تھا کہ ان کی اچانک ناگہانی موت سے کچھ دن پہلے وہ خاموش اور پریشان رہنے لگے تھے، تو میرے دل میں ایک تشویش آمیز کھٹک سی پیدا ہوئی تھی، پھر مجھے ان سے زیادہ بات کرنے کا موقع نہ مل سکا تو مجبوراً مجھے دباؤ کے باعث آپ سے بات کرنا پڑی۔“ وہ ذرا رکا تو سرمد بابا نے بھویں سکڑ کر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”دباؤ.....؟ کیا دباؤ؟“

میں نے محسوس کیا تھا کہ بار بار اپنے جواں مرگ بیٹے محمود کے تذکرے نے ان کی بوڑھی آنکھوں کے گوشے نمناک کر ڈالے تھے۔

”میں اسی طرف ہی آرہا ہوں۔“ سیٹھ نوید سانچے والے نے کہا اور بولا۔ ”میں چاہتا ہوں..... بلکہ وہ لوگ بھی یہی چاہتے ہیں کہ یہ معاملات ہمارے درمیان بہ خیر و اسلوبی طے پا جائیں۔ دراصل، اڑیسہ کمپنی کے کچھ شیئرز تھے آپ کے بیٹے کے پاس..... آپ کو معلوم ہے کہ وہ انہوں نے کہاں رکھے ہوں گے..... میرا مطلب ہے کسی بینک کے کسی لاکر میں؟“

”اس کا علم نہیں۔“ سرمد بابا نے سپاٹ لہجے میں کہا جبکہ میں اندر سے چونک گیا۔

”آخر یہ اڑیسہ کمپنی..... ہے کس بلا کا نام؟“

”یہ ایک تجارتی جہاز راں کمپنی ہے..... اس کا ہیڈ آفس برما کے دارالحکومت رنگون میں ہے۔ کسی زمانے میں یہ خسارے میں جا رہی تھی۔ بورڈ مالکان نے اس کے شیئرز

خارج کرتے ہوئے پہلے تو..... ان کے مرحوم بیٹے محمود کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا تار ہا پھر آخر میں کہا۔ ”کیا آپ کو اپنے بیٹے کے کاروباری معاملات کے بارے میں پورا علم ہے وڑانچ صاحب؟ یا پھر میرا مطلب تھا..... اگر عارفہ صاحبہ بھی موجود ہوتیں تو..... زیادہ مناسب ہوتا۔ چونکہ میں جانتا ہوں وہ بہ غرض علاج امریکا میں مقیم ہیں اس لیے میں نے سوچا سر دست آپ سے بات کر لی جائے۔“

”میں سن رہا ہوں، کہتے رہو۔“ سرمد بابا بولے۔ ”مجھے بیٹے کے تمام کاروباری معاملات کا اچھی طرح علم ہے جبکہ اس کی ابتدا بھی میں نے ہی کی تھی۔“ سرمد بابا کی بات پر میں نے محسوس کیا کہ سیٹھ نوید سانچے والا کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ”معاف کیجیے وڑانچ صاحب! میرے علم میں تو یہ بھی ہے کہ آپ کے بیٹے محمود نے آپ کا سارا کچھ اپنے نام کروانے کے بعد آپ کو اولڈ ہوم.....“

”یہ ہمارا ذاتی گھریلو معاملہ ہے۔ تمہیں اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم کام کی بات کر دو تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ سرمد بابا نے کسی قدر گئی سے یہ کہتے ہوئے اس کی بات کاٹی تو جیسے سیٹھ نوید بھی بہ یک ترنت ادھار کھائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میر پوچھنے کا مقصد یہی تھا کہ یہ بات میرے علم میں بھی ہے کہ آپ کے بیٹے محمود کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ یعنی آپ کی بیوہ عارفہ بیگم ہی کے نام اب سب منتقل ہو چکا ہے۔ بے شک سنبھال اب بھی آپ ہی رہے ہیں مگر قانونی طور پر تو اب بھی وہی سب کی مالک ہیں۔“ اس کی بات پر مجھے ایک جھٹکا لگا تو گویا میرا شبہ ٹھیک ثابت ہوا تھا۔ سرمد بابا کا اب بھی سب کچھ ان کی بیوہ کے نام تھا۔ مجھے دوسرا جھٹکا اس بات کا محسوس ہوا تھا کہ سیٹھ نوید سانچے والا یہ سب جانتا تھا مگر اب وہ کہنا کیا چاہتا تھا۔

میں خاموش رہا۔ تاہم میں نے سرمد بابا کے چہرے سے غیر محسوس انداز میں دکھ کی ہلکی سی رمتی ضرور اٹھاتے دیکھی تھی۔ وہ خاموش رہے۔ میں نے دیکھا۔ سیٹھ نوید مکاری سے مسکرایا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے دانستہ سرمد بابا کو ایک تلخ حقیقت کا احساس دلانا چاہا تھا اور جواب میں انہیں ایک نامعلوم سی دکھ بھری خاموشی میں پا کر گویا ایک اور کچوکا لگاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ویسے عارفہ نے بتایا تھا کہ.....“

”دیکھو مسٹر سانچے والا! عارفہ ابھی تک میری بہو اور



فروخت کرنا شروع کر دیے تھے۔ یہاں مقیم مذکورہ کمپنی کے ایک نمائندے سے آپ کے بیٹے محمود اور میں نے بھی کچھ شیراز خرید لیے تھے۔ دس، دس فیصد..... مگر بعد میں شاید آپ کے بیٹے کو کسی طرح اس بات کا اندازہ یا علم ہونے لگا کہ یہ کمپنی نہ صرف دھیرے دھیرے سنبھلنے لگی ہے بلکہ منافع بخش بھی ہو جائے گی لہذا اس نے چالیس فیصد کے شیراز مزید خریدے۔ یوں اب آپ کے بیٹے کے پاس پچاس فیصد شیراز موجود ہیں۔ اب ان کو موت کے بعد دیگر حصے دار کمپنی کے مختار بننے کا حق رکھتے ہیں لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام شراکت داروں کے پاس ان کے اصل کاغذات حصے دار موجود ہوں..... کیونکہ ان کاغذات کی عدم موجودگی میں وہ مختار نہیں بن سکتے۔“ سیٹھ نوید سانچے والا اتنی تفصیل بتا کر خاموش ہو گیا۔

”کاغذات والی بات سمجھ میں نہیں آئی؟“ سرمد بابا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ سیٹھ نوید بولا۔

”مذکورہ کمپنی کی طے شدہ شرائط کے مطابق جو بھی کمپنی کا پچاس فیصد شیراز ہولڈر ہوگا، کمپنی کے نصف مالکانہ حقوق کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے جائیں گے۔“

”اگر وہ کاغذات ہمارے پاس ہیں بھی تو پھر وہ ہم ان کے حوالے کیوں کریں؟“ سرمد بابا نے سوال داغا۔ میں بغور یہ ساری گفتگو نہ صرف سن رہا تھا بلکہ سمجھنے کی بھی کوشش کر رہا تھا اور اس کے پس منظر میں چھپی کسی گہری سازش کو بھی بھانپنے کی سعی کر رہا تھا۔ سرمد بابا کے سوال کے جواب میں سیٹھ نوید سانچے والا نے کہا۔

”پچاس فیصد مالکانہ حقوق کے ان اہم کاغذات والی شرط کے ساتھ یہ بھی شرط تھی کہ شیراز ہولڈر کی موت کے بعد انہیں کمپنی کو واپس فروخت کر دیا جائے گا۔ اس وقت مذکورہ کمپنی شدید خسارے سے دو چار تھی، ہم محمود صاحب کے مشکور ہیں کہ درحقیقت انہوں نے اس گرتی ہوئی کمپنی کو سہارا دیا تھا۔“

”تو اب میرے بیٹے کے احسان کے بدلے میں اس کے شیراز ہتھیانے کی کوشش کی جارہی ہے؟ یہ کہاں کا قانون ہے اور کون سا انصاف ہے؟“

سرمد بابا بولے تو ان کا چہرہ دھیرے دھیرے کسی اندرونی جوش اور دباؤ تلے سرخ ہو رہا تھا۔ اس میں تو خیر کوئی شک بھی نہ تھا کہ وہ ایک خالصتاً کاروباری شخص بھی تھے۔ شاید انہیں اب اس بات کی دل ہی دل میں خوشی بھی ہو رہی تھی کہ ان کے بیٹے نے دورانہدیشی اور ٹھیک کاروباری

جاسوسی ڈائجسٹ

سوچ بوجھ کے مطابق درست وقت پر درست فیصلہ کیا تھا کہ ایسی کمپنی کے شیراز خرید لیے تھے جس کے دس فیصد شیراز خریدنے کے لیے بھی لوگ اچکپارے تھے، مگر اب نہ جانے کس طرح ایک دم اڑیہ کمپنی ترقی کی جانب گامزن ہو گئی تھی تو کچھ مکار اور ابن الوقت لوگ اس کے بیٹے کی موت سے فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔

”وہ لوگ ہیں کون؟ میری ان سے میٹنگ کرواؤ۔“

بالآخر سرمد بابا نے سیٹھ نوید سے کہا۔

”ابھی وہ حصے دار خود کو گمناں رکھنا چاہتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”انہوں نے تمہیں اپنا نمائندہ بنا کر میرے پاس بھیجا ہے؟“ سرمد بابا نے آنکھیں سکیڑیں۔

”ایسا ہی سمجھ لیں۔“ وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

”آپ مجھے ان کا قانونی مشیر بھی سمجھ سکتے ہیں۔“

”اونہ..... قانونی مشیر.....“ سرمد بابا نے استہزائیہ کہا۔ پھر سوال کیا۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ جنہوں نے تمہیں نمائندہ بنا کر میرے پاس بھیجا ہے اور وہ جو مطالبہ کر رہے ہیں، وہ اس پر حق بہ جانب ہیں۔“ سرمد بابا کے اس سوال پر سیٹھ نوید بوکھلا سا گیا۔ مجھے اس کی تنگ سی پیشانی پر جھوٹ اور دغا بازی کی جھلک صاف محسوس ہوئی۔

... وہ جلدی سے گویا بات بناتے ہوئے بولا۔ ”بات یہ ہے کہ کمپنی اور اس کا جوائنٹ اکاؤنٹ ابھی تک آپ کے مرحوم بیٹے محمود کے نام ہے۔ وہ قانونی طور پر اب اس کمپنی کے واحد حصے دار ہیں..... میرا مطلب یہ ہے..... اور.....“

”جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، آپ بھی تو دس فیصد کے حصے دار تھے؟“ سرمد بابا نے درمیان میں کہا۔

”ہاں، مگر میں نے اپنی زندگی کی بڑی غلطی کی تھی اور آپ کے بیٹے نے ایک عظیم عقل مندی، میں اپنا دس فیصد شیراز محمود کو فروخت کر چکا تھا۔ یہی نہیں، جن لوگوں نے بھی دس فیصد کے شیراز لیے تھے، وہ سب آپ کے بیٹے نے خرید لیے تھے جبکہ دوسری طرف بھی یہی صورت حال رہی۔“

سیٹھ نوید سانچے والا سانس لینے کے لیے رکا پھر آگے بولا۔ ”باقی کے پچاس فیصد شیراز..... رنگون کے دو مسلم تاجروں نے اور ایک امریکی نے خریدے، اس امریکی نے آپ کے بیٹے کی طرح دورانہدیشی سے کام لیا اور ان دونوں رنگونی مسلم تاجروں سے ان کے حصے کے شیراز مہنگے داموں خرید لیے، اب پچاس فیصد شیراز امریکی سوداگر کے ہیں۔“



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



انہوں نے "اسپیئرٹم" کے حوالے سے مذکورہ امریکی لولوش کا نام لیا تھا جو درحقیقت جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ اور ایک "ڈون" تھا۔ اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے اور مخصوص سربراہانہ شخصیات سے حاصل کردہ اثر و رسوخ کے علاوہ اپنی کارگزاریوں کو "شرافت" کے پردے میں چھپانے کے لیے اس نے امریکا کی ایک معروف صہیونی سوداگروں کی ایک تنظیم JBC (جیوش بزنس کمیونٹی) میں بھی بطور اہم کاروباری شخصیت ایک بزنس مین کی حیثیت سے بھی متعارف کروا رکھا تھا اور مختلف کاروباری دھندوں میں ہاتھ ڈالتا رہتا تھا۔ بقول میجر باجوہ صاحب کے وہ اسپیکٹرم کا سربراہ اور اس ادارے کو ہائی جیک کرنے والا واحد شخص لولوش ہی تھا۔ جس نے اپنے ذاتی مفادات اور اپنے کالے دھندوں اور سیاہ کرتوتوں کو وسیع کرنے کی خاطر درونِ خانہ بلیوٹسی والوں سے بھی گٹھ جوڑ کر رکھا تھا بلکہ ان کے وسیع تر خفیہ مفادات کے لیے مذکورہ دونوں انٹیلی جنس نے اسے سپورٹ کر رکھا تھا۔

میری نگاہ میں لولوش ایک خطرناک ترین بین الاقوامی مجرم..... ایک "ڈون" تھا۔ جبکہ سرمہ بابا کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ تھا کہ وہ کس سے ٹکر لے رہے ہیں۔ اگر تو لولوش وہی تھا۔ مجھے اس کی تصدیق کرنا چاہیے تھی۔ مگر محتاط انداز میں یا پھر موقع محل کا انتظار کر کے مگر مجھے لگ رہا تھا کہ سرمہ بابا ایک ٹھیکہ کاروباری شخصیت ہونے کے باعث اس جہاز راں کمپنی میں پوری طرح دلچسپی رکھتے تھے، اور پچاس فیصد تو کیا کسی بھی صورت میں ایک فیصد شیئر بھی لوٹانے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس سے متعلق آج اگرچہ سیٹھ نوید سانچے والا نے انہیں "اب ڈیٹ" کیا تھا جبکہ باقی کی بریفنگ وہ اپنے سیکریٹری (انگل جمال) اور اپنی بیوہ بہو عارفہ سے حاصل کرنے کا پورا ارادہ رکھے ہوئے تھے۔

سرمہ بابا نے اپنی طرف سے سردست بات ختم کر دی۔ حالانکہ جس قسم کی گفتگو ان دونوں کے درمیان ہو رہی تھی، اس کے مطابق سرمہ بابا، عارفہ سے متعلق کئی ایک باتیں مستفسرانہ طور پر اس سے پوچھ سکتے تھے مگر وہ دانستہ اپنی بہو کا ذکر سیٹھ نوید کے سامنے کرنا پسند نہیں کر رہے تھے۔ وہ روادار، قدامت پرست انسان تھے اور سیٹھ نوید کو تو وہ ویسے ہی پسند نہیں کرتے تھے۔ لہذا وہ اپنی بات کر چکے تھے، مگر سیٹھ نوید جیسے بات کو کسی نتیجے تک پہنچانے کی کوشش میں تھا لہذا رخصت ہوتے ہوئے بولا۔ "سوچ لیجیے

اور پچاس آپ کے بیٹے کے۔ وہ امریکی سوداگر بھاری آفر کے ساتھ آپ کے بیٹے کے نام کے بقیہ پچاس فیصد شیئرز خریدنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ جوائنٹ اکاؤنٹ اور پارٹنرشپ کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اب میں نے آپ کو کھل کر ساری بات بتا دی ہے تاکہ آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔"

"مگر تم ابتدا میں دھونس جانے والے انداز میں باتیں کر رہے تھے کہ ہر صورت میرے بیٹے کے نام کے شیئرز اور کاغذات تمہارے مؤکلوں کے حوالے کردوں؟" سرمہ بابا نے چھتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر مکارانہ فروتنی سے بولا۔

"وڑا کچ صاحب! آپ ضعیف انسان ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اتنی بڑی کمپنی کا بار آپ اپنے بوڑھے کاندھوں پر اٹھا پائیں گے۔ میں راستہ سہل کرنا چاہ رہا تھا۔"

"میں اگر اتنا بوڑھا ہو گیا ہوتا تو سرمہ بابا سے آج دوبارہ سیٹھ منگور وڑا کچ کی صورت میں تمہیں یہاں بیٹھا نظر نہیں آ رہا ہوتا۔" سرمہ بابا نے اس کی چندی چندی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "بہر حال میں اپنے سیکریٹری سے بریفنگ لوں گا لیکن میں پچاس فیصد شیئرز سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔" پھر ذرا رک کر پوچھا۔

"کیا تم بزنس پارٹنر..... یعنی امریکی سوداگر کا نام بتا سکتے ہو اور وہ ہوتا کہاں ہے؟"

"میں اس سلسلے میں مسز محمود (عارفہ) سے بھی بات کر چکا ہوں۔ مگر ان کی ناسازی طبیعت کے باعث تفصیل سے نہ کر پایا تھا۔ پھر اس وقت حالات بھی اور تھے۔" سیٹھ نوید نے سرمہ بابا کے سوال کو شاید دانستہ صرف نظر کر دیا تھا۔

"میں نے تم سے اپنے بزنس پارٹنر کا نام پوچھا تھا؟" سرمہ بابا نے دوبارہ اپنے سوال کی طرف اشارہ دیا۔ وہ بھی چھوڑنے والے کہاں تھے۔

سیٹھ نوید ہولے سے کھنکھا کر بولا۔ "وہ نیو یارک میں مقیم ہے، مگر آج کل رنگون آیا ہوا ہے۔ معاملہ طے ہو جانے کے بعد وہ رنگون والا ہیڈ آفس نیو یارک شفٹ کرنا چاہتا ہے یا پھر ممکن ہے وہ وہاں اپنا کوئی آدمی تعینات کر دے۔ اس کا نام لولوش ہے۔" اس نے بالآخر نام بتا دیا۔

"لولوش....." مجھے یہ نام سن کر ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس کے لیے مجھے اپنی یادداشت کے خانے کو کھنگالنے کی ضرورت نہ پڑی۔ یہ نام میرا شناسا تھا۔ مجھے اپنی حال ہی میں میجر ریاض باجوہ کے ساتھ ملاقات یاد آگئی جس میں



گاوڑا کج صاحب! ممکن ہو، ساری حقیقت جان لینے کے بعد آپ کے دل میں یہ شوق جاگ اٹھا ہو کہ مذکورہ کمپنی کے اب آپ مالک ہوں گے تو میرا آپ کو دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ ہو گا کہ اس خوش فہمی کو ذہن سے اپنے نکال پیچھے گا کیونکہ لولودش جیسے انسان کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ بزنس کی دنیا کا وہ بہت بڑا ٹانگیوں ہے۔ آج وہ ایک ملک میں ہوتا ہے تو کل دوسرے ملک میں۔“

”مجھے ہی نہیں، سرمد بابا کو بھی اس کے لہجے میں چھپی تہدید صاف محسوس ہوئی تھی، شاید میرے بھڑک جانے کے ڈر سے یا کسی اور وجہ سے سرمد بابا نے ضبط سے کام لیا اور سیٹھ نوید سانچے والا کی طرف سر د نظروں سے دیکھتے ہوئے فقط اتنا کہا۔“تم اب یہاں سے جا سکتے ہو۔ میں تم سے پھر بات کروں گا۔“ جو بابا سیٹھ نوید سانچے والا اپنی چندی چندی آنکھوں سے سرمد بابا کو عجیب سی نظروں سے گھورتا ہوا خاموشی سے لوٹ گیا۔

”ذلیل..... کمینہ..... فریبی..... مجھے دھمکی دینے آیا تھا۔“ اس کے جاتے ہی سرمد بابا نے خود کلامیہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

”یہ آپ کو چکر دینے کی کوشش کر رہا تھا شاید۔“ میں نے ہولے سے مسکراتے ہوئے بابا کی طرف دیکھا۔ مجھے کاروبار کی کوئی سوجھ بوجھ تو نہ تھی تاہم پڑھا لکھا انسان میں بھی تھا۔ عقل سلیم جسے کامن سنس کہتے ہیں، وہ میری غیر معمولی حد تک تیز تھی پھر اطفال گھر جیسے ادارے میں جو کسی بھی یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، پھر اس کے رواج رواں بھی حاجی اسحاق ملک مرحوم جیسے نیک اور اصول پرست انسان تھے، وہ جب تک زندہ رہے..... اطفال گھر پر یتیم خانے کی چھاپ نہیں لگنے دی اور جدید خطوط پر اسے چلاتے رہے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے وہاں رہتے ہوئے، پرائیویٹ طور پر بی اے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ نیز انگریزی بھی سیکھتا رہا تھا۔ پھر وہاں ٹی وی کے پروگراموں میں مجھے ڈراموں سے زیادہ خبروں، حالات حاضرہ اور ڈاکو میٹری کے پروگراموں میں دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ کچھ اپنی غیر معمولی فطری صلاحیتیں..... جو ہر انسان کو کسی نہ کسی شکل میں ودیعت ہوتی ہیں اور ان سے زیادہ حالات نے میرے شعور کو بڑی جلا بخشی تھی۔

”یہ مجھے کیا چکر دے گا“ مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ عارفہ بیٹی نے مجھے ابھی تک اس کی تفصیل کیوں نہ بتائی؟“

وہ میری بات پر کوئٹو سے لہجے میں بولے۔ میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے ان کی ٹانج میں بھی آپ جتنی ہی آگاہی ہو، یہ تو اب آپ کو عارفہ بہن سے ہی پوچھنا پڑے گا۔“

”ہوں۔“ میری بات پر انہوں نے ایک ہرکاری بھری۔ ”امریکا تو میں دو چار روز میں روانہ ہو ہی جاؤں گا۔ کسی مناسب موقع پر عارفہ بیٹی سے بات کروں گا لیکن پہلے میں اپنے طور پر کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

”شہزی بیٹا! تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ میں ذرا ایک ضروری کام سے نکلوں گا پھر باتیں ہوں گی۔“

میں نے شکریے کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ اب ہم تینوں وہاں بیٹھے رہ گئے۔

”اواخر۔“ اول خیر نے ہولے سے کہا۔ ”شہزی کا کہ! یہ تمہارے باباجی تو پکے بوڑھے شیر ہیں۔ نئے کاروبار کی سرمایہ کاری سن کے ان کی بوڑھی مگر شیر جیسی آنکھوں میں بڑی شکارانہ چمک ابھر آئی ہے۔ پر مجھے تو اس میں خطرہ ہی لگتا ہے۔ اے وڈے پیڈے والا کام لگتا ہے۔“ میں اس کی بات پر ہولے سے بے تاثر انداز میں مسکرایا۔ یہ حقیقت تھی اور خطرہ بھی کوئی معمولی نوعیت کا نہ تھا۔ اس کی خطرات کی کو صرف میں ہی جانتا اور سمجھتا تھا۔ اگر تو یہ وہی انٹرنیشنل کینکسر تھا تو لولودش ہشت پاؤں کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ اسے بیک وقت کئی لوگوں کی نہیں بلکہ کئی اہم خفیہ اداروں کی بھی سپورٹ حاصل تھی۔ جو اپنے اپنے مفادات کے لیے اسے استعمال کر رہے تھے۔ مگر کاٹھ کا الو لولودش بھی نہ تھا۔ یہ مشترکہ مفادات کا ٹھیل تھا۔ لولودش اپنی سپورٹ چار دانگ برا عظم پھیلا رہا تھا۔ سرمد بابا اسے یقیناً معمولی آدمی سمجھ رہے تھے یا صرف ایک امریکی بزنس مین..... مجھے اب سرمد بابا کی طرف سے سخت تشویش ہونے لگی۔ میں سردست خاموش رہنا چاہتا تھا۔ پہلے دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ اونٹ کس کردٹ بیٹھے گا؟

مگر میرے نزدیک توجہ طلب دو باتیں ہیں۔ اس سارے گمن چکر میں..... سیٹھ نوید سانچے والا کہاں فٹ ہوتا تھا؟ جو لولودش کا بظاہر نمائندہ بن کر آیا تھا اور پھر عارفہ یہاں کس خانے میں فٹ ہوتی تھی۔ تجسّس آمیز کئی سوالات میرے دل و دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ بہر طور..... ہمیں ابھی اہم ترین ہم پہ لگنا تھا۔ شکیلہ کو ابھی ہم نے کچھ



نہیں بتایا تھا اور اسے وہیں رہنے کا کہہ کر میں اور اول خیر  
ویسی طریقے سے اپنا تھوڑا بہت حلیہ بدل کے سرمد بابا کی  
کونجی سے روانہ ہو گئے۔

اس بار ہم سرمد بابا کی رہائش گاہ سے ایک کار  
میں سوار ہو کر نکلے تھے۔ مجبوراً ہمیں اس بار ذاتی سواری کی  
ضرورت پڑی تھی۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ملتان  
سے ساہیوال 84 کلومیٹر تھا۔ نان اسٹاپ تیز رفتار  
ڈرائیونگ سے یہ کم وبیش گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔

وزیر جان کی عالی شان ذاتی رہائش ”کنال لاج“  
مین سٹی میں تھی اور وہ شہر کا خاصا امیر ترین اور پوش علاقہ  
کہلاتا تھا۔ وہاں سے ہائی وے سے نواح میں تقریباً پندرہ  
میں کلومیٹر کے فاصلے پر اسپیکٹرم کے اسٹیشن چیف یعنی وزیر  
خان کا خفیہ ٹھکانا اسٹیشن فور تھا۔ وزیر جان کے ان دونوں  
ٹھکانوں پر میں قدم رکھ چکا تھا۔ کنال لاج میں کبیل دادا  
کے ساتھ اور اسٹیشن فور میں ثریا کے ساتھ۔ نیرو ہاؤس.....  
جوا اسپیکٹرم کا بیس کوارٹر کہلاتا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کی میرے  
دل میں تمنا شدت سے موجود تھی۔

اس وقت مجھے بیک وقت کئی مشن درپیش تھے۔ وزیر  
جان پر ہاتھ ڈالنا اور اپنے بارے میں پوری صراحت کے  
ساتھ ماضی سے متعلق تفصیل جاننا..... اس کے بعد ثریا کا  
سراغ لگانا۔ سیٹھ نوید سانچے والا..... نے بھی ایک نیا مسئلہ  
کھڑا کر دیا تھا جس کی بھیا تک خطرناکی سے بہر حال سرمد بابا  
آگاہ نہ تھے اور مجھے لگ رہا تھا، اب سرمد بابا کا گھرانہ بھی  
کسی لمبے ہولناک چکر میں پھنسنے والا تھا۔ مجھے سب سے  
زیادہ تشویش اس بات کی ہو رہی تھی، جس نے مجھے خاصا  
پریشان کر ڈالا تھا۔ اب تک میں نے حتی الوسع یہی کوشش  
کی تھی کہ ان سارے چکروں سے سرمد بابا کو دور ہی رکھوں  
مگر میرے دیدہ و نادیدہ دشمن ہشت پا کی طرح میرے ہی  
خواہوں تک بھی پھلتے جا رہے تھے۔ مجھے خاموش اور  
پریشان دیکھ کر اول خیر مخصوص لہجے میں بولا۔

”او خیر..... کا کا! کیا بات ہے، تجھے ایک عجیب سی  
چپ لگ گئی ہے؟“

کار بھی وہی ڈرائیور کر رہا تھا۔ میں اس کی برابر والی  
سیٹ پر براجمان تھا۔ میں نے ایک گہری اور پُرسوج  
ہمکاری خارج کر کے کہا۔ ”ہاں یار! اول خیر..... بات کچھ  
ایسی ہی ہے نہ جانے کیا بات ہے میرے گرد مسائل اور  
مشکلات کے دائرے بنتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ مجھے ایسا  
لگتا ہے جیسے ایک بھنور ہے جس کے اندر میں دھنسا ہی چلا

جار رہا ہوں۔ جیسے نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ لا متناہی ہے۔“  
”او خیر..... کا کا۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں جی  
دارانہ حوصلہ افزائی سے بولا۔ ”یار رکھنا کا کا! جو جتنے بڑے  
میدان کا شہسوار ہوتا اس پر آزمائشیں بھی اتنی ہی آن پڑتی  
ہیں۔ یہ قدرت کا اصول ہے لیکن قدرت کے اصول کی ایک  
حقیقت یہ بھی ہے کہ اللہ انسان کو نوازتا تو اس کی اوقات  
سے بڑھ کر ہے مگر تکلیفیں اس کی سکت سے کم دیتا ہے۔  
پریشان نہ ہو میرے یار! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لینے دے  
تقدیر کو ہم سے کام..... کب تک لے گی۔ ہمت ہارنا تو نہ تو  
نے سیکھا ہے نہ میں نے۔“

اول خیر کی بات پر بے اختیار میرے ہونٹوں پر  
مسکراہٹ رقص کر گئی۔ اس کی باتوں میں، اس کے لہجے  
میں اور سب سے بڑی بات اس کی سنگت یاری میں جانے کیسا  
سحر تھا کہ آپ میرا دل بڑا ہونے لگتا تھا۔ حوصلوں کے  
بادبان بلند ہونے لگتے تھے۔ میں نے اسے سرمد بابا سے  
متعلق اپنی اصل فکر اور تشویش کی بات بتادی۔ جسے سن کر  
ایک لمحے کو اول خیر جیسا نڈرا اور با حوصلہ انسان بھی دم بہ خود  
سارہ گیا پھر اسی لہجے میں بولا۔

”او خیر..... کا کا! اگر یہ بات ہے تو پھر واقعی میں ایک  
لما پواڑا (بڑا مسئلہ) پڑتے دیکھ رہا ہوں۔“ مگر پھر  
دوسرے ہی لمحے مشورے دینے کے انداز میں بولا۔ ”اگر  
یہ لولودش والی بلا وہی ثابت ہوئی تو تجھے سرمد بابا کو سمجھانا ہوگا  
کہ وہ اس معاملے یعنی اس سودے سے اپنا ہاتھ کھینچ.....  
مجھے یقین ہے لولودش کی حقیقت جان لینے کے بعد بابا تیری  
بات رد نہیں کریں گے۔“

”ہاں۔“ میں نے دھیرے سے سر کو اٹھاتی جنبش دی  
اور آگے بولا۔ ”مگر ایک بات اور بھی ہے اول خیر۔“

”وہ کون سی؟“ اس نے ایک لمحے کے لیے اپنی  
نظریں کار کی ونڈا سکرین سے ہٹا کر میرے چہرے پر ڈالی  
تھیں۔

ہم ملتان روڈ پر سفر کر رہے تھے اور کافی آگے نکل  
آئے تھے، میں نے اول خیر سے کہا۔ ”یار! سچی بات  
بتاؤں، مجھے تو سرمد بابا کی بہو..... عارفہ کی بھی شخصیت  
مشکوٰۃ محسوس ہونے لگی ہے۔“ میری بات پر یقیناً اول خیر کو  
حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا۔ اس کے کہنے کا انداز اس بات کا  
غماز تھا وہ بولا۔ ”او خیر..... کیا مطلب کا کے؟ کیا پھر کوئی نوا  
پواڑا.....؟“ اس کے انداز پر بے اختیار میں ہنس دیا مگر پھر  
دوسرے ہی لمحے کھنڈی ہوئی متانت سے بولا۔



ہوں۔ ممکن ہے اس کے ذہن میں اب بھی یہی مغالطہ ہو کہ مجھے اس کے اسٹیشن فور وائل ٹھکانے کا علم نہ ہو۔ تاہم وثوق سے ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

بادی النظر میں کوٹھی میں ”آبادی“ کے وہ آثار محسوس نہیں ہوئے جس کی محتاط توقع لے کر میں یہاں آیا تھا۔ میں واپس پلٹا اور کار میں آن بیٹھا۔ اس بار کار کا اسٹیرنگ اول خیر نے سنبھال لیا تھا۔ میرے اشارے پر اس نے کار آگے بڑھا دی۔ ہائی وے پر آتے ہی کار ایک بار پھر فرارٹے بھرنے لگی۔ اسٹیشن فور وائل بچنے کا محل وقوع اور وہاں تک جانے والا راستہ مجھے ازبر تھا۔ پندرہ بیس کلومیٹر بعد میں نے اول خیر کو کار سڑک کے دائیں جانب موڑنے کا اشارہ کیا۔ ساہیوال کے نواح میں بھی اچھی خاصی آبادی کے آثار نظر آتے تھے۔ یہ بھی گنجان آباد علاقہ نظر آتا تھا جبکہ اسٹیشن فور کی عمارت یہاں سے قدرے مضافات میں نسبتاً الگ تھلگ مقام پر تھی، اگرچہ وہاں بھی پختہ و نیم پختہ مکانات اور گھر نظر آ رہے تھے، اسٹیشن فور سے پہلے ہم نے کار دانستہ طور پر ایک قریبی آٹو کار ملینک کی گیراج میں لے جا کر روک دی اور مستری کو اس کی معمول کی ٹیونگ وغیرہ میں مصروف کر دیا۔ اس کے بعد میں اور اول خیر پیدل ہی آگے بڑھ گئے۔ دن کا ایک بج چکا تھا۔

اب مذکورہ عمارت ہم سے محض چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ میں دوسری بار یہاں آیا تھا۔ اب مجھے یہاں ایک بورڈ لگا نظر آیا، دو چھوٹے بڑے سائز کی گاڑیاں بھی کھڑی دکھائی دیں۔ ایک دو آدمی بھی دکھائی دیے، یہاں سڑک نما پختہ راستہ تھا۔ کنارے عمارت کے گیٹ کے باہر..... دو آہنی اینگل نصب کر کے وہ سفید اور سبز رنگ کا بورڈ لگا نظر آ رہا تھا جس پر گول دائرے کی صورت میں سونو گرام بھی نظر آ رہا تھا۔ بادی النظر میں اب اس عمارت پر کسی ادارے یا سرکاری عمارت کے دفتر کا ہی گمان ہوتا تھا۔ گویا ان چند دنوں میں اسپیکٹرم کی اس عمارت ”اسٹیشن فور“ کو مختلف ناموں سے تحفظات دے دیے تھے۔ کسی مشہور بین الاقوامی این جی او کا نام استعمال کیا گیا تھا۔ جسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی اور نہ جانے کتنے ترقی یافتہ ممالک کے نام بھی درج تھے جو انسانی خدمت کی بھلائی کے نام پر اسے سپورٹ کر رہے تھے۔ یونہی عام راہ گیروں کی طرح قریب سے گزرتے ہوئے میں نے یہ سب غور سے ”ملاحظہ“ کیا تھا اور اندر ہی اندر غصے سے دانت چرس کر رہ گیا تھا۔ وزیر جان کا نام بھی.... سپورٹ آفیسر کے طور پر

”مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ عارفہ، سرمد بابا کی سادہ مزاجی اور محبت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے اور بابا کی جذباتی کمزوری بن کر اپنا مطلب نکال رہی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں کا کا؟“ اول خیر نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اول خیر! سرمد بابا دنیا کے سامنے سیٹھ منظور وڑائچ ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ درحقیقت وہ اب بھی سرمد بابا ہیں لیکن بد قسمتی سے سرمد بابا کو اس تلخ حقیقت کا اندازہ نہیں۔“

”او خیر..... کا کے! تو کیا کہنا چاہتا ہے؟“ اول خیر اب بھی نہیں سمجھتا تھا۔ حالانکہ سرمد بابا اور سیٹھ نوید سانچے والا کی گفتگو وہ بھی سن رہا تھا۔ ممکن تھا اس کی توجہ نہ ہو۔

”اول خیر! اب بھی سب کچھ عارفہ نے اپنے ہی نام رکھا ہوا ہے۔ کاروبار... سے متعلق معاملات، کوٹھی، جائداد اور بینک بیلنس..... حالانکہ یہ سب ابتدا سے ہی سرمد بابا کا ہی تھا۔“ میں نے اول خیر کو ایک بار پھر سرمد بابا کے ماضی سے متعلق اپ ڈیٹ بھی کر دیا۔

”ان سب باتوں کا اندازہ مجھے سیٹھ نوید سانچے والا کی باتیں سن کر ہوا تھا۔ اب مجھے ڈر لگتا ہے، مطلب نکل جانے یعنی عارفہ کی صحت یاب واپسی کے بعد کہیں بے چارے سرمد بابا ایک بار پھر عضو معطل کی طرح کسی کوٹھے میں نہ پھینک دیے جائیں، میں نے بھی اس وقت تہیہ کر لیا کہ اگر دوبارہ ایسا ہوا تو میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ کیونکہ سرمد بابا نے مجھے اپنا بیٹا کہا ہے۔“ اول خیر نے میری بات پر تائیداً اپنا سر ہلایا تھا۔

باقی سفر خاموشی سے تمام ہوا۔ ساہیوال پہنچ کر میں نے اپنی کار کا رخ اس پوش علاقے کی طرف کر دیا تھا جدھر کنال لاج نامی کوٹھی واقع تھی۔ وہاں مجھے سناٹے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ کار تھوڑی دور کھڑی کرنے کے بعد میں نے اول خیر کو کار میں محدود رہنے کا کہہ کر خود منرگشت کے انداز میں چلتا ہوا کنال لاج کے قریب آ کر اس کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے تھوڑا بہت اپنا حلیہ بدل رکھا تھا کہ فوری طور پر پہچان نہ لیا جاؤں۔ مجھے یہاں وزیر جان کی موجودگی کا کچھ زیادہ وثوق نہیں تھا۔ کیونکہ بقول ثریا کے وزیر جان کے اسٹیشن چیف بن جانے کے بعد اس کا زیادہ تر وقت اب اسٹیشن فور وائل بچنے میں گزرتا تھا جو درحقیقت اسپیکٹرم کا ذیلی ٹھکانا بھی تھا۔ وزیر جان کے علم میں یقیناً یہ بات تھی کہ میں اس کی یہ کنال لاج والی کوٹھی دیکھ چکا



”آخر، کا کے! لگتا ہے کہ ایک نئی پسوڑی پڑنے والی ہے۔“

”یہ پسوڑی نہیں ہے اول خیر! اطفال گھر میرا اپنا گھر ہے۔ یہ میرا اپنا خاندان ہے۔ میں بہت بے چین ہو گیا ہوں اول خیر! میں ہر صورت میں ان لوگوں کا دہاں سے قبضہ ختم کروں گا۔ ورنہ مجھے ساری زندگی چین نصیب نہیں ہو گا۔“

میں جوش غیظ تلے بولے جا رہا تھا اور میرے سینے میں ایک دھواں سا بھر رہا تھا۔ میں تو اب تک یہی سمجھتا ہوں تھا کہ کنگل خان کے خاتمے اور چودھری ممتاز خان کو ایک بڑی زک پہنچانے کے بعد ان لوگوں کا اطفال گھر سے قبضہ ختم ہو چکا ہوگا۔ مگر آج یہ میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی تھی۔ مجھے یاد تھا اس سلسلے میں سرمد بابا نے بھی مجھے تسلی تو دی تھی کہ وہ بذات خود اطفال گھر کا نظام سنبھالنے والے تھے، پھر بد قسمتی سے نہ مجھے ان سے اس بارے میں کچھ پوچھنے کا موقع مل سکا، نہ ہی وہ مجھے اب تک کچھ بتائے تھے، کیونکہ انہی دنوں ایک طرف میں پولیس وغیرہ کے چکروں میں الجھا ہوا تھا تو دوسری طرف عارفہ اپنی بیماری کے سلسلے میں امریکا روانگی کی تیاریوں میں تھی اور سرمد بابا عارفہ اور عابدہ کی روانگی وغیرہ کے سلسلے میں مصروف کار رہے تھے۔

ہم تھوڑا آگے جا کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ یہاں کچھ نئے اور زیر تعمیر ہائوس پروجیکٹ کے ”ڈھانچے“ استادہ تھے۔ میں نے اول خیر سے کہا۔ ”یہ وزیر جان تو یہاں اس عمارت میں باقاعدہ ایک دفتر بنا کر فروکش ہو گیا ہے تو کیا اس سے پہلے عام آدمی کے طور پر ملاقات کی جائے یا پھر دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے؟“ میری بات پر وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

”آخر، کا کے! آج پہلی بار تو مجھ سے مشورہ مانگ رہا ہے ورنہ تو تو ہر پھنڈے میں خود ہی ٹانگ اڑا لیتا ہے اور پھر میں بھی تیرے ساتھ چل سو چل۔“ اس کے شرارت بھرے انداز پر میں بے اختیار ہنس دیا پھر سنجیدہ ہو کے بولا۔

”نہیں یار! ایسی بات نہیں۔ کیونکہ مجھے تم پر بھروسہ بھی ہے، تم کبھی مجھے کوئی غلط مشورہ نہیں دو گے۔“

”آخر، کا کے! تو تو جذباتی ہو گیا۔ میں نے تو تیرے ساتھ ٹول (مذاق) کیا تھا۔ خیر، اب سن میری بات۔ تو نہ صرف ان لوگوں کی نظروں میں آچکا ہے بلکہ انہیں یہ بھی پتا چل چکا ہے کہ تو ان کی اصلیت سے اچھی طرح آگاہ ہے۔“

درج تھا۔ جس فلاحی تنظیم کا نام مونو گرام کی صورت درج تھا، اسے پڑھ کر میں یکلخت مبہوت ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ نام ”اطفال گھر“ تھا۔

میں اس نام کو دیکھ کر ادھر ہی جامد ہو کے رہ گیا۔ یہ تو اول خیر تھا جس نے بازو سے پکڑ کر مجھے آگے بڑھا دیا۔ ”آخر، کا کے! ادھر رکنا نہیں ہے۔ آگے چل۔“ ہم کافی آگے چلے گئے اور پھر رک گئے۔

میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اطفال گھر اب بھی ان مردودوں کے حوالے تھا اور یہ اس ادارے کی آڑ میں اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے یا عین ممکن ہے اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالے ہوئے تھے۔ اطفال گھر میرے بچپن اور میرے ماضی کی پہچان تھی اور میں کسی صورت میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ چودھری ممتاز خان یا وزیر جان جیسے سماجی درندوں اور ملک دشمن عناصر اس کے روج رواں بنیں۔

مجھے ساری کہانی سمجھ میں آرہی تھی، رفتہ رفتہ کسی..... لیکن اس دوران اول خیر نے مجھے ٹوکا۔

”شہزی کا کے! کدھر کھو گیا تو؟“

”اول خیر! مجھے یہ لمبی کھیڈ معلوم ہوتی ہے۔ اطفال گھر پر ان لوگوں نے پوری طرح اپنا قبضہ جمالیا ہے۔“ ”یہ تو ہے کا کے! وزیر جان بھی لوگوں کی نظروں میں ایک مشہور صنعت کار اور انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں خود کو ایک سماجی کارکن کے طور پر ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”کچھ بھی ہو اول خیر! میں اطفال گھر جیسے ادارے میں ان خبیث شیطانوں کا تسلط ہوتا کبھی نہیں دیکھ سکتا۔“ میں نے غیظ جوش سے پھرے ہوئے لہجے میں کہا تو اول خیر آہستگی سے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

”آخر، کا کے! ذرا ہولارہ۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آہستہ آہستہ نہیں اول خیر، یہ کام فوراً ہونے کا متقاضی ہے۔“ میں مضبوط اور جے ہوئے لہجے میں بولا۔

”نہ جانے وہاں یہ معصوم بچوں کے ساتھ کون سا نیا گل کھلا رہے ہوں، پتا نہیں۔ وہاں ممتاز خان جیسے درندوں کے کسی کنگل خان جیسے کارپرداز سے کوئی دوسرا شہزی نبرد آزما ہو، نہیں اول خیر نہیں۔ مجھے اطفال گھر کو دیکھنا ہے۔ وہاں کے حالات کی آگاہی حاصل کرنا مجھ پر اب ویسے بھی فرض سے بڑھ کر ایک فرض ہے۔“



# کیا آپ

## لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لحاظ کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

### المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

کیونکہ ٹریا پر سب سے پہلے وزیر جان کو ہی شبہ ہوا تھا۔ بقول تیرے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر جان بہت شاطر آدمی ہے۔ وہ ہم پر قابو پانے کی کوشش کرے گا ہمیں دیکھتے ہی۔ میرا خیال ہے یہ باہر جو بورڈ وغیرہ نظر آرہا ہے یہ بھی لوگوں کو دھوکے میں رکھنے کے لیے ہوگا۔ اندر کوئی دفتر وغیرہ نہ ہوگا یوں بھی آج کل ہنگوں میں دفتر لگانے کا عام رواج ہے۔ ہمیں نقب لگا کر اندر داخل ہونا چاہیے۔“

”ہوں، میں تیار ہوں پھر۔“ میں نے ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر پلٹے۔

دفتر یعنی اسٹیشن فور کی عمارت کے باہر ذرا بھی کسی قسم کی آؤک جاؤک..... یعنی آمدورفت نظر نہیں آتی تھی۔ گویا یہاں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ یا تو انتہائی رازداری کے ساتھ یا پردے کے پیچھے ہو رہا تھا۔

اس بار ہم نے عقیبی راستہ اختیار کیا تھا۔ ابھی ہم اس راستے پر ہی تھے کہ اچانک ٹھٹک کر رکے۔ ایک گاڑی کی آواز عقب سے آتی ہوئی سنائی دی۔ ہم دونوں ہی بیک وقت رُک کر پلٹے، وہ ایک مزدار ٹرک تھا۔ یہ چھوٹے سائز کا ٹرک تھا جو عام حریلو سامان وغیرہ اٹھانے میں مستعمل ہوتا تھا۔ ہم ایک طرف کو ہو کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ہمارے قریب سے گزر گیا۔ اس کے اوپر فرنچیز لدا ہوا تھا۔ یہ عام دفتری فرنچیز تھا۔ جو آفس ٹیبلو اور چیئرز پر مشتمل تھا۔ ٹرک نے موڑ کاٹا اور عمارت کے داخلی گیٹ کی طرف گھوم گیا۔ میرا سو فیصد خیال تھا کہ اس ٹرک کا فرنچیز اس عمارت کے لیے ہی لایا گیا ہوگا۔ کچھ سوچ کر ہم نے ارادہ بدلا اور اس طرف مڑ گئے۔ دیکھا تو وہ ٹرک گیٹ کے سامنے رکا ہوا تھا۔ اور اس میں سے کرسیاں، میزیں اتاری جا رہی تھیں۔ میرے ذہن نے فلا بازی کھائی اور میں نے اول خیر سے کہا۔ ”آؤ، ادھر ہی سے اندر چلتے ہیں۔“

”او خیر..... سمجھ گیا۔“ اول خیر ہولے سے بڑبڑایا۔ عمارت کے اندر سے ایک موٹا آدمی برآمد ہوا اور اس کے ساتھ ایک جوان شخص بھی تھا، موٹا پختہ العمر تھا۔ یہ فرنچیز کا سرسری جائزہ لے رہے تھے، ہم دونوں قریب آگئے، دونوں نے ہم پر اچھتی سی نظر ڈالی تھی، میں نے گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ دونوں ٹرک کے کسی منشی ٹائپ آدمی سے باتیں کرنے میں محو تھے، میں اور اول خیر عام ملاقاتیوں کے انداز میں عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔ مجھے یقین تھا، اسٹیشن فور میں وزیر جان نے جس طرح کا بہروپ بدلا ہوا تھا، وہ یہاں کسی قسم کی گرما گرمی کے موڈ



میں نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ادارے کی شکل میں یہاں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور دھما چوکڑی اسے یہاں عام مقامی لوگوں کی نگاہ میں مشکوک بنا سکتی تھی۔

بہروپ بازی میں جہاں بہت سے فائدے ہوتے ہیں وہاں ایک اس کمزوری کو مصلحتاً برداشت کرنا پڑتا ہے اور میرے ذہن رسامیں اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا خیال ابھرا تھا۔ یوں میں اور اول خیر دیسی ساختہ بھیس بدلے ہوئے تھے باؤی النظر میں ہمیں کوئی نہیں پہچان سکتا تھا جب تک قریب بیٹھ کر کسی سے محو کلام نہ ہوتے۔

اندر داخلی دروازے پر بھی ایک چہرہ اسی ٹائپ شخص ایک اسٹول پر بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔ ”وزیر صاحب سے ملنا ہے۔“

”اندر آفس سپرنٹنڈنٹ اسلم صاحب سے مل لو پہلے۔“ چہرہ اسی نے کہا اور آگے بڑھ کر جالی دار شٹر کھول دیا۔ میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ بلاشبہ ہم نے ایک خطرناک جگہ پر قدم رکھ دیا تھا مگر ہم اپنے گرد و پیش سے محتاط بھی تھے، کچھ لگتا ایسا ہی تھا کہ یہاں موجود ”اسٹاف“ کے لوگوں میں زیادہ تر عام لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ ان میں دو چار ”خاص“ لوگوں کی موجودگی بھی ممکن ہو سکتی تھی، ہال کمرے میں سات آٹھ افراد اپنی میزوں پر جھکے کام میں مصروف نظر آئے۔ پورا دفتری ماحول پیدا کیا گیا تھا۔ یہاں میزوں پر کمپیوٹر، پرنٹرز وغیرہ بھی موجود تھے۔ کچھ آپس میں باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ اپنی میز اور کرسی کے غیر معمولی سائز اور الگ تھلگ جگہ پر موجود آفس سپرنٹنڈنٹ اسلم کو پہچاننے میں مجھے چنداں دیر نہ لگی۔ ہم نے اسی کی طرف قدم بڑھا دیے۔

اس کے برابر میں ایک بڑے سے کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا، جس کی پیشانی پر وزیر جان بریکٹ میں ”سپورٹ آفیسر“ کا نام مجھے نظر آیا تھا۔ اسلم ایک پختہ العمر شخص تھا۔ رنگ گورا تھا۔ پیشانی کی طرف سے بال چٹ تھے، جو باقی تھے وہ بہت پیچھے جا کر کچھ کرلی ہو گئے تھے۔ ہماری طرف اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ میں نے وزیر جان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک مذکورہ آفس روم کا دروازہ کھلا اور دو افراد برآمد ہوئے۔ دونوں میرے لیے اجنبی تھے۔ اسلم نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ہم سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”آپ کس سلسلے میں صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”اطفال گھر میں موجود ایک بچے کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔“ اس بار اول خیر نے کہا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسلم نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود کمرے میں چلا گیا۔

”شکار اندر موجود ہے کا کے۔“ اول خیر نے میرے کان کے قریب سرسراتی سرگوشی کی۔ خود جوش اور عجیب و غریب احساسات و کیفیات کے مارے میری حالت و گریگوں سی ہو رہی تھی، وزیر جان نے یا یوں کہا جائے کہ اسپیکٹرم نے بڑا شاندار بہروپ بدلا تھا۔ یہاں موجود سب بظاہر عام سے ملازم ٹائپ لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ ممکن تھا ان میں ان کا کوئی گھاگ تربیت یافتہ ایجنٹ بھی موجود ہو جو آنے جانے والوں پر نگاہ رکھتا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد اسلم برآمد ہوا اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ خود بھی اندر ہی تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سب سے پہلے میں نے اندر قدم رکھا تھا۔ آفس بلاشبہ بڑے شاہانہ طرز کا تھا۔ ایک بڑی سی میز کے پیچھے گھومنے والی سیاہ کرسی پر وزیر جان براجمان تھا۔ اول خیر بھی اندر آ گیا پھر میں نے وزیر جان کو کبھی آواز میں کہتے سنا۔

”اسلم صاحب! آپ باہر جاؤ۔“ وہ باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اندر کا ماحول مجھے دھڑکتا محسوس ہونے لگا۔ کچھ خبر نہ تھی، وزیر جان مجھے پہچانا بھی تھا یا نہیں..... مگر دوسرے ہی لمحے جیسے میری ٹھنکی ہوئی سماعتوں میں سنسنی گونج گئی جب وزیر جان نے عجیب سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ شہزی اور اپنے ساتھی کو بھی بٹھا دو۔“

اول خیر کو بھی یقیناً اس بات پر جھٹکا لگا تھا کہ وزیر جان ہمیں بہر حال پہچان چکا تھا۔ وزیر جان نے بیش قیمت سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بہت مطمئن اور پرسکون نظر آ رہا تھا مگر اس کے عمر رسیدہ سے چہرے پر جیسے بڑی خطرناکی تھی جو میری بھانپتی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ میں نے کچھ زیادہ چونکنے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اس کی بات پر کیونکہ میں اس کی حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ کیا ”شے“ ہے۔

”اوہ..... تو تم مجھے پہچان گئے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھال لی۔ اول خیر بھی میرے برابر والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ یہ آرم چیئر تھی۔ جس کی ہتھملی پر بازو رکھتے ہی یکلخت ایک کلک کی آواز ابھری اور دوسرے ہی لمحے میرے پورے وجود میں سنسنی



کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اور اول خیر..... بڑے آرام سے کسی چوہے دان میں پھنس گئے ہوں کیونکہ کرسیوں کی دونوں ہتھکیوں میں لگے دو خفیہ آہنی کلپس نے ہماری دونوں کلائیوں کو رکن بست کر دیا تھا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ میں نے خوشخوار نظروں سے وزیر جان کو گھورا۔ اس نے بڑے آرام سے انٹرکام کا ریسپورٹ اٹھا کر کسی کو اندر آنے سے منع کرنے کی ہدایت جاری کی۔ اس کے بعد اس کا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ سارے سسٹم کے بشن اس کی چیئر یا میز کے نیچے چھپے کسی خفیہ کنٹرول سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دفعتاً ایک جھماکا ہوا اور وزیر جان کی عقبی دیوار جس پر بڑی سی کوئی پینٹنگ نصب تھی، ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ ایک طرف کو سرک گئی اور اب وہاں ایک بڑی سی اسکرین روشن ہو گئی۔ میری اور اول خیر کی نظریں وزیر جان کے چہرے سے ہٹ کر اس کے عقب میں اٹھ گئیں اور مجھے ایک جھٹکا لگا۔ اسکرین پر میری اور اول خیر کی مانیٹرنگ کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ جب ہم دونوں تھوڑی دیر پہلے اسٹیشن فور کی عمارت کے سامنے سے گزرے تھے، پھر دوبارہ عقب میں جا کر لوٹے ہوئے دکھایا جا رہا تھا۔ پھر ایک جگہ منظر Still ہو گیا۔ ہم دونوں کے چہرے فوکس ہوئے، چھ خانوں کا ایک مربع گراف ہمارے چہروں پر فوکس ہوا، اور اس نے ہمارے اصل چہرے واضح کر دیے۔ وزیر جان کی نظریں ہم دونوں کے چہروں پر جمی رہیں۔ اسکرین آف ہو گئی، پھر اس پر دوبارہ پہلی والی دیوار سرک آئی جس پر عام سی پینٹنگ آویزاں تھی۔

میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے اپنی طاقت اور ہوشیاری کا ایک ٹیکنیکل مظاہرہ کیا تھا۔ گویا وہ آرام سے اسٹیشن فور کی عمارت کے اندر بیٹھا عمارت کے اطراف کی مانیٹرنگ کرتا رہتا تھا۔

”ہاں، اب کہو..... یہاں کیا لینے آئے تھے؟“ اس نے گہمیر مگر سرسراتے لہجے میں کہا۔ میں نے اپنے غیظ و غضب پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

”اسس ماحول میں کیسے گفتگو کی جاسکتی ہے؟“ میرا اشارہ اپنے ہاتھوں کی کلائیوں کے جکڑ بندوں کی طرف تھا۔ میری بات سن کر وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔ اس وقت مجھے اس کا بھاری چہرہ بہت مکروہ محسوس ہوا۔ وہ کسی طور بھی ساتھ سے کم کا نہ تھا مگر عمر رسیدگی میں بھی اس نے اپنی صحت سنبھالے رکھے تھے۔ اس میں یقیناً خوش حال

زندگی کی آرام طلبی کا بھی دخل رہا ہوگا جبکہ میں نے اپنے بچپن میں اسے ایک جوان مرد کی شکل میں ہی دیکھا تھا۔ ایک تنگ و تاریک اور عسرت زدہ ماحول میں..... مگر اس کا چہرہ میں بھلا نہیں پایا تھا آج تک اور بھلاتا بھی کیونکر.....

”وقت ضائع کرنے کے بجائے کام کی بات کرو تو زیادہ بہتر ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں اس پر نظریں جماتے ہوئے یولا..... ”تم سے اپنی زندگی کا اہم ترین سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ..... تم کون ہو؟ اور میرے کیا لگتے ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے فوراً سرد مہری سے کہا۔

”اس کا مجھے اندازہ اسی دن ہو چکا ہے جب ہماری پہلی ملاقات ”کنال لاج“ میں ہوئی تھی۔“ میں نے اپنے سینے کے اٹھتے غبار پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”جب تم نے میری موت کا پروانہ جاری کیا تھا۔“

”وہ تو میں اب بھی کروں گا۔“ اس نے بڑی سفاکی سے کہا اور مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی رہتی محسوس ہونے لگیں مگر میرے سینے سے اٹھتا ازلی دکھ کا غبار میرے دل و دماغ میں ہی نہیں میرے رگ و پے میں بھی رفتہ رفتہ سرایت کرتا جا رہا تھا۔ یہ گھڑیاں یہ لمحات میری زندگی کی اہم ساعتوں میں شمار ہو رہے تھے۔ میری شناخت کے حوالے سے یہ لمحات میری ذہنی اور نفسیاتی شخص کے لیے شکست و ریخت کا باعث بھی تھے اور میرے تفاخر کا بھی..... یقیناً اس سے وزیر جان بھی بخوبی واقف تھا۔ لہذا میں نے اس کی سفاکانہ دھمکی کو صرف نظر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”یہ وقت بتائے گا، اسے چھوڑو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ اگر میں تمہارا کچھ نہیں لگتا تھا تو پھر وہ سب کیا تھا؟ وہ عورت کون تھی؟ جو میری سوتیلی ماں اور تمہاری محبوب بیوی کہلاتی تھی اور تم میرے باپ..... تم یقیناً اسی کے کہنے پر ہی مجھے اطفال گھر جیسے ادارے میں میری انگلی پکڑ کر لائے تھے، مجھے یہ بہلا دادے کر کہ تم مجھے باہر سیر کرانے لے جا رہے ہو۔ پر وہاں مجھے چھوڑ کر تمہارا موٹے موٹے آنسوؤں کے ساتھ رونا..... وہ سب کیا ڈراما تھا۔ اگر تم میرے لیے کچھ حیثیت نہیں رکھتے تو پھر میرے اصل ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟“ یہ سب کہتے ہوئے میرے لہجے میں رقت اترنے لگی۔ لفظوں میں تھر تھراہٹ لڑنے لگی۔ مگر میں اپنی اعصابی قوت کی بھرپور کوشش سے خود کو سنبھالے ہوئے رکھنے کی بھی سعی کر رہا تھا۔ میری بات پر



پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس سے ظاہر ہوا کہ تم ایک عورت کی خاطر اپنی سگی اولاد کو بھی خود سے دور کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔“ میرے جواب نے اس پر کاری ضرب لگائی تھی۔ اس کا مسکراتا ہوا زہریلا چہرہ جیسے یک دم ترخ سا گیا۔ ایک تلخ سارنگ اس کے چہرے اور آنکھوں میں لہرا گیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ عجیب پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ میرے ذہن نے تیزی سے موجودہ صورت حال پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے دونوں ہاتھ کلائیوں کی طرف سے رسن بستہ تھے۔ میں نے بارہا اپنے ہاتھوں کی کلائیوں کو جنبش دے کر آہنی کلپس کی مضبوطی کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کی تھی مگر جکڑ بند بہت مضبوط تھے۔

وہ دوبارہ اپنی بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر پر براجمان ہو گیا پھر میری طرف بر مانی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”تم کون ہو، کیا ہو، کس کے بیٹے ہو، تمہارا باپ کون ہے اور اس وقت گمنامی کے اندھیروں میں کہاں پڑا سڑ رہا ہے۔ تمہاری ماں کہاں ہے۔ یہ سب جو تمہارے لیے ایک ازلی کرب کا باعث بنے ہوئے ہیں، وہ سب میں اچھی طرح۔۔۔ بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔“

مجھے اس کی باتوں پر چونکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ مجھے تو پہلے ہی یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ یہی وہ واحد شخص ہے جو میرے سینے میں سلگتی چنگاریوں جیسے بھڑکتے سوالوں کے جواب رکھتا ہے مگر اس کی آخری بات پر میں چونکنے پر ضرور مجبور ہوا تھا کہ میرا باپ اس وقت گمنامی کے اندھیروں میں کہاں پڑا سڑ رہا تھا اور ماں کے متعلق بھی اس نے اسی طرح کا اشارہ دیا تھا کہ وہ کہاں ہے؟

”تو کیا میرے ماں باپ۔۔۔ دونوں زندہ تھے؟“ ایک اور سوالیہ آنکڑا میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا اور میرے کانوں میں آندھیوں کی شاخیں شاخیں سی گونجنے لگیں۔ اس کی باتیں سن کر۔۔ ایک بار پھر میرا دل و دماغ ازلی کرب تلے گھٹنے لگا تھا۔ تڑپ کی ایک شدید لہر میرے پورے وجود تفتہ میں سرایت کر گئی اور پھر جیسے میں ڈھے جانے کی کیفیات سے گزرنے لگا۔

”اگر تم یہ سب جانتے ہو تو مجھ سے چھپانے کا کیا فائدہ؟ میرے ماں باپ اگر زندہ ہیں تو کہاں ہیں؟“ ”کیا یہ تمہاری آخری خواہش ہے؟“ وہ استہزائیہ

وزیر جان نے اونچی پشت گاہ والی دبیز چیئر سے اپنی پشت لگا دی اور بڑے غور سے میرا چہرہ تکتا رہا پھر بولا۔ ”لڑکے! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اپنی ذات کے بارے میں اس قدر حساس نکلو گے اور نہ ہی مجھے تمہارے سینے کی اس تڑپ کا پتا تھا کہ تم اپنی شناخت کے معاملے میں کتنے ”مچی“ ہو۔“ ”ہر خود دار اور با غیرت انسان یہ ضرور جاننا چاہتا ہوگا کہ وہ کس باپ کی اولاد ہے۔ وہ کس نسل سے ہے۔ پھر میرا معاملہ تو ویسے بھی اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میرے ماں باپ اس دنیا میں بھی ہیں کہ نہیں۔“ میں نے کہا۔ وزیر جان اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے گردن موڑ کر اول خیر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی مجھ سے نظریں چار کیں اور پھر جیسے اس کی نظروں نے میرے چہرے اور میری آنکھوں سے جھلکتی غم و اندوہ اور کرب آمیز جوش جھلسلاہٹ بھانپ لی۔ اسے ادراک ہوا تھا فوراً کہ میں اس وقت کس قیامت خیز ذہنی ہیجان اور نفسیاتی وجدان کی ملی جلی اور متضاد کیفیات سے گزر رہا ہوں۔

”حوصلہ رکھ کا کا۔“ مجھے اس کی ہولے سے مخصوص آواز سنائی دی اور اسی وقت میں وزیر جان کی آواز پر متوجہ ہو گیا۔

”لڑکے! اس بات کا تو اطمینان رکھ کے تو میرا بیٹا نہیں ہے اور نہ ہی میرا تجھ سے ایسا کوئی نسب یا خونی رشتہ ہے۔“

”یہ بات میرے لیے بھی باعث طمانیت ہے کہ میں تیرے جیسے انسان کا بیٹا نہیں۔۔۔ وزیر جان۔“ ایک خوش کن احساس تلے جیسے میرے اندر کا غبار اور لہجے کی رقت ہل کے ہل صاف ہونے لگی تھی اور میں نے بڑے مستحکم لہجے میں فوراً وزیر جان سے یہ کہا تھا۔ اسے یہ بات بری لگی ہوگی یا نہیں۔ تاہم وہ میری طرف گھوما تو اس کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی اور وہ اسی لہجے میں بولا۔

”مجھے تمہاری دلی و ذہنی کیفیات اور کرب کا اچھی طرح اندازہ ہے۔۔۔ لڑکے اور سب سے اہم بات یہ کہ کئی سال پہلے میں کبھی یہی سمجھے ہوئے تھا کہ تم میری اولاد ہو۔۔۔ جب تم چھوٹے تھے، بہت چھوٹے اور میں نے تمہیں اطفال گھر لے جا کر پھینک دیا تھا، بعد میں اس حقیقت کا علم ہوا تھا کہ تم میری اولاد نہیں ہو اور پھر میں نے اطفال گھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔“

میرے دل میں درد کی لہری اٹھی۔ میں نے بھی



داری فزوں تھی۔ مجھے تسلی ہو گئی پھر اچانک ہی روشنی ہو گئی۔ اندھیرے سے یک دم روشنی ہونے پر ایک لمحے کو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ جب تک صورت و گرد و پیش سمجھ میں آئی، بیک وقت کئی گئیں ہم پر اٹھتی چلی گئیں۔۔۔ پانچ گن بردار چوکس کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے درشت لہجے میں ہمیں اٹھنے کا حکم دیا۔ یہ تہ خانہ نما آٹھ بائی دس کا کمر تھا۔ فرنیچر نام کی ہر شے سے عاری۔ میں اور اول خیراٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے بظاہر سرسری نگاہ سے ان کا جائزہ لیا تھا۔ ان کے انداز و اطوار سے انتہائی مہارت ٹپکتی تھی۔ چوکس ہونے کا انداز بھی ان کی اس قسم کی تربیت کی غمازی کرتا تھا۔ میں اور اول خیراٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

ہمیں گن پوائنٹ پر وہاں سے ایک دوسرے نسبتاً بڑے ہال کمرے میں لایا گیا۔ یہ آراستہ کمر تھا۔ فرنیچر بھی پڑا نظر آ رہا تھا۔ دو افراد نے ہمارے ہاتھ پشت کی ست موڑ کر باندھ دیے۔ انہیں ہمارے سلسلے میں جو حکم ملا تھا وہ یہ پورا کر چکے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان میں سے تین گن بردار ایک دوسرے دروازے سے نکلتے چلے گئے۔ جس نے تحکمانہ درستی میں ہمیں آگے بڑھنے کا کہا تھا وہ اب اپنے دائیں کان پر ہاتھ لے جا کر مؤدبانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”باس! دونوں روم تھری میں پہنچا دیے گئے ہیں۔“

میں آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنے کان میں چسپاں وہی چپ نما خفیہ ٹرانسمیٹر استعمال کر رہا تھا جو ثریا نے مجھے بھی دیا تھا جو اب میرے پاس نہیں تھا۔ وہ یقیناً اپنے پاس یعنی اسٹیشن چیف وزیر جان سے ہی مخاطب تھا۔ میرے ذہن میں دھکڑ پکڑ جاری تھی۔ وزیر جان سے مجھے کم از کم اتنا تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ میرے ماں باپ زندہ تھے۔ کہاں تھے، یہ وہی جانتا تھا۔ تاہم میرے دل و دماغ کو اس احساس نے جہاں سکون و مسرت بخشی تھی، وہاں یہ خیال مجھے ادھ موایے دینے کی حد تک بے چین کیے ہوئے تھا کہ مجھے اپنے ماں باپ کو ہر قیمت پر تلاش کرنا تھا۔ میرا تقاضا لوٹنے لگا تھا۔ میری گرجی گرجی شناخت اب دوبارہ مستحکم ہو رہی تھی، دل و دماغ میں شدید تڑپ جاگ پڑی تھی کہ میں اپنے ماں باپ کو تلاش کروں، وہ کہاں تھے، کس حال میں تھے، میں ان کا لخت جگر تھا۔ یقیناً وہ بھی میری طویل جدائی میں تڑپ رہے ہوں گے۔ میرے اندر جوش و جذبات کے طوفان اٹھانے لگے تھے۔ میں اپنے باپ کے سینے سے لگنا چاہتا تھا پھر اس کی

اور پُر غرور انداز میں مسکرا کر بولا۔ میں ایسے نازک موقع پر اسے خار دلانا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا ہموار لہجے میں بولا۔ ”ایسا ہی سمجھ لو۔“

”نہیں۔“ اس نے یک دم کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ ”نہیں۔۔۔ ابھی تمہاری آخری خواہش کے اظہار کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ہمیں تم سے بہت کام لینے ہیں۔“ میں اس کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔

”کیسا کام لینا چاہتے ہو تم مجھ سے؟“

”یہ باتیں یہاں نہیں ہو سکتیں۔“ وہ بولا۔ ”مجھے افسوس تو اسی بات کا ہے کہ تمہیں ہلاک کرنے کی ابھی میری تمنا قہطل کا ہی شکار رہے گی۔“ اس نے یہ الفاظ آخر میں قدرے دانت پیسنے کے انداز میں کہے تھے۔

”کیا یہ سپیریئر اتھارٹی کا فیصلہ ہے یا ماسٹر اتھارٹیز کا؟“ میں نے طنز یہ کہا۔

”اوہ۔۔۔ بہت کچھ جانتے ہو تم ہمارے بارے میں۔“ وہ ہونٹ سکیڑ کر بولا۔ ”یہ سب اس کتیا کا کام ہے۔“ میں چونکا۔ اس نے ”کتیا“ کس کو کہا تھا؟ میں سوچتے لگا اور پھر میرے ذہن کی اسکرین پر ثریا کا نام ابھرا۔

ٹھیک اسی وقت مجھے یوں لگا جیسے میں آن کی آن میں فضا میں معلق ہو گیا ہوں۔ زمین شق ہوئی تھی اور میں اور اول خیراٹھ سیمت یک دم جیسے پاتال میں اتر گئے۔ کسی خود کار میکینزم کے تحت پوشیدہ ٹینک پہلے ہی سے وزیر جان کی رسائی تھی، اس نے اس کا استعمال کیا تھا۔ چند منٹ کی گھٹا ٹوپ گہرائی میں اترنے کے بعد ہلکی سی کلک کی آواز سے میری کلاسیاں آزاد ہوئیں تب اس کے دوسرے ہی لمحے کرسی نے مجھے الٹ دیا۔ میں منہ کے بل فرش پر آ رہا تھا۔ شکر تھا، فرش پر دبیز قالین بچھا تھا۔ بچ گیا مگر اوندھے منہ گرا۔ ہلکی سرسراہٹ ابھری۔ شاید کرسیوں کو دوبارہ اوپر کھینچ لیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے والا آفس روم کا فرش اب گویا چھت بن گیا تھا اور کرسیاں دوبارہ ایک خود کار میکینزم کے تحت چھت کے شق زدہ روشن ٹکڑے میں غائب ہو گئیں۔ چھت برابر ہو گئی۔

اب ہاتھ کو ہاتھ تک بھائی نہ دینے والا معاملہ تھا۔ میرے گرد گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تاریکی کے باعث میری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔

”اول خیر!“ میں نے ہولے سے اسے پکارا۔

”او خیر۔۔۔ کا کے، میں بھی تیرے ساتھ ہوں۔“

اس کی مخصوص آواز ابھری۔ ان حالات میں بھی اس کی جی



بوزھی آنکھوں میں اترتے ایک باپ کے فخر کو دیکھ کر مسرت آگئیں گھڑیوں کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اپنی ماں کی گود میں سر رکھنا چاہتا، اس کی میٹھی مست کی چھاؤں میں وہ سکون حاصل کرنا چاہتا تھا جس سے میں آج تک محروم تھا۔ ایک پیاس تھی میرے اندر جو اب شدید تر ہوئی جا رہی تھی۔ کئی سوالات میرے اندر کھلبلائے لگے تھے، میں اپنے ماں باپ سے کیسے جدا ہوا تھا۔ میری ماں اس مردود شخص وزیر جان کے عقد میں کیسے آئی تھی؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا جب میں چھوٹا تھا تو اپنی سوتیلی ماں کو اپنے باپ (اب نہیں) وزیر جان سے غصے میں یہ کہتے بھی سنا تھا کہ ”شیدے! اسے بتا کیوں نہیں دیتے کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔“ وہ سب کیا تھا؟ اور اب .... پھر یہ سب کیا ہے، وزیر جان جو ایک معمولی آدمی تھا۔ شیدے سے وزیر جان کیسے بن گیا۔ ایک معروف صنعت کار دولت مند آسودہ حال آدمی اور اب اسپیکٹریم کا اسٹیشن چیف .... ایک ڈان .... یہ کیا بھید تھا؟ میرے ماضی اور اب حال کے اسرار کی تاریکی میں اور کیا کیا پوشیدہ تھا؟ یہ مجھے جانتا تھا مگر افسوس .... اس نازک موقع پر وزیر جان مجھ پر قابو پانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب نہ جانے وہ میری اس جذباتی کمزوری کو کس طرح ایک خفیہ اور نامعلوم ڈیل کے نام پر ”کیش“ کرانا چاہتا تھا۔ یہ ابھی مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ ہمیں اس کمرے میں ایک صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھا دیا۔ وہ دونوں گن بردار اب بھی چوکس انداز میں کھڑے تھے، وہ مقامی ہی معلوم ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر گزری۔ وزیر جان ایک دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس بار اس کے ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ وہ ہمارے سامنے کے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ اس کے انداز و اطوار سے غرور جھلکتا تھا۔ ضمیر فروشی سے حاصل کردہ اس طاقت کا اسے بڑا گھمنڈ تھا۔

”تم نہیں جانتے لڑکے کہ تم نے چودھری ممتاز خان کی دشمنی میں کن خطرناک لوگوں سے ٹکر لے لی ہے جو تمہیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔“ اس نے موٹے گھسنی رنگ کے سگار کا ایک کش لے کر کھمکھراتے لہجے میں مجھ سے کہا۔

”مجھے تم لڑکے کے بجائے، شہزی کہہ کر مخاطب کر سکتے ہو۔“ میں نے اس کے لہجے اور بات کی خطرناکی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے نڈر لہجے میں کہا تو وہ خار کھنے والے انداز میں مجھے گھور کے رہ گیا پھر اسی لہجے میں بولا۔

”بہت گھمنڈ ہے خود پر نہیں جانتے تم کہ تمہاری جڑیں تک ہمارے قابو میں ہیں جس کی ڈوریاں ہلا کر ہم تمہیں محض

ایک کاٹھ کی پتلی بنا سکتے ہیں جو صرف ہمارے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہوگی۔“

”یہ وقت بتائے گا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ترکی بہ ترکی کہا اور آخر میں اسے یاد دلایا۔

”تم کسی ڈیل شیل کو بات کر رہے تھے؟“

”یہ ڈیل تم سے سپریمیر اتھارٹی کرے گی۔“

”تو تم صرف ایک مہرے ہو؟“

”یہی سمجھ لو۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ اس بار

اس نے اپنے طیش پر حیرت انگیز انداز میں قابو پایا تھا۔

”ڈیل سے پہلے میں اپنے ساتھی اول خیر اور اپنی

زندگی کی ضمانت ضرور چاہوں گا۔“

”دیکھا جائے گا۔“ اس نے بے پروانہ انداز میں کہا

پھر اپنے صوفے کے عقب میں دائیں بائیں کھڑے

حواریوں میں سے ایک کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ اس کے

سامنے آکر مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔ وزیر جان اس سے تحکمانہ

بوللا۔ ”ان دونوں کو روم سیون میں پہنچا دو۔ کڑی نگرانی

کرنا، میں زیرو ہاؤس کو مطلع کر چکا ہوں۔ مسٹر آرک خود

یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ان دونوں کو ان کے حوالے کر

دینا۔“

”یس سر۔“ اس نے مؤدبانہ کہا۔

میں زیرو ہاؤس کے نام پر چونکا۔ یہ نام میرے لیے

غیر شناسانہ تھا۔ ثریا کے ذریعے ہی مجھے معلوم ہوا تھا کہ

”زیرو ہاؤس“ درحقیقت ”اسپیکٹریم“ کا ”بیس کوارٹر“ کہلاتا

تھا۔ سپریمیر اتھارٹیز اس زیرو ہاؤس میں براجمان تھیں۔

مسٹر آرک کے نام سے بھی مجھے شنوائی تھی۔ ثریا نے مجھ سے

مختصر سی ملاقات یا مڈ بھیڑ کہہ لیں پر مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا

اور میں نے خود بھی اسے مسٹر آرک سے مخاطب ہوتے سنا

بھی تھا۔

بہر طور ہمیں وہاں سے ایک تیسرے کمرے میں لایا

گیا۔ یہ مختصر ترین اور کسی جیل کی بیرک نما سا کمرہ تھا جو

میرے اور اول خیر کے سوا ہر شے سے عاری تھا۔

اندر دھکیلنے اور آہنی دروازہ باہر سے لاک کرنے کے

بعد .... وہ دونوں گن بردار چلے گئے۔

”اواخر، کا کے! یہاں آ کر تو۔۔۔ ایک قہقہے کا پتا چلا

ہے۔“ تنہائی میں آتے ہی اول خیر اپنے مخصوص لہجے میں

بوللا۔ ”اوئے کا کے! سچ پوچھ تو مجھے بھی یہ جان کر بہت خوشی

ہو رہی ہے کہ تیرے ماں باپ زندہ ہیں۔۔۔۔۔ کا کے! یقین

کر تیرے ماں باپ کا سن کر تو خود میرے اندر بھی عجیب سی



ہے۔“

”ہاں، آنے دو اسے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سرے۔۔۔۔۔ تم سے کس قسم کی خفیہ ڈیلنگ کرنا چاہتے ہیں؟“ وہ بولا۔ میں کیا کہہ سکتا تھا یہ تو ان کے آنے اور بتانے پر منحصر تھا۔ لہذا میں محض سر ہلا کر رہ گیا وقت گزرتا گیا، گزرتا رہا۔ اور انہی سوچوں، قیاس آرائیوں میں نہ جانے کتنا وقت مزید بیت گیا۔

ہم دونوں مبہوت سے اس تنگ و تاریک کمرے میں دیوار سے پشت ٹکائے پاؤں پھیلانے بیٹھے رہے۔ اس طرح کچھ مزید اور وقت گزرا تو اچانک دروازے پر کھڑ بڑ کی آواز ابھری۔ وہی دونوں گن بردار نمودار ہوئے اور دروازے پر کھڑے کھڑے ہی حکمانہ درشتی کے ساتھ باہر آنے کا کہا۔ میں اور اول خیر دیوار سے پشت ٹکائے اسی طرح سہارا لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے آگے چل دیے۔ ہمیں دوبارہ اسی کشادہ کمرے میں لایا گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے وزیر جان نے ہم سے باتیں کی تھیں۔ وہ بھی موجود تھا مگر اب اس کے ساتھ والے صوفے پر ایک چھریا جسم کا سرخ چہرے والا غیر ملکی بھی براجمان تھا۔ اس نے بہترین تراش کا سفید بے داغ سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ میں بہ غور اس کا جائزہ لیتا ہوا اول خیر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ غالباً یہی مسٹر آرک تھا جو اسپیکٹرم میں ہینڈلر ایجنٹ (Handler Agent) کی حیثیت رکھتا تھا۔ کم و بیش اسٹیشن چیف کے مساوی عہدہ تھا یہ۔ (ٹریا کی دی ہوئی معلومات کے مطابق) مجھے اس کی ٹانگیں لمبی اور جسم سینے کی طرف سے چھوٹا محسوس ہوا۔ چہرہ لمبوتر تھا۔ بال کرپوٹ تھے، آنکھیں خلائی مخلوق کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ باپچھیں پھیلی ہوئی سی اور ہونٹ پتکے اور کھنچے ہوئے تھے۔ مگر شکل و صورت اور آنکھوں سے تیز طراری اور شاطر خیزی ٹپک رہی تھی، اس کے ہمراہ دو اور افراد بھی تھے، ایک مقامی اور ایک غیر ملکی تھا۔ وہ بہ غور اپنی کھنچی کھنچی بھوئیں سکینز کر باری باری ہم دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔ ہمیں وزیر جان نے میری طرف دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا آرک نے ہولے سے انگریزی میں وزیر جان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ”ان میں شہزی کون ہے؟“ اور وزیر جان نے میری جانب اشارہ کر کے اسے بتایا تو آرک اب میری طرف بہ غور ہی نہیں بلکہ برمائی ہوئی نظروں سے گھور گھور کے ٹکنے لگا تھا پھر وزیر جان نے اسے

تڑپ جاگ اٹھی ہے۔ شہزی کا کے! ذرا تصور کر جب ہم ان سے ملیں گے اور تو انہیں میرے بارے میں یہ بتائے گا کہ میں تیرا بھائیوں جیسا یار ہوں تو۔۔۔ تو مجھے یقین ہے ماں میرے سر پر بھی مٹا بھرا ہی ہاتھ پھیرے گی اور تیرا باپ۔۔۔۔۔ مجھے بھی اس طرح ہی محبت اور شفقت سے اپنی چھائی سے لگا لے گا جس طرح تجھے لگائے گا۔ سچی کہتا ہوں کا کے! تیرے ماں لی کا سن کے تو مجھے اپنے ماں پی یاد آگئے۔“ وہ جذبات کی رو میں بولے جا رہا تھا اور میں حیرت سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ وہ اس قدر میرے دل کے میرے دماغ کے حتیٰ کہ میری ذات و شخص کے اتنے قریب ہو چکا تھا، اس کا مجھے اب اندازہ ہو رہا تھا۔ خود میری آنکھیں بھی دفور جذبات سے آبدیدہ سی ہو گئی تھیں اور میں ہونٹ پر ہونٹ دبائے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میرا اور اول خیر کا چہرہ جذبات کی رو سے لرزاں تھا اور پھر اس انداز میں ہی میرے ہونٹوں سے مرتعش سے الفاظ برآمد ہوئے۔

”اول خیر۔۔۔۔۔ یار، یار تو ٹھیک ہی کہتا مجھ سے کہ ادخیر، شہزی کا کے! تیرا میرا واسطہ اور تعلق کچھ دکھو کمرے قسم کا ہو چلا ہے۔ آج مجھے اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔“

ہم اگر دونوں رسن بستہ حالت میں نہیں ہوتے تو یقیناً ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو ہی پڑتے۔

”ہاں شہزی کا کے! اللہ کی قسم ہے مجھے۔۔۔۔۔ تیرے ماں باپ کے زندہ ہونے کا سن کے مجھے بھی پتا نہیں کیوں وہی خوشی ہو رہی ہے جو تیرے سینے میں پھل رہی ہے اس خواہش کے ساتھ کہ ہم ان کا جلد از جلد پتا لگاتے مگر بد قسمتی سے یہ خوشی ملی بھی تو ایسے وقت میں کہ ہم خود دشمن کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔“

”حیرت ہے اول خیر، تو کیا مایوس ہو گیا اتنی جلدی؟“ میں نے کہا۔ ”اللہ پر بھروسہ رکھ۔“

وہ ہنسا پھر بولا۔ ”میں جانتا ہوں اچھی طرح۔۔۔ مگر دشمن نہیں جانتے کہ انہوں نے شہزی کو اپنی کچھار میں بلا کر درحقیقت اپنی شامت کو خود آواز دی ہے اور اب وہ سالا گورا کیا نام تھا اس کا شارک۔۔۔۔۔ شارک پھلی۔۔۔۔۔ یا کیا۔۔۔۔۔؟“

”آرک۔۔۔۔۔ مسٹر آرک۔۔۔۔۔“ میں نے دبی دبی ہنسی کے ساتھ تصحیح کی۔

”ہاں وہی آرک شاک۔۔۔۔۔ اب وہ خود ہمیں اپنے بیس کوارٹر یعنی زیر و ہاؤس لے جانے کے لیے یہاں آ رہا



”ہم صرف۔۔۔ شہزی کو ساتھ لے کر جائیں گے۔“  
آرک نے گمبھیر لہجے میں وزیر جان سے کہا۔ اس کی بھاری  
اور کھردری آواز اس کی دلی پتلی شخصیت سے کسی طور بھی ہم  
آہنگ نہیں تھی۔ میں نے دانت چبا چبا کر براہ راست آرک  
کو انگریزی میں مخاطب کر کے کہا۔

”مسٹر آرک! اول خیر کے بغیر میں یہاں سے ہلوں گا  
بھی نہیں۔ یہ بات تم اچھی طرح اپنے دھیان میں رکھ لو۔“  
اطفال گھر جیسے جدید خطوط پر استوار ادارے کی  
سکھائی ہوئی تعلیم یہاں میرے کام آرہی تھی۔ میں نے  
دیکھا۔ میری بات پر آرک کی پٹنی ہوئی بھووں تلے آنکھوں  
میں ایک لمحے کو سانپ کی سی زہریلی چمک ابھری تھی پھر وہ  
اسی لہجے میں گویا پھنکارتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ”مسٹر  
شہزی! اپنی اوقات میں رہو۔ مت بھولو کہ تم محکوم ہو  
ہمارے۔۔۔ اور تمہاری زندگی موت ہمارے ہاتھ میں  
ہے۔“

”سفید سڑکی اولاد! کتے کے پلے! کان کھول کے  
سن۔۔۔ میرا نام شہزاد احمد خان عرف شہزی ہے اور میں  
مسلمان ہوں جو اس ازلی اور حتمی حقیقت پر یقین کامل رکھتا  
ہے کہ زندگی اور موت صرف اور صرف اللہ جل شانہ کے  
اختیار میں ہے تو بھی ایک ایک سانس کے لیے اسی  
قادر المطلق کا محتاج ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے اور  
ان جہانوں کا بھی جو ہم گناہ کاروں کی آنکھوں سے اوجھل  
ہیں۔۔۔ سمجھا تو۔“

پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا اس غبیٹ ملعون گورے  
آرک کی اس پُر غرور بات نے مجھے ایک دم ہی ہتھ سے  
اکھاڑ دیا تھا۔ ایک لمحے کو تو میرے گرج دار کچے نے ماحول  
پر پل کے پل سکتے سا طاری کر دیا۔ خود آرک کو یکثرت سانپ  
سو گھ گیا تھا۔ وزیر جان البتہ تھوڑا پریشان ہوتا نظر آیا تھا۔ وہ  
ضمیر فروش اس وقت آرک کا میزبان تھا اور اس کی چھت  
کے نیچے رن بستہ حالت میں ایک قیدی کا یہ سلوک اسے  
بوکھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

”او خیر۔۔۔ جیو کا کے۔“ اول خیر نے ہولے سے  
کہا۔ میری سانسیں چڑھنے لگی تھیں اور آنکھوں کے سامنے  
جیسے خون کی بارش ہونے لگی تھی، پتا نہیں میں کس جواں مرد  
کی اولاد تھا۔ جانے کون دلیر سپاہی تھا جس کا خون۔۔۔  
جس کی خو۔۔۔ اور جس کا جلال میری رگ رگ میں۔۔۔

میرے خون کے قطرے قطرے میں۔۔۔ میری سرشت  
میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا کہ میں موت کو سامنے دیکھنے کے  
باوجود۔۔۔ رن بستہ اور قیدی ہونے کے باوصف۔۔۔ خود  
پر غالب مد مقابل کو پھاڑ کھانے والے انداز میں للکارنے  
سے کبھی باز نہیں آتا تھا۔

آرک کے دم پہ خود چہرے پہ چند ٹانیوں بعد  
زہریلے پن کی سرخی کے آثار نمودار ہوئے اور آنکھوں سے  
نفرت و غیظ کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ اس گورے سُر  
سے بالکل خوف زدہ نہیں تھا کیونکہ اس نے بکو اس ہی ایسی کی  
تھی، کتنے پُر غرور لہجے میں اس نے مجھے جتانے کی کوشش  
چاہی تھی کہ۔۔۔ میری زندگی اور موت کا فیصلہ اس کے ہاتھ  
میں تھا اور میں نے بلا خوف اس کی آنکھوں میں ڈال کر اسے  
اس کا خاطر خواہ جواب دے دیا تھا۔ آرک کو قہر و غضب میں  
جلتا بلکتا دیکھ کر وزیر جان نے فوراً مداخلت کی اور آرک سے  
مخاطب ہو کے بولا۔ ”مسٹر آرک۔۔۔ تم اس گیڈر بھکیوں کی  
پروانہ کرو جیسا تم بہتر سمجھو۔۔۔ وہ کرو۔۔۔ میں اسے جانتا  
ہوں، یہ دیوانہ اور پاگل ہے۔“ وزیر جان کے بولنے پر  
آرک کے چہرے کا خارش زدہ خروش کچھ کم ہوا اور وہ وزیر  
جان سے مخاطب ہو کے گمبھیر آواز میں بولا۔

”دیوانے اور پاگل ہی ہمارے لیے سب سے بڑا  
خطرہ بنتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ اپنے ساتھی کی  
موجودی کے بغیر ہماری کوئی بات سننے کا بھی نہیں۔ ڈیل میں  
ہمیں بھی مجبوراً تھوڑی لچک کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ ان  
دونوں کو میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے آرک  
میری طرف کھا جانے والی نظروں سے گھورتا ہوا صوفے  
سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار  
ہو گئی۔ تاہم مجھے ان کی خفیہ ڈیل سے متعلق اس کی اہمیت کا  
کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ معاملہ یقیناً مجھ سے زیادہ ان  
کے لیے اہم تھا مگر مجھے اس بات کا بھی ادراک تھا کہ ان کی  
کوئی بھی ڈیل میرے لیے ہرگز قابل قبول نہ ہوگی تاہم میں  
دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ اس ڈیل کے پس منظر میں انہیں کس  
طرح ”ڈانچ“ دینے کی کوشش کر سکتا ہوں؟

باہر ایک لمبی سی کار کھڑی تھی۔ ہمیں عقبی سیٹ پر بٹھا  
دیا گیا تھا اور اول خیر کی طرف آرک کا ایک ساتھی براجمان  
ہو گیا جبکہ دوسرے ساتھی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔  
آرک اس کے برابر والی سیٹ پر تھا۔ کار روانہ ہو گئی اور  
تھوڑی دور ہائی وے پر آنے کے بعد ہماری آنکھوں پر پٹی  
باندھ دی گئی۔ کار اب فراٹے بھر رہی تھی۔ میرے ذہن



رسانے تیزی کے ساتھ ان اندھے راستوں کی "یکلویشن" شروع کر دی۔ کار ہائی وے پر آ کر دائیں جانب گھومی تھی۔ گویا ملتان روڈ پر ساہیوال سے آگے کی طرف گامزن تھی۔ میں بظاہر خاموش بیٹھا تھا لگ بھگ کوئی دس پندرہ منٹ کی تیز رفتاری کے بعد میرے محتاط انداز سے کے مطابق انہوں نے کوئی بیس پچیس کلومیٹر کا سفر طے کیا ہوگا اس کے بعد کار کی رفتار دھیمی ہو گئی تھی، میں نے اپنے جسم کو دانستہ ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ کار نے جب ایک موڑ کاٹا تو میرا جسم دائیں جانب جھکا تھا جس کا مطلب تھا کار نے بائیں جانب موڑ کاٹا تھا۔ اب کار ہچکولے کھانے لگی تھی۔ یہاں بھی دو موڑ بائیں جانب اور آخری تیسرا موڑ دائیں جانب کاٹا اس کے کوئی پانچ منٹ بعد کار رک گئی۔ میرے ذہن نے اسٹیشن فور سے یہاں تک راستوں کی ساری "کتر بیونت" کر ڈالی تھی اور ان کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوا ہوگا کہ میں کافی حد تک ان کے "بیس کوارٹر" تک کے راستے کا ایک محتاط "اندازہ" قائم کر چکا تھا۔ کار سے اترنے تک بھی ہماری آنکھوں سے پٹیاں نہیں اتاری گئی تھیں۔ البتہ کسی بڑے گیٹ کے کھلتے اور ہلکی گڑ گڑاہٹ کی آواز مجھے ضرور سنائی دی تھی، گویا ہم اس وقت اسپیکٹرم کے بیس کوارٹر میں موجود تھے، باہر کا محل وقوع کیا تھا، مجھے اس کا بالکل علم نہ ہو سکا تھا نہ ہی اندازہ۔ اندر مختلف راہداریوں سے گزرنے کے بعد ہمیں ایک کمرے میں آرم چیئر پر بٹھا دیا گیا اور پھر ہماری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ چند ثانیے آنکھوں کے سامنے کالے دھبے تاپتے رہے۔ اس کے بعد جب میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو، میرے سامنے جو منظر تھا، اسے دیکھتے ہی میرے جیسا مضبوط اعصاب کا مالک۔۔۔ بھی سر سے پاؤں تک کئی ٹانے تک تھرا اٹھا تھا۔ نام کو تو یہ کرا تھا مگر اس پر "سلاٹر روم" کا گمان ہوتا تھا۔ یادداشت اس کمرے کا ماحول ایسا بنایا گیا تھا کہ جس کی دیواروں سے رنگ دروغن تو کیا پلستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا، مخصوص سی سلین چمکی ہوئی تھی، ایک دہشت زدہ کرنے والا ماحول تھا چھت پر لمبی تار کے ساتھ گلوب نمابلب روشن تھا۔ مگر مجھے اس کے ماحول نے لرزے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ بات کچھ اور تھی، اس سے بھی زیادہ ہولناک اور عبرت انگیز۔۔۔۔۔

☆☆☆

کمرے کے رنگ آلودہ آہنی کنڈے سے ایک چمچی کے ذریعے سی کے ساتھ ایک مادر زاد برہنہ جوان لڑکی کو الٹا لٹکا یا ہوا تھا اور جانے کب سے اس حرام نصیب

اوارہ گرد

کو اس حالت میں۔۔۔ اس طرح الٹا لٹکا یا گیا ہوگا مگر اس کے ننگے جسم پر جا بجا انسانیت سوز تشدد کے نشانات کالے اور سرخ دھبوں کی صورت میں نظر آرہے تھے، چہرے کی حالت اس سے زیادہ ہولناک تھی۔ ایک آنکھ کی جگہ خلا تھا اور وہاں سے خون تو قطرہ قطرہ ٹپک ہی رہا تھا مگر کسی باریک خون آلود نس کے سہارے آنکھ کا ڈیلا ابھی تک نیچے جھول رہا تھا۔ نچلا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ ایک کان کی بھی یہی حالت تھی، غرضیکہ اس پر ظلم و بربریت کی جتنی انتہا کی جاسکتی تھی۔ وہ ایک لرزہ خیز قیامت کی صورت اس بد نصیب جوان عورت پر توڑی جا چکی تھی، اس کے داغ دار اور جگہ جگہ سے جلے ہوئے سینے کے زیر و بم سے اتنا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس جان کنی میں جتنی سانس لے رہی تھی وہ مستعار ہی تھیں۔

ایک ہولناک اور تھرا دینے والا کرب انگیز خیال میرے ذہن میں ثریا کے حوالے سے ابھرا تھا اور اس پر گھبر گیا تھا کیونکہ سردست میں اس بد نصیب لڑکی کے چہرے کو پہچاننے کی کوشش ہی کر رہا تھا۔

سلاٹر روم میں صرف تین افراد موجود تھے، دو گن بردار اور تیسرا آرک۔۔۔ جو میری طرف۔۔۔ اس طرح مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ میری کیفیات سے حظ اٹھاتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ کہ وہ یہ منظر دکھا کر مجھ پر اپنا خوف طاری کرنا چاہتا ہو۔

"اللہ کی لعنت ہو ان پر۔" میں نے اول خیر کو ہولے سے یہ کہتے سنا۔

"پہچان سکتے ہو اسے مسٹر شہزی! کون ہے یہ؟" معا سلاٹر روم کے دم بہ خود ماحول میں صفت ابلیس آرک کی آواز ابھری۔

"شاید نہیں۔۔۔ کون ہے یہ؟" میں نے حتی الامکان اپنی آواز اور لہجے کو کسی کرب انگیز بوجھل پن سے بچانے کی کوشش کی تھی۔

"یہ ثریا ہے۔" آرک کی مکروہ آواز ابھری۔ میں ذہنی طور پر اس بری خبر پر خود کو تیار کر چکا تھا، تاہم تصدیق ہو جانے پر میری روح تک کو غمناکی کا ایک زبردست جھٹکا لگا تھا مگر میں اسے ایسا کوئی تاثر دینا نہیں چاہتا تھا کہ میرا ثریا کے ساتھ ایسا کوئی تعلق نمایاں ہو جس کی بنا پر ثریا پر مزید عرصہ اذیت و حیات تنگ کیا جاتا اور آرک جیسے مکار آدمی کا مجھے یہ اچانک سے ہولناک منظر دکھانے کا بھی یقینا یہی مقصد ہوگا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے جب مجھے یہ بتایا کہ "یہ ثریا ہے" تو اس نے فوراً بھانپتی ہوئی نظروں سے میری



طرف دیکھا تھا۔ وہ مکار سُر.... یقیناً میرے تاثرات و میری اندرونی کیفیات سے ثریا کے لیے دکھ و کرب کے آثار کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ یہاں میری غیر معمولی ودیعت کی گہنی عقل سلیم یعنی کامن سنس کام آئی تھی اور یہ ادراک ہوتے ہی میں نے اپنی کیفیات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل ہی رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”کون ثریا؟“ میں انجان بن گیا۔

”تم میری سوچ سے بھی زیادہ فطین اور عیار ہو مسٹر شہزی۔“ آرک سرسراتے ہوئے مکروہ لہجے میں بولا۔

”میں سمجھا نہیں تمہاری بات کا مطلب؟“ میں نے بدستور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اور نہ ہی میری یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ آخر یہ سب مجھے دکھانے کا تمہارا مقصد کیا ہے؟ تم تو مجھے یہاں کسی ڈیل کے سلسلے میں لائے تھے؟“

میری بات پر اس نے بڑی بے رحمانہ نظروں سے میری طرف دیکھا پھر ایک سگار سلگا لیا۔ دو تین کش لیے اس کے بعد چند قدم چلتا ہوا الٹا جھولتی ہوئی ثریا کے قریب آ کے رکا۔ سگار کا سلگتا ہوا سرا اس نے ثریا کے گال پر رکھ دیا۔ اس کے بے سدھ جسم نے ہولے سے جھٹک لیا۔ سلاٹر روم میں ہلکی سی گوشت جلنے کی چراندی اٹھی۔

”چ... چ... بے چاری پر اس قدر تشدد ہوا ہے کہ اب تو اس کی اذیت ناک تکلیفیں بتانے والی حیات ہی مردہ ہو کر دل گہنی ہیں۔ ورنہ یہ بُری طرح تڑپ رہی ہوتی۔“ آرک بڑی بے رحمی سے یہ کہتا ہوا دوبارہ سگار کو اپنے بدہیت ہونٹوں میں دبائے میری طرف بڑھا پھر میرے ذرا قریب آ کر رک کے بولا۔

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، ڈیل قیدیوں سے نہیں کی جاتی، قیدیوں اور غلاموں سے حکم دے کر کام کروایا جاتا ہے۔ ہمارا اصول بھی یہی ہے کہ جو غداری کرتا ہے ہم اس کے ہاتھ میں پستول تھما دیتے ہیں جس کے چیمبر میں صرف ایک گولی ہوتی ہے جو وہ یعنی غدار اپنی کنپٹی میں اتار لیتا ہے۔“ اس کا لہجہ تھرا دینے والا تھا پھر وہ ذرا اور میرے قریب آیا۔ بغیر آرم کی اسٹول نما کرسی پر مجھے اور اول خیر کو ساتھ ساتھ بٹھایا ہوا تھا۔ آرک میرے بالکل نزدیک پہنچ کر مجھ پر جھک گیا۔ اس قدر کہ اس کی ناک کی پھٹ میری ناک کے بالکل قریب ہو گئی۔ ایسے میں مجھے اس کا چہرہ بہت مکروہ محسوس ہونے لگا۔ اس رذیل صفت اور سفاک آدمی کے ہمایک چہرے کو اپنی جلتی سلگتی آنکھوں کے قریب پا کر مجھے اپنے اندر کی آتش خوں رنگ کیفیات پر قابو پانا دودھ بھر محسوس

ہونے لگا۔ جی چاہا میرا اس کا دانتوں تلے چہرہ بگاڑ ڈالوں۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ جانے کے ڈر سے میں نے اپنے دانت اور ہونٹ دونوں ہی بھیج رکھے تھے۔

”مسٹر شہزاد احمد خان المعروف شہزی! تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں تمہارے بارے میں سب جانتا ہوں اور نہ صرف تمہارے بارے میں بلکہ تمہارے قریبی ساتھیوں اور بہی خواہوں کے علاوہ تمہاری ایک اور کمزوری سے بھی میں اچھی طرح واقف ہوں جو ایک مجبوری کے تحت تم سے ہزاروں میل دور سہی لیکن ہم جانتے ہیں وہ تمہارے دل کے کس قدر قریب ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر سیدھا ہو کے کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ کس کی طرف تھا۔ عابدہ کے حوالے سے اس طرح کے اشارے مجھے پہلے بھی چند لوگوں سے ملتے رہے تھے اور اب اس نسل خنزیر..... آرک کے منہ سے بھی یہ سن کر میری رنگوں میں دوڑتے خون کی گردش مثل لاوا کے دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے غیظ و غضب پر قابو پا رکھا تھا۔ آرک سیدھا ہو کے چند قدم پیچھے ہٹ گیا پھر پلٹ کر ایک ساتھی سے تحکمانہ بولا۔ ”اس لڑکی کو ہوش میں لاؤ۔“

اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ایک دیوار کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں رُبڑ کا بائب تھا۔ جس کا ایک سرا دیوار میں نصب شاید کسی پانی کے کنکشن سے منسلک ہوگا۔ دوسرا سرا جس پر پلاسٹک کی نوزل تھی، تھام کر وہ ثریا کے قریب آیا اور وال کھول دیا۔ پانی کی تیز دھار ثریا کے چہرے پر پڑنے لگی اور اس وقت تک پڑتی رہی جب تک کہ اس نے عوطے لگنے کے انداز میں کھانسا شروع کر دیا۔ وہ ہوش میں آنے لگی تھی اور اب اس کے حلق سے آہوں اور سسکیوں کی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد چہرخی کی مدد سے ثریا کے اٹنے جھولتے وجود کو فرش پر چھوڑ دیا گیا۔ تاہم رسی اب تک اس کے دونوں پیروں میں بندھی رہنے دی تھی۔ تاہم اس کو اوپر سے اتنا جھول دے کر ڈھیلا چھوڑ دیا گیا تھا کہ ثریا اگر چاہتی تو اٹھ کر بیٹھ بھی سکتی تھی اور چند قدم چل بھی لیتی اگرچہ اس بے چاری کے اندر اتنی سکت نہ تھی۔

ثریا کی ہیئت کدائی دیکھ کر مجھے کچھ عرصہ پہلے آسیہ کا اس سے ملتا جلتا ہولناک منظر یاد آنے لگا جس کا درد ابھی تک میرے دل و دماغ میں تازہ تھا۔ آسیہ کے ساتھ تو اس سے بھی زیادہ شرمناک اور سفاکانہ سلوک کیا گیا تھا۔ جس کے تلے اس بے چاری نے بڑی جان کنی کے عالم میں بالآخر دم توڑا تھا۔ اور میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکا تھا۔ مگر پھر میں



ہمارے خلاف جانے کیا کیا منصوبے بنا رکھے تھے، پہچانو اسے اچھی طرح..... اور ہماری طاقت کو بھی.....“

اس کے منہ سے ثریا کے لیے Whore Bitch کے الفاظ نے میرے اندر آگ سی لگا دی تھی۔ ثریا اپنے مسخ زدہ یک چشم چہرے سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کا ہولناک چہرہ میرے سامنے تھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ سے مردنی ٹپک رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس قدر زخمی ہو کے وحشیانہ ہو رہا تھا کہ میں اس کے چہرے کے تاثرات بھی جاننے سے قاصر تھا کہ آیا وہ مجھے پہچان بھی سکی تھی یا نہیں۔ تاہم اس کے حلق سے سسکاری ضرور برآمد ہوئی تھی اور اس نے ہسٹریائی انداز میں آرک سے کھٹی کھٹی التجا کی۔ ”مم..... مجھے مار ڈالو.....“

خ خدا کے لیے مجھے اس عذاب سے نجات دلا دو..... مسٹر آرک..... پلیز۔“

ثریا سے ٹھیک طرح بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ یہ سارے الفاظ اس نے ٹوٹے پھوٹے لب و لہجے اور آواز میں بمشکل ہی ادا کیے تھے۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ آرک غیظ آلودہ لہجے میں اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے غرایا۔ ”مجھے بتاؤ تم اس شخص کو پہچانتی ہو یا نہیں؟“

”ہاں، میں اسے اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ ذلیل، کتے! یہی انسان.... تیری موت ہے۔ تو بھی پہچان لے اس کو..... اپنی موت کو..... مردود آدمی..... آہ۔“ پتا نہیں کس طرح اپنے زخموں سے چورد جود کی طاقت سمیٹ کر ثریا نے یہ الفاظ آرک سے کہہ ڈالے تھے۔ جسے سن کر آرک کا

چہرہ مسخ ہو کے رہ گیا۔ اس نے اسی طرح اس کے بالوں کو کھٹی سے پکڑے پکڑے ایک طرف گھسیٹا مگر چھوڑا نہیں۔ پھر ایک ہاتھ اپنے سفید کوٹ کے اندر ڈالا، نکالا تو اس کے

ہاتھ میں لمبی نال والا خوفناک پستول تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے پستول کی نال ثریا کے زخم خوردہ منہ کے اندر گھسیڑ دی اور ٹریگر دبا دیا۔ سلاٹر روم کے سیلن زدہ وحشت ناک ماحول میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ ثریا کے چہرے پر خون کی

سرخ لکیروں کا جال سا بن گیا۔ گولی اس کے سر کے پچھلے حصے سے بھیجے کے لوتھڑوں کو اگلتی ہوئی پار ہو گئی۔ ظلم و بربریت کے اس قہرناک شیطانی کھیل نے ماحول تک کولرزا کر رکھ دیا تھا۔

میرے دل و دماغ کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی، ایک خوابیدہ آتش فشاں تھا جو قہر و غضب کا لاوا اگلنے کو بے چین تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوئی میرے ہاتھوں

نے آسیہ پر ستم توڑنے والے چودھری ممتاز خان کے زرخیز کتوں کو بھی بھیا تک عبرت ناک انجام سے دو چار کیا تھا جبکہ آسیہ کا ابھی انتقام میرے سینے میں باقی تھا۔ وہ میں ممتاز خان کو جہنم واصل کر کے پورا کرنا چاہتا تھا۔

کم و بیش یہی کچھ اس وقت ثریا کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ اگرچہ ثریا کی نوعیت کچھ مختلف تھی۔ کیونکہ وہ ان کی آلہ کار رہ چکی تھی۔ اسے بھی اس کے ضمیر نے جھنجھوڑا یا پھر بقول ثریا کے ہی اسپیکٹرم والوں کی اصلیت ان کے مذموم مقاصد جان لینے کے بعد وہ ان کے خلاف ہو گئی تھی مگر ان کی آلہ کار اور ”رازداں“ کی حیثیت سے رہتے ہوئے وہ ان کی جڑوں کو کاٹنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں ثریا سے میری اچانک اور حادثاتی ملاقات میں اس نے مجھے آگاہ کیا تھا مگر اسے پوری حقیقت مجھے بتانے کا موقع اور وقت نہ مل سکا تھا اگرچہ اس نے اس بات کا بھی اظہار کیا تھا کہ وہ خود بھی اس گھبر اور خطرناک معاملے میں مجھ سے مدد لینے کی خواہش مند تھی وغیرہ۔ ایک جھماکا میرے ذہن میں یہ رہا تھا کہ ثریا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اسپیکٹرم میں اس کے ہم خیال ساتھی اور بھی تھے، اگرچہ ان کی تعداد بہ آسانی انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر وہ کہاں تھے؟ یا ان لوگوں نے ثریا کے منہ سے ان کے بارے میں بھی اگلوایا تھا اور انہیں اذیت ناک موت سے دو چار کر یا تھا؟

کچھ ذرا ہوش میں آتے ہی ثریا کے برہنہ جسم اور چہرے کی حالت زار زخموں سے درد کی تیسیں پھوٹ پڑیں اور وہ مارے درد و کرب سے کھٹی کھٹی چیخیں مارنے لگی۔ بے چاری کے اندر تو درد کی اذیت ناک کیفیات کودبانے کے لیے چیخنے اور سسکنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ آرک نے دوسرے ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے ایک دیوار کے کونے میں رکھی میز کی دراز سے ایک اسپرے نما بوتل نکالی اور آگے بڑھ کر وہ ثریا کے رستے زخموں پر اسپرے کرنے لگا۔ اس اسپرے سے ثریا کے زخموں پر شاید ٹھنڈک اتر آئی تھی عارضی طور پر کہ وہ اب ہولے ہولے سسکنے لگی۔ آہیں بھرنے لگی۔ اس کے بعد آرک نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ کی ایک مٹھی میں ثریا کے کھجڑی زدہ جٹاؤں بالوں کو جکڑ کر اٹھا کے بٹھا دیا اور اسی طرح ہی اس کے بال مٹھی میں جکڑے، اس نے ثریا کا چہرہ میری جانب اٹھا دیا اور زہر آلودہ لہجے میں بولا۔

”ہو رہی..... (Whore Bitch) دیکھو اپنے ساتھی کی طرف..... یہ شہزی ہے جس کے ساتھ مل کر تم نے



بہتر کی لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔  
 ”تمہارے لیے معمولی کام ہے وہ..... ہمارے لیے نہیں۔“ اس نے سپاٹ سنجیدگی سے کہا۔  
 ”کام کیا ہے؟“ میں نے برہمائی نظروں سے اس کی طرف گھورا۔

”تمہیں کچھ عرصے ہمارے لیے کام کرنا ہوگا..... ایک مشن پر..... لی ایس ایس کا خاتمہ اور میجر ریاض باجوہ کا قتل۔“ اس نے کہا اور میرے پورے وجود میں جیسے لاتعداد چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس مردود و ملعون کے خطرناک عزائم جان کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔ میں نے حتی الامکان خود کو پھر نارمل رکھتے ہوئے بلا تصدیق و تامل پوچھا۔ ”اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”ہمیں معلوم ہے تمہارے میجر ریاض باجوہ سے بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ پاور سیکرٹ سروس کو کن مقاصد کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ ہم تمہیں آزاد چھوڑ دیں گے مگر ہماری تیسری آنکھ تم پر مرکوز رہے گی، جہاں تم نے ہمیں ڈانچ دینے یا کوئی چالاکی چلنے کی کوشش کی تو..... سب سے پہلے تمہیں اپنے اس ساتھی کی اذیت ناک موت کا یقینی تصور کر لینا ہوگا۔ اس کے بعد تمہاری معشوقہ عابدہ کی باری آئے گی جو امریکا کے ایک اسپتال میں مقیم ہے۔ سمجھ گئے تم۔“

آرک کی بات نے مجھے اندر سے سرتاپا جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اول خیر اور عابدہ کا میں بال بیکا بھی ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا جبکہ عابدہ کے بارے میں آرک کو یقیناً اس رذیل ممتاز خان نے ہی گمانڈ لائن دی ہوگی کیونکہ میرے ازلی دشمنوں میں ایک وہی تھا جو میری بعض جذباتی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے بظاہر آرک کی اس تہدید کو کوئی اہمیت نہ دی اور بولا۔

”دیکھو مسٹر آرک! یہ لی ایس ایس کیا بلا ہے مجھے اس کا علم نہیں۔ ہاں یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں کہ میجر ریاض باجوہ سے میرے صرف دوستانہ مراسم ہیں اور اس کی وجہ شخص اتنی ہے کہ اتفاق سے ایک پرائیویٹ میڈیکل سینٹر میں میرا اپنے پرانے دشمنوں سے ٹاکرا ہو گیا تھا اور سوئے اتفاق میجر ریاض باجوہ کی بیگم اور بچہ وہاں ایڈمٹ تھے، دشمنوں نے بھاگ نکلنے کے لیے ان کے بچے کو یرغمال بنا کر ڈھال بنالیا تھا۔ عین وقت پر میں نے اپنے دشمنوں پر غلبہ پالیا تھا اور میجر صاحب کے بچے کی بھی جان بچ گئی تھی، فقط

کے جکڑ بند کھول ڈالے اور میں اس سفاک و سنگدل انسان جو انسان کہلانے کا مستحق نہ تھا بلکہ جانور کہنا بھی اسے جانور کی توہین ہوتی۔ یہ تو سراپا شیطان تھا ابن شیطان تھا۔  
 ”لے جاؤ اس کتیا کی لاش..... میرے لیے یہ جانتا ہی کافی تھا کہ کتیا نے مسٹر شہزی کو پہچان لیا۔“ آرک نے تحکمانہ کہا اور مجھے ایک جھٹکا لگا۔ ثریا نے کیا دانستہ ایسا کیا تھا یا جوش میں آکر آرک کو میری طرف سے تہدید کی تھی؟ اپنی موت آسان کرنے کے لیے؟ اس اذیت ناک تشدد سے بچنے کے لیے؟ کہ میں آرک کی موت تھا۔

بد نصیب ثریا کی لاش اٹھالی گئی۔ اول خیر کا چہرہ بھی اس کھلی بربریت پر سکتہ زدہ سا رہ گیا تھا۔

”مسٹر شہزی! اب تو تمہارے پاس جھوٹ بولنے کی مہجائش نہیں باقی بچی ہوگی کہ ثریا تمہارے ساتھ مل کر ہماری جڑیں کاٹنا چاہتی تھی کیونکہ وہ آخری وقت میں تمہیں پہچان چکی تھی۔“ آرک نے مکارانہ سفاکی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، اس کے گورے مکروہ چہرے پر بڑی خبیثانہ مسکراہٹ تھی۔

”یہ صرف میری بچپن کی دوست تھی جس ادارے میں.....“

”بس، ہمیں سب پتا ہے۔ چھوڑو اس بات کو اب۔“ آرک نے ہاتھ اٹھا کر میری بات درمیان سے کاٹ دی۔ میں اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا۔ وہ آگے بولا۔ ”اس کے ساتھ تین غدار اور بھی تھے، دو ہم نے مار ڈالے..... مگر بد قسمتی سے ایک بچ کر بھاگ نکلا۔ اسے جلد تلاش کر لیا جائے گا۔“

میں جواباً خاموش رہا۔ آرک چند ثانیے کھڑا میرے چہرے سے میری اندرونی کیفیات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا۔ ”مسٹر شہزی! اب تم کیا کہتے ہو؟ ہمارے حکم پر عمل کرو گے یا اپنے ساتھی سمیت اس سلاٹر روم کو اپنی اذیت ناک چیخوں سے رونق بخشو گے؟“

میں نے اندر ہی اندر اس خبیث پر لعنت بھیجی پھر بظاہر بے پروانہ لہجے میں بولا۔

”میں نے تو ابھی تک تمہاری بات سنی ہی نہیں۔“  
 ”تمہیں ہمارا ایک معمولی سا کام کرنا ہوگا۔“

”کام معمولی ہے تو مجھ سے کروانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تمہیں؟ اپنے آدمیوں کی تمہارے پاس کوئی کمی تو نہیں؟“ میں اس کی بربریت اور چنگیزیت کے نظارے دیکھنے اور دھمکیوں سے مرعوب ہوئے بغیر اس کے ساتھ ترکی



گا۔

”شٹ آپ۔“ آرک کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ سیدھے ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہاری کوئی فضول بکواس نہیں سنوں گا نہ ہی تم مجھے اس حقیقت سے بہکا سکتے ہو کہ تمہارا پاور سے کوئی تعلق نہیں..... ہمارے آدمیوں سے دوبار پی ایس ایس کا ٹکراؤ ہو چکا ہے اور تم بھی ان میں شامل رہ چکے ہو، سمجھے تم..... اب ایسی کوئی فضول بکواس نہیں چلے گی۔“ وہ پھر گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہاں آرک کے بلکہ اسپیکٹرم کے ہاتھ مضبوط کرنے والے دو ہی افراد تھے۔ ایک چودھری ممتاز خان اور دوسرا وزیر جان..... یہ دونوں ہی میرے مافیہ اور حال سے ہی نہیں بلکہ میری بعض جذباتی کمزوریوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ میرے ذہن میں تو یہی منصوبہ چل رہا تھا کہ میں ایک بار ان کے چنگل سے نکل کر آزاد ہو جاؤں اور بعد میں انہیں ”بلف“ کرنے اور ”ٹریپ“ کرنے کی کوشش کروں مگر کیا یہ سب اتنا آسان تھا؟ مگر اور کوئی صورت بھی نہ تھی، سردست تو میرے لیے یہی غنیمت تھا کہ میں صرف ایک بار یہاں سے آزاد ہو جاؤں پھر دیکھا جائے گا۔ ممکن ہے میری یار اور تقدیر مجھے یہ موقع دے رہی ہو۔

میں نے کہا۔ ”میں اپنی زندگی اور ساتھی کی زندگی کی ضمانت چاہوں گا کیونکہ یہ بات تم بھی جانتے ہو گے کہ میری دشمنی صرف ممتاز خان سے ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ تمہارا ساتھی ہے۔ اس ضمن چکر میں تو میں خواہ مخواہ ہی پھنس گیا ہوں۔“ خود سے طاقت ور دشمن اور کبھی جوش کی جگہ ہوش سے کام لینے کا گرمیں نے سرمد بابا سے ہی سیکھا تھا اور بہت کچھ حالات سے..... لہذا میں نے مکارانہ چال چلنے کی روش اختیار کر لی تھی۔

”شاید تمہاری یہ بات ٹھیک ہو۔“ آرک اسرار بھرے انداز میں مسکرایا۔ ”لیکن مجھے پتا ہے کہ تم ہمارے بارے میں بھی اب تک بہت کچھ جان چکے ہو۔ اس میں ثریا نے بھی ہم سے غداری کر کے نمایاں کردار ادا کیا۔ افسوس یہاں چند لوگوں کے انتخاب میں ہم سے کچھ فاش غلطیاں ہو گئی تھیں۔ بہر حال رہی بات تمہاری اور تمہارے ساتھی اول خیر کی اس سلسلے میں تم بے فکر رہو۔ یہ ادھر ہی رہے گا۔ ایک اہم قیدی کی حیثیت سے اور اس کی زندگی کی ضمانت تمہارے کام سے مشروط ہوگی اور تمہاری بھی جبکہ تمہاری اور ممتاز خان کی ذاتی دشمنی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ اسی سبب ہم نے اسے تمہارے معاملے سے دور رکھا ہے۔“

یہی حقیقت ہے میری ان سے تعلق داری کی، اس کی تفصیلی خبر مختلف نجی ٹی وی چینلز پر بھی آچکی ہیں۔“

آرک نے پہلی بار میری بات بظاہر بڑے غور اور دھیان سے سنی تھی۔ وہ بحث و مباحثہ کرنا نہیں جانتا تھا اور دو ٹوک لہجے میں بات کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ لہذا بڑی مکاری سے بولا۔

”او کے..... او کے..... اٹس او کے..... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں مگر تمہیں کرنا وہی ہوگا جو میں کہہ رہا ہوں تم سے۔“ وہ ذرا رکا پھر چند قدم اٹھاتا ہوا دوبارہ میرے قریب آ کر مزید بولا۔ ”تمہیں مرحلہ وار ہمارا یہ مشن انجام دینا ہوگا۔ پہلے مرحلے میں تمہیں پاور والوں کے ہیڈ کوارٹر اور ان کے خفیہ تربیتی مرکز کا پتا چلانا ہوگا اور ہمیں اپ ڈیٹ کرنا ہوگا، تمہیں صرف تین دن کی مہلت ہوگی اس کام کے لیے۔ چوتھے روز تمہیں میجر باجوہ کے سر میں گولی اتارنی ہو گی، سمجھ گئے تم؟ مجھے یقین ہے تمہارے لیے یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں۔“

”یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے مسٹر آرک۔“ میں نے کہا۔ ”میجر باجوہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ وہ ریجنل فورس کا سربراہ ہے۔ ملٹری انسٹی جنس سے بھی تعلق رکھتا ہے جبکہ میں ایک عام اور غیر اہم ساسو یلین..... میں ان سے کیسے یہ سب اٹھوا سکتا ہوں؟ انہیں مجھ پر شبہ ہو جائے گا۔“

”شبہ تو ہمیں بھی تم پر اس بات کا ہوگا کہ تم یہاں سے جانے کے بعد..... میجر باجوہ سے پہلی فرصت میں یہ ساری حقیقت بیان کر ڈالو گے اور ان سے خفیہ گٹھ جوڑ بلکہ مدد بھی لینے کی کوشش کرو گے۔“ یہ کہتے ہوئے آرک نے قدرے جھک کر ایک بار پھر اپنا مکروہ چہرہ میرے چہرے کے بالکل سامنے کر دیا اور بات جاری رکھی۔ ”مگر یاد رکھو شہزی! تم لوگ ہماری گرد بھی نہیں پاسکو گے، کیونکہ ہمارے ساتھ چودھری ممتاز خان اور وزیر جیسے آدمی موجود ہیں جو عوامی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں کی میڈیا کو بھی ہم نے خرید رکھا ہے۔ ہم ان اداروں کو انہی کے ملک میں بدنام کر کے رکھ دیں گے مگر افسوس ہمارے پاس سردست ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ یہ ہم تم سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا اپنے دل و دماغ سے ہر قسم کی چالاکی اور عیاری نکال پھینکو..... پولو اب کیا کہتے ہو؟“

میں اس سفید گورے سٹور کی بات پر بے اختیار ایک گہری ہکاری بھر کے رہ گیا پھر بولا۔ ”میں تنہا یہ کام نہیں کر سکتا.... میرے ساتھ اول خیر کو بھی میرے ساتھ کرنا ہو



آرک کی مکارانہ اور سنگدلانہ تاثرات، گفتگو اور میرے رد عمل نے اسے کچھ ایسا سمجھ دیا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، میرے لیے وہ بالکل قابل قبول نہ تھا۔ میں نے اول خیر کی بات کا ابھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے دل و دماغ میں پہلی بار تشویش کی لہر پوری شدت کے ساتھ بیدار ہوئی تھی، میں اگر اول خیر کو اس ”چٹے سوز“ کے خطرناک عزائم کے بارے میں آگاہ کر دیتا تو یقیناً اول خیر آپے سے باہر ہو جاتا۔

ہم قیدی تھے یہاں..... مجبور اور بے بس بھی۔ میرے ذہن نے عیاری کی جو بساط آرک کے آگے بچھانے کی کوشش چاہی تھی، اسے پہلی ہی چال میں ”شہ مات“ ہو گئی تھی اور مجھے یہ بساط سمیٹنے ہی بنی تھی۔

میرا ذہن تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ سر دست مفر کی تمام راہیں مسدود نظر آتی تھیں۔ اب اللہ کا ہی آسرا تھا کہ جتنا بڑا نام اتنا بڑا آسرا۔

آرک نے ہولے سے اپنے آدمی سے کچھ کہا تھا۔ مجھے بازوؤں سے پکڑ کر وہاں سے لے جایا جانے لگا۔ اول خیر بھی اٹھ کر کھڑا ہوا مگر اسے دبوچ کے سلاٹر روم میں ہی مقید کر دیا گیا وہ چیخنے چلانے لگا۔ میں خود بھی اب آپے سے باہر ہو گیا تھا اور آرک کو گالیوں سے بُری طرح لتاڑنے لگا۔ وہ آگے جا چکا تھا۔ میری آنکھوں میں دوبارہ پٹی چڑھادی گئی تھی، یہ بہت محتاط تھے۔ مجھے اپنے بیس کو ارٹری یعنی زیر و ہاؤس کے اندرونی محل وقوع سے بھی آشنا نہیں ہونے دے رہے تھے۔ سرجیکل آپریشن کے نام سے ہی میرے اندر ہولناکیاں جنم لے رہی تھیں کیونکہ اس آپریشن کا مطلب تھا کہ میں ان کا بے دام غلام بن جاتا۔ میری چھٹی حس چیخ چیخ کر مجھے خبردار کر رہی تھی۔ ”شہزی! یہ شیطانی آپریشن نہیں ہونا چاہیے۔ ہرگز نہیں۔“ میں نے اپنی حالت پر قابو پانا شروع کر دیا تھا۔ میرے ذہن میں اچانک یہ خدشا بھرا تھا کہ کہیں میرے اس طرح واویلا کرنے سے یہ مجھے وقت سے پہلے ہی بے ہوش نہ کر ڈالیں مگر ہوش میں رہتے ہوئے بھی میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت کی سمت بندھے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور میں ان کے شیطانی گڑھ میں موجود تھا۔ جہاں نہ جانے ان کے اور کتنے ساٹھی جدید ہتھیاروں سے مسلح تھے اور میں مکمل طور پر بے بس اور ان کے رحم و کرم پر تھا۔ پھر مجھے مختلف راہدار یوں سے گزار کر جس کمرے میں لایا گیا وہاں میرے نعتوں سے کچھ ایسی بوکھراکی تھی جس نے میرے اندر

وہ بھی میرے ساتھ چالاکی چل رہا تھا۔ گویا میرے اور آرک کے درمیان ایک بساط بچھ چکی تھی، اس کے پاس مہروں کی کمی نہ تھی جبکہ میرے پاس تو ایک چلا ہوا کارتوس تک نہ تھا۔ یہ دماغی کھیل تھا جس کی چال کامیاب ہوتی، جیت اس کا مقدر بنتی۔ میں نے حامی بھری تو آرک نے کسی مسرت کا اظہار نہ کیا اور بولا۔

”او کے، سب ٹھیک ہے۔ ہمارے مشن پر روانہ ہونے سے پہلے تمہیں ایک مائنز آپریشن سے گزرنا ہوگا۔“

”آپریشن؟ کیسا آپریشن؟“ میں بُری طرح چونکا۔

اس کے بدبخت ہونٹوں پر بڑی مکروہ اور سنگدلانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔ ”ہم اپنے تحفظات کے سلسلے میں مکمل طور پر تسلی چاہتے ہیں یہ ایک معمولی سا سرجیکل آپریشن ہوگا۔ تمہیں جنرل اسٹھیا کے ذریعے تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش کیا جائے گا پھر تمہارے جسم کے کسی مقام پر خفیہ طور پر ایک ڈیوائس چپ لگا دی جائے گی، جو تمہاری مکمل کارکردگی کی رپورٹ ہمیں یہاں بیٹھے ہائی ٹیک سپر کمپیوٹر پر منتقل کرتی رہے گی، اس میں تمہاری کسی چالاکی، کسی عیاری کے شے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی نہ ہی تمہیں ہم سے رابطہ کر کے کسی قسم کی رپورٹ دینے کی زحمت گوارا کرنا پڑے گی۔ تمہارے جسم میں موجود مائیکرو الیکٹرک ڈیوائس خود بخود تمہاری ایک ایک حرکات و سکنات کی ہمیں آگاہی دیتی رہے گی۔“ اس خبیث کی بات سن کر میرے دماغ کی کیا پورے وجود کی سیس پھول گئیں۔ نہ جانے یہ مردود میرا ایسا کون سا سرجیکل آپریشن کرنے والے تھے، جو مجھے قطعاً قابل قبول نہ تھا بلکہ سچی بات تو یہ تھی مجھے اس آپریشن کے نام سے ہی ہول آنے لگا تھا۔ سب سے اہم بات میرے نزدیک یہ تھی کہ اس ملعون خبیث آرک کے بقول اس میں کسی شے یا چالاکی کرنے کی بال برابر بھی گنجائش نہ تھی، تو پھر یہ آپریشن دیسے بھی میرے لیے خطرناک تھا۔

”یہ مائیکرو الیکٹرک ڈیوائس تمہیں ہمارا بے دام غلام بنا کے رکھے گی۔“ آرک نے آخری تیر چلایا جو سیدھا میرے دل میں کھاتا تھا۔

”اوئے کا کے! یہ چٹا سوز..... انگریزی میں تیرے ساتھ کیا گٹ پٹ کیے جا رہا ہے۔ تیری تو حالت ہی غیر ہو رہی ہے۔“

اول خیر نے ہولے سے اپنا منہ میرے کان کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ اول خیر اتنا پڑھا لکھا نہ تھا مگر



کے ہولناک خدشات کو مزید سوا کر ڈالا تھا۔ یہ ایسی ہی...  
مخصوص دوائیوں کی بوتلی جیسی کسی اسپتال کے آپریشن روم  
میں ہوتی ہے۔ دفعتاً مجھے اپنی گردن پہ چھین کا احساس ہوا۔  
لیکھت میری آنکھیں پھیل گئیں اور میرا دماغ ماؤف ہونے  
لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ڈوبتے ذہن  
کے ساتھ ہی میں نے دل میں اللہ کی مدد کو ضرور پکارا تھا۔

☆☆☆

مجھے جب ہوش آیا تو لیکھت میرا دل اچھل کر حلق میں  
آن ٹپکا۔ کیونکہ آنکھ کھلنے پر میں نے خود کو ایک آپریشن ٹیبل  
پر پڑے پایا تھا۔ میرے اوپر بڑا سا کٹھوپ تھا جس پر کئی  
گلوب روشن تھے، میرے دائیں جانب ایک بڑی سی ٹرالی  
رکھی ہوئی تھی جس پر اسٹین لینس اسٹیل کے سرجیکل  
انسٹرومنٹ رکھے تھے۔ بائیں جانب قدرے عقب میں  
ایک مشین سی تھی، جس پر دو چھوٹے مانیٹر اور ایک آکسیجن  
پمپ نظر آتا تھا۔ مانیٹر میں دل کی دھڑکنیں اور نبض کی رفتار  
کے گراف تحرک رہے تھے۔

میں آپریشن ٹیبل پر چت لیٹا ہوا تھا۔ میرے دونوں  
ہاتھوں کی کلائیوں پر جی بیلٹ بندھے ہوئے تھے۔ یہی  
حالت دونوں پیروں کی تھی۔ سفید کوٹ (ایپرن) میں وہاں  
چار افراد موجود تھے، پانچواں آرک تھا۔ دو جوان سے مرد  
تھے، مجھے ان کی حیثیت جیلر جیسی معلوم ہوئی تھی، ایک بوڑھا  
سافٹس تھا۔ سر کے بال سفید، چہرہ بھاری اور ٹماٹر کی طرح  
سرخ تھا۔ آنکھیں چھوٹی اور گول..... مجھے اس کے چہرے  
سے نامعلوم سی منحوسیت نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ایسی ہی  
مسکراہٹ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ثبت سی معلوم ہوتی  
تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے ساٹھ سے اوپر ہی لگایا  
تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا ایک پختہ العمر آدمی تھا۔ یہ مقامی لگتا  
تھا، چہرے پہ داڑھی موچھیں تھیں۔

آرک نے پہلے بڑھے گورے کا تعارف کراتے  
ہوئے مجھ سے کہا۔ ”یہ ڈاکٹر گھٹ ہیں۔ معروف سرجن.....  
اپنے کام کے ماہر۔ ہمارے پرانے خیر خواہ.....“ پھر آرک  
نے قریب کھڑے مذکورہ پختہ العمر مقامی شخص کا کاندھا  
تھپتھا کر بولا۔ ”یہ حامد ہیں کپیوٹر ماسٹر..... مجھے یقین ہے  
مسٹر شہزی!“ وہ مردود آخر میں مجھ سے مخاطب ہو کے  
زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔ ”ان دونوں ماہرین کی موجودی  
میں تمہیں بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔“

اس کے بعد آرک آپریشن تھیٹر نما اس منحوس کمرے  
سے چلا گیا۔ گھٹ نے چہرے پر سفید ماسک چڑھا لیا۔

ٹرالی کے قریب ایک ہیلپر کھڑا ہوا۔ دوسرا مشین کے پاس  
کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک انجکشن بھرنے لگا۔ میں اسٹریچر نما ٹیبل  
پر لیٹا یہ سب بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے چیخنا چلانا  
شروع کر دیا۔ یہ سب مجھے انسان کم اور قصائی زیادہ معلوم  
ہونے لگے۔ ڈاکٹر گھٹ کا چہرہ اب سیاٹ نظر آ رہا تھا اور وہ  
میرے جسم کا جگہ جگہ سے ہاتھ پھیر کر کچھ جائزہ اور معائنہ  
کرنے میں مصروف ہو گیا۔ شاید بے ہوشی کے عالم میں میرا  
لباس بھی تبدیل کر دیا گیا تھا اور آپریشن کرانے والے  
مریضوں کا سا ”چولا“ ٹائپ لباس پہن رکھا تھا۔ ایک ڈرپ  
کی سوئی میری نرس میں اس ہیلپر نے گھونپ دی تھی اور  
انجکشن بھر کے پہلے ڈرپ کے اندر دوا انجیکٹ کی پھر دوسرا  
وائل اٹھا کے اس سے سر ج بھری اور ڈرپ ٹیوب میں جس  
کی سوئی میرے بازو کی نرس میں پیوست تھی، کے اندر بہت  
دھیرے دھیرے انجیکٹ کرنے لگا۔ آج میں پہلی بار زندگی  
میں خود کو اس قدر بے بس، مجبور اور لاچار محسوس کر رہا تھا۔

شیطان صفت سرجن ڈاکٹر گھٹ..... نے سر جیکل  
ٹرالی کے قریب کھڑے دوسرے ہیلپر سے کچھ کہا۔ وہ آگے  
بڑھا تو اس کی ہلکی سی ٹھوکر سے ٹرالی سرک کے میرے  
آپریشن ٹیبل کے ساتھ آن لگی اور پھر دفعتاً ہی میرے دائیں  
جانب بندھے ہاتھ کی انگلی سے کوئی آہنی شے ٹکرائی، میری  
انگلیاں بہر حال آزاد تھیں۔ میں نے وہ شے محض انگلیوں کی  
مدد سے دیوچ لی اور پھر وہ جیسے اس شے کو انگلیوں کے لمس  
سے محسوس کرتے ہی میرے ذہن کے اندھیروں میں  
لیکھت امید کی جوت جاگ پڑی۔ وہ سر جیکل ٹائف تھا۔  
ادھر وہ خبیث ہیلپر مجھے جانے کون سا انجکشن لگا چکا تھا۔ اس  
سے میرا ذہن رفتہ رفتہ نیم غنودہ ہو رہا تھا۔ ایک چیخ تھی جو  
میرے سینہ سوزاں سے برآمد ہونے کو بے چین تھی کہ کاش  
بے ہوشی کے یہ لمحات کچھ طویل ہو جائیں اور میں اس سے  
پہلے اپنا کام انجام دے ڈالوں..... کاش ایک حسرت زدہ  
آہ تھی، جس نے مجھے پاگل ہونے کی حد تک بے چین کر ڈالا  
تھا۔ میں ٹائف سے غیر محسوس انداز میں اپنی کلائی کی بیلٹ  
کاٹنے لگا۔ شکر تھا کہ پہلے والا ہیلپر دوبارہ اپنی جگہ پر نہیں  
لوٹا تھا ابھی تک..... ورنہ وہ اپنی ”غفلت“ اور میری مخفی  
حرکت دیکھ لیتا۔ دوسرا منحوس ہیلپر ڈرپ ٹیوب میں مجھے  
انجکشن دے چکا تھا پھر مؤدبانہ اور ہولے سے ڈاکٹر گھٹ  
سے بولا۔ ”سر! میں نے سنگل ڈوز دے دی۔ آخری ڈوز  
کے لیے اس کے چہرے پر ماؤتھ کیٹ.....  
دینا پڑے گا۔“ ڈاکٹر گھٹ اس وقت میرا پیٹ برہنہ کیے



کچھ جائزے میں مصروف تھا اور ساتھ ہی کمپیوٹر ماسٹر حامد کو کچھ بتا رہا تھا۔ دوسرے ہیلپر کی بات پر سیدھا ہو کے بولا۔  
”ییس! ماؤتھ گیگ لگا کر آخری ڈوز دے دو۔ ہم نے مارک کر لیا ہے۔“

میں چونکا گویا ابھی سنگل ڈوز دی گئی تھی، آخری ڈوز دینے کا مطلب تھا میں مکمل طور پر بے ہوش ہو کے ان کے رحم و کرم پر ہو جاتا مگر سنگل ڈوز سے ہی میری حالت نیم غنودہ سی ہوتی جا رہی تھی لیکن میں اپنی قوت ارادی اور مضبوط اعصاب کے سہارے اپنے ”کام“ میں لگن تھا اور ساتھ ہی دل ہی دل میں اللہ سے اپنی کامیابی کی دعائیں بھی مانگتا جا رہا تھا کہ بے ہوشی کی آخری ڈوز سے پہلے میرا کم از کم ایک ہاتھ تو آزاد ہو جائے۔

پہلے والے ہیلپر کو ڈاکٹر گھٹ نے کسی کیبنٹ کی جانب مصروف کر دیا تھا۔ وہاں وہ کچھ تلاش کر رہا تھا۔

دوسرا منحوس ہیلپر میرے چہرے کا بہ غور جائزہ لیتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا دیکھنا چاہ رہا تھا لہذا میں نے نیم غنودہ ہونے کی ایکٹنگ شروع کر دی۔ تاکہ اس شیطانی ٹولے کو مجھ پر یا میری مخفی حرکت پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔

ٹھیک اسی وقت میرا دایاں ہاتھ آزاد ہو چکا تھا۔ ایک ہاتھ کے آزاد ہوتے ہی جیسے میری رگ رگ سے قہر و غضب کا کالا طوفان اٹھ پڑا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے حلق سے شیر جیسی غرغراہٹ برآمد ہوئی اور دوسرے ہی لمحے میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا جس میں وہی نشتر دبا ہوا تھا۔ پہلا نشانہ میرا یہ شیطان ڈاکٹر گھٹ بنا تھا۔ میں نے اس کی موٹی سفید چہ بلی گردن چیر ڈالی۔ اس کی شررگ کٹ گئی تھی شاید کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کی گردن سے خون کا فوارہ ابل کر اس کے ساتھ کھڑے حامد کے چہرے پر پڑا اور سرخ ہو گیا۔ دوسرا دار بکلی کی سی سرعت کے ساتھ میں نے حامد کے پیٹ پر کیا۔ سر جیکل نشتر بہت تیز دھار تھا اور صرف گویا اشارے کا منتظر تھا۔ حامد کے پیٹ پر چڑھ کا لگنے کی دیر بھی کہ اس کا پیٹ کھل گیا۔ اور انٹریوں کا جھلجھاتا ہوا ڈھیر باہر کو آن پڑا جسے حامد پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا اور بے دونوں ہاتھوں سے اپنی انٹریوں کے گچھے کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر ڈاکٹر گھٹ کے ساتھ وہ بھی کرہناک خرخراتی چیخیں مارتا ہوا زمین پر آ رہا۔ مجھ پر تو جیسے آتش جنوں خیزی طاری ہو چکی تھی۔ دوا دینے والا ہیلپر تو پہلے ایک لمحے کو خوف زدہ ہوا پھر دہشت زدہ ہو کے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اس کی خوف زدہ کیفیات سے فائدہ اٹھایا اور جلدی جلدی

اپنے دوسرے بازو کی بیلٹ کاٹ ڈالی تب دونوں ہیلپروں کے ہوش ٹھکانے آئے اور وہ جارحانہ انداز میں مجھے قابو کرنے کی غرض سے میری طرف لپکے۔ یہی تو میں چاہتا تھا، پہلے والے ہیلپر نے کچھ زیادہ ہی بہادری کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا مگر آریشن میل کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کا پاؤں آریشن ٹھیکڑ کے چکنے فرش پر پھیلے ہوئے خون و دیگر آلائش میں پڑ کر پھسلا اور منہ کے بل وہ میری طرف آ رہا۔ میں نے اس کے چہرے پر بائیں ہاتھ کا گھونسا رسید کر دیا۔ وہ اپنے حلق سے اوغ کی آواز خارج کر کے زمین پر آ رہا۔ دوسرے ہیلپر کو میں نے نشتر سے نشانہ بنانا چاہا مگر نشتر کا دار اس کے سینے یا پیٹ پر پڑنے کے بجائے اس کے بازو پر پڑا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ وہ اب ادنیٰ سے باہر بھاگنے کے چکروں میں تھا کہ میں نے بلاخیز پھرتی کے ساتھ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے دونوں پیروں کے بیلٹ بھی کاٹ ڈالے۔ آزاد ہوتے ہی پھر تو میں جیسے پھرا ہوا ایک زخمی شیر بن گیا تھا۔ ڈاکٹر گھٹ اور کمپیوٹر ماسٹر حامد تڑپ تڑپ کر ختم ہو چکے تھے۔ ان کے خون اور آلائشوں کے باعث چکنے فرش پر کافی خطرناک حد تک پھسلن پیدا ہو گئی تھی مجھے خود کو بار بار سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ انجکشن کی فرسٹ ڈوز بھی اپنا غلبہ میرے دماغ میں بھار رہی تھی اور خود کو میں نیم غنودہ سی حالت میں محسوس کر رہا تھا۔ یہ تو میرے اندر کی آتش جنوں خیزی تھی کہ غیظ جوش تلے میں اپنے مضبوط اعصاب اور خود اعتمادی کو بروئے کار لا رہا تھا۔ گھونسا کھا کے اور پھسل کر گرنے والے ہیلپر نے بدحواسی میں اٹھ کر بھاگنے کی کوشش چاہی تھی کہ پھر گر پڑا۔ اس کا سفید کوٹ بھی فرش پر خون کے تالاب میں لٹھڑ کر سرخ ہو رہا تھا۔ دوسرا ہیلپر جو دروازے کی طرف دوڑا تھا، وہ بھی پھسل کر گرا تھا۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے خود میں بھی پھسلتے پھسلتے بچا تھا۔ دونوں نے بے بسی اور خوف کے عالم میں چیخنا چلانا اور ”ہیلپ“.....



لڑکھڑا گئے اور میں شاید کوریڈور کی دیوار سے ٹکرایا تھا۔ ایک لوگر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور پھر میں بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چلنے فرش پر گرا۔ میری سانسیں تیر تیز چل رہی تھیں جانے کدھر سے مجھے دوڑتے ہوئے بھاری جوتوں کی دھمک سنائی دی، یہ میرے لیے انتہائی جاں نگیں اور خطرناک لمحات تھے۔

”نہیں، شہزی نہیں، اب گراتو کبھی نہیں اٹھ پائے گا۔“

اٹھ، سنبھال خود کو۔“ میرے اندر جیسے کوئی دھاڑ مار کر چیخا۔

میں نے فرش پر لیٹے لیٹے سر کو دو تین بار جھٹکے دیے۔ کچھ ہوش و

خرد کا یارا ہوا، ایک لوگر ہنوز میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔

دوسرا مجھ سے تھوڑے فاصلے سے فرش پر پڑا تھا۔ میں نے

بمشکل آگے کی جانب خود کو گھسیٹا اور دوسرے لوگر کو بائیں

ہاتھ میں دبوچتے ہی دوڑتے قدموں کی دھمک کی آوازوں کا

اندازہ کرتے ہی میں پشت کے بل لیٹے لیٹے اپنے سر کو تھوڑا

سا اٹھایا اور میرے لوگر والے دونوں ہاتھ ہی بلند ہوئے،

مجھے اپنی ٹانگوں کے رخ پر سامنے سے تین چار مسلح افراد

اپنی طرف دوڑتے ہوئے آتے دکھائی دیے اور پھر یہی وہ

لحہ تھا شاید جب مجھے ان سے پہلے ان پر فائر کا موقع ملا تھا۔

میرے دونوں ہاتھوں کے لوگر کے ٹریگر پر میری انگلیاں

جیسے بجلی کی طرح تھر تھراتی چلی گئیں اور لوگرز کی ٹالیں شعلے

اٹکنے لگیں۔ بے درپے کئی کریہہ انگیز چیخیں لوگر کے دھماکوں

کی آتشیں غر مستیوں میں ابھریں اور وہ سب ایک دوسرے

کے اوپر گولیوں سے چھلنی ہو کر گرنے لگے۔ میری آنکھوں

میں چھانے والی دھندلاہٹ ابھی پوری طرح سے چھٹی نہیں

تھی۔ تاہم میں نے ایک پھر مضبوط قوت ارادی اور چیخے

اعصاب کی بے قاعدگی پر مکمل دسترس قائم رکھتے ہوئے بجلی

کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا اب جو بھی کرنا تھا، وہ

فوری اور جلد کرنے کا متقاضی تھا۔ پل کے پل میں نے

اندازہ لگایا کہ وہ منحوس سلاٹر روم کدھر ہو سکتا تھا مگر عبث مجھے

علم نہ ہو سکا۔ کیونکہ درمیان میں مجھے گردن پر سرنج کی سوئی

چھو کر بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ اول خیر کی طرف سے تشویش

کی ابھرتی لہر نے مجھے بولا کر رکھ دیا۔ میں کچھ دیر پہلے

آرک کی ٹریا کے ساتھ درندگی اور چنگیزی کا مظاہرہ ہوتے

دیکھ چکا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ آرک، اول خیر کو گن پوائنٹ

پر رکھ کر مجھے بے آسانی قابو میں آنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

میں ایک اندازے سے اللہ کا نام لے کر آگے دوڑتا

چلا گیا۔ دائیں جانب مجھے ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا کھلا

نظر آیا۔ پھر آگے پیچھے متعدد دوڑتے قدموں کی آہٹ ابھری

تھی۔ مجھے ان کی بیٹوں میں پستولیں اڑ سے ہوئے دکھائی دیے۔ بے شک یہ اسپیکٹرم کے تربیت یافتہ ایجنٹ ہو سکتے تھے اور خود میں کیا تھا۔ اس پر مستزاد مجھ پر نیم غنودگی کا بھی غلبہ سوار تھا مگر بقائے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پاؤں ہلانے ہی تھے، ورنہ تو میرے ساتھ..... اول خیر کی بھی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی، سر دست تو میرے لیے یہی بہت تھا کہ میں اس منحوس سرجیکل آپریشن سے بچ گیا تھا۔ اور ان دونوں شیطانوں..... ڈاکٹر گھٹ اور حامد کو ختم کر چکا تھا یقیناً یہ میرا اسپیکٹرم جیسی تنظیم کو پہنچایا ہوا خاصا بڑا نقصان تھا نہ جانے اس ہشت پانچ تنظیم کے کتنے شعبے یہاں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل میں مصروف کار تھے؟

بہت دھیرے سے دروازہ کھول کے میں باہر نکلا۔

پھر چپتے کی سی پھرتی کے ساتھ میں پشت کی جانب سے ان

دونوں پر پل پڑا۔ میری حتی الامکان کوشش یہی تھی کہ انہیں

خود سے دو بد و مارا ماری کا موقع نہ دوں اور کم سے کم وقت

میں ان پر قابو پانے کی کوشش کروں کیونکہ جانتا تھا میں کہ

میں اس وقت خونی بھیڑیوں کی کچھار میں تھا جبکہ اول خیر بھی

ان کے قبضے میں تھا، ابھی تھوڑی دیر میں آرک تک خبر پہنچنے

والی تھی کہ میں اس کے بیس کوارٹر میں کیا گل کھلا چکا ہوں۔

اس کے غرور اور طاقت کے گھمنڈ کی دھجیاں بکھرنے والی

تھیں۔ یہ اطلاع پہنچتے ہی بیس کوارٹر کے در و دیوار تک مجھ

پر اور اول خیر پر تنگ کر دیے جائیں گے۔

وہ دونوں گویا ”اپنے ہی گھر“ میں اس اچانک حملے

کے لیے بالکل تیار نہ تھے، سو مار کھا گئے، دونوں ہی کوریڈور

کے فرش پر گرے تھے اور میں نے ان میں سے ایک کو اپنا

ہدف بناتے ہوئے اپنے ہاتھ میں دبے نشتر سے اس کی

گردن چیر ڈالی اور اس کے پستول پر ہاتھ مارا، یہ امریکن

ساختہ جدید آٹومینک ”لوگر“ تھا۔ دوسرے نے گرتے ہی

اور صورت حال کی خطرناکی کو پل کے پل بھانپتے ہی بڑی

بلاخیز پھرتی کے ساتھ اپنا پستول نکال کر لیٹے لیٹے ہی اس کی

خونناک نال کارخ میری طرف کر دیا۔ گولی چلانے کا دھماکا

ہوا اور اس کی پستول کی نال سے گولی ٹککنے کی حسرت ہی رہ

گئی گو کہ اس سے پہلے ہی میرے لوگر نے آتش قبضہ اگل دیا

تھا۔ گولی اس کی پیشانی پھاڑتی ہوئی بھیجے میں اتر گئی تھی۔

میں نے اس کا لوگر بھی اٹھالیا اور دونوں ہاتھوں میں

جدید ساختہ ہتھیار ساتے ہی میری ہمت سوا ہو گئی۔ میں اٹھ

کر اندازے سے ایک طرف کو دوڑا تو اچانک مجھے چکر سا

آگیا اور میری آنکھوں میں تاری کی چھانے لگی، میرے قدم



جب تک کوئی اس طویل کوریڈور میں نمودار ہوتا تھا غراب سے مذکورہ کھلے دروازے والے کمرے میں گھس گیا۔ کمرہ روشن تھا مگر خالی۔ ٹھیک اسی وقت مجھے کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

کان دھرنے پر پتا چلا کہ یہ مردود چنگیز نسل..... آرک تھا جو غیظ و غضب کے مارے تقریباً پاگل ہو رہا تھا۔ وہ پاگل جنونیوں کی طرح چلا چلا کر اپنے ساتھیوں کو میرے بارے میں احکامات صادر کر رہا تھا۔ یہ آواز مجھے ایک کونے کے قریب سے زیادہ محسوس ہوئی۔ میں نے اس جانب دیکھا وہاں مجھے درز نظر آئی۔ قریب آیا تو عقدہ کھلا وہ ایک فلکسڈ دروازہ تھا۔ میں نے اس کی جھری سے آنکھ چپکادی۔ آرک کا منحوس چہرہ اور ناپاک وجود نظر آ گیا۔ مارے طیش اور جوش غیظ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور گردن کی رگیں پھول رہی تھیں۔ وہاں قریب آٹھ دس مسلح ساتھی موجود تھے۔

”کہاں غلطی ہوئی ہے ہم سے..... کس جگہ ہم نے چوٹ کھائی؟ اور کیسے؟ میں نے تو آخری وقت تک اسے بالکل بے بس اور بندھا ہوا آپریشن ٹیبل پر پڑے پایا تھا۔ کیا وہ جن تھا، وچ تھا، یا چھلاوا؟“

”باس! وہ واقعی چھلاوا تھا۔ اس نے پتا نہیں کیسے خود کو عین اس وقت چھڑا لیا تھا جب اسے بے ہوش کیا جا رہا تھا۔“ ایک ساتھی ایجنٹ نے آرک کو بتایا تو وہ اس پر گندی گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے دھاڑا۔

”جاؤ اب میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اسے ڈھونڈو..... وہ کسی خوفناک عفریت کی طرح ادھر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔“ وہ سب اٹھ پیروں لوٹ گئے۔ میں نے آرک کو دیکھتے دروازے کو ہولے سے اندر کی طرف تھوڑا دھکیلتا چاہا مگر ندارد۔ وہ بند تھا۔ ایک ساتھی کو اس نے اپنے پاس موجود رہنے دیا تھا۔ اس سے پوچھا۔

”کیا ڈاکٹر گھٹ اور حامد دونوں ختم ہو چکے ہیں؟“

”یس باس، دونوں پر شہزی نے بہت کاری وار کیا تھا۔“

”شٹ..... شٹ..... اس بد بخت شہزی نے میرا کتنا بڑا نقصان کر ڈالا۔ مم..... میں..... میں ماسٹر لولووش کو کیا جواب دوں گا۔ ایک ایک عام سالڑکا..... زیر و ہاؤس میں ہمارے بیس کوارٹر میں اتنے تربیت یافتہ لوگوں کی موجودی میں..... اتنی بڑی تباہی پھیلا کر کسی پراسرار مخلوق کی طرح غائب ہو گیا۔ نو..... نو..... نیور..... ماسٹر لولووش..... میری

کھال ادھیڑ دے گا اور تم سب کی بھی.....“ آرک کی حالت دیدنی حد تک بڑی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ اسے یوں اپنی ہی غیظ و غضب کی آگ میں چلتا سلکتا دیکھ کر میرے انتقامی جذبے کی بھی تسکین ہو رہی تھی۔ میں ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔ اس وقت اس کے ہرکارے نے کہا۔ ”باس! اس کا ساتھی ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم اسے گن پوائنٹ میں لے کر شہزی کو قابو کر سکتے ہیں۔“ اس کی بات پر یکنخت میرے کان کھڑے ہو گئے، آرک نے کہا۔ ”میں آخر میں یہی کروں گا مگر ابھی نہیں، اسے ڈھونڈو، تم بھی دفع ہو جاؤ میری نظروں سے.....“ اس کی غصیلی دھاڑ پر وہ بھی اٹھ پاؤں کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

میں نے اس مختصر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ خالی کمرہ تھا مگر اچانک مجھے اس کے دوسرے کونے والی سمت پر ایک چبوترہ نما تھڑا سا ابھرا ہوا دکھائی دیا۔ یہ باکس نما تھڑا کم و بیش پانچ فٹ کا تھا اور فرش سے ایک ڈیڑھ فٹ اوپر بھی تھا۔ میں لپک کر اس کی جانب بڑھا تو عقدہ کھلا یہ ایک مختصر سا زمین دوز زینہ تھا۔ میں لپک کر جیسے ہی اس کے اندر داخل ہوا مجھے اس کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلتا سنائی دیا۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ مجھے تھوڑی سی بھی دیر ہو جاتی تو صورت حال سنگین تر ہو سکتی تھی، میں تیزی کے ساتھ مگر بے آواز قدموں سے نیچے اترتا چلا گیا۔ پھر ایک مقام پر رک گیا۔ ابھی میں زینے میں تھا۔ نہ جانے اور نیچے کتنی گہرائی تک یہ تہ خانہ جاتا ہو گا مگر چند ثانیوں تک وہیں دبکا رہا اور اوپر دیکھنے لگا۔ دفعتاً میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ کئی چہرے مجھے اوپر سے نیچے تاریک خلا میں جھکے دکھائی دیے۔ یقیناً وہ مجھے دیکھنے سے عاری ہوں گے مگر دفعتاً ان میں سے ایک آواز سن کر میں پریشان ہو گیا۔

”نیچے روشنی پھینکو..... ممکن ہے..... وہ بیسمنٹ میں اتر گیا ہو۔“

ان شیطانی ہرکاروں کو اگر میری ایک ذرا بھی جھلک نظر آ جاتی تو وہ ادھر ہی مجھے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے جبکہ میں نیچے مزید نہیں اترنا چاہتا تھا۔ میری پہلی کوشش اول خیر کو مردود چنگیز صفت آرک کے چنگل سے چھڑانا تھا۔ میری آنکھوں کے گرد ابھی تک ٹریا کی اس کے ہاتھوں عبرت ناک اور تھرا دینے والی موت کا منظر تازہ تھا۔ آرک جیسے خبیث اور جلا د آدمی سے کچھ بھی متوقع تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں آرک کو دیکھتے ہی اس پر قابو پانے کی سوچ رہا تھا کہ اس



کمرے کی اچانک رکنی ہو گئی، بہر طور میں روشنی پھیلنے والی بات سن کر تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگا تو اسی وقت اوپر سے کسی ٹارچ کی مدد سے نیچے روشنی پھیل گئی، اب میرا مزید حرکت پذیر رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ نیچے نہ جانے اور کتنا طویل زینہ تھا یا فرش کہاں تک تھا، مجھے اس کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ البتہ روشنی پڑتے ہی میں نے خود کو پشت کے ذریعے زینے کی دیوار سے چپکا لیا۔

”ہمیں نیچے اترنا پڑے گا۔ وہ یقیناً ادھر ہی گیا ہو گا۔“ دوسرے نے کہا۔ مجھے پھر پریشانی نے آگھیرا۔ کیونکہ میں کم از کم یہاں ان سے مقابلہ کرنے کے موڈ میں نہ تھا، یہ تہ خانہ میرے لیے چوہے دان بن سکتا تھا۔ آرک نے گویا میرے سلسلے میں ایک طرح سے ”ڈ-تھ وارنٹ“ جاری کر دیا تھا۔ یہاں مقابلہ کرنے کا مطلب تھا، اپنی قبر آپ کھودنا کیونکہ سب کا پھر ادھر ہی رخ ہو جاتا۔ ابھی تو ان کی ”افرا دی قوت“ میری تلاش میں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھی۔

”کوئی فائدہ نہیں۔ جابر اور رابرٹ..... دوسرے زینے سے کم از کم دس پندرہ ساتھیوں کے ساتھ نیچے اتر چکے ہیں۔ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں جعفر کو فالو کرنا ہوگا۔ اس طرف اب تک کوئی نہیں گیا۔ وہ وہاں اکیلا ہے۔“ ایک دوسری آواز نے گویا میرے اندر تسکین کی بے پایاں لہر دوڑا دی۔ ورنہ تو میں ان کی زبانی یہ سن کر مزید متوحش سا ہو گیا تھا کہ نیچے بھی مسلح دشمنوں کا جتنا موجود تھا۔ گویا یہاں دیکھ لیے جانے کی صورت میں دونوں طرف سے سینڈ ویج بن کر رہ جاتا اور یہ تہ خانہ ہی میری قبر بننا۔

وہ سارے پلٹ گئے۔ میں نے حرکت کی، اوپر آیا۔ ذرا جھانک کر دیکھا۔ وہ جا چکے تھے۔ کمر خالی تھا۔ میرا مزید اس کمرے میں رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ دونوں جدید ساختہ لوگرز میرے دونوں ہاتھوں میں کھلونوں کی طرح دبکے ہوئے تھے، دروازے کی جھری سے میں نے جھانکا تو جیسے یکلفت میرے پورے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ برابر والا کمرہ وہی تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں آرک اور اس کے مسلح ساتھیوں کو دیکھ چکا تھا۔ میرے چوکنے کی وجہ وہ دو افراد تھے جو اول خیر کو رن بستہ حالت میں اسی کمرے کی طرف لارہے تھے، میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن نے پل کے پل فیصلہ کر ڈالا۔ ”اب نہیں تو کبھی نہیں“ ایک دھڑاکے سے میں نے دروازہ کھولا۔ میرے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب بلند ہوئے اول خیر مجھے فائرنگ پوزیشن میں دیکھ کر بروقت عقل

جاسوسی ڈائجسٹ

مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً نیچے کو تھوڑا جھکا۔ اسے دائیں بائیں بازو سے دبوچے ہوئے ہر کاروں کو سنبھلنے کا موقع تو دور کی بات تھی، انہیں ایک ذرا جنبش کا بھی موقع دیے بغیر میں نے ایک بیک اپنے دونوں پستولوں کے ٹریگر دبا دیے۔ دونوں کو جھٹکا لگا اور زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ آگے بڑھ کر میں نے انتہائی پھرتی کے ساتھ اول خیر کے دونوں ہاتھوں کی رسیاں کھول ڈالیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر روٹھیں اور زندگی کی مسرتیں دوڑ گئی تھیں۔ ایک لوگر اسے تھماتے ہی میں نے دروازے کو لات رسید کر دی۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور اندر کوئی اس سے ٹکرا کر چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ وہ آرک تھا جو فائر کی آواز سنتے ہی پستول ہاتھ میں لیے، دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ باہر کی سچویشن کا اسے کچھ اندازہ نہیں ہو پایا تھا اس نے سنبھلنے کی کوشش چاہی تھی۔ میرے لوگر نے شعلہ اگلا، گولی اس کے پستول والے ہاتھ کی پوری پھٹکی ہی اڑا چکی تھی، وہ کریمہ انداز میں چیخا، پھر میں نے کسی زخمی شیر کی طرح اس پر جھپٹا مارا اور گردن سے دیوچ لیا پھر خوفناک لہجے میں غرایا۔

”بس! اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا کتے۔“

”تم..... تم..... یہاں سے بچ کر نہیں جاسکو گے۔“ وہ کراہتے ہوئے غیظ آلود لہجے میں بولا۔ اس کا دایاں ہاتھ کلائی سے اڑ جانے کے بعد خون اگل رہا تھا۔ میں نے زہر خند غراہٹ سے اور گویا اس کی حالت زار سے حظ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”یہ ہمارا دوسرا ہے۔“

”ماسٹر لولوش سے دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ نہیں جانتے تم اس کو، وہ سیکڑوں میل دور بیٹھے بھی تمہیں کسی چڑیا کی طرح بے بس کر سکتا ہے۔“ آرک دھمکیاں دینے سے باز نہیں آ رہا تھا۔

”تمہارے ماسٹر لولوش سے میں بھی دو دو ہاتھ کرنے کو بے چین ہوں۔ اس سے بھی نمٹ لوں گا میں، تم اپنی جہنم میں خیر منانا اب۔“

”میں ماسٹر کا خاص آدمی ہوں۔ وہ میری موت کبھی برداشت نہیں کرے گا۔“

”اسے برداشت کرنا پڑے گا..... بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔“ میں نے کہا اور اسے آگے دھکیلا۔

”اول خیر! محتاط رہنا اس سُر کی اولاد کو ہم گن پوائنٹ پڑھاں بناتے ہوئے یہاں سے نکلیں گے۔“

”او خیر..... کا کا، میں تیار ہوں۔ شکر ہے تجھے صحیح



دانت بھیج کر اپنے بازو کا شکنجہ اس کی گردن کے گرد مزید تنگ کر ڈالا۔ اس کے حلق سے مارے اذیت کے کراہ خارج ہو گئی۔ ”میں تیری گردن توڑ ڈالوں گا خبیث کتے، اور تیری لاش کو بھی ڈھال بنا کر ان پر گولیوں کی بارش کر کے نکل۔۔۔ جاؤں گا۔ بول ان کو یہ دفع ہو جائیں۔“ میری خوں ناک لہجے کے اٹل پن پر ایک لمحے کو آرک کی کھینچی ہوئی بھروسہ والی آنکھوں میں خوف کی چمک لہرائی، دشمن خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو مگر موت یقینی موت کو سامنے پا کر اس کے اوسان خطا ضرور ہو جاتے ہیں۔ یہی حال آرک کا تھا۔ گردن پر میرے بازو کا شکنجہ تنگ پڑتے ہی اس نے محض ہاتھ کے اشارے سے اپنے مسلح ساتھیوں کو حکمانہ اشارہ دیا۔ اپنے باس کا اشارہ اور اس کی ہیئت کذا کی بھانپ کر انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ اپنے ہتھیار کو ریڈور کے فرش پر رکھ کر وہ سب پلٹ گئے۔ میری عقابی نظروں نے ہتھیاروں کا جائزہ لیا۔ وہ جدید ساختہ سب مشین گنتیں تھیں۔ میں نے اول خیر کو اشارہ کیا وہ فوراً آگے بڑھا اور دو کمر اٹھالیں جبکہ لوگر اس نے اپنے نیچے میں اڑس لیا۔

”آرک! اب میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا اگر تو نے اب بلا چون و چرا میرے احکامات پر عمل نہ کیا۔“ میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے کہا۔ ”نکاسی کا راستہ بتاؤ۔“

”اس طرف.....“ اس نے آنکھوں کے ڈیلے گھما کر اور ایک ہاتھ کے اشارے سے سامنے دائیں جانب مڑتی راہداری کی طرف رہنمائی کی، ہم وہاں پہنچے..... بائیں جانب بھی ایک راہداری تھی۔ میں دانستہ آرک کی ہدایت کے بجائے دائیں مڑنے کے بائیں جانب مڑ گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور کنپٹیوں میں فرط جوش سے سائیں سائیں ہو رہی تھی۔

”ادھر نہیں..... ادھر.....“ آرک پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ میں نے اس پر توجہ نہ دی۔ نہ ہی میں اس پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا وہ کسی وقت بھی مجھے پھانس سکتا تھا۔ اس طرف..... مجھے ایک دروازہ دکھائی دیا اور میں نے اول خیر کو مخصوص اشارہ کیا۔ جسے بھانپتے ہی اس نے دروازے پر جدید ساختہ سب مشین گن سے برسٹ مارا۔ دروازہ تو اکھڑ گیا۔ مگر ساتھ ہی کئی کریہہ انگیز انسانی چیخیں بھی سنائی دیں۔ معلوم ہوا وہاں بھی اس کے ساتھی گھات لگائے بیٹھے تھے، گولیوں کی آتشیں بوچھاڑ نے انہیں بری طرح رگید ڈالا تھا۔ کچھ مسلح ساتھی بچ کر دائیں بائیں گھات

سلامت دیکھ لیا۔ ورنہ تو میری جان ہی سولی پر انگی ہوئی تھی۔“ وہ بولا۔

ہم دروازے کی طرف بڑھے۔ میں نے آرک کی گردن کے گرد اپنا بازو کا شکنجہ جکڑ رکھا تھا اور لوگر کی نال اس کی کنپٹی سے لگا رکھی تھی ٹھیک اسی وقت کھلے دروازے پر کئی مسلح افراد اٹھ پڑے مگر آرک کی ہیئت کذا کی دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

میں نے انہیں خبردار کر دیا اور آرک کو جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ اول خیر میرے ساتھ تھا۔ وہ سب تذبذب میں مبتلا تھے۔ میں نے پھر آرک کی کنپٹی پر پستول کی نال کا دباؤ بڑھا کر کہا۔ ”اپنے کتوں سے بولو، ہمارا راستہ صاف کریں ورنہ ہم نے اپنے سر پر کفن تو باندھ ہی رکھا ہے۔“

آرک کو اب تک میری خوں ناک کا بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا مگر شاطرائہ لہجے میں بولا۔ ”اس کے بعد میری زندگی کی ضمانت کیا ہوگی؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو حیرت آمیز الجھن چمکی۔ میں نے اس سمیت قدم بڑھائے۔ اول خیر بھی میری طرح اپنے ”چو طرف“ سے پوری طرح محتاط تھا کہ آرک کا کوئی ساتھی کسی جگہ سے اچانک ہم پر وار کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کیونکہ ہم بہر حال دشمن پر کامل سبقت نہیں رکھے ہوئے تھے۔ کوئی بھی چالاکی چل سکتا تھا، آرک نے پھر میرے ساتھ تہدید کی کارروائی کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”شہزی! اب بھی وقت ہے تم دونوں خود کو ہمارے حوالے کر دو، میں ڈاکٹر گھٹ اور حامد کی موت کو فراموش کر دوں گا اور تمہارے ساتھ اس بار دوستانہ ڈیل کرنے کو تیار ہوں۔“

وہ خبیث بڑی زبردست مکاری چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا، عیار اور خنزیر صفت آرک کو میں نے جو کاری زخم لگایا تھا اس کے باعث وہ اندر سے کس قدر پھرا ہوا تھا۔ وہ ایک مکار، سنگ دل اور بے رحم آدمی تھا جس طرح اس نے ثریا کا حال کیا تھا، وہ تمہارا دینے والا منظر میری آنکھوں سے نہیں ہٹ رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے بھی مکاری دکھائی۔ ”مگر اس وقت..... تم نہیں میں تم سے ڈیل کروں گا۔ اپنے ساتھیوں سے کہو ہتھیار زمین پر رکھ کر اٹلے پاؤں دوڑ جائیں۔“ ”یہ نہیں جائیں گے۔“ جواباً آرک غرایا۔ میں نے



لگانے کی کوشش میں معروف کار ہوئے تو اسی وقت آرک کو چالاک چلنے کا موقع مل گیا کچھ وجہ میری لمحہ بھر کو اس کی طرف سے توجہ ہٹنے کی بھی تھی کیونکہ اس کے مسلح ساتھیوں کا دوسرا ٹولہ اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔ آرک نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دائیں بازو کی کہنی میرے پیٹ پر سید کر دی۔ میں اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ نتیجتاً میرے بازو کی گرفت کمزور پڑی جبکہ میرے منہ سے تکلیف کے مارے برآمد ہونے والی ہلکی آواز نے اول خیر کو میری طرف متوجہ کیا تھا۔ آرک بلاشبہ ایک تربیت یافتہ ہی باس تھا اور کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں رہا تھا۔ اس کی ٹانگ نے بھی حرکت دکھائی جو اول خیر کے سینے پر پڑی اس کے لیے بھی یہ اچانک حملہ تھا۔ لات کھا کر وہ پیچھے کو لڑکھڑایا اور کوریڈور کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ ادھر مجھے بھی سنبھلنے میں دیر لگی مگر آرک اس مختصر سے دورانیے میں ہی کافی کامیابی حاصل کرنے لگا تھا۔ وہ پچھلی کی طرح تڑپ کر میری گرفت سے نکلا اور ساتھ ہی میرے گن والے ہاتھ پر جھپٹا مارنا چاہا کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہوا کیونکہ میرے ہاتھ میں تھا ہوا لوگر ہاتھ سے گرا۔ اور اس نے پھرتی کے ساتھ اپنے پہلو میں کہیں اڑسا ہوا پستول نکالنے کی کوشش چاہی تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس پر قابو پانے کے بعد مجھے اس کی جامہ تلاشی لینی چاہیے تھی مگر اب یہ سب سوچنے کا وقت نہ رہا تھا۔ میں نے ایک عقل مندی کی کہ بجائے اپنا لوگر اچکنے پر وقت ضائع کرنے کے میں نے لات چلا دی۔ پستول آرک کے ہاتھ میں آچکا تھا مگر میری بروقت حاضری۔۔۔ دماغی اور لات رسید کرنے پر آرک چند قدم پیچھے لڑکھڑایا مگر میری یہ کوشش بھی زیادہ دیر خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکی تھی کیونکہ لات کھا کر چند قدم پیچھے لڑکھڑانے کے باوجود بھی آرک نے حیرت انگیز طریقے سے اپنے حواسوں پر قابو پائے رکھا تھا اور سنبھلتے ہی اس خبیث نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ میری جانب کیے ہی رکھا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے اپنی یقینی موت..... خود سے محض چند قدموں کے فاصلے پر محسوس ہوئی تھی اور ایسے نازک ترین لمحات میں اچھے اچھوں کے حواس لمحہ بھر کو مختل ہو جاتے ہیں۔ آرک پہلے ہی مجھ پر زخم... کھائے ہوئے تھا۔ ٹھیک اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑا بڑی ابھری اور آرک کا پورا چہرہ ہی چھلنی ہو گیا۔ اول خیر نے سنبھلتے ہی بروقت اس پر اپنی سب مشین گن سے فائر کر ڈالا تھا۔

کو بڑے بھیانک طریقے سے جہنم داخل کرنے کے بعد اول خیر نے مجھے پکارا۔ شاید میری طرح اسے بھی اندازہ تھا کہ آرک کے ختم ہوتے ہی اس کے مسلح ساتھی ہم پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑیں گے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اپنا لوگر اٹھانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اول خیر کی ہدایت پر عمل کیا تھا اور اس کے عقب میں دوڑتا ہوا پلٹا۔ ہم جیسے ہی مڑے تھے اور ہمارے عقب میں بیک وقت کئی گنز گرج اٹھیں..... میں نہتا تھا اس لیے اول خیر نے اپنا لوگر میرے حوالے کر دیا تھا۔

زیر و ہاؤس کی اس عمارت میں نہ جانے کتنی منحوس بھول بھلیاں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ نہ ہی ہمیں اس کے محل وقوع کا کچھ اندازہ تھا مگر ہمیں جہاں راستہ سوچ رہا تھا ہم اندازے سے اسی طرف کا رخ کر لیتے مگر جانتے تھے کہ زیادہ دیر تک ہم اس ”چھپن چھپائی“ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے ہماری ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ ہم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔

ایک زپنے کے دائیں جانب ہمیں بغیر دروازے کا ہال کمر اساد دکھائی دیا۔ ہم دونوں اس کے اندر جا گھسے۔ یہاں الا بلا اشیا کا ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔ ہم دوڑ پڑنے کی روش پر گامزن ہال سے گزرنے لگے۔ ہال کے دوسری طرف دو کھلے پٹ والے دروازے ملتے دکھائی دیے۔ ہم اسے ٹھوکر رسید کرتے ہوئے آگے بڑھے تو اچانک ٹھٹک کر رک گئے اور دوسرے ہی لمحے ہمارے بشروں پر بیک وقت مسرت چمکی۔ سامنے ایک طویل و عریض میدان تھا وہاں شام کے سائے اترے ہوئے تھے اور آسمان دورنگی نظر آ رہا تھا۔ سرخی اور تاریکی کے احتزاج میں عجیب سا منظر پیش کر رہا تھا۔ کہیں کہیں چھوٹے الیکٹرک پول پر بلب روشن تھے۔ باہر آئے تو دنگ رہ گئے۔ میدان کے تین اطراف تقریباً آٹھ فٹ اونچی دیواریں تھیں جن کے اوپر تین رویہ خاردار آہنی باڑیں تین تین فٹ کے فاصلے پر نصب خم دار فولادی بریکٹوں کے ساتھ جال کی صورت میں منسلک تھیں۔ اور یہ سلسلہ تین اطراف تک چلا جاتا تھا۔ سامنے بڑا سا دیویدکل آہنی گیٹ تھا جبکہ دائیں بائیں طویل القامت آہنی ڈھانچے نصب تھے جن پر بڑے بڑے لوہے کے ڈرمز اور بوائلر نصب تھے۔ ان میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ چوکی سمت اس عمارت کا رقبہ تھا۔

”کا کے! ادھر پلٹ آ..... جلدی۔“ وہ چلایا۔ آرک

جاسوسی ڈائجسٹ



سرگزشت جولائی 2015ء کی جھلکیاں

# سرگزشت

ماہنامہ

## بلند اقبال

عظیم شاعر کا زندگی نامہ

## لباس

لباس کے ارتقا کی داستان

## سلطنت انکا

ایک ترقی یافتہ تہذیب جو دنیا سے ختم ہو گئی

## عہد بہ عہد

تاریخ عالم قبل از تاریخ



خون کی روانی تیز کر دینے والی طویل کہانی  
 ”سراب“ فلمی دنیا کی بھولی بسری ہیروئن  
 روزینہ کا احوال زیست، سفر نامہ، شکار کتھا  
 اور بھی بہت سے سچے قصے، سچے بیانیات،  
 دلچسپ واقعات

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر پرچہ مختص کرا لیں

حاسوس ڈائجسٹ 127 جولائی 2015ء

کو ایک ”مل“ کی آڑ میں چھپا رکھا ہے۔“ اول خیر پرتخیر لہجے میں بولا۔ ”مجھے سالونٹ پلانٹ دکھانی دیتا ہے۔“ اس کی یہ بات درست تھی کیونکہ عقب میں مڑ کر میں نے عمارت کی پیشانی پر ”سن ریز سالونٹ پلانٹ“ پڑھا تھا۔ کچھ گاڑیاں اور بار بردار ٹرک کھڑے تھے، ایک جانب ہلکی گڑ گڑاہٹ سی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ پاور پلانٹ تھا گویا عمارت کو بجلی پہنچانے کا الگ سے اسٹینڈ بائی بندوبست بھی کیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک جارحانہ خیال ابھرا۔ میں نے فوراً اول خیر کے ہاتھوں سے سب مشین گن جھپٹ لی اور اس کا رخ اس سینٹرل پاور پلانٹ کی طرف کر کے برسٹ کھینچ مارا، دھماکوں کی گونج سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمق سی روشنیاں ابھریں اور پوری عمارت کی بجلی چلی گئی جبکہ پاور پلانٹ روم میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔

”او خیر.....“ اول خیر کے حلق سے ہولے سے برآمد ہوا۔ میں نے دیوہیکل آہنی گیٹ کی طرف دوڑ لگاتے ہوئے چچ کر اول خیر کو پکارا۔ اس نے بھی فوراً میری تقلید کی۔

ہم چشم زدوں میں گیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے، بغلی دروازہ تلاشنے میں مجھے مطلق دیر نہ لگی۔ اسے کھول کر ہم باہر آ گئے۔ سامنے کیکر اور سرس کا جنگل سا پھیلا ہوا تھا۔ دفعتاً ہمارے عقب میں گولیوں کی بوچھاڑ ابھری۔ ٹن..... ٹن..... زٹ زٹ زٹ کی سح خراش آوازیں ہماری ٹھکی ہوئی سماعتوں سے ٹکرائی تھیں مگر ہم باہر نکل چکے تھے اور جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہم نے جو گل کھلانا تھا، وہ کھلا چکے تھے۔ ہماری مہم اگرچہ ایک طرف ناکام بھی ثابت ہوئی تھی تو دوسری طرف کامیاب بھی تھی۔ ثریا ہمیں کچھ بتانے کی حسرت لیے دنیا سے چلی گئی تھی مگر ہم نے آرک کو بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ نیز ڈاکٹر کھٹ اور کمپیوٹر ماسٹر حامد کو بھی جہنم واصل کر کے بنیادی طور پر اسپیکٹرم کو کاری ضرب لگائی تھی۔ اسپیکٹرم کے تین عہدیداروں میں سے ایک آرک، اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ چکا تھا جو لودش کا خاص الخاص آدمی کہلاتا تھا۔ وزیر جان اور چودھری ممتاز ابھی زندہ تھے۔ اسپیکٹرم کے کیا مذموم مقاصد تھے، ان میں سے کچھ ظاہر ہو چکے تھے باقی تاریکی کے پردے میں تھے۔ وزیر جان میرا اگلا ٹارگٹ تھا۔

ہم زیر و ہاؤس میں تباہی مچا کر نکل بھاگے تھے، آرک کے باقی ماندہ ساتھی ہمارے تعاقب میں آسکتے تھے یا پھر وہ زیر و ہاؤس کے پاور پلانٹ کی آتش زدگی پر قابو



نے دشمنوں کی صفوں میں کھلبلی مچا دی ہوگی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

”سڑک کے پار دوڑ چلو، کا کا۔“ دفعتاً اول خیر نے سرسراہی آواز میں کہا۔ ”ابھی ہم ان کی نظروں میں نہیں آئے ہیں۔“

میں نے اس کی بات پر صاد کیا اور یہ سرعہ میں سڑک پار کر کے دوسری جانب کے کچے میں آگئے اور پھر تیزی کے ساتھ قدرے نشیبی ڈھلان میں اترتے چلے گئے۔ یہاں بھر بھری مٹی کی سوندھی سوندھی بو خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جسے محسوس کر کے اول خیر نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ ساہیوال کا انڈسٹریل ایریا معلوم ہوتا ہے یہاں جا بجا کاشن، فلور مل اور سالونٹ پلانٹ قائم تھے۔ اسپیکٹرم نے اپنے وسیع تر مفادات کے لیے اس علاقے کو اپنا بیس کوارٹر بنایا تھا تو کچھ سوچ کر ہی بنایا تھا۔

ہم آگے بڑھتے رہے۔ مجھے امید نہ تھی کہ اتنی جلدی دشمن ہمارے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں گے۔ ورنہ تو ابھی تک انہیں اپنے زخم چاٹتے رہنا چاہیے تھا ممکن تھا۔ آرک کی موت کے بعد سیکنڈ کمانڈر ممتاز خان یا وزیر جان کے سپرد ہو چکی ہو اور انہوں نے فون پر ہدایات جاری کر دی ہوں۔ کیونکہ ظاہر ہے اب تک زیرو ہاؤس کی ہنگامی یا تباہی وغیرہ کی صورت حال اسٹیشن چیف اور کیڈا ایجنٹ تک پہنچا دی گئی ہو۔ بہر طور، میں اور اول خیر کے نہیں اور تاریکی کا حصہ بنے آگے بڑھتے رہے۔ ہائی وے کے بعد یقیناً دشمن بھٹک سکتے تھے۔ مجھے امید تھی آرک کے واصل جہنم ہو جانے کے بعد ان کے حوصلے اور امیدیں پست ہو چکی ہوں گی اور وہ محض تلاشِ غنیمت میں ایک قارمیلٹی پوری کرنے ہی نکلے ہوں۔

کافی آگے جا کر ہم نے عقب میں دیکھا بھی تھا، ہمیں کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ صاف ظاہر تھا، وہ بھٹک گئے تھے۔ میں اللہ کے حضور صد شکر گزار تھا کہ اس نے مجھے ایک منحوس اور قاتل گھڑی سے بال بال بچایا تھا۔ ورنہ تو میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اب بس اس بھیا تک گھڑی کا تصور کرتے ہوئے بے اختیار مجھے سرتاپا جھرجھری سی آ جاتی تھی کہ اگر وہ مردود آرک اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور اس سرجیکل آپریشن میں وہ مائیکرو الیکٹرانک ڈیوائس میرے جسم کے کسی حصے میں نصب کر دی جاتی تو میں بڑی مصیبت کا شکار ہو سکتا تھا۔

خود رو ہماڑیوں اور ٹیلے بوں کا سلسلہ ختم ہوا تو کسی

پانے میں مصروف کار تھے، تاہم میں اور اول خیر بغیر رکے تاریک جنگل میں دوڑتے رہے۔ جنگل مختصر ثابت ہوا تھا کیونکہ اس کے بعد ایک ہائی وے کی طرف سے روشنیاں سی متحرک نظر آنے لگی تھیں۔ ہم نے وہیں پہنچ کر دم لیا تھا اور ایک جگہ تاریکی میں ٹھہر کر اپنی بے ترتیب اور پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے۔

”اب کیا ارادے ہیں شہزی کا کے؟“ اول خیر نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ جب تک میں بھی اپنی سانسیں درست کر چکا تھا، بولا۔ ”پہلے والے نامکمل رہ جانے والے مشن کو مکمل کرنا ہے۔“

”تمہارا مطلب..... اسٹیشن فور پر چڑھائی؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہو گیا ہے اول خیر! مگر اسے دنیا سے رخصت کرنے سے پہلے..... مجھے بہت کچھ بتانا ہوگا۔ ابھی اس کی زندگی میرے لیے بہت اہم ہے۔ ورنہ اس کی بے وقت موت مجھے زندہ درگور کر ڈالے گی۔“

”او خیر..... کا کے، میں سمجھ رہا ہوں تیری بات۔“ وہ بولا۔ ”اس پر بھی ہم قابو پالیں گے، آرک جیسے شاطر گورے کو کیفر کردار تک پہنچا دیا، یہ کم بات نہیں۔ پتا نہیں یہ رذیل شیطان کیسے کیسے بھیا تک مقاصد لے کر یہاں آن وارد ہوا تھا۔ مجھے تو اس وقت تیری طرف سے تشویش ہی نے مار ڈالا تھا جب یہ خبیث گورا مجھے نہ جانے کدھر لے گیا تھا۔“

میں اس کی بات پر مسکرایا۔ پھر جب اسے اصل حقیقت کا پتا چلا تو اول خیر خوف زدہ سا ہو گیا اس کے لیے یہ سب نیا تھا جو ڈاکٹر گھٹ اور حامد میرے ساتھ آرک کے حکم پر اس منحوس آپریشن تھیمز میں کرنے والے تھے۔

ٹھیک اسی وقت ہمیں اپنے عقب میں روشنیاں دکھائی دیں۔

”او خیر..... کا کے، لگتا ہے دشمن تعاقب میں آرہا ہے۔“ میرے چہرے پر بھی تشویش کے آثار اٹھ پڑے۔ ہتھیار ابھی ہم نے پھینکے نہیں تھے۔ ہائی وے دور تک ویران اور چمکتی نظر آرہی تھی۔ شام گہری ہو کے تاریکی میں بدل چکی تھی۔

☆☆☆

دشمنوں کی ”باقیات“ ہمارے لیے اس وقت بھی کئی مشکلات گھڑی کر سکتی تھیں۔ کوئی بعید نہ تھا کہ آرک وغیرہ کی موت اور زیرو ہاؤس میں ہونے والی خون ریزی کی خبروں

جاسوس ذہان جست



خود عابدہ نے بھی فون پر بار بار مجھ سے کسی انجانے خطرات کا اظہار بھی کیا تھا۔

”اوائے کا کے، کیا بات ہے، تو بہت پریشان ہو گیا ہے؟“ مجھے خاموش اور سوچتا پا کر اول خیر نے مجھے ہولے سے ٹھوکا دیا تو میں چونک کر خیالات کے بھنورے بھکے بولا۔ ”کچھ نہیں یار..... بس اب یہاں سے نکلنے کی کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں آبادی کی طرف رخ کرنے کے بجائے دوبارہ سڑک کی طرف رخ کرنا چاہیے دشمن جا چکے ہیں۔“

اول خیر نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ہم دوبارہ پلٹے اور ہائی وے پر آ گئے، یہاں ہمیں کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا غالباً دشمن یہ تسلی کرنے نکلے ہوں گے کہ ہم دونوں زیر و ہاؤس کے گرد و جوار سے نکل چکے تھے یا ابھی مزید کہیں چھپ کر دوبارہ شب خون مارنے کو گھات لگائے بیٹھے تھے۔

”میرا ارادہ اس علاقے کی طرف روانگی کا تھا جدھر اسٹیشن فور تھا۔ وہیں ہماری کار بھی ایک آٹو مکینک گیراج میں ٹیوٹک وغیرہ کے لیے موجود تھی۔ یقیناً گیراج والا بھی حیران ہو گا کہ ہم کار چھوڑ کر اچانک کدھر غائب ہو گئے تھے۔ اب ظاہر ہے رات کافی ہو گئی تھی، گیراج بند ہی ہو گا۔ تاہم شہر پہنچ کر ہمارا ارادہ کسی چھوٹے موٹے اقامتی ہوٹل میں رات گزارنے کا تھا۔“

جلد ہی شہر کی طرف جاتی ہوئی ایک مسافر ٹائٹ کوچ مل گئی اور ہم دونوں اس میں سوار ہو گئے۔

شہر پہنچ کر ہم اترے۔ رات ایک ہوٹل میں گزاری۔ اگلے دن سویرے جا گئے اور ہوٹل چھوڑ دیا۔ سب سے پہلے ہم نے ٹیکسی کر کے مذکورہ گیراج پہنچ کر اپنی کار حاصل کی اس کے بعد دوبارہ اسٹیشن فور کی جانب روانہ ہوئے جس کی عمارت وہاں سے محض چند فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔

شب ب سری کے بعد ہم دوبارہ تازہ دم ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی تھی اور اول خیر میرے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ میں کار کو درمیانی رفتار سے دوڑاتا ہوا اسٹیشن فور کی عمارت کے قریب پہنچا تو میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہونے لگی۔ وزیر جان نے میرے گمشدہ ماں باپ کے بارے میں جو تذکرہ کیا تھا اس کے بعد میں وزیر جان کی گردن ٹاپنے کے لیے سخت بے چین تھا۔ زیر و ہاؤس سے حاصل کردہ ایک سب مشین گن اور دو لوگرز ابھی تک ہمارے قبضے میں تھے، اول خیر نے

میں آبادی کے آثار اور کچھ کھیتوں کے سلسلے دکھائی دیے۔ جدھر سے آوارہ جانوروں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہم ایک جگہ رک گئے۔

”او خیر، کا کا! بڑا کالا مارا ہے۔“ اول خیر بولا۔ اس کے لہجے سے تشویش ہو رہی تھی۔ کامیابی کا جوش بھی تھا۔ ”پر شہزی کا کا! لگتا ہے اب کچھ ایسا ہی ہے اس گورے سور..... آرک کی ہلاکت کے بعد ہم نے کچھ دلائی قسم کے دھرمے ہی لوگوں سے دشمنی سول لے لی ہے۔“

”یہ دشمنی مجھ پر زبردستی جبر کی صورت مسلط کی گئی ہے، اول خیر۔“ میں نے کہا۔

”چودھری ممتاز نے اپنے کہاں تک ہاتھ پاؤں پھیلا رکھے تھے۔ یہ تو اب ہمیں معلوم ہوا ہے۔ پر یار! پتا نہیں میرے دل کو ایک عجیب اور نامعلوم سی بے چینی اور تشویش سی محسوس ہونے لگی ہے۔“

”او خیر، کا کے! اب کیسی بے چینی..... کیوں پریشان ہوتا ہے تو؟ ٹھیک ہے جو راہ میں آئے گا اسے منہ توڑ جواب دے گا اور پھر شہزی کا کے! تیری تو اپنی پہنچ بھی بہت اونچی ہو گئی ہے۔ مگر ریاض باجوہ صاحب سے تیری اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی ہے۔ ہمیں یہ ساری کارروائی ان کے علم میں بھی لانی چاہیے اور انہیں آگاہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اسپیکٹرم والے اس کی ٹارگٹ کلنگ کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔“

اول خیر! اب بھی میری اصل تشویش کی وجہ نہیں جان سکا تھا میں درحقیقت عابدہ کی طرف سے نامعلوم سی تشویش آمیز بے چینی کا شکار تھا کیونکہ اب تک میرا جن بڑے دشمنوں سے (بشمول آرک) سامنا ہوا تھا انہوں نے مجھے اشارۃً عابدہ کی طرف سے بھی مجھے وقتاً فوقتاً دھمکا یا تھا۔ پہلے میں ان کی بکواس کو گیدڑ بھیکی سمجھتا تھا مگر اب اسپیکٹرم سے ٹکراؤ ہونے کی صورت میں مجھے کچھ لگتا تھا کہ یہ دھمکیاں ایک بڑے خطرے کی طرف اشارہ کرتی تھیں اور دشمن مجھ پر باور کراتے آرہے تھے کہ وہ عابدہ کی صورت میں ایک ترپ کا پتا ان کے ہاتھ میں تھا جو اسے کسی بھی وقت ایک ٹرمپ کارڈ کی صورت میں میرے خلاف آزما سکتے تھے، عابدہ کو امریکا بھیج کر میں اب تک مطمئن تھا کہ وہ سر دست دشمنوں کی پہنچ سے دور تھی مگر اب اسپیکٹرم اور لولووش جیسے بین الاقوامی بااثر کنیکٹرز کی شمولیت سے مجھے خود بھی اب یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ عابدہ مجھ سے سیکڑوں میل دوری پر..... ایک آن دیکھے خطرے میں تو نہیں بگھری ہوئی، جبکہ



دن کافی نکل چکا تھا۔ لوگوں کی چہل پہل دیکھنے میں آرہی تھی۔ اول خیر کو زیادہ تشویش ہمارے پاس موجود ان غیر قانونی ہتھیاروں کی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی تھی کہ ہم بہت جلد ان سے چھٹکارا پالیں گے۔

کنال لاج پر بھی بظاہر سناٹا طاری محسوس ہوا۔ البتہ چونکہ کار موجود تھا۔ دفعتاً گیٹ کھلا اور اندر سے ایک لمبی سی چمچاتی کار نمودار ہوئی، میں چونکا اور بہ غور بھویں سیٹز کر دیکھنے لگا۔ کار کے اندر فقط ایک ماڈرن ٹائپ کی خاتون براجمان تھی، اور خود ہی کار ڈرائیو کر رہی تھی، گیٹ سے نکلتے ہی اس نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور ہماری کار کے بالکل قریب سے زانے کے ساتھ گزر گئی۔ مگر میرے چونکنے سے پہلے ہی عقابی نظریں عورت کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اسی لیے مجھے اس عورت پر شناسائی کا شائبہ ابھرا تھا اور میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ میں اس عورت کو پہچان چکا تھا اگرچہ کئی ماہ و سال بیت چکے تھے۔ مگر اس عورت کو اس چہرے کو کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ بے شک گزرتے وقت کی گرد پرانے نقوش اپنی تہ میں دباضور لیتی ہے مگر کچھ ایسے نقوش واضح ضرور تھے جو کسی دوسرے کے لاشعور میں نقش ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ میری سوتیلی ماں ہی تھی اب پتا نہیں تھی بھی یا نہیں مگر بہر حال عورت یہ وہی تھی جو وزیر جان کی چہیتی بیوی کہلاتی تھی۔ اس حیرت سے قطع نظر کہ ان دونوں غریب میاں بیوی کی معاشی کایا پلٹ کسی کی رہن منت ہوگی، مجھے اعتراف کرنا پڑا تھا کہ اس بظاہر جاہل اور مرد مار عورت نے بھی خود کو نئے اور ماڈرن ماحول میں ڈھال لیا تھا۔

میں نے فوراً کار اس کی کار کے تعاقب میں لگا دی۔  
 ”او خیر..... کا کا! کیا تو اس زنانی پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔“ مجھے اس کے تعاقب میں روانہ ہوتے پا کر اول خیر نے کہا تو میں اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت اور نظریں سامنے ونڈ اسکرین پر مرکوز رکھتے ہوئے کبھیر لہجے میں بولا۔

”ہاں اول خیر، کیونکہ میں اس عورت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“

www.paksociety.com

میرے چہرے کے پرجوش تاثرات بھانپتے ہوئے مجھے ایک بات کی طرف اشارہ دیتے ہوئے اتنا ضرور کہا کہ اسٹیشن فور کی عمارت ایک ادارے کے زیر دست ہے لہذا یہاں میری ایسی کوئی دراندہ وار حرکت ہمیں قانون کی نظروں میں مجرم بنا سکتی تھی، اس پر مستزاد ہمارے پاس غیر قانونی ہتھیار بھی تھے، مجھے نہ جانے کیوں کبھی کبھی اول خیر کی ایسی باتوں سے سخت اختلاف ہوتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا۔ اسٹیشن فور کی عمارت کے قریب پہنچ کر میں نے کار روک دی۔ سب مشین گن ہم نے کار کی سیٹ کے نیچے چھپا دی جبکہ لوگر ہمارے قمیضوں کے اندر اڑے ہوئے تھے مگر اسٹیشن فور کی عمارت کے گیٹ پر بڑا سا تالا دیکھ کر میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ یہاں ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔“ اول خیر نے گویا ایک مرسکون ہمارے خارج کرتے ہوئے کہا۔

”وزیر جان کو اب تک تیری کامیاب مہم جوئی کا پتا چل چکا ہوگا اور اس بات کا اندازہ بھی اسے ہو گیا ہوگا کہ ہم کسی بھی وقت دوبارہ یہاں کارخ کر سکتے ہیں۔“

”یہ کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی.....“ میں نے دانت بھینچ کر کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہ اندر ہی ہو۔“

”اگر وہ اندر ہوگا بھی تو دوبارہ ہمارے لیے پھندا تیار کیے بیٹھا ہوگا شہزی کا کا! مگر میرا نہیں خیال کہ ان حالات میں وہ یہاں موجود ہو۔“ اول خیر نے پُرسوج لہجے میں کہا تو مجھے اس کی بات پر صاد کرنا پڑا تاہم بولا۔  
 ”لیکن یار! وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہے۔“

”میں تیری بے چینی سمجھتا ہوں کا کا، مگر ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ میرا خیال ہے پھر..... ہمیں اس کی شہر والی کوٹھی کنال لاج کارخ کرنا چاہیے۔“ اس نے کہا اور میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس کی بات درست تھی۔ اسٹیشن فور پر سناٹا طاری دیکھ کر مجھے بھی مایوسی ہوئی تھی۔ وزیر جان یا اس کے ”بڑے“ اب زیر و ہاؤس کے کریش ہونے کے بعد یقیناً کوئی اور لائحہ عمل مرتب کرنا چاہتے ہوں گے شاید اس لیے انہوں نے یہاں سے فی الحال اپنا بوریا بستر سیٹ لیا ہوگا۔

اگلے چند منٹوں میں ہماری کار فرائے بھرتی ہوئی شہر کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

شہر پہنچ کر ہم نے سیدھا کنال لاج کارخ کیا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرانے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ



وہ بہت دنوں سے زندگی کی بساط پر سرور و نشاط کی بازی کھیل رہا تھا... تمام مہرے اس کی جنبشِ نظر کے مطابق حرکت کر رہے تھے مگر اچانک اسے ایک روز محسوس ہوا... ان دغا باز ساعتوں کی کہانی... جب محبت کے رشتوں نے اپنا اعتبار کھو دیا...

بے وقائی کر کے وفا کی امید رکھنا عین حماقت ہے...

ایک دیرینہ ہمد کی یکدم اجنبی ہو جانے کی تلخ نوائی...

## رنگِ وفا

امجد نسکس



”میرا کیا قصور ہے؟ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گئی... اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ بس یہ ہو گیا۔“ کارلا نے کہا۔ وہ بستر پر اوندمی لیٹی اسے ٹنگ رہی تھی۔ کہنی پکے پر تھی اور ٹھوڑی پھٹی کے پیالے میں۔  
”میں واقعی نہیں چاہتی تھی... پتا نہیں یہ سب کیسے ہو گیا؟“

وہ سکرایا اور کارلا کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ ”تم کیوں خود کو پریشان کر رہی ہو؟ کیوں

جاسوسی ڈائجسٹ 131 جولائی 2015ء



واش روم کا دروازہ کارلا نے کھولا۔ اسی وقت عقب سے دیوچ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے والا ایلن تھا۔ کارلا کی چیخ بر وقت گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ہمیشہ کے لیے وہ خوفناک منظر اس کی یادداشت میں محفوظ ہو گیا۔

بے نور آنکھوں والی لاش ٹب کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی۔ پیشانی پر گولی کا سوراخ تھا۔ سیاہ پتلون اور قمیص گرے رنگ کی تھی۔ کارلا کا سر گھومنے لگا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب ایلن نے دروازہ بند کیا اور کب اسے گھسیٹ کر واپس بیڈ تک لایا۔ کارلا پر ہشتریائی کیفیت طاری تھی۔

ایلن بھی بدحواس تھا۔  
”پلیز... پلیز... خود پر قابو پاؤ، کوئی سن لے گا۔ خاموش رہو۔“ وہ گڑ گڑایا۔ اس نے کارلا کے دونوں بازو پکڑے ہوئے تھے۔ وہ چاروں طرف اس طرح دیکھ رہا تھا گویا راؤ فرار تلاش کر رہا ہو۔

”اوہ گاڈ۔“ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

کارلا کا بدن لرز رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔  
”اٹھو، کپڑے بدللو۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔“  
”ہاں، ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ ایلن نے اسے چھوڑ دیا۔ کارلا نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی۔ جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

”ووہ... ووہ... ووہ... آدمی...“ وہ پھر کانپنے لگی۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے۔  
”ایلن... میں... مجھے لگ رہا ہے کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔“

”سنو۔“ ایلن نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔  
”ہوش میں رہو۔ یہ ہوش میں رہنے کا وقت ہے۔ ورنہ دونوں مارے جائیں گے۔ بیٹھو ادھر۔ میں پانی لاتا ہوں۔“  
”ٹھیک ہے۔“ اس نے خالی خالی نظروں سے ایلن کو دیکھا۔ ”تل... لیکن کیا ہمیں پولیس کو نہیں بتانا چاہیے؟“  
”پولیس؟ پاگل ہو گئی ہو کیا؟“  
”ہم نے تو اسے نہیں مارا۔“ وہ بولی۔

”اوہ گاڈ۔“ ایلن نے سراٹھا کر چھت کو گھورا۔ ”بات پھیل جائے گی۔ پولیس کو کیا جواب دیں گے۔ ٹام اور لزا کو بھی خبر مل جائے گی۔ یہاں سے نکلنے کی کرو۔“ ایلن چپ

”اُداس ہو؟“  
کارلا نے آہ بھری اور ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ ”میں اُداس نہیں ہوں لیکن خوش بھی نہیں ہوں۔“  
”کم آن بے بی... تم دراصل خوف زدہ ہو اور کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے کارلا کو تسلی دی۔

”بھئی بھئی جب میں ٹام کو دیکھتی ہوں۔“ وہ بولی۔  
”تو مجھے انجانا سا ڈر لگتا ہے۔ جیسے وہ ہم دونوں کے بارے میں جان چکا ہے۔“  
”میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ اسے کیونکر پتا چل سکتا ہے؟“

کارلا کے چہرے پر سایہ سا گزر گیا۔ ”مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے۔ کیسے پتا چل سکتا ہے... میں نہیں جانتی۔“  
”ہم نے اب تک بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔“  
اس نے پھر کارلا کو دلا سا دیا۔

”ہاں، احتیاط، حماقت اور خود غرضی...“  
”جسہیں وہم ہو گیا ہے۔“

کارلا نے ہونٹ کے کمرے میں نظر دوڑائی۔ ”مجھے ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی شناسا کار میں مجھے یہاں آتے ہوئے نہ دیکھ لے۔ مجھے ڈر اُوٹنے خواب دکھائی دینے لگے ہیں... کبھی ایسا لگتا ہے کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔  
”مجھے لگتا ہے کہ اب تم سوتے میں بولنا نہ شروع کر دو۔“ وہ کارلا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے مسکرایا۔

”اوہ لارڈ! ایلن، تم مجھے اور ڈرا رہے ہو... کیا جسہیں دھڑکا نہیں لگا رہتا کہ اگر لزا کو پتا چل جائے تو؟“  
ایلن ہنس پڑا۔ اس کا سر نشی میں مل رہا تھا۔ ”لزا کو اگر پتا چل جائے تو وہ مجھے شوٹ کر دے گی۔ میں اس کے بارے میں سوچ کر پریشان نہیں ہونا چاہتا۔ یہ ایک چانس ہے، ہنی۔ میرا نظریہ ہے کہ انسان کو جگہ جگہ چائس لینا پڑتا ہے۔ زندگی بذات خود ایک چانس ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہر وقت پریشان ہوتے رہیں کہ اب کیا ہوگا۔ اس طرح ہم لٹھ موجود اور اپنی ملاقاتوں کے لطف کو بھی غارت کر بیٹھیں گے۔“ ایلن نے فلسفہ جھاڑا۔

”ہاں، شاید۔“ اس کی آواز میں غیر یقینی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”مجھے تاخیر نہ ہو جائے۔ میں شاور لے کر روانہ ہوتی ہوں۔ ڈنر بھی تیار کرنا ہے۔“ کارلا نے گھڑی دیکھی۔

”اوکے، سوئٹ ہارٹ۔“ ایلن اٹھ بیٹھا۔

☆☆☆

جاسوسی ڈائجسٹ 132 جولائی 2015ء



ہو گیا اور داش روم کے بند دروازے کو کھولنے لگا۔  
 ”بدحواسی میں سب کام بگڑ جائے گا۔“ اس نے خود  
 کلامی کی... ایک منٹ ہمیں سوچنا چاہیے۔“  
 ”بعد میں سوچیں گے۔“ کارلا نے اپنا حلیہ  
 درست کرنا شروع کیا۔ ”پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا  
 چاہیے۔“

ایلن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ ہم  
 پیچھے ایک لاش چھوڑ کر ٹپکتے ہوئے نکل جائیں۔“  
 کارلا نے تھوک نکلنے کی کوشش کی۔ ”ہم پکڑے  
 جائیں گے۔ ایلن! نیجر پولیس کو بتادے گا کہ ہم کب آئے  
 اور کب گئے۔ وہ یہ بھی بتادے گا کہ ہم یہاں آتے رہتے  
 ہیں۔ پولیس ہمارے پیچھے آئے گی۔ نام کو پتا چل جائے  
 گا... اور...“

”اپنا منہ بند رکھو۔ مجھے سوچنے دو۔ تم بولتی رہو گی تو  
 میرا ذہن کام نہیں کرے گا۔“ ایلن نے سر دونوں ہاتھوں  
 میں تھام لیا۔

”لیکن میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ میں اس  
 مرڈر کیس میں ملوث نہیں ہو سکتی۔ اگر نام...“ وہ رونے  
 لگی۔

”اور میرا کیا ہوگا؟ تم خود کو مصیبت میں خیال کر رہی  
 ہو۔ صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہو۔“ ایلن نے  
 خشک لہجے میں کہا۔

”میں کیا کروں؟ اگر گھر پہنچنے میں مجھے تاخیر ہو  
 گئی...“ وہ بمشکل بول پار ہی تھی۔

ایلن پر تفکر انداز میں خاموش رہا۔

”ایلن! ہم سے پہلے جو یہاں ٹھہرا تھا، قتل یقیناً اسی  
 نے کیا ہے۔ اگر ہم فیجر کو بتا دیں کہ ہمیں یہاں لاش ملی  
 ہے...“ کارلا نے تجویز دی۔

”ویری گڈ۔“ ایلن کی تپریوں پر بل پڑ گئے۔ ”اور  
 فیجر یقین کر لے گا۔ ظاہر ہے پولیس تک خبر پہنچے گی۔ اگر ہم  
 سے پہلے اس کمرے میں آنے والے نے جعلی نام استعمال  
 کیا ہے، پھر کیا ہوگا۔ میں نے بھی یہاں اصل نام ظاہر نہیں  
 کیا ہے۔“

”میں جاری ہوں۔ ایلن مجھے جانا پڑے گا۔“  
 کارلا کے چہرے سے دہشت فک رہی تھی۔

ایلن کے چہرے پر درخشنگی ظاہر ہوئی۔ ”موج  
 کرنے کے لیے تم میرے ساتھ تھیں۔ مصیبت میں اکیلا  
 بھگتوں گا۔ بُرے وقت میں بھی ہم دونوں ساتھ ہوں

گے۔“ وہ تڑخ اٹھا۔

کارلا کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ”لیکن... لیکن...  
 میں کیسے رک سکتی ہوں؟“ اس کی آواز میں بے بسی تھی۔  
 آنکھوں میں التجا۔  
 ”آواز دھیمی رکھو۔“

کارلا نے چاروں طرف دیکھا۔ اسے لگا جیسے وہ کسی  
 قید خانے میں بند ہے پھر اس نے ایلن کو دیکھا جو پنجرے  
 میں پھنسے جانور کی طرح کمرے میں ادھر سے ادھر گھوم رہا  
 تھا۔

”ہم اس منحوس جگہ پر پھنس گئے ہیں۔“ وہ کراہ  
 اٹھی۔

”اپنا منہ بند رکھو۔“ ایلن نے بمشکل آواز دہائی۔ وہ  
 غصے میں تھا۔ ”میرا دماغ ٹھنڈا رہے گا تو میں ہر زاویے سے  
 غور کر سکوں گا۔“

”کیا... کیا مطلب؟“  
 ایلن کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ رک کر اس نے کارلا کو  
 گھورا۔ ”سوچو... ذرا سوچو۔ فرض کرو تمہارے خدشات  
 ٹھیک تھے۔ نام کو علم تھا۔ تم یہاں کسی سے ملتی ہو۔ وہ یہاں  
 آیا اور میری جگہ کسی اجنبی کو ختم کر کے چلا گیا۔“

”نن... نہیں... نہیں۔“ کارلا نے تیزی سے سر  
 دائیں بائیں ہلایا۔

ایلن پھر کمرے کے چکر کاٹنے لگا۔ معاوہ رکا اور  
 داش روم کی جانب گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے اندر  
 جھانکا۔ دروازہ بند کر کے وہ پلٹا۔ ”یہ پاگل پن ہے۔  
 دیوانگی ہے۔ درندگی ہے۔“ اس نے ایک ہاتھ کی منجھی  
 دوسرے ہاتھ پر ماری۔

سکوت کا ایک طویل کرناک وقفہ آیا۔ ایلن نے گہرا  
 سانس لیا۔ ”ایک چانس ہے۔“

”نکل جائیں۔ اپنی اپنی گاڑی میں خاموشی سے  
 چلے جائیں۔“ کارلا جھٹ سے بول اٹھی۔

”تم کب سے اتنی احمق رہی ہو؟“ ایلن بولا۔ ”ہم  
 بارہا یہاں آچکے ہیں۔ فیجر خوب جانتا ہے۔“  
 ”لیکن اسے تمہارا اصل نام نہیں معلوم۔“

”اوہ گاڈ! میں اپنا چہرہ کہاں لے جاؤں؟“ ایلن  
 نے اپنے رخسار پر انگلی رکھی۔ ”وہ اس شکل کو پہچانتا ہے۔  
 تمہاری صورت بھی۔ وہ ہماری گاڑیوں کی بھی نشاندہی کر سکتا  
 ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس گاڑیوں کی لائسنس پلیٹ  
 کے نمبر بھی ہوں۔“



کیا یہ سب واقعی میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ اودہ... نو۔ ایلین تم تو میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ تمہیں میرا نام اس معاملے سے الگ رکھنا چاہیے... تمہیں پتا ہے میری مجبوریوں کا... وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ امید تھی۔  
فضا بوجھل ہو گئی۔

”کارلا! تم نے محبت کے بارے میں کیسے سوچ لیا؟“

”ایلین!“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کے چہرے پر غم و غصے کے ملے جلے تاثرات تھے۔

”ہم اس وقت مصیبت میں ہیں۔ ایک ساتھ۔ تم اور میں۔“ ایلین نے کہا۔

”تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی؟“

”اُف... اس وقت ہم آفت کا شکار ہیں۔ تم محبت کو لے کر بیٹھی ہو۔“

کارلا دھیمے انداز میں اٹھی۔ اس کا چہرہ رنگ بدل رہا تھا۔ غصے کی سرخی۔ اس کی آواز بلند ہو گئی۔

”میں جا رہی ہوں۔ جہنم میں جاؤ۔ جو کرنا ہے کرو۔ مجھے آئندہ کال مت کرنا۔ نہ کسی بھی طرح ملنے کی کوشش کرنا۔ میں واقعی احمق تھی۔ نہ میں کوئی گواہی دوں گی۔ چاہے تم لاش میرے گھر کے سامنے ہی پھینک دو۔“ وہ یک دم آگ بولہ ہو چکی تھی۔ کارلا پیر پٹختے ہوئے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد ایلین بند دروازے کو گھورتا رہ گیا۔ باہر کسی کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی پھر وہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔

ایلین بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ خاموشی اور احتیاط سے باہر نکلا۔ اپنی گاڑی سے ایک رین کوٹ نکالا اور ٹرنک کا لاک کھلا چھوڑ دیا۔ اطراف کا جائزہ لیتا ہوا وہ واپس آیا۔

وہ سیدھا کمرے میں واش روم کی طرف گیا۔ دروازہ کھولا۔ اس کے لبوں پر ایک کامیاب مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ایلین نے مصنوعی لاش کورین کوٹ میں لپیٹا اور بولا۔

”شکریہ، بابا جارج۔ تم اس مرتبہ بھی خوب کام آئے۔ چلو تمہیں اسٹورٹنگ پہنچا دوں۔ فی الحال کئی مہینے آرام کرو۔“

وہ پھر کانٹے لگی۔ ”میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ کبھی دوبارہ یہاں نہ آؤں۔“  
ایلین کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فیصلہ کن لہجے میں گویا ہوا۔ ”ہاں، یہی ایک راستہ ہے۔ رات کی تاریکی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس میں اگرچہ خطرہ ہے لیکن اور کوئی چارہ کار نہیں۔ اندھیرے میں، میں اس مصیبت کو گاڑی کے ٹرنک میں رکھ کر لے جاؤں گا۔ کسی مناسب جگہ پر اسے پھینک دوں گا۔“

کارلا کی جان میں جان آئی۔ ”ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک... تم یہ کر سکتے ہو۔ مجھے جانا چاہیے۔“  
ایلین نے گہری نظر سے کارلا کو دیکھا۔  
”ایسے مت دیکھو، پلیز میری مجبوری سمجھو۔“ کارلا منت سماجت پر اتر آئی۔

”ویری فنی۔“ ایلین نے کہا۔ ”یوں معلوم ہوتا ہے کہ ڈوبتے جہاز سے کودنے کی تیاری ہے۔“  
”تم کیا چاہتے ہو؟ میں ٹام کو کیسے قائل کروں گی؟“ وہ بری طرح رو ہانسی ہو گئی۔

”میں کچھ نہیں چاہتا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی کی طرف گیا۔ ونڈو بلاسٹڈ میں رخنہ کر کے باہر جھانکا۔  
”سرمایہ میں سورج جلدی غروب ہو جاتا ہے۔“ کارلا پُر امید انداز میں بولی۔

”ہاں، مجھے پتا ہے۔“ ایلین پلٹا۔  
”تم لاش کو کہاں پھینکو گے؟“ کارلا نے پھنجی آواز میں سوال کیا۔

”تمہارے گھر کے سامنے۔ وہی بہتر جگہ ہے۔“ ایلین زہر خند سے بولا۔

”اودہ پلیز، تم مجھے مجرم کیوں سمجھ رہے ہو۔ میں اپنی تاخیر کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتی جبکہ تم لڑا کو فون کر کے کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایلین نے انگلی اٹھائی۔ ”دیکھو اگر میں لاش کو ٹھکانے لگاتے وقت پکڑا گیا تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔“

”کک... کیا مطلب؟“  
”تمہیں گواہی دینی پڑے گی کہ میں بے قصور ہوں۔“ کارلا کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ وہ ایلین کی بات کا مفہوم سمجھ گئی۔

”مجھے یقین نہیں آرہا۔ کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں۔“





## تلاش

سکندر عظیم

احساسات کی لرزشوں اور اپنے دل کی جنبشوں کے ہاتھوں ہم ایسے نقصان اٹھاتے ہیں... جس کا کبھی کوئی مداوا نہیں ہوتا... وہ کٹھن کام جن کا ہمیں کوئی صلہ نہیں ملتا... وہ کبھی کبھی ضرور جگمگاتے ہیں اور اپنی عظمت کا اعلان کرتے ہیں... اور جو صعوبتیں جھیلنے ہوں... وہ ہمارے سروں پر سرفرازی کا تاج بن کے چمکیں گی... ایک ایسے ہی سلسلے کی کڑی... اس کا ہر قدم آنے والے دنوں کے لیے خوشگواہی اور انصاف کا پیام برتتا...

وقت اور حالات کے تحت جرم کا شکار ہونے والے ایک شکاری کی پتلا...

میں ایک شوقیہ سراغ رساں ہوں اور اپنی یادداشت اور چرب زبانی کی بدولت میرا کاروبار خوب چل رہا ہے اس لیے میرے لیے اس فون کال کو نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ ویسے بھی اس فون کا تعلق جرسی سے تھا جہاں سے

جاسوس ڈائجسٹ 135 جولائی 2015ء



ویسے بھی اخبار کے حالات کچھ اچھے نہ تھے اس لیے میں نے صبح وقت پر فیصلہ کر لیا۔ میرا خیال ہے کہ تم نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔“

اسے کیا بتاتا کہ مجھے ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ میں 1990ء سے اب تک کیا کرتا رہا، میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ”تم نے مجھے کیسے تلاش کیا؟“

”ایک رپورٹر کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں اور اس کے ہوتے ہوئے۔“ اس نے میز پر رکھے ہوئے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ”آج کے دور میں کسی کے بارے میں جاننا بہت آسان ہے۔“

ایجنسی کا دفتر ایک مکان میں بنایا گیا تھا۔ سامنے والے بڑے کمرے میں جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے، نصف درجن میزیں مع کمپیوٹر رکھی ہوئی تھیں۔ روزیٹی کے علاوہ وہاں صرف ایک سیاہ بالوں والا شخص بیٹھا ہوا تھا اور مسلسل فون پر باتیں کر رہا تھا۔ عقی دیاور بڑے منفرد انداز میں بھی ہوئی تھی۔ وہاں چار ضرب آٹھ کی پلاکی وڈ شیٹس لٹکی ہوئی تھیں اور ان پر قطار در قطار مکانوں کی چابیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ جن کے ساتھ سبز رنگ کے ٹیگ لگے ہوئے تھے۔

ان چابیوں کو دیکھنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ یہ ایجنسی جائیداد کی خرید و فروخت کے علاوہ کرائے کے مکانوں کی دیکھ بھال اور ان کا انتظام بھی کرتی ہے۔ گرمی کے دنوں میں ہر ہفتے یہاں کرائے داروں کا ہجوم ہوتا ہوگا۔

”میری اب بھی کبھی کبھار کیٹ ولسن سے بات ہوتی ہے۔“ روزیٹی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ کیٹ ولسن بھی رپورٹر تھی اور اسی کیس میں ملوث تھی جس کی وجہ سے مجھے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ روزیٹی میرے اور اس کے تعلقات سے بھی باخبر تھی۔

”وہ تمہارا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کرتی ہے کہ کس طرح تم نے قتل کے مجیدہ کیس حل کئے۔ وہ تمہیں شراک ہو مزیا کسی بھی بڑے سراغ رساں سے کم نہیں سمجھتی لہذا جب باس نے مجھ سے نقب زنی کی وارداتوں کا کھوج لگانے کے لیے کہا تو مجھے تمہارا ہی خیال آیا۔“

میں نے سر ہلاتے ہوئے اس کی بات غور سے سننے کی کوشش کی، وہ کہہ رہی تھی۔ ”یقین سے نہیں کہا جاسکتا لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ سلسلہ کئی ہفتوں سے چل رہا ہے۔ سب سے پہلے جون ویکوف نامی عورت نے اس کی نشاندہی کی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب اس نے ویلنٹائن ڈے پر مکان کھولا تو

میری کئی یادیں وابستہ تھیں۔ میں کسی زمانے میں جرے کے ساحل سے قریب ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہا کرتا تھا لیکن حالات نے مجھے دوبارہ خشکی کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا لہذا جب اوٹین سٹی سے فون آیا اور کال کرنے والی نے بتایا کہ وہ میری ایک پرانی ساتھی ہے تو میرے دل میں پرانی یادیں سراٹھانے لگیں۔ اس کا خیال تھا کہ صرف میں ہی یہ معاملہ کر سکتا ہوں۔

اوٹین سٹی، اٹلانٹک سٹی کے جنوب میں ایک جزیرے کے کنارے واقع ہے۔ کئی سال پہلے میں وہاں رہ چکا تھا۔ وہاں لوگوں نے ساحلوں کے لیے مکانات بنائے تھے جو سیزن کے دنوں میں پوری طرح آباد رہتے۔ جزیرے کے شمالی سرے سے اٹلانٹک سٹی کی روشنیاں واضح طور پر نظر آتی تھیں۔ شہر کے جنوبی علاقے میں چوڑی چوڑی سڑکیں تھیں۔ جن کے دونوں جانب دو منزلہ مکان بنے ہوئے تھے اور۔ ان کی بالکونیاں فرائیزی طرز کی تھیں۔

مجھے شہر کا یہی نقشہ یاد تھا لیکن جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ کئی تہدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ زیادہ تر ایک منزلہ مکانات مسمار ہو چکے تھے اور ان کی جگہ جدید طرز کی عمارتوں نے لے لی تھی۔ ان کا نقشہ و کٹور پن طرز کا تھا اور کلر اسکیم بھی مختلف تھی۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں شوخ رنگ استعمال کیے جاتے تھے لیکن اب ان میں سادگی کا پہلو نمایاں تھا۔ جس معاملے کو سلجھانے کے لیے میں یہاں آیا تھا، اس میں بھی رنگ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ جیسا کہ بعد میں مجھے ریٹاروزیٹی نے بتایا، وہ ان دنوں اسٹار ریکل اسٹیٹ ایجنسی میں کام کر رہی تھی۔ میں جب اس کے دفتر پہنچا تو اس نے ماضی کے تعلق کو دہرانا مناسب سمجھا اور کہنے لگی۔

”یقین نہیں آرہا کہ اووین کین میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ تمہیں وہ دن یاد ہے جب ہم ’بوسٹ‘ میں ایک ساتھ کام کیا کرتے تھے؟“

روزیٹی سنہرے بالوں والی ایک پُرکشش عورت تھی۔ وہ چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن دیکھنے میں کم عمر نظر آتی تھی۔ وہ مجھے بالکل یاد نہیں تھی اور جس اخبار کا اس نے نام لیا، وہاں میں بارہ سال پہلے کا پی ایڈیٹر کے طور پر کام کیا کرتا تھا۔ میں نے اپنی خفت چھپانے کے لیے اس سے کہا۔

”تم نے وہ اخبار کیوں چھوڑ دیا؟“

”ہر آدمی خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ میں بھی مرنے سے پہلے ایک نئی کار خریدنا چاہ رہی تھی۔



کے مالکان اندر سے کھڑی کی چٹنی لگانا بھول گئے اور اس طرح وہ بھوت کھڑکی کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔  
”الارم کونا کارہ بنائے بغیر؟“

”بہت سارے مکانوں میں ایسے الارم نہیں ہیں کیونکہ ہر ہفتے اجنبی لوگوں کو مکان کرائے پر دینا ہوتا ہے اس لیے ان الارم کا درست استعمال مشکل ہے۔ البتہ ہماری ایجنسی میں الارم لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے ہماری ڈپلیکیٹ چابیاں محفوظ ہیں۔“

اس وقت تک ہم ویسٹ ایونیو پہنچ چکے تھے۔ روزیٹی نے ایک خالی جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کی اور بولی۔  
”گرمیوں میں یہاں پارکنگ ملنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“  
وہ گاڑی سے باہر آتے ہوئے مزید بولی۔ ”آف سیزن میں یہاں کی تین چوتھائی آبادی کم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے بھوت کے لیے آسانی ہو جاتی ہے۔“

وہ مجھے ایک مکان میں لے گئی جو نسبتاً نیا اور بڑا تھا۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”پہلی منزل پر صرف گیراج اور اسٹور ہے اور اس کے اوپر پہلا رہائشی یونٹ بنا ہوا ہے۔“

وہ مکان ایک بڑے کمرے، کھانے کے کمرے اور کچن پر مشتمل تھا اور اس کے سامنے ایک وسیع پورج بنا ہوا تھا جہاں سے خلیج کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ مکان کے عقبی حصے میں چار بیڈروم تھے۔ پورے مکان کو قالین، پردوں اور دیگر آرامی اشیاء سے آراستہ کیا گیا تھا۔ لیکن اندر داخل ہوتے ہی میری نظریں سب سے پہلے سامنے والی سفید دیوار پر گئیں جس پر سیاہ مارکر سے لکھا ہوا تھا۔ ”۶ مئی 0515 ڈیول ہوائے کی تلاش میں“ اور اس کے نیچے ایک کراس کا نشان بنا ہوا تھا۔  
میں نے اس تحریر کو دوبارہ پڑھا اور کہا۔ ”یہ تو کوئی ذاتی اشتہار لگتا ہے؟“

”یہ ایک نیا انداز ہے۔“ روزیٹی نے جواب دیا۔  
”بجائے اس کے کہ آپ اخبارات کے ذریعے اپنا پیغام دیں۔ آپ اجنبی لوگوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کی دیواریں خراب کر رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد ہوگا۔“

گوکہ یہ پیغام بڑے کیپٹل حروف میں لکھا گیا تھا لیکن یہ ایک زنانہ تحریر معلوم ہو رہی تھی اور لگتا تھا کہ لکھنے والے کا قد بہت چھوٹا ہے کیونکہ سب سے اوپر لکھے ہوئے حروف بمشکل میرے سینے تک پہنچ رہے تھے۔  
”پولیس کیا کہتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

محسوس ہوا کہ وہاں کوئی آیا تھا۔ اسی مکان میں اس سے پہلے وہ نیو ایئر ٹائٹ مناچکے تھے اور اب ویلنٹائن منانے واپس آئے تھے۔ جیسا کہ میں جنہیں فون پر بتا چکی ہوں کہ نقب زن کوئی چیز لے کر نہیں گیا، اس لیے اسے چور نہیں کہا جاسکتا۔ ”وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور آہستہ سے بولی۔ ”وہ ایک پیغام اور صلیب ضرور چھوڑ گیا۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی۔ ”آؤ، میں جنہیں جائے واردات پر لے چلتی ہوں۔“

جس نئی کار کے لیے روزیٹی نے اپنا جرتزم کا کیریئر ترک کیا، وہ نئے ماڈل کی ہنڈا اکارڈ تھی لیکن مجھے بڑی حیرت ہوئی جب اس نے مشرق کی طرف جانے کے بجائے مغرب کی جانب گاڑی کا رخ موڑ دیا۔

”شاید تم نے بتایا تھا کہ مسز ویکوف کا مکان سینٹرل کے علاقے میں ہے۔“

”ہاں لیکن اس دیوار پر دوبارہ رنگ ہو گیا ہے جہاں نقب زن نے پیغام لکھا تھا۔ ہمارے پاس ایک کارنگر ہے جو آف سیزن میں مکانات کی دیکھ بھال کرتا ہے گوکہ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ اسے کسی گھر کے اندر جا کے بے ڈھنگی تحریر صاف کرنا پڑی۔ ہم دوسرے مکان دیکھ لیتے ہیں۔“

”اس طرح کے کتنے مکان ہیں؟“

”اب تک تین مکانوں میں نقب زنی ہو چکی ہے جن کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا ہے۔ ان میں سے دو کی شکایت گاہکوں نے کی جب وہ ویلنٹائن کے موقع پر آئے۔ اگر ویکوف اور نیویارک سے آیا ہوا جوڑا، ویک اینڈ پر نہ آتے تو ہمیں اس کی خبر بھی نہ ہوتی، ہم کرائے کے مکانوں کے نگہبان نہیں صرف ایجنٹ ہیں اور ہر گھر کو چیک نہیں کرتے سوائے اس کے کہ کوئی بڑا طوفان نہ آجائے لیکن جب ہم نے دوسری نقب زنی کے بارے میں سنا تو خالی مکانوں کو دیکھنے کے لیے ڈپلیکیٹ چابیاں استعمال کرنا شروع کر دیں۔ سب سے پہلے ہم نے اپنے دفتر سے نزدیک مکان دیکھے۔ یہ ایک طویل عمل ہے کیونکہ ہم اس جزیرے کے آدھے مالکان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکو گے۔“

”اگر ڈپلیکیٹ چابیاں تمہارے پاس ہیں تو برگر مکان میں کیسے داخل ہوا؟“

”شکر ہے کہ اس کے ہاتھ ڈپلیکیٹ چابی نہیں لگی ورنہ ہم مزید مصیبت میں پھنس جاتے۔ اس بھوت نے اندر جانے کے لیے دوسرے کھڑکی توڑی۔ میرا خیال ہے کہ مکان



”وہ زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی نوجوان کسی دوسرے نوجوان کو ڈھونڈ رہا ہے بظاہر یہی سوچا جاسکتا ہے۔“

”اس جزیرے پر اور کتنی ایجنسیاں ہیں جو کرائے پر مکانات دیتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ایسی تین ایجنسیاں اور ہیں لیکن کوئی بھی ہم سے بڑی نہیں۔ میں نے سب کوفون کر کے معلوم کیا لیکن ان کے مکانوں میں ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ ایسا لگتا ہے کہ بھوت صرف انہی مکانوں میں داخل ہو رہا ہے جن پر ہماری کمپنی کا نشان لگا ہوا ہے۔ دوسرا اہم عنصر رنگ بھی ہو سکتا ہے۔ ویکوف اور طر کے مکان اور یہ تینوں نیلے رنگ کے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں بھی کوئی راز پوشیدہ ہو؟“

اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ میری حوصلہ افزائی کر رہی ہو۔ مجھے لگا جیسے میں نے ابھی تک اسے مایوس ہی کیا ہے۔ شاید کیٹ ولسن نے ضرورت سے زیادہ میری تعریف کر دی تھی۔ میں روزیٹی کو بتانا چاہ رہا تھا کہ تمام حقائق جانے بغیر میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ سبھی اچھے سراغ رساں ایسا ہی کرتے ہیں لیکن اس کے بجائے میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے سچ کے لیے کسی اچھی جگہ کا پتا بتائے۔

میں نے اس کے بتائے ہوئے مرکز شہر کے ایک چھوٹے سے ریستوران کا انتخاب کیا۔ وہ بہت جلدی میں تھی، اسے یاد آگیا کہ کسی گاہک کو مکان دکھانا ہے۔ اس نے بمشکل تمام مجھے ان مکانوں کی فہرست اور چابیوں کا لفافہ دیا جنہیں ابھی چیک کرنا تھا۔

جس میز پر میں کھانا کھا رہا تھا، وہاں اوشین سٹی کا ایک پرانا ہفتہ وار اخبار بھی رکھا ہوا تھا۔ اس میں لوٹ مار، نقب زنی یا دیگر جرائم کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اس میں چھ عدد ذاتی اشتہارات بھی تھے لیکن کسی میں ڈیول ہوائے کا ذکر نہیں تھا۔ مجھے ایک ہفت روزہ اخبار میں اتنے کم اشتہار دیکھ کر کوئی حیرت نہ ہوئی اس کی وجہ روزیٹی مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ آف سیزن میں جزیرے کی آبادی بہت کم ہو جاتی ہے جس کا اثر دوسرے کاروبار کے ساتھ اخبارات پر بھی پڑتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس وجہ سے نقب زن کا کام آسان ہو گیا تھا۔ زیادہ تر مکان خالی پڑے ہوئے تھے اور اسے دیکھنے والے بہت کم تھے۔

یہی حال اس ریستوران کا بھی تھا جہاں اس وقت صرف ایک نوجوان لڑکی ہڈ والا سویٹر پہنے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور دوسری جانب متوجہ ہو گئی۔

جاسوسس ڈائجسٹ

مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میری عمر کا شخص اس لڑکی سے یہی توقع کر سکتا تھا۔ ویٹرس میرے لیے کافی لے کر آئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اٹھل 0515 یا ڈیول ہوائے کو جانتی ہے۔

”یہ نام تو مجھے فلم اسٹارز جیسے لگتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”یا اس طرح کے نام انٹرنیٹ چینلک میں استعمال کیے جاتے ہیں۔“

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا لیکن مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ روزیٹی جیسی عورت جو کمپیوٹر سے واقف ہے اور اس کے ذریعے مجھے تلاش کر سکتی ہے، اس نے ان ناموں میں تعلق جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ اگر یہ فلم اسٹارز کے نام ہیں تو کمپیوٹر سے پتا لگا یا جاسکتا تھا۔ شاید اس نے یہی مناسب سمجھا ہو گا کہ اس شخص کو سلجھانے کے لیے مجھ جیسے سراغ رساں کی خدمات حاصل کی جائیں۔

میں ویٹرس سے چیٹ روم کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن وہ فون سننے چلی گئی پھر میں نے سوچا کہ اس لڑکی سے پوچھ لوں جو ہڈ والا سویٹر پہنے ہوئے تھی لیکن وہ بھی جا چکی تھی۔ میں واپس اشارہ ایجنسی کی طرف آیا اور مکانات دیکھنا شروع کر دیے۔ انہی دنوں نائن الیون کا واقعہ پیش آیا تھا اور حفاظتی اقدامات بہت سخت تھے لیکن اوشین سٹی میں ایسی بات دیکھنے میں نہیں آئی۔ روزیٹی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ کوئی بھی شخص میری جانب دوسری بار دیکھنے کی زحمت نہیں کرے گا اور وہ یہی سمجھے گا کہ میں ایک ایسا گاہک ہوں جو اپنے لیے مکان تلاش کر رہا ہے اور واقعی ایسا ہی ہوں۔ میں نے اس دوران میں پانچ مکان چیک کیے اور مجھے ان میں غارت گری کی کوئی نشانی نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد میں نے ایک وقفہ لیا اور ساحل کی طرف چل دیا۔

میں نے ساحل کی ٹھنڈی ریت پر چھل قدمی شروع کر دی اور اس کیس میں اب تک جو بھی معلومات ملی تھیں، ان کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک عورت تھی اور اس سے ذرا پیچھے ایک چھوٹے قد کی لڑکی ہڈ والا سویٹر پہنے چل رہی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے میں نے ریستوران میں دیکھا تھا گوکہ ہم وہاں سے پچاس بلاک کے فاصلے پر تھے۔ میں نے اس تک پہنچنے کے لیے اپنی رفتار تیز کر دی پھر سوچا کہ اس سے کیا کہوں گا گوکہ ایسی کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں اس سے بات نہ کروں لیکن میں خود نقب زن کے بارے میں کیا جانتا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ کوئی لڑکی ہے اور میری ہی طرح کسی ایسے شخص کی تلاش میں



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



سال کی لڑکی بعد میں چالیس سال کی عورت نکلی۔  
 ”لیکن کوئی کس طرح ایک لڑکی کو حاصل کر سکتا ہے جو  
 کسی دوسری ریاست یا ملک میں رہتی ہو؟“  
 ”میرا خیال ہے کہ تم کرنا لو جی کے طالب علم رہے  
 ہو۔ کیا اخبار نہیں پڑھتے یا تمہارے پاس ٹیلی فون نہیں  
 ہے۔“

”میرے پاس بلیک اینڈ وائٹ ڈی وی ہے۔“ میں  
 نے معصومیت سے کہا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ کوئی سخت  
 بات کہے گی لیکن اس نے بڑی نرمی سے کہا۔  
 ”لوگ بہلا پھسلا کر لڑکیوں کو پارٹیوں میں لے  
 جاتے ہیں اور انہیں نشہ آور مشروب پلا کر ان کے ساتھ  
 زیادتی کرتے ہیں اور پھر وہ لڑکی ان کی تلاش میں ماری  
 ماری پھرتی رہتی ہے۔“

امینڈا کی باتوں نے مجھے ایک راستہ دکھا دیا تھا۔ میں  
 نے اس کا شکریہ ادا کر کے فون بند کیا اور دوبارہ اوشین سٹی کی  
 جانب چل دیا۔ میں نے گاڑی ایک جگہ پارک کی اور  
 اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں نقشہ دیکھنے لگا جو روزیٹی نے مجھے  
 دیا تھا۔ میں نے اس نقشے کا فہرست سے موازنہ کیا تو معلوم  
 ہوا کہ دو مکان ایجنسی سے بہت قریب ہیں۔ ان میں سے  
 ایک ایس بری اور دوسرا سینٹرل پر تھا۔ میں نے نگرانی کے  
 لیے ایس بری کو منتخب کیا۔ اس مکان کا رنگ بھی نیلا تھا اور یہ  
 اس مکان سے مشابہت رکھتا تھا جو روزیٹی نے مجھے پہلے  
 دکھایا تھا۔ اس میں گراؤنڈ فلور کے اوپر دو رہائشی یونٹ  
 تھے۔ اب مجھے وہیں رک کر انتظار کرنا تھا۔ اس طرح دو  
 گھنٹے گزر گئے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی اور سڑک کا جائزہ  
 لینے لگا۔ مجھے سامنے والی سڑکیوں پر کچھ نقل و حرکت نظر  
 آئی۔ یہ کسی چیز کا سایہ بھی ہو سکتا تھا یا پھر کوئی سڑکیوں کی  
 رینگ پر پھسل رہا تھا۔

میں نے کار کے ڈیش بورڈ سے تاریخ نکالی اور  
 سڑکیاں چڑھنے لگا۔ ایک جگہ رک کر میں نے توقف کیا پھر  
 شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے دو سڑکیاں چڑھ کر تاریخ  
 روشن کی لیکن فرامیسی دروازوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں  
 نے بہ آواز بلند کہا۔ ”میں مکان تلاش کرنے میں تمہاری مدد  
 کروں گا اگر تم اپنے آنے کی وجہ بتا دو میرے پاس چابیاں  
 ہیں اس لیے تمہیں مزید کچھ توڑنے کی ضرورت نہیں پڑے  
 گی۔“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے اپنی دائیں جانب  
 ایک چڑچاہٹ کی آواز سنی۔ میں نے مزید دو سڑکیاں

ہے جس کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتی۔ مثلاً اس کا  
 اصل نام، ورنہ وہ اس کے لیے فرضی نام کیوں استعمال کرتی  
 اور نہ ہی اسے مطلوبہ شخص کا پتا معلوم تھا۔ البتہ وہ اس کے  
 مکان کے بارے میں غیر واضح باتیں جانتی تھی۔ مثلاً اس کا  
 رنگ اور اس پر لگا ہوا ایجنسی کا نشان جس سے ظاہر ہوتا تھا  
 کہ یہ مکان کرائے کے لیے دستیاب ہے۔

روزیٹی نے مجھے نئے سال کے موقع پر ہونے والی  
 پارٹی کے بارے میں بتایا تھا۔ اس وقت تک ویکوف کے  
 مکان میں نقب زنی نہیں ہوئی تھی اور یہ واقعہ اس کے کچھ  
 عرصے بعد پیش آیا اس لیے یہ ممکن تھا کہ آنکھل بھی اس پارٹی  
 میں شریک ہوئی ہو اور اسے وہاں گزارے ہوئے لمحات یاد  
 آرہے ہوں اور اب وہ اس شخص سے تجدید تعلق کے لیے  
 بے چین ہو۔ اس کے علاوہ مجھے ایک بات اور پریشان  
 کر رہی تھی اگر نقب زن کو صرف پیغام ہی چھوڑنا تھا تو اس  
 کے لیے اسے گھر میں داخل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ  
 مکان کی بیرونی دیوار پر بھی پیغام لکھ سکتا تھا اس طرح وہ  
 اپنے آپ کو بڑی مشکل سے بچا سکتا تھا اور اس کا پیغام بھی  
 زیادہ موثر انداز میں مطلوبہ شخص تک پہنچ جاتا۔

روزیٹی نے مجھے اپنی قیام گاہ پر سونے کی پیشکش کی  
 لیکن میں نے ایک موٹیل میں ٹھہرنا پسند کیا کیونکہ میں کسی کا  
 احسان لینا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہاں سے میں نے کالج  
 اسٹوڈنٹ امینڈا اوکین کو فون کیا۔ میں نے اپنا تعارف  
 کرواتے ہوئے کہا۔ ”تم سے لائبریری میں ملاقات ہوئی  
 تھی۔“

”ہاں، کہو کیا بات ہے؟“ وہ چلاتے ہوئے بولی۔  
 عقب سے موسیقی کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں نے اسے بتایا کہ انٹرنیٹ چیٹ روم کے بارے  
 میں کچھ جاننا چاہ رہا ہوں۔

”کیا تم کسی سے ملنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ اس نے  
 کہا۔

”کیا وہاں لوگ اسی لیے جاتے ہیں۔ کسی سے ملنے  
 کے لیے؟“

”اس کے لیے وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ تم کہیں  
 بھی کسی سے مل سکتے ہو۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ انٹرنیٹ کے ذریعے ملاقات  
 محفوظ ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس میں ایک قباحیت ہے۔“ وہ بولی۔ ”لوگ اپنے  
 آپ کو کچھ بھی ظاہر کر سکتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ پھر وہ



چند کرنارچ کی روشنی اس طرف پھینکی۔ مجھے سیاہ لباس میں ایک سایہ پورچ کی طرف جاتا نظر آیا۔ میں نے اس جانب دوڑ لگائی تو سامنے کی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا نظر آیا۔ میں نے پورچ کی رینگ پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن لمبے کوٹ کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی اور میں زمین پر گر گیا۔ وہاں لیٹے لیٹے میں نے مکان کے عقبی حصے میں کسی کے قدموں کی آواز سنی پھر ایک پولیس کار کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ میں مکان کی عقبی گلی میں پہنچا۔ اسی وقت پولیس کی گاڑی اگلے چوک سے گزری۔ میں جنوب کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک وہ شخص وہاں سے جا چکا تھا۔ میں نے گلی کے دونوں طرف مکانوں کے درمیان اسے تلاش کیا لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ اسی تلاش کے دوران ایک ایسبولینس اور پولیس کی گاڑی وہاں پہنچی۔ ان کو دیکھ کر کچھ لوگ بھی جمع ہو گئے۔ ایک عورت مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”ایک نوجوان لڑکی پر حملہ ہوا ہے۔“

اس نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا جس پر نیلا رنگ تھا۔ میں نے اس مکان کو پہچان لیا۔ کیونکہ میں اسی کی نگرانی کر رہا تھا لیکن غلطی سے میں سینٹرل پر مکان نمبر ستاون پر پہنچ گیا۔

اگلی صبح میں ایک میٹنگ میں شریک تھا جو اوشین سٹی پولیس اسٹیشن میں ہوئی۔ ریٹارو زینٹی بھی وہاں موجود تھی اور اس طرح علی الصباح بلائے جانے پر خوش نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے یہ جان کر بھی زیادہ خوشی نہیں ہوئی جب میں نے اسے بتایا کہ اس کی ایجنسی کو ایک اور مکان میں کھڑکی کا شیشہ لگانا پڑے گا اور کسی کو اس کا الزام نہیں دیا جاسکتا۔

اس میٹنگ میں پولیس چیف ڈائن ڈائیکوس اور مشت پر مامور سپاہی جان ڈائیکوس نے بھی شرکت کی۔ وہ بہت کم عمر تھا لیکن اپنی حرکتوں سے ایک ذمے دار پولیس افسر ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب ہم سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو اس نے اپنا چشمہ صاف کیا اور بولا۔ ”مس روزیٹی! ہم نے تمہیں اس لیے یہاں بلا پایا ہے کیونکہ تمہارے دوست مسٹر کین نے ہمیں کچھ باتیں بتائی ہیں۔ پہلے تو مسٹر کین! میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟“

”میں کرمتالوئی کا طالب علم ہوں۔“ میں نے امینڈا کے کہے ہوئے الفاظ دہرا دیے۔

ڈائیکوس نے زوردار قہقہہ لگایا اور روزیٹی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر کین کا اصرار ہے کہ گزشتہ شب ہونے والے حملے کا تعلق کسی نہ کسی طرح ان واقعات سے جاسوسی ڈائجسٹ

ہے جن کی رپورٹ تم پہلے درج کروا چکی ہو۔ جو کچھ اس نے جان اور پھر جان نے مجھے بتایا، اگر وہ سچ ہے تو میں تم سمیت سب لوگوں سے معافی چاہتا ہوں کہ ہم نے نقب زنی کی ان وارداتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ شاید مسٹر کین نے تمہیں گزشتہ رات کے واقعے کے بارے میں بتا دیا ہو لیکن میں ریکارڈ پر لانے کے لیے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ لیزا..... اپنے والدین کے گھر میں داخل ہو رہی تھی کہ کسی نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ اسی وقت اس کا بوائے فرینڈ سامان کے تھیلے پکڑے ہوئے آگیا۔ حملہ آور نے اسے دھکا دے کر زمین پر گرایا اور فرار ہو گیا لیکن لڑکی کے بوائے فرینڈ قلعہ کاسترو نے پورچ لائٹ کی روشنی میں اس کی جھلک دیکھ لی۔“

”لیزا اب کیسی ہے؟“ روزیٹی نے پوچھا۔

”اب وہ بہتر ہے۔ اس کے والدین فیو یارک سے

روانہ ہو چکے ہیں اور تھوڑی دیر میں یہاں آنے والے ہیں۔ انہیں لیزا اور کاسترو کے تعلقات کا علم نہیں۔ میں ساری تفصیلات جمع کر رہا ہوں تاکہ ان کے چہنچے پر انہیں بتا سکوں۔ مسٹر کین! تمہارا کہنا ہے کہ گزشتہ شب کا واقعہ بھی نقب زنی کی وارداتوں کا حصہ ہے لیکن میرے حساب سے یہ اس زمرے میں نہیں آتا۔ ہمیں کسی شخص کے اندر داخل ہونے کے آثار نظر نہیں آئے اور نہ ہی ہم نے دیوار پر کوئی تحریر دیکھی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ لیزا نے وہاں پہنچ کر پیغام لکھنے والی 0515 کے کام میں مداخلت کی۔“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ میرا خیال ہے کہ حملہ آور لیزا کو 0515 میں سمجھ بیٹھا۔“

وہ سب حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگے۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے سب سے پہلے پس منظر بیان کیا اور انہیں بتایا۔ ”میرے نظریے کے مطابق وہ پیغام جنسی، زیادتی کا نشانہ بننے والی لڑکی کی جانب سے تھا۔ اس لڑکی کو انٹرنیٹ کے ذریعے ورغلا کر اوشین سٹی بلایا گیا اور نشہ آور مشروب پلا کر اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی گئی۔ وہ اب جریرے پر واپس آگئی ہے اور اس مکان کو تلاش کر رہی ہے جہاں اس کی عصمت دری کی گئی تھی۔ اس کی تلاش کی بنیاد چند مبہم باتوں پر ہے۔ اس کے یہ پیغامات حملہ آور کے لیے ایک انتہاء کی حیثیت رکھتے ہیں یا پھر اس نے اپنے آپ سے کوئی مہد کر رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ حملہ آور گزشتہ شب اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا کہ لیزا وہاں پہنچ گئی۔ اس نے اندر داخل ہونے کے لیے کھڑکی نہیں توڑی لیکن 0515 میں بھی ایسا نہیں کرتی تھی بلکہ اس نے ایک دفعہ تالا



تلاش

آدی وہاں موجود تھے۔“

میں نے اگلا سوال جان سے کیا۔ ”گزشتہ روز جب میں وہاں بے ڈھنگے انداز سے چل رہا تھا تو تم نے کاسترو سے مجھے شناخت کرنے کے لیے نہیں کہا۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں حملہ آور نہیں ہوں؟“

گشت کرنے والے سپاہی نے میری توقع کے مطابق جواب دیا۔ ”تم اس حلیے پر پورے نہیں اترتے تھے۔ کاسترو نے بتایا تھا کہ وہ سیاہ بالوں والا سفید قام شخص ہے جبکہ تمہارے بال سرمئی ہیں۔“

ڈائیکوس نے ریٹا سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے دفتر میں کوئی سیاہ بالوں والا شخص ہے؟“

”ہاں، ایک ہے۔ اودن جب تم کل آئے تھے تو وہ دفتر میں موجود تھا۔ اس کا نام مارک ریڈنگ ہے۔“

جان نے پیشکش کی کہ وہ ابھی جا کر ریڈنگ کو پکڑ لیتا ہے لیکن ڈائیکوس نے جلد بازی مناسب نہ سمجھی۔ ریٹا سے بتا چکی تھی کہ اسٹار ایجنسی کا دفتر ایک گھنٹے بعد مکمل جائے گا اور ریڈنگ معمول کے مطابق کام پر آئے گا لہذا اس نے جان سے کہا کہ پہلے وہ موقع کے چشم دید گواہ قلب کاسترو کو بلا کر لائے۔

جان نے خدشہ ظاہر کیا۔ ”ریڈنگ غائب ہو سکتا ہے۔“

”اگر اسے بھاگنا ہوتا تو اب تک کہیں جا چکا ہوتا۔“

ڈائیکوس نے جواب دیا۔ ”اگر وہ بھاگ بھی گیا تو ہم اسے تلاش کر لیں گے۔“

ہم ایجنسی کا دفتر کھلنے سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔

ڈائیکوس، روزیٹی، کاسترو اور میں اندر داخل ہوئے جبکہ جان باہر کھڑا رہا۔ ”اطمینان رکھو۔“ ڈائیکوس نے روزیٹی سے کہا۔ ”ہم تمہارے آدی کو پریشان نہیں کریں گے۔ اس پر ہمیں ظاہر کیا جائے گا کہ ہم یہاں نقب زنی کی وارداتوں کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔“

”تمہیں یہی کہنا چاہیے۔“ روزیٹی نے کہا۔

اس کے بعد ڈائیکوس نے کاسترو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اسے دیکھ کر صرف ہاں یا نہ میں جواب دو گے۔ اگر وہ ہمارا مطلوبہ شخص نہ ہو تو ہم تمہیں واپس لیزا کے پاس بھیج دیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد ہی ریڈنگ بھی آگیا۔ اس نے روزیٹی کو دیکھ کر کہا۔ ”تم جلدی کیسے آگئیں؟“

”ہاں، ایک گاڑی آئے والا ہے۔“ روزیٹی نے جواب دیا۔

ہم نے کاسترو کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلاتے

بھی کھول لیا تھا جس کا علم شاید ڈیول ہوائے کو بھی تھا۔“

ڈائیکوس بولا۔ ”یہ خیال اسے کیسے آیا کہ گزشتہ شب نقب زن اسی مکان کو منتخب کرے گا؟“

اس سوال کا جواب بہت آسان تھا۔ میں نے اسے ایک منٹ دیا تا کہ وہ خود اپنے طور پر سوچ سکے لیکن اس سے پہلے جان بیچ میں کود پڑا۔ ”یہ یقیناً وہی مکان ہوگا جہاں اس نے لڑکی کے ساتھ زیادتی کی ہوگی اور وہ امید کر رہا تھا کہ لڑکی کو جلد یا بدیر وہ مکان یاد آ جائے گا۔“

”یا پھر اسے موقع مل گیا۔“ میں نے کہا۔ ”شاید وہ ہر رات وہاں اس لڑکی کا انتظار کرتا تھا جب سے نقب زنی کے واقعات شروع ہوئے تھے۔“

”لیکن وہ مکان میں کیسے داخل ہوا؟“ ڈائیکوس نے پوچھا۔ ”وہ اس رات اس مکان میں کیسے آیا تھا جب اس نے مبینہ طور پر اسٹار ایجنسی کے ساتھ جنسی زیادتی کی تھی؟“

میں نے روزیٹی کی طرف دیکھا۔ ڈائیکوس اور جان کی نظریں بھی اس کی جانب اٹھ گئیں۔ روزیٹی حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا بات ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ اس نے تمہاری چابیاں استعمال کیں۔ گزشتہ شب سے پہلے یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ ڈیول ہوائے کا یہاں اپنا مکان ہوگا اور اسٹار ایجنسی کے اسے اور اس کے مکان کو تلاش کر رہی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس نے عارضی طور پر یہ مکان لیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آف سیزن میں یہ خالی ہوگا۔“

”ہماری چابیاں کوئی نہیں حاصل کر سکتا اودن! میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ہمارے دفتر میں ایک الارم لگا ہوا ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”اس نقب زنی کے بارے میں کس کس کو معلوم تھا؟“

”ویکوف، ملر اور پولیس کے سوا کسی کو بھی نہیں۔ ہم نے اس کی پبلسٹی نہیں ہونے دی۔“

”ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”اسٹار ایجنسی۔“ روزیٹی نے فخریہ انداز میں کہا۔

”ہم جانتے ہیں کہ ڈیول ہوائے کو اس نقب زنی کا پہلے سے علم ہوگا ورنہ وہ گزشتہ شب وہاں انتظار نہ کر رہا ہوتا۔ اس نے ایجنسی کے لوگوں سے ہی سنا ہوگا یا پھر وہ پولیس کا کوئی آدی ہے۔“

”وہ ہمارا کوئی آدی نہیں ہو سکتا۔“ ڈائیکوس جلدی سے بولا۔ ”میں نے گزشتہ شب اپنے سب آدمیوں کو یہ معاملہ وینڈل کرنے کے لیے بلایا تھا اور ہمارے چھ کے چھ

حساسو سے ڈائجسٹ

141 جولائی 2015ء

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



ہوئے کہا۔ ”نہیں۔“

ڈائیکوس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے روزیٹی کا کھڑیہ ادا کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی اور ایک دبلا پتلا لمبا شخص ہاتھوں میں اوزاروں کا بیگ لیے اندر داخل ہوا۔ سردی کے باوجود اس نے کوئی کوٹ یا جیکٹ نہیں پہن رکھی تھی۔ البتہ اس کے جسم پر ڈانگری نظر آرہی تھی۔ سر پر ٹوپی تھی جس میں سے سیاہ بال جھلک رہے تھے۔

وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ”کسی نے مجھے فون پر ایک اور کھڑکی ٹوٹنے کی اطلاع دی ہے۔“

”میں نے تمہیں فون کیا تھا۔“ روزیٹی نے کہا پھر ڈائیکوس کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”جب ہم یہاں آ رہے تھے۔۔۔“

ابھی اس کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ کاسٹرو اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ ”یہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہی وہ شخص ہے۔“

ایک لمحے کے لیے ہم سب اپنی جگہوں پر ساکت ہو گئے اور یہ سکوت اس وقت ٹوٹا جب اوزاروں کا تھملا فرش پر گرا۔ دوسرے ہی لمحے وہ شخص دروازے سے باہر نکل گیا۔ ڈائیکوس اس کے پیچھے گیا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا۔ وہ شخص ایک سرخ رنگ کی پک اپ میں بیٹھ کر مغرب کی جانب جا رہا تھا۔ ایک سیکنڈ بعد جان بھی اپنی پولیس کار میں اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

میں واپس دفتر نہیں گیا، جانتا تھا کہ روزیٹی کیا وضاحت پیش کرے گی۔ وہ یہی کہے گی کہ اس کارنگر کی چابیوں تک رسائی تھی تاکہ وہ دفتری اوقات کے بعد بھی متاثرہ مکانات میں جا کر کام کر سکے اور اس نے اسی سہولت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ مجھے اس سلسلے میں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ حملہ آور کی نشاندہی ہو چکی تھی اور اب پولیس خود ہی اس سے سب کچھ معلوم کر لے گی۔

اس وقت میری توجہ کا مرکز وہی لڑکی تھی جس نے ہڈ والا سویٹر پہن رکھا تھا۔ وہ اس وقت سینٹرل ایونیو پر کھڑی تھی جہاں سے وہ یہ تعاقب نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس نے پولیس کار کو ڈپول بوائے کے پیچھے جاتے ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ وہاں کیسے پہنچی، اس بارے میں اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں جو کچھ میں نے سوچا، وہ اندازوں پر ہی مبنی تھا۔ پہلے میرا اندازہ تھا لیکن اب یقین ہو گیا کہ وہی ۶ محل 0515 ہے اور پولیس سائرن کی آواز

سن کر اسے بھی اطمینان ہو گیا ہوگا کہ اس کی تلاش ختم ہوئی۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ ڈائیکوس اس سے بات کرنا چاہے گا۔ میں نے اس کی جانب ایک قدم بڑھایا تو وہ مخالف سمت میں دو قدم آگے بڑھ گئی۔ میں رک گیا تو وہ بھی رک گئی۔ گزشتہ شب اس کا پیچھا کرنے میں میری ہنڈلی میں جو چوٹ آئی تھی، اس میں اب بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو پولیس خود ہی اسے تلاش کر لے گی۔ وہ میرے مقابلے میں زیادہ بہتر پوزیشن میں تھے۔ لہذا میں نے صرف اسے ہاتھ ہلانے پر اکتفا کیا اور مسکرا دیا گوکہ وہ مجھ سے ایک بلاک کے فاصلے پر تھی۔ جواب میں اس نے بھی سویٹر کی جیب سے ہاتھ باہر نکالا اور ہوا میں لہرا دیا۔ اس کے بعد وہ اچانک مڑی اور ساحل کی طرف چل دی۔

ایک ہفتے بعد میں اپنے گھر میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے ریٹاروزیٹی بول رہی تھی۔ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”اوون! تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ پولیس نے بالآخر ۶ محل کا پتہ لگا لیا۔ وہ برشل کی رہنے والی پندرہ سالہ لڑکی تھی۔ اس نے خودکشی کر لی۔“

”کب؟“ میرا سانس سینے میں اٹک کر رہ گیا۔ ”تین ہفتے قبل۔ اس وقت تک نقب زنی کی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی اور تم جانتے ہو کہ دیواروں پر جو کراس بنایا گیا تھا، وہ بالکل ویسا ہی تھا جو وہ پہنتی تھی۔ اسے اسی کراس کے ساتھ دفن کیا گیا۔ میں ہمیشہ اسے بھوت کہتی رہی لیکن اس سے میری مراد یہی تھی کہ وہ شخص جسے کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔“

”بھوت کھڑکیاں نہیں توڑا کرتے۔“ میں نے کہا۔ ”۶ محل کی کوئی بہن یا سہیلی جانتی ہوگی کہ اس پر کیا گزری یا ۶ محل نے اسے بتایا ہوگا چنانچہ وہ اس کا انتقام لینے کے لیے ایسا کر رہی تھی اور اس کا مقصد صرف اس شخص کو دہشت زدہ کرنا تھا جس نے ۶ محل کی زندگی برباد کی اور وہ اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہ رہی تھی۔“

”شاید ایسا ہی ہو۔“ روزیٹی نے جواب دیا۔ میں نے کمرے کی لائٹ بند کر دی اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ اس امید پر کہ ہڈ والی لڑکی نظر آجائے اور میں اسے دیکھ کر دوبارہ ہاتھ ہلا سکوں لیکن تاریک سڑک بالکل خالی تھی۔



جاگیرداری نظام کی دیمک جو معاشرے کو ہر طرح سے کھوکھلا بنا رہی ہے

ہر شخص اچھے خواب دیکھتا ہے... لیکن اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے وہ اپنے ضمیر کو گروی نہیں رکھتا... کٹھن سے کٹھن حالات میں اس کا ضمیر زندہ رہتا ہے... نیکی و بدی... لالچ و ہوس کی دلدل میں دھنسیے کرداروں کی ایسی ہی کشمکش...

اس نوجوان کا المیہ جو ایک خاموش دیوار کی طرح ساکت تھا...

## ضمیر

جمال دستی

”اڑے فیضو...“ سکندر شاہ نے مجھ سے کہا۔  
 ”بابا آج رات کام ہے۔“  
 ”حاضر سائیں۔“ میں نے دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم تھا وہ اب کیا کہے گا۔  
 اسے معلوم تھا کہ میری رات کی ڈیوٹی ہے اور اب وہ اس کا فائدہ اٹھائے گا۔ میں اس کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ ایک تو وہ میرا افسر تھا۔ اسی نے مجھے اس نوکری پر لگوا یا تھا۔ مگر میری اصل مجبوری یہ تھی کہ وہ میرے گاؤں کے وڈیرے مقدر شاہ





کا پتہ تھا۔ اس کی بات نہ ماننے کا غیازہ صرف مجھے نہیں میرے پورے خاندان کو بھگتنا پڑ سکتا تھا اس لیے اسے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سکندر شاہ تقریباً بیس سال کا صاف رنگ کا نمند شخص تھا۔ اگرچہ وہ دیکھنے میں خوب صورت لگتا تھا مگر ساتھ ہی اس کے نقوش میں ایک قسم کا مکروہ پن تھا۔ شاید یہ صرف مجھے محسوس ہوتا تھا کیونکہ میں اس کے کردار سے اچھی طرح واقف تھا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو گاؤں میں سکندر شاہ کی بدکرداری کے قصے عام ہو چکے تھے حالانکہ وہ اس وقت اٹھارہ سال کا بھی نہیں تھا۔ مگر بچپن سے عیاشی میں زندگی گزارنے والے سکندر شاہ کی بڑھوتری خاصی تیز تھی اور وہ سترہ سال کی عمر میں پورا مرد لگنے لگا تھا۔ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں اس سے محفوظ نہیں تھیں۔ کتنوں کو اس نے محبت کا جھانسہ دے کر برباد کیا تھا۔ مقدر شاہ بھی وڈیرا ذہیت کا آدمی تھا مکروہ بدکردار نہیں تھا اور اس کے دو بڑے بیٹے بھی بس شادیوں اور پیشہ ور عورتوں سے دل بہلانے کے لیے بدنام تھے۔ مگر سکندر شاہ نے تو حد ہی کر دی تھی۔ وہ صرف پندرہ سال کا تھا جب اس نے حویلی میں کام کرنے والی ایک عورت پر ہاتھ ڈالا اور بے آبرو ہونے کے بعد اس عورت نے خودکشی کر لی تھی۔ مقدر شاہ نے یہ کیس کسی نہ کسی طرح دبا دیا اور سکندر شاہ کو پڑھنے کے بہانے اس کے چچا کے پاس شہر بھیج دیا۔

مگر شہر میں بھی اس نے وہ گل کھلائے کہ دو سال بعد ہی اس کے چچا نے اسے واپس بھیج دیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ سائنڈ ہو کر واپس آیا تھا۔ یہاں بھی اس نے مارا ماری جاری رکھی اور بالآخر اس کے باپ کے ممبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ لوگوں کی اسے کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ غلام ذہیت کے مارے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ وڈیرا خاندان کچھ بھی کرتا وہ اسے اپنا مقدر سمجھ کر خاموش رہتے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ مقدر شاہ کا حلقہ انتخاب ایک بڑے قصبے میں لگتا تھا اور وہاں رہنے والے اس کے غلام نہیں تھے۔ مقدر شاہ کے سیاسی حریفوں نے سکندر شاہ کے کرتوت استعمال کر کے پچھلے الیکشن میں کامیابی حاصل کی تھی۔ مقدر شاہ کو اپنی یہ ناکامی دل پر لگی تھی اور اس نے سکندر شاہ کو صوبے کے سب سے بڑے شہر بھیج دیا کہ وہاں پڑھے یا جو چاہے کرے لیکن اب گاؤں کا رخ نہ کرے۔ مقدر شاہ نے اسے ایک یونیورسٹی میں داخل کرادیا اور وہ ہاسٹل میں رہتا تھا۔

مقدر شاہ کی شہر میں اپنی کوٹھی بھی تھی مگر اسے معلوم تھا

کہ سکندر ہاسٹل میں ذرا قابو میں رہے گا، اگر اسے کوٹھی میں چھوڑ دیا تو اسے بھی عیاشی کا اڈا بنادے گا۔ جس علاقے میں مقدر شاہ کی کوٹھی تھی وہاں لوگوں میں اس کی عزت تھی، اگر سکندر وہاں رہتا تو یہ عزت خاک میں مل جاتی۔ دوسرے اسے امید تھی کہ ہاسٹل میں رہے گا تو کسی نہ کسی طرح پڑھ جائے گا۔ سکندر شاہ نے ایک کالج سے کسی نہ کسی طرح بی کام کر لیا تھا اور اب وہ ایم بی اے کر رہا تھا۔ کالج وہ ایک دن نہیں گیا تھا اور نہ ہی اس نے کتابوں کو ہاتھ لگا کر دیکھا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ اس کی جگہ پرچے بھی کسی اور نے دیے تھے اور ڈگری اسے ملی تھی۔ مگر یہاں اسے یہ سہولت نہیں تھی۔ اس لیے وہ کسی نہ کسی طرح کام چلاتا رہا اور چھ کے بجائے نو سمسٹر میں اس نے ایم بی اے کر لیا اور کوشش کر کے ڈویژن بھی اچھی حاصل کر لی تھی۔

اس دوران میں اس کی شادی ہو چکی تھی اور یہ بیوی خاندان سے تھی جس سے سکندر شاہ کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شادی کے بعد مقدر شاہ نے چاہا کہ وہ بیوی کو لے جا کر شہر والی کوٹھی میں رکھے مگر سکندر شاہ نے خود کوٹھی میں رہائش اختیار کر لی اور بیوی کو حویلی میں ہی رکھا تھا۔ اسے مصروف رکھنے کے لیے مقدر شاہ نے اپنے تعلقات استعمال کیے اور اسے بندرگاہ پر ملازمت دلوا دی۔ اگرچہ اسے ڈھنگ سے ایک سطر بھی لکھنی نہیں آتی تھی مگر اسے اچھے گریڈ میں افسر کی نوکری ملی تھی۔ نوکری بھی شاہانہ قسم کی تھی۔ وہ صبح گیارہ بارہ بجے دفتر جاتا اور ایک دو گھنٹے بیٹھ کر لکھنے کے بہانے نکل جاتا۔ اس کے بعد مرضی ہوتی تو چلا جاتا اور نہ گھر چلا جاتا۔ اس کے ماتحت اس کی ساری ذمے داریاں پوری کرتے تھے اور اگر کسی وجہ سے اس کا دفتر میں ہونا ضروری ہوتا تو اسے پہلے ہی خبردار کر دیتے تھے۔ اس کے بدلے سکندر شاہ نے انہیں کھانے پینے کی کھل آزادی دی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی اس سیٹ سے دونوں ہاتھوں سے کمار ہا تھا۔

میرا تعلق ایک غریب ہاری گھرانے سے ہے۔ بابا اور میرا بڑا بھائی مقدر شاہ کی زمین پر کام کرتے ہیں اور انہیں بس اتنا ملتا ہے کہ ہم کھینچ تان کر گزارا کر لیں۔ ہمارا کچا گھر بھی وڈیرے کی زمین پر ہے اور وہ جب چاہے ہمیں بے دخل کر سکتا ہے۔ میرا بڑا بھائی ایاز آن پڑھ رہا ہے، اس نے مشکل سے دو سال اسکول میں گزارے جہاں اس نے ایک لفظ سیکھ کر نہیں دیا۔ اسے شوق ہی نہیں تھا اس لیے بابا نے اسے اسکول سے اٹھا کر بکریاں چرانے پر لگا دیا۔ یہ واحد کام تھا جو ہمارا ذاتی تھا۔ اگرچہ اس میں سے بھی مقدر



نظر نہیں آتا تھا۔ ان ہی دنوں سکندر شاہ کی شادی بھی اور وہ گاؤں آیا ہوا تھا۔ اس کی شادی میں پورے گاؤں نے حصہ ڈالا تھا۔ سب نے کچھ نہ کچھ دیا تھا تا کہ سارا بوجھ اکیلے وڈیرے پر نہ پڑے۔ بابا نے دو بکرے دیے تھے۔ اسی طرح گاؤں میں کسی غریب کی شادی ہوتی تو وڈیرا سب سے زیادہ کرتا تھا۔ اتفاق کی بات ہے جب میں بکرے لے کر حویلی پہنچا تو مقدر شاہ کے ساتھ سکندر شاہ بھی تھا۔ مقدر شاہ نے میرا تعارف کرایا اور پھر اچانک بولا۔

”سکندر، یہ اچھا چھورا ہے۔ اس کے لیے کوئی ملازمت نکال۔ ابھی اس نے انٹر کیا ہے۔“  
سکندر شاہ نے میرا حلیہ دیکھا اور حقارت سے بولا۔  
”بابا اس نے تو اسکول کی شکل نہیں دیکھی ہوگی۔“  
”اڑے نہیں بچہ، اسے خود میں نے اسکول بھیجا ہے۔“

”سائیں میرا تو رزلٹ بھی آ گیا ہے۔“ میں نے کہا تو سکندر شاہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔  
”میں کوشش کروں گا۔“

”کوشش کو چھوڑ۔“ مقدر شاہ نے حاکمانہ انداز میں کہا۔ ”ابھی جاتے ہوئے تو اسے اپنے ساتھ لے جا اور وہاں اپنے محکمے میں اسے کوئی نوکری دلوا دے۔ ہم اپنے لوگوں کا خیال نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا اور بابا ادمر بے روزگاری بہت ہو گئی ہے، زمین کتنے لوگوں کو روزگار دے سکتی ہے۔“

سکندر شاہ کتنا ہی منہ زور سہی لیکن باپ کے حکم کے آگے وہ چوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے بابا میں لے جاؤں گا۔“

میری خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ میری خواہش یوں از خود پوری ہو جائے گی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس خوشی میں، میں نے سکندر شاہ کی شادی میں بھرپور حصہ لیا اور بنا تنخواہ کے خادم بنا رہا۔ اس کا صلہ مجھے ملا اور شادی کے بعد سکندر شاہ اپنی بیوی کے بجائے مجھے لے کر شہر روانہ ہو گیا۔ اس کی شاندار گاڑی میرے لیے اڑن کھنولے سے کم نہیں تھی جو مجھے اڑا کر پریوں کے دیس لے جا رہی تھی۔ پھر شہر کے سب سے پوش علاقے میں مقدر شاہ کی شاندار کوٹھی جس کا سرونٹ کوارٹر ہمارے گاؤں کے کچے مکان کے مقابلے میں کسی محل سے کم نہیں تھا۔ سکندر شاہ یہاں صرف ایک ملازم کریم کے ساتھ رہتا تھا، وہی اس کے لیے کھانا بناتا، اس کے کپڑے دھوتا، استری کرتا، دھوتا اور گھر کی صفائی اور سودا

شاہ کو ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ سال میں دو بار اس کی طرف سے بکرے کی فرمائش آتی تھی اور وہ پوری کرنا پڑتی تھی۔ ایاز کے برعکس مجھے پڑھنے کا شوق تھا۔ خاص طور سے اس لیے بھی کہ میں سات آٹھ سال کی عمر میں بکریوں کے پیچھے نہیں بھاگتا چاہتا تھا۔ میں نے ضد کی تو مجھے اسکول میں داخل کرادیا گیا اگرچہ بابا کا موڈ نہیں تھا۔ ان کے خیال میں، میں بھی ایاز کی طرح ایک دو سال ضائع کر کے بکریاں چرانے پر آ جاؤں گا۔

مگر میں مارے باندھے پڑھتا رہا۔ سچی بات ہے مجھے کوئی بہت شوق نہیں تھا مگر کام سے بچنے کے لیے پڑھنے کا ٹانگ کرتا تھا اور اسی ٹانگ میں کچھ نہ کچھ پڑھ ہی جاتا۔ اس لیے کبھی کسی کلاس میں ٹپل نہیں ہوا۔ گاؤں کا اسکول مڈل تک تھا۔ اس کے بعد میں میٹرک کے لیے قصبے کے اسکول میں داخل ہوا اور میرا داخلہ سراسر مقدر شاہ کی مہربانی سے ہوا تھا۔ ورنہ بابا نے تو مڈل کو کافی قرار دے کر مجھے جانور چرانے پر لگا دیا تھا۔ ایاز اب زمین پر کام کرتا تھا اس لیے بکریاں ماں سنبھالتی تھی اور بابا نہیں چاہتا تھا کہ وہ گھر کے ساتھ ساتھ یہ ذمے داری بھی پوری کرے۔ مقدر شاہ نے حسب معمول بابا سے ایک اچھا بکرا بیجنے کی فرمائش کی تھی اور بابا نے مجھے گلے کا سب سے اچھا بکرا لے جانے کا حکم دیا تھا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور بکرے لے کر مقدر شاہ کی حویلی پہنچا، اس نے مجھے بکرے سمیت طلب کر لیا۔ وہ بکرہ ادیکھ کر خوش ہوا اور پھر مجھ سے میرے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا کہ میں نے مڈل کیا ہے۔ اس نے آگے پڑھنے کا پوچھا تو میں نے بتایا کہ مجھے شوق ہے مگر بابا نے بکریاں چرانے پر لگا دیا ہے۔

”بابا بکریاں تو ایاز بھی چرا سکتا ہے جب تو پڑھ رہا ہے تو آگے بھی پڑھ، میں تیرے باپ سے بات کرتا ہوں۔“

وڈیرے کا بات کرنا بھی حکم کے مترادف تھا اور بابا نے گالیاں دے کر مجھے اسکول میں داخل کرادیا۔ مگر یہ مجھے گاؤں سے دور پڑتا تھا اور مجھے بس میں آنا جانا پڑتا تھا۔ دو سال بعد میں نے یہاں سے میٹرک کیا تو یہی اسکول اب انٹر تک ہو گیا تھا۔ موقع غنیمت جان کر میں نے یہیں سے انٹر بھی کر لیا۔ بابا بے چارہ سمجھ رہا تھا کہ میٹرک چار سال میں ہوتا ہے۔ مگر اب میرے پاس کوئی اور بہانہ نہیں تھا اس لیے پھر سے بکریاں چرانے لگا۔ میری خواہش تھی کہ کسی طرح میں شہر چلا جاؤں اور وہاں نوکری کر لوں مگر کوئی راستہ



لانے سے لے کر لان کی دیکھ بھال تک سارے کام اسی کے ذمے تھے۔ میں آیا تو اس نے بہت سے کام میرے ذمے ڈال دیے اور میں خوشی خوشی یہ کام کرنے لگا۔ دو مہینے تو ایسے ہی گزرے تھے۔ مگر اس کے بعد مجھے مفت کی یہ بچا رکھنے لگی۔ سکندر شاہ کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے بنا تنخواہ کے ایک نوکر اور مل گیا ہے اور اس کا ارادہ اگر مجھے نوکری دلانے کا تھا بھی تو اب بدل گیا تھا۔ دو مہینے بعد میں نے اس سے دبے لفظوں میں نوکری کا کہنا شروع کر دیا تھا مگر وہ مجھے بس تسلیاں دیتا رہا۔ ان دو مہینوں میں، میں نے سکندر شاہ کے اصل رنگ ڈھنگ اچھی طرح دیکھ لیے تھے۔ اس کی کوئی رات مشکل سے ہی اکیلے گزرتی تھی۔ ہر روز ایک نئی عورت یا لڑکی آرہی ہوتی تھی۔

بعد میں مجھے پتا چلا کہ سکندر شاہ صرف زر سے نہیں بلکہ زور سے اور اپنے عہدے سے بھی ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا۔ اپنے دفتر میں کام کرنے والی مجبور لڑکیوں پر ہاتھ صاف کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ اس طرح بعض ان لوگوں کی عورتیں ہوتی تھیں جن کے کام سکندر شاہ سے اٹکے ہوتے تھے اور وہ اس طرح سے کام نکھواتے تھے۔ بعض کو سکندر نے دوستی اور محبت کا جھانسا دے کر پھانس رکھا تھا اور وہی سب سے زیادہ یہاں آتی تھیں۔ سکندر شاہ کا نوکر کریم مجھے باغی کے سنسنی خیز قصے بھی سناتا تھا کہ اس نے کن کن مواقع پر سکندر شاہ اور اس کے ساتھ آنے والی عورتوں کو نشے میں دھت ہو کر جاے اور انسانیت سے باہر ہوتے دیکھا تھا۔ اب شاید سکندر شاہ احتیاط کرنے لگا تھا کیونکہ میں نے ایسا کوئی منظر نہیں دیکھا۔ جب وہ کسی عورت یا لڑکی کو لے کر آتا تو کوٹھی کے دروازے اندر سے بند ہو جاتے تھے اور پھر ہمیں وہاں آنے یا مداخلت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

جب میں نے محسوس کیا کہ سکندر شاہ ایسے کام کرنے والا نہیں ہے تو میں نے اس سے صاف بات کی۔ ”سامیں آپ مجھے نوکری دلانے کے لیے لائے تھے مگر اب تین مہینے ہونے والے ہیں۔ میں فارغ بیٹھا ہوں اگر نوکری نہیں ہے تو مجھے اجازت دو، میں واپس چلا جاؤں۔ ادھر کوئی کام کر لوں گا۔“

میری اس بات کا اس پر اثر ہوا کیونکہ میں واپس جاتا تو لازمی وڈیرے کو علم ہو جاتا اور وہ پھر اسے پکڑتا۔ اس لیے اس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد مجھے نوکری دلادے گا۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا جب میں نوکری کی بات کرتا وہ یہی

کہتا کہ کوشش کر رہا ہے اور سرکاری ملازمت اتنی آسانی سے نہیں ملتی ہے۔ شاید اسی ٹالنے میں وہ نہ جانے کتنا عرصہ گزار دیتا لیکن ایک دن اچانک مقدر شاہ سکندر کی بیوی کو لے کر وہاں آ گیا۔ اس کی آمد سکندر شاہ کے لیے بھی غیر متوقع تھی اور جس وقت مقدر شاہ کی شاندار گاڑی اور اس کے گاڑی کی جیب اندر آئی تو سکندر شاہ کسی عورت کے ساتھ اندر تھا اور صبح بارہ بجے بھی وہ سو رہے تھے۔ دروازہ بجانے پر سکندر شاہ نے باہر جھانکا اور اپنے باپ کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے اس نے عجلت میں لڑکی کو عقبی راستے سے نکالا اور پھر دروازہ کھولا۔

اس کا باپ سمجھ گیا تھا کیونکہ وہ خود بھی ایک زمانے میں ان راہوں پر چلا تھا مگر اس نے سکندر کو کچھ کہا نہیں۔ لڑکی کو کریم نے کمال ہوشیاری سے کوٹھی سے باہر پہنچا دیا۔ مقدر شاہ اپنی بیوی کو یہاں لے کر آیا تھا جو اس کی بیٹی بھی تھی۔ وہ دونوں اس پر ناخوش تھے کہ سکندر شاہ بیوی کو ساتھ کیوں نہیں رکھ رہا۔ اس وقت تو سکندر شاہ دب گیا کیونکہ اس کے دل میں چور تھا مگر باپ کے جاتے ہی اس نے بیوی کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور اسے اس قدر زچ کیا کہ اس نے واپس حوٹلی جانے کا مطالبہ کر دیا۔ وہ مشکل سے دو مہینے یہاں رہی تھی۔ بہر حال مقدر شاہ کے آنے سے میرا کام ہو گیا جب اسے پتا چلا کہ ابھی تک میری نوکری نہیں لگی ہے تو اس نے وڈیرا نہ لہجے میں سکندر شاہ کو حکم دیا۔ ”میرے واپس جانے سے پہلے اس کی نوکری لگ جانی چاہیے۔ مجھے ادھر اس کے باپ کو منہ دکھانا ہے۔ وہ کیا سوچے گا کہ وڈیرا اس کے بیٹے کو نوکری نہیں دلا سکتا ہے۔“

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہفتے بعد میرے ہاتھ میں نوکری کا پروانہ تھا۔ اگرچہ یہ چوکیدار کی نوکری تھی مگر تنخواہ اور دوسری سہولیات اچھی تھیں۔ سکندر شاہ نے مجھ سے کہا کہ اگر میں نے ہوشیاری دکھائی تو اتنا کمالوں گا کہ اس شہر میں ایک سال میں اپنا گھر بنالوں گا۔ مگر مجھے ایسی ہوشیاری بھی نہیں آئی۔ میں بندرگاہ کے کنٹینرز والے شعبے میں چوکیدار تھا۔ ڈیوٹی تین شفٹوں میں ہوتی تھی اور ہر ہفتے بعد شفٹ بدل جاتی تھی۔ نوکری کنٹریکٹ پر لیکن سرکاری تھی۔ امید تھی کہ میں بھی پکا ہو جاؤں گا۔ سکندر شاہ بھی اسی شعبے میں تھا۔ مگر اس کا دفتر ذرا فاصلے پر تھا اور وہ کنٹینرز والی جگہ پر کم آتا بلکہ صرف مطلب اور کام سے آتا تھا۔ اس کا پتا مجھے کچھ عرصے بعد ہی چل گیا تھا۔ میں حیران ہوا تھا۔ رشوت تو اب یوں لی جاتی تھی جیسے اپنا حق لیا جا رہا ہو اور یہ بھی کم نہیں تھی۔



بے ضمیر

بھی شام کو جاتے ہوئے ہزاروں روپے لے کر جاتا تھا۔ یہاں چوری کا سامان ملتا تھا۔ چوری کے سامان کی سب سے بڑی مارکیٹ یہی تھی۔ آنے جانے والے جہازوں کے ملاح چیزیں اسمگل کر کے یہاں فروخت کرتے تھے۔ بندرگاہ کے باہر پچاس روپے میں ملنے والی چرس یہاں دوسو روپے میں ملتی تھی۔ مگر بندرگاہ کے باہر ہزاروں روپے میں ملنے والا کوئی الیکٹرانک کا آئٹم اندر دوسو روپے کا بھی مل جاتا تھا۔ اگرچہ یہ ظاہر آنے جانے والوں کی مکمل تلاشی لی جاتی تھی اور سامان باہر لے جانے یا اندر لانے پر پابندی تھی مگر لوگ جانتے تھے کہ مال کیسے لانا یا نکالنا ہے۔

گوداموں میں کھلے مال سے چوری عام تھی۔ سب اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے تھے۔ مگر جلد مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بند کنٹینرز سے بھی مال چرایا جاتا ہے۔ حالانکہ کنٹینر سیل اور لاک ہوتا ہے۔ مگر کرنے والے اپنا کام کر جاتے تھے۔ جس طرح میں دوسروں کو جان کیا تھا اس طرح دوسرے بھی کچھ عرصے میں مجھے جان گئے تھے اور مجھے پتھر قرار دے دیا گیا تھا جس میں چونک نہیں لگتی ہے۔ اس لیے سب حرام کام مجھ سے چھپا کر اور مجھے دور رکھ کے جانے لگے۔ میں جس حصے میں چوکیدار تھا وہاں کوئی نہیں پہنچتا تھا۔ کیونکہ میں نے ان کاموں میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ کرنے والے میرے ہی بھائی بند چوکیدار ہوتے تھے۔ اس لیے وہ مجھ پر دھونس بھی نہیں جاسکتے تھے۔ یہ کام سکندر شاہ نے کیا۔ ایک دن اس نے مجھے ڈیوٹی کے بعد اپنے دفتر بلا لیا۔ اس نے مجھے سامنے کرسی پر بٹھایا اور بے تکلفی سے بولا۔

”بابا فیضو اب تک کچھ کمایا بھی ہے یا بس ایسے ہی گزارا کر رہے ہو؟“

”سامیں تنخواہ سے اچھا گزارا ہو جاتا ہے۔“ میں نے محتاط انداز میں کہا۔ اب میں اس کے منہ پر حرام کو برا نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سر سے پاؤں تک اس میں ڈوبا ہوا تھا۔

”لگتا ہے تجھے ابھی زمانے کی ہوائیں لگی ہے۔ چل تجھے ہوا لگاتا ہوں، یہ بتا تیری ڈیوٹی کل رات کی ہے نا؟“

”جی سامیں۔“ میں نے فکر مند ہوتے ہوئے کہا۔

”رات بارہ سے صبح نو بجے والی نا؟“

”جی سامیں۔“

”بس تو میرا انتظار کرنا، میں آؤں گا۔“

”وہ کیوں سامیں؟“

اپنی تنخواہ سے کئی گنا زیادہ وہ اوپر سے کھاتا تھا۔ پھر جدی پشتی رکھتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ اس حد تک گر جائے گا یہ میں نے سوچا نہیں تھا۔

اب تک میں سکندر شاہ کے ساتھ رہتا آیا تھا مگر جب نوکری لگ گئی تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں اپنا بندوبست کر لوں۔ اب وہ مجھے مفت میں روٹی کھلاتا نہیں چاہتا تھا۔ میں خود بھی اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ساری آمدنی حرام تھی اور میں بھی اسی میں سے کھاتا تھا۔ اس لیے میں خوشی سے الگ ہو گیا۔ مجھے بندرگاہ کے نزدیک ہی ایک جگہ مل گئی تھی۔ محکمے کے چار پانچ افراد مل کر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ میں بھی حصہ دے کر ان کے ساتھ رہنے لگا۔ یہاں رہنے میں یہ فائدہ بھی تھا کہ میں پیدل ہی بندرگاہ چلا جاتا تھا اور میرا کنوینس کا خرچ بچتا تھا۔ پھر بندرگاہ پر کنٹینر سے کھانا اچھا اور بہت سستا پڑتا تھا۔ یوں میرا کھانے پر بھی کم خرچ ہوتا تھا۔ میں گزارے لائق رقم رکھ کر باقی بابا کو بھجوا دیتا تھا۔ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی تھی اور کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لیے میں نے آگے پڑھنے کے لیے ایک ٹائٹ کالج میں داخلہ لے لیا اور دو سال میں یہاں سے گریجویشن کر لیا۔

دو سال میں بابا نے میری بھیجی رقم میں سے اتنا جوڑ لیا کہ اس نے میری شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے ہاں شادی صرف برادری میں ہوتی تھی اور وہ بھی بچپن میں طے کر دی جاتی تھی۔ ایاز کی شادی دو سال پہلے ہوئی تھی، اس کی بیوی میری خالہ کی بیٹی تھی، اس کی چھوٹی بہن شبانہ سے مہری منگنی ہوئی تھی۔ میں گاؤں آیا اور شبانہ کو رخصت کر کے گھر لے آیا۔ شبانہ شکل و صورت کی بہت پیاری تھی۔ پھر ہنسنے بولنے اور بھاگ کر کام کرنے والی تھی اس لیے جلد پورے گھر کو اپنا بنالیا اور میں تو پہلے دن سے اس کا ہو گیا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں آنا چاہتا تھا مگر اسے شہر میں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا، اس صورت میں گھر رقم نہیں بھجوا سکتا تھا اس لیے دل پر پتھر رکھ کر میں اسے گاؤں میں چھوڑ آیا اور مہینے میں ایک چکر گاؤں کا لگاتا تھا۔

بندرگاہ پر ملازمت کے چند مہینوں بعد میں سمجھ گیا تھا کہ کمانے کے لیے اس سے بہتر جگہ کوئی نہیں ہے اور سب سے زیادہ کمائی دو نمبر کاموں میں تھی۔ یہاں منشیات اور ہر قسم کے سامان ضرورت اور عیش سے لے کر معمولی سا ٹھیلہ تک بہت نفع بخش تھا۔ سب کھاتے تھے اور سب ایک دوسرے کی پردہ پوشی کرتے تھے۔ معمول چہرہ اسی اور سپاہی



میرے سوال پر اس کے تیور بدل گئے۔ ”بابا تو تو سوال کرنے لگا ہے، کل کا چھوڑا جو آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرتا تھا۔“

”سائیں، جلدی سے ہاتھ جوڑ دیے۔“ سائیں منہ سے نکل گیا ورنہ مجال ہے کہ تم سے سوال کروں۔“ اس کے تیور نرم پڑ گئے۔ ”بابا بے شک تو سرکاری ملازم ہے مگر مت بھول اصل نوکر ہمارا ہے۔“

”سائیں غلطی ہو گئی۔“ میں نے مزید عاجزی سے کہا۔ ”بس دفع ہو جا اور انتظار کرنا، کہیں غائب مت ہو جاتا۔“

”بالکل سائیں، میں اپنی ڈیوٹی پوری کرتا ہوں ایک منٹ کو بھی کہیں نہیں جاتا۔“ میں جانتا تھا کہ سکندر شاہ نے آنے کی بات کی ہے تو اس کے پیچھے اس کا کوئی نہ کوئی مطلب ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کوئی غلط کام کرے گا تو میں کیا کروں؟ میں اسے روکنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف وڈیرا ہی نہیں میرا افسر بھی تھا۔ اگر میں اس کے ساتھ شامل ہوا تو یہ ضمیر کے خلاف ہوگا۔ میں آدمی بے شک چھوٹا تھا لیکن بے ضمیر نہیں تھا۔ اسی کشمکش میں اگلی رات ڈیوٹی پر پہنچا۔ اب تک میری ایونگ تھی اور اس رات سے نائٹ ہو گئی تھی۔ یہاں ہر سیکشن کے الگ الگ چوکیدار ہوتے ہیں۔ ہر سیکشن خاصا بڑا ہوتا ہے اور اس میں ایک وقت میں ہزاروں کنٹینرز موجود ہوتے ہیں۔ چوکیدار کی حیثیت سے میری ذمہ داری تھی کہ میں سیکشن کے مختلف حصوں کے بارے میں جانتا ہوں تاکہ اگر کسی کو مخصوص کنٹینرز تک جانا ہو تو میں اس کی رہنمائی کر سکوں۔ بندرگاہ پر چوبیس گھنٹے کام ہوتا ہے اس لیے کسی بھی شفٹ میں کنٹینرز آتے اور جاتے رہتے تھے۔

اس رات بھی جب میں پہنچا تو کنٹینرز کی آمد و رفت جاری تھی۔ انہیں جہازوں سے اتار کر یہاں رکھا جا رہا تھا اور جن کی روائگی تھی انہیں بحری جہازوں پر بار کیا جا رہا تھا۔ کنٹینرز ونڈل کرنے والے سپردانز رمنٹ منٹ پر مجھے پکار رہے تھے۔ حالانکہ یہ براہ راست میرا کام نہیں تھا مگر وہ اپنا کام بھی مجھ سے لیتے تھے۔ صبح پانچ بجے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ اس کے بعد ذرا سکون ہوا تھا۔ سکندر شاہ یقیناً اسی سکون کے انتظار میں تھا کیونکہ جیسے ہی آخری کنٹینرز کرین نے یارڈ میں رکھا وہ ایک طرف سے نمودار ہوا تھا۔ سپردانز پہلے ہی جا چکے تھے۔ سکندر شاہ کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ اس کے پاس بڑا سا بیگ تھا۔ سکندر شاہ نے میرے

پاس آ کر کہا۔ ”ہمارے ساتھ آؤ۔“

”سائیں میں یہاں سے ہٹ نہیں سکتا، ابھی کوئی کنٹینرز آنے جانے کا ہوا تو مسئلہ ہو جائے گا۔“

”اب یہاں کوئی کام نہیں ہوگا۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میرے ساتھ چلو اور بی سیون سیکشن کا بتاؤ۔“

بی سیون سیکشن خاصا اندر کو تھا۔ بادل ناخواستہ میں اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ بی سیون میں باہر جانے والے کنٹینرز رکھے ہوئے تھے۔ سکندر شاہ اور اس کے ساتھ آنے والے کو معلوم تھا کہ انہیں کس کنٹینرز تک جانا ہے، وہ ٹارچ کی روشنی میں ان کے نمبر دیکھ رہے تھے۔ بالآخر انہیں وہ کنٹینر مل گیا۔ یہ گراؤنڈ پر تھا اور اس کا دروازے والا حصہ ایک چھوٹی سی راہداری میں تھا۔ سکندر شاہ کے ساتھی نے اسے تلاش کیا تھا، اس نے آواز دی۔ ”شاہ جی یہ رہا۔“ سکندر شاہ اس تک آیا اور اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”ہاں یہی ہے۔“

اتنے عرصے کی ملازمت کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کون سا کنٹینرز کہاں سے تعلق رکھتا تھا اور اس میں کیا ہو سکتا تھا۔ یہ کنٹینرز ایک پڑوسی ملک سے آیا تھا اور اب باہر جا رہا تھا۔ سکندر شاہ نے اپنے ساتھ آنے والے سے کہا۔ ”دیکھ کیا رہے ہو، کھولوا سے۔“

”سائیں یہ کیا کر رہے ہیں۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”میں مارا جاؤں گا۔“

”تم فکر مت کرو، اول تو کسی کو پتا نہیں چلے گا اور چل بھی گیا تو یہاں تین شفٹیں ہوتی ہیں، کسی کو کیا معلوم کہ کس شفٹ میں یہ کام ہوا ہے۔“ اس نے مجھے تسلی دی اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے مجھے تیز روشنی والی ٹارچ پکڑا دی۔ ”مجھے روشنی دکھاؤ۔“

میں روشنی دکھانے لگا اور اس نے اپنے بیگ سے لاک کھولنے والے اوزار نکالے اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ سکندر شاہ آس پاس سے چوکنا تھا۔ میں نے دبے لہجے میں پوچھا۔ ”سائیں اس میں کیا ہے؟“

”ابھی کھلے گا تو دیکھ لو گے۔“ اس نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔ کنٹینرز کا لاک کھلنے میں دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ اس کی سیل اتار دی گئی اور پھر سلاخیں ہٹا کر اس کا دروازہ کھولا۔ نہ جانے کب سے بند دروازہ بہت مشکل اور آواز کے ساتھ کھلتا تھا۔ مگر یہاں سننے والا کون تھا؟ راہداری میں زیادہ جگہ نہیں تھی مگر پورا دروازہ کھولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سکندر شاہ اپنی ٹارچ روشن



ضروری باتیں کرتا رہا جو اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ اس نے اچانک پوچھا۔ ”فیضو تیری شادی ہوگئی ہے تو آج تک بیوی کو یہاں کھانے پھرانے نہیں لایا۔“

”سائیں ادھر رکھنے کا مسئلہ ہے۔ میں جہاں رہتا ہوں وہاں سارے چھڑے چھانٹ ہیں۔“

”کوئی گھر دیکھ لے۔ اب کیوں اکیلا رہ رہا ہے۔“

سکندر شاہ نے کہا اور کچھ رقم نکال کر زبردستی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا اور یوں اس چوری میں شامل ہو گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ قالینوں سے بھرے اس کنٹینر سے سکندر شاہ نے جو قالین نکلوائے تھے ان کی مالیت چار لاکھ روپے تک تھی۔ کنٹینر میں سیکڑوں کی تعداد میں قالین تھے اور اگر کوئی کھول کر دیکھتا تب بھی اسے پتا نہیں چلتا کہ کچھ قالین غائب ہیں۔ سکندر شاہ خالی ہونے والی جگہوں کو دوسرے قالین کھسکا کر اس طرح بھر رہا تھا کہ کنٹینر میں خلا باقی نہیں رہا تھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس کے آدمی یہاں سے جا چکے ہوں گے تو وہ بھی رخصت ہو گیا۔ اس کا طریقہ میں سمجھ گیا تھا۔ اس نے چوری کا مال نکالنے کا آسان طریقہ سوچا تھا۔ گیٹ سے نکالنے میں بات کھل جاتی اور دس لوگوں کو کھلانا یا کسی بھی طریقے سے ان کا منہ بند کرنا پڑتا۔

جو لوگ قالین لے گئے تھے، ان پر بندر گاہ میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ کشتی لے کر نکلتے تو اس وقت کوئی چیک نہیں کرتا تھا ہاں جب وہ سمندر سے آتے تو ان کی کشتیاں چیک کی جاتی تھیں۔ وہ قالین اپنی کشتی میں ڈال کر کسی بھی عام ساحل پر جہاں سکندر شاہ نے کہا ہو گا پہنچا دیں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ لاکھوں کی چوری کے بدلے سکندر شاہ نے مجھے صرف پانچ سو روپے دیے تھے۔ اگر گڑبڑ ہوتی تو وہ افسر اور وڈیرے خاندان سے ہونے کی وجہ سے صاف بچ جاتا اور میں مارا جاتا۔ سچی بات ہے مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا اور تیسرے دن جب وہ کنٹینر جا چکا تھا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس کے بعد سکندر شاہ نے مجھ سے کئی ہفتے تک رابطہ نہیں کیا۔ دراصل وہ موقع کے انتظار میں تھا اور جیسے ہی اس کے مطلب کا کنٹینر آیا اس نے مجھے موبائل پر کال کی۔

”فیض کدھر ہے بابا؟“

”سائیں ادھر ہی ہوں، آپ کے راج میں بیٹھا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”بابا ہمارے راج میں بیٹھا ہے تو ہمارا کام بھی کر کے دے گا۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ میرا دم خشک

کرتے ہوئے اندر داخل ہوا اور اس کے ساتھی نے مجھ سے نارچ لے کر بند کر دی۔ اب وہاں معمولی سی روشنی تھی۔ چند منٹ بعد سکندر شاہ نے مجھے بلایا۔ ”فیضو ادھر آؤ۔“

میں چھوٹے سے خلا سے اندر داخل ہوا تو کنٹینر میں چھوٹے غالیچے نما قالین بھرے پائے۔ یہ اعلیٰ درجے کے ہاتھ سے بنے ہوئے قالین تھے جو بیرون ملک بہت زیادہ قیمت پر بکتے ہیں اور لوگ اپنے گھروں کی دیواروں اور نشست گاہوں میں بہ طور سجاوٹ استعمال کرتے ہیں۔ مجھے یہ سب سکندر شاہ نے بتایا۔ کیونکہ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے صرف قالینوں کے لیے اسے کھولا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”فیضو یار یہ صرف قالین نہیں ہیں، یہ بہت قیمتی والے قالین ہیں۔ چھوٹے سے قالین کی قیمت بھی تیس ہزار روپے سے کم نہیں ہے۔“

وہ نارچ کی روشنی ڈال کر رول کیے ہوئے قالین دیکھ رہا تھا اور اس میں سے اپنے مطلب کے چھانٹ رہا تھا۔ وہ جس پر ہاتھ رکھتا میں اس کی ہدایت کے مطابق اسے اٹھا کر باہر لے جاتا۔ سکندر شاہ نے کوئی ایک درجن قالین جن کر نکلوائے اور پھر کنٹینر کو ویسے ہی بند کر دیا جیسے یہ پہلے بند تھا۔ ان کے پاس سل بھی تھی جو اس پر لگا دی۔ اب کوئی خاص طور سے سل کا نمبر چیک کرتا تو اسے پتا چلتا کہ سل جعلی ہے اور ایسا عام طور سے کوئی کرتا نہیں تھا بلکہ صرف کنٹینر نمبر ہی دیکھا جاتا تھا۔ قالین جو پلاسٹک شیٹوں میں لپٹے ہوئے تھے، راہداری میں ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ میں ابھی سوچ رہا تھا کہ انہیں یہاں سے کیسے نکالا جائے گا کہ سکندر شاہ نے موبائل پر کسی کو کال کی اور چند منٹ بعد ہی وہاں علیے اور شکل و صورت سے مابی گیر نظر آنے والے تین نوجوان آئے۔ ان کے پاس سے مچھلی کی بو آرہی تھی۔ سکندر شاہ نے ان میں سے ایک سے کہا۔

”رجیم تجھے معلوم ہے نامال کہاں پہنچانا ہے؟“

”صاحب آپ فکر مت کرو۔“ رجیم نے مخصوص لہجے

میں کہا۔ ”رجیم بخش پہلی بار یہ کام نہیں کر رہا ہے۔“

”ادھر کوئی نہیں روکے گا، روکے تو میرا نام لے دیتا۔“

آگے تم لوگوں کی ذمہ داری ہے۔“

ان تینوں نے یہ سارے قالین اٹھائے اور وہاں سے چلے گئے۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ قالین لے کر کہاں جا رہے تھے مگر سکندر شاہ ساتھ تھا اس کے ہوتے ہوئے میں ان کے پیچھے نہیں جاسکتا تھا اور شاید اس کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور چند منٹ تک غیر



ہو گیا اور میں نے مرے انداز میں کہا۔

”حکم سائیں۔“

”بابا تیری پھر ٹائٹ ہے نا؟“

”جی سائیں کل آخری ٹائٹ ہے۔“

”بس تو کل ہی کام ہوگا۔“ وہ بولا۔

”سائیں یہ بہت خطرے والا کام ہے، بات کھلی تو

آپ بچ جاؤ گے، میں غریب آدمی ہوں مارا جاؤں گا۔“

میں نے ہمت کر کے کہا۔

”کچھ نہیں ہوتا بابا، یہ ہمارا ملک ہے یہاں سب بچ

جاتے ہیں۔ کھاؤ بابا کھاؤ اور موج کرو بس یہی زندگی ہے۔“

مگر میرے نزدیک ایک زندگی اور بھی ہے جب آدمی

کو مرنے کے بعد اس زندگی میں دنیا کی زندگی کا حساب دینا

پڑے گا اور وہ بہت سخت ہوگا مگر سکندر شاہ جیسے لوگ اسی

زندگی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ میں نے پہلی چوری کے بعد بھی

اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگی تھی کہ وہ جانتا ہے اس کا بندہ مجبور

ہے۔ میں ایک بار پھر مجبور تھا۔ حسب معمول سکندر شاہ رات

کے آخری پہر آیا اور اس کے ساتھ وہی آدمی تھا۔ میرا خیال تھا

کہ وہ بھی بندرگاہ پر ہی کام کرتا تھا یا پھر سکندر شاہ اسے باہر

سے لایا تھا۔ کوئی غیر متعلقہ شخص یہاں نہیں کھسکتا تھا۔ اس

بار سکندر شاہ نے جس کنٹینر کا انتخاب کیا تھا وہ باہر سے آیا تھا

اور کلیئرنگ کے لیے یہاں پڑا ہوا تھا۔ سی ٹو سیکشن میں یہ کنٹینر

فرسٹ پر تھا یعنی اس کے نیچے ایک کنٹینر اور رکھا ہوا تھا۔ مگر یہ

کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہاں سیڑھی تھی۔ سکندر شاہ کا آدمی سیڑھی

لگا کر اوپر چڑھا اور اس بار اس نے دو منٹ میں تالا کھول لیا۔

”فیض میرے ساتھ آؤ۔“ سکندر شاہ نے کہا اور

سیڑھی پر چڑھ گیا۔ اس کنٹینر کے چاروں طرف کئی کئی منزل

تک کنٹینرز رکھے تھے اس لیے کسی کے دیکھ لینے کا امکان

صرف اسی وقت ہوتا جب وہ خود یہاں تک چلا آتا۔ میں

سیڑھی سے چڑھ کر کنٹینر میں آیا۔ یہ تو دروازے تک مختلف

سائز کے گتے کے ڈبوں سے بھرا ہوا تھا اور ان ڈبوں میں

الیکٹرانکس کا مال تھا۔ سکندر شاہ جن جن کرائل سی ڈی ٹی وی

نکالنے لگا۔ اس بار وہ یہ کام خود کر رہا تھا میرا کام اس کے

نکالنے ڈبوں کو نیچے کھڑے سکندر شاہ کے آدمی کو تھمانا تھا۔

اس نے کوئی نصف درجن ایل سی ڈی ٹی وی نکالے۔ اس

کے بعد گاڑیوں میں لگنے والے اعلیٰ درجے کے

اسپیروں کے ڈبے نکالنے لگا۔ آخر میں اس نے ایک بڑا ڈبا

نکالا جو سادہ تھا یعنی اس میں کیا تھا اس کی وضاحت نہیں تھی۔

پھر اس نے مجھے اترنے کو کہا اور خود بھی نیچے آکر اپنے آدمی

سے کنٹینر بند کرنے کو کہا۔ جب تک آدمی کنٹینر بند کرتا رہا اس

نے کال کر کے ان ہی لوگوں کو بلوایا جو پہلے بھی قالین لے

کر گئے تھے۔ اس نے رحیم بخش کو خبردار کیا۔

”احتیاط کرنا اس میں الیکٹرانکس کا سامان ہے، ذرا

ساپانی لگا تو سب برباد ہو جائے گا۔“

”صاحب کوئی پہلی بار ایسا مال لے جا رہے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”ہم تو ادھر طوفانی سمندر میں جہاز سے مال اتار کر

لاتا ہے۔ مجال ہے جو ایک پس بھی خراب ہو۔“

رحیم بخش اس بار تین بندے لایا تھا کیونکہ قالین کے

مقابلے میں ڈبے اٹھانا ذرا مشکل اور احتیاط والا کام تھا۔

انہیں سارا سامان لے جانے کے لیے دو چکر لگانا پڑے۔

جب وہ دوسرے چکر میں سب سامان اٹھا کر رخصت ہوئے

تو سکندر شاہ نے سکون کا سانس لیا۔ اس بار اس نے مجھے کچھ

دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں مجبوراً یہ کام کر

رہا ہوں۔ اس کے عیار دماغ نے اسے سمجھایا کہ جو کام مفت

میں ہو رہا ہو اس کے لیے دس روپے بھی خرچ کرنا حماقت

ہوتی ہے۔ اس لیے اس نے مجھے اس بار کچھ نہیں دیا اور

میں نے سکون کا سانس لیا۔ جو پانچ سو روپے اس نے مجھے

پہلے دیے تھے وہ میں نے گھر جاتے ہوئے راستے میں ملنے

والے فقیروں میں تقسیم کر دیے تھے۔ جب تک وہ میرے

پاس سے چلے نہیں گئے مجھے بے چینی رہی تھی۔

اس دوسرے ٹرپ کے بعد میں دودن کی چھٹی پر تھا

اور گھر چلا گیا۔ اماں بابا اور شبنم مجھے دیکھ کر خوش ہوئے

تھے۔ شبنم یہاں بھی خوش تھی کہ سب اس کا خیال رکھتے

تھے مگر شوہر کی کمی تو کوئی پوری نہیں کر سکتا اس لیے اس نے

تہائی پاتے ہی مجھ سے فرمائش کی۔ ”فیض مجھے شہر لے جا۔“

”مشکل ہے اگر تجھے وہاں رکھا تو پھر خرچ پورا کرنا

مشکل ہو جائے گا۔ ادھر شہر میں بہت مہنگائی ہے۔“

”میں کب ہمیشہ کے لیے چلنے کو کہہ رہی ہوں۔ بس

کچھ دن کے لیے لے چل، مجھے شہر دکھا، اپنے ساتھ رکھ۔“

میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا کیونکہ میں خود اسی کیفیت

سے گزرتا رہا ہوں۔ نئی نئی شادی کے بعد میاں بیوی دور

ہوں تو ان دونوں کے لیے بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ شبنم

نے کچھ دن کا کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ سچی بات ہے میں

نے سوچ رکھا تھا کہ اسے شہر ضرور لے جاؤں گا۔ مگر ابھی

میری تنخواہ اتنی نہیں تھی۔ بی اے کر کے میں چاہتا تھا کہ مجھے

میں ہی کوئی اچھی جگہ مل جائے تب میری تنخواہ اتنی ہو کہ میں

گھر لے کر شبنم کو رکھ سکوں۔ مگر ٹھوڑے عرصے کے لیے تو



شروع میں، میں سمجھتا تھا کہ سکندر شاہ ہی یہ کام کرتا ہے لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس میں اور بھی بہت سے بڑے لوگ ملوث تھے اور ایسے مگر مجھ بھی تھے جو کنٹینرز سے چیزیں چرانے کے بجائے پورا کنٹینر ہی غائب کر دیتے تھے۔ ایسے کئی واقعات میرے سامنے ہوئے۔ جب کنٹینر غلط طریقے سے باہر نکالے گئے اور غائب ہو گئے، اس کے بعد کسٹم اور دوسری ایجنسیاں تفتیش کے لیے آ جاتی تھیں۔ پکڑ دھکڑ ہوتی جس میں ہمیشہ نچلے درجے کے اہلکار یا نجی کمپنی والے پکڑے جاتے تھے مگر کچھ عرصے بعد وہ بھی چھوٹ جاتے۔ جس پارٹی کا کنٹینر غائب ہوا ہوتا وہ بھی رو دھو کر دوبارہ کاروبار میں لگ جاتی اور اپنا ہونے والا نقصان پورا کرنے کی کوشش کرتی۔ یہ میں وہ دھندے بتا رہا ہوں جو سراسر غیر قانونی ہیں یہاں ایسے دھندوں کی بھی کمی نہیں ہے جو قانون کے زیر سایہ ہوتے ہیں اور ان سے حکومت کو ٹیکس اور ڈیوٹی میں نقصان ہوتا ہے۔

یہاں ایسے گروہ بھی ہیں جو اتنے طاقتور ہیں کہ وہ بندر گاہ سے بالا بالا ہی بحری جہازوں سے سامان یا کنٹینر اتار کر شہر میں کہیں بھی پہنچا سکتے ہیں بس ان کو ان کی منہ مانگی رقم دے دو۔ یہ بھی مجھے سکندر شاہ نے بتایا۔ وہ جب مجھ سے کام لیتا اس کی پوری کوشش ہوتی کہ میں بھی ان دھندوں میں شامل ہو جاؤں۔ شاید اسے خوف تھا کہ کبھی بھانڈا پھوٹا تو میں اس کے خلاف گواہی نہ دے دوں۔ حالانکہ اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے دل کے چور کی تسلی کے لیے میرے منہ کو بھی حرام لگانا چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے دفتر بلایا تو میں سمجھا کہ شاید پھر کوئی کنٹینر کھولا جائے گا۔ مگر اس نے مجھے ایک بند سوٹ کیس تمھارا اور بولا۔

”یہ میرے بیٹکے پر پہنچا دے۔“

”اس میں کیا ہے سائیں؟“

”میرا سامان ہے، تجھ سے کوئی نہیں پوچھے گا، ابھی

میرا آدمی تجھے گیٹ سے نکلوا دے گا۔“

”پر سائیں، میں ڈیوٹی پر ہوں۔“

اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس نے گالی دے کر کہا۔

”اڑے... تو میری ڈیوٹی پر ہے، سرکاری ڈیوٹی کو بھول

جا۔ ادھر کوئی تجھ سے نہیں پوچھے گا۔“

میری غیر موجودگی میں کوئی مسئلہ ہو جاتا یا پھر کوئی بڑا

افسر آ جاتا اور مجھے غیر حاضر پاتا تو میرے لیے مشکل ہو جاتی

اس لیے میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے سائیں، کوئی مگر بڑ ہوئی تو

تم ہی دیکھنا۔“

میں اسے لے جاسکتا تھا۔ پر مسئلہ اسے رکھنے کا تھا۔ فلیٹ میں تو اسے کسی صورت نہیں رکھ سکتا تھا۔ ایک بار مجھے سکندر شاہ کا خیال آیا تھا کہ اس کی کوشی میں جگہ تھی مگر وہاں بھی اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ شبانہ کو اکیلے رہنا پڑتا جب میں ڈیوٹی پر ہوتا اور میں اسے سکندر شاہ جیسے آدمی کے ساتھ اکیلا ہرگز نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے شبانہ سے کہا۔

”میں کوشش کروں گا کہ چند دن کے لیے کوئی جگہ مل جائے جہاں تو رہ سکے اور میں بھی چھٹی لے لوں تا کہ پورا وقت تیرے ساتھ ہی گزرے۔“

شبانہ خوش ہو گئی۔ میں دو دن بعد واپس جانے لگا تو وہ ایسی تڑپ کر روئی کہ میرا دل ہل جانے کا ارادہ بدلنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ نوکری پر لعنت بھیجوں اور یہاں آ کر بکریاں چرانا شروع کر دوں۔ مگر اس میں میرا اور میری ہونے والی اولاد کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ اس لیے دل پر پتھر رکھ کر شہر چلا آیا۔ یہاں نوکری کے ساتھ سکندر شاہ کی غلامی بھی جاری تھی۔ مہینے میں ایک بار وہ میری ڈیوٹی کے دوران اپنا کام کر جاتا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس نے آدمی بدل لیا اور اب وہ کسی اور کو لاتا تھا۔ سامان نکالنے کے لیے رحیم بخش اینڈ پارٹی تھی۔ وہ بھی اس کے بے دام کے غلام تھے کہ وہ ان کی نہ جانے کون سی رگ دباتا تھا۔ میں جانتا تھا اکثر مایہ گیر غلط سلسلہ دھندوں سے دور رہتے ہیں مگر ان میں کچھ ہوتے ہیں جو پیسے کے لیے ہر الٹا سیدھا کام کرتے ہیں۔ رحیم بخش بھی ایسے ہی مایہ گیروں میں سے تھا۔

رحیم بخش اور اس کا بھائی اللہ بخش دونوں منشیات کا دھندا کرنے کے لیے مشہور تھے۔ وہ خود بھی جس پیتے تھے اور یہاں بندر گاہ کے علاقے میں فروخت بھی کرتے تھے۔ شاید سکندر شاہ نے ان کو اجازت دلوائی تھی کیونکہ انہیں کوئی نہیں روکتا تھا۔ صرف یہ دونوں نہیں یہاں ایسے بہت

سارے تھے جو قانون کے تعاون سے غیر قانونی کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ اگر کوئی اور منشیات

فروشی یا کوئی غلط کام کرنے کی کوشش کرتا تو قانون فوراً

حرکت میں آ جاتا تھا۔ سکندر شاہ اکیلا نہیں تھا یہاں اس جیسے

لوگوں کی ایک پوری مافیا تھی جو دو نمبری کاموں سے کماتے

تھے اور ایک دوسرے کے دھندوں کو تحفظ دیتے تھے، یہی

وجہ تھی کہ یہ کبھی پکڑے نہیں جاتے تھے۔ حد یہ کہ ان کی

طرف کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ان کی مثال کوئلے کی

کان میں سیاہ لباس پہننے والوں کی سی تھی، ہاں اگر کوئی سفید

پوش آ جاتا تو وہ فوراً نظروں میں آ جاتا۔



”فکر نہ کر، ادھر اپنی بادشاہت ہے۔“ وہ غرور سے بولا۔

www.paksociety.com

اس کے آدمی نے مجھے سوٹ کیس سمیت گیٹ سے نکلوا دیا اور کسی نے نہیں پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ ورنہ عام ملازمین کی تو جامہ تلاشی بھی ہوتی ہے۔ میں سکندر شاہ کی کوٹھی پہنچا۔ وہاں کریم موجود تھا۔ وہ بہت عرصے بعد مجھے دیکھ کر خوش ہوا اور اپنے کوارٹر میں لے گیا۔ وہ شادی شدہ آدمی تھا مگر پہلے اس کی بیوی ساتھ نہیں رہتی تھی اب وہ اسے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے مجھے چائے پلائی۔ تب میں نے اس کی بیوی کو دیکھا۔ وہ عام سی صورت والی لیکن جوان عورت تھی۔ اسے سکندر شاہ سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ ہمیشہ خوب صورت عورتوں کے چکر میں رہتا تھا۔ میں نے بھی یہاں کسی معمولی صورت والی لڑکی یا عورت کو آتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے کریم سے پوچھا۔

”سائیکس نے تمہیں اجازت دے دی بیوی کو رکھنے کی؟“

”ہاں اسی نے تو کہا تھا ادھر کام کرنے والی عورت کی ضرورت ہے۔ اب یہ بچکے میں کام کرتی ہے۔“ کریم خوشی سے بولا۔ اس کی خوشی کی وجہ ظاہر تھی۔ بیوی بھی اس کے پاس تھی اور اسے اس کی تنخواہ بھی مل رہی تھی۔ کھانا دہی بناتی تھی اس لیے اب تینوں وقت کا کھانا بچکے کے کچن سے آتا تھا اس لحاظ سے کریم کی پانچوں انگلیاں مٹی میں اور سر کڑا ہی میں تھا۔ اس نے میری بیوی کے بارے میں پوچھا۔ ”تو اسے یہاں کیوں نہیں لے آتا ہے۔“

”ہمیشہ کے لیے تو مشکل ہے پر میں سوچ رہا ہوں کہ اسے کچھ عرصے کے لیے لے آؤں، اسے شہر بھی دکھاؤں گا۔ پر ایک مسئلہ ہے کہ اسے رکھوں گا کہاں؟“

”ادھر لے آ۔“ کریم نے فراغ دلی سے کہا۔ ”دوسرا کوارٹر خالی ہے، شاہ جی سے پوچھ لے۔ کچھ سامان لے آ اور جب تک بیوی ہو اس کے ساتھ یہاں رہ۔ ضرورت کی چیزیں مجھ سے لے لیتا۔ یہاں سب ہے۔“

کریم کی پیشکش نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پہلے میں نے یہ خیال اس لیے مسترد کر دیا تھا کہ شبانہ کو اکیلے یہاں نہیں چھوڑ سکتا تھا مگر اب یہاں کریم کی بیوی سمیرا تھی۔ شبانہ اس کے ساتھ رہتی۔ پھر میں کوشش کرتا کہ مجھے چھٹیاں مل جائیں اور میں ڈیوٹی پر جانے کے بجائے شبانہ کو گھماؤں پھراؤں۔ میں نے سکندر شاہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا، وہ مجھے جگہ بھی دے سکتا تھا اور چھٹی بھی دلوا سکتا تھا۔ میں واپس

جانے کے بجائے کوٹھی میں رک کر اس کا انتظار کرتا رہا۔ کریم بھی خوش تھا کہ اسے کوئی کپ شپ کرنے والا ملا ہوا تھا۔ اس نے مجھے روک لیا کہ رات وہیں رگ جاؤں۔ برآمدے میں چار پائی پر سو جانا۔ سکندر شاہ رات بہت دیر سے آیا۔ وہ نشے میں دھت تھا، اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس کے سامنے آؤں۔ اگلی صبح ڈیوٹی پر جانے سے پہلے میں اس سے ملا۔ وہ حیرت سے بولا۔

”بابا تو اتنی صبح؟“

”سائیکس میں تو کل سے یہاں ہوں، آپ سے ایک بات کرنی تھی پر آپ رات دیر سے آئے۔“

”بولو بابا۔“ اس نے کہا۔ وہ اس وقت تازہ دم لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی گزارش اس کے سامنے پیش کی۔ وہ نہ جانے کس موڈ میں تھا اس نے فوراً ہی دونوں باتیں مان لیں۔ ”بابا تجھے پہلے بھی کہا تھا کہ بیوی کو یہاں لے آ۔ چل اب لے آ، یہاں رہے جب تک مرضی ہو اور چھٹی میں دلوا دوں گا۔ پردس دن سے زیادہ کی نہیں ملے گی۔“

”بہت ہے سائیکس۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”بس تو جا کے لے آ۔“

مگر میں نے سوچا تھا جب چھٹیاں منظور ہو جائیں گی تب جاؤں گا۔ اس دوران میں، میں نے دوسرے سرورٹ کوارٹر میں کچھ سامان لا کر ڈال دیا جو ضروری تھا۔ کھانے کا بھی سکندر شاہ نے کہہ دیا تھا کہ اس کے کچن سے ہوگا۔ اب صرف ہم اور ہمارا ذاتی سامان آتا تھا۔ جیسے ہی چھٹیاں منظور ہوئیں، میں روانہ ہو گیا۔ میں ہفتے کی شام گاؤں کے لیے روانہ ہوا اور رات گئے وہاں پہنچا۔ شبانہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئی اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں اسے دس دن کے لیے شہر لے جا رہا ہوں تو وہ خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اس نے رات میں ساری تیاری کر لی اور اگلے روز میں اسے لے کر شہر روانہ ہو گیا۔ ہم رات کے قریب سکندر شاہ کے بچکے پہنچے۔ کریم گیٹ پر موجود تھا، اس نے ہمیں کوارٹر پہنچایا اور سمیرا کو اٹھایا۔ اگرچہ میں نے اور شبانہ نے منع کیا تھا مگر اس نے سمیرا سے کھانا گرم کرا کے بھجوا دیا اور پھر اس نے چائے بھی بنائی تھی۔ شبانہ بہت متاثر ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”ادی تو بہت اچھی ہے۔“

”بس جب میں نہیں ہوں گا تو تم اس کے ساتھ وقت گزارنا۔“ میں نے کہا۔ ہم تھکے ہوئے تھے کھاپی کر سو گئے۔ اگلی صبح دیر سے اٹھے اور ناشتے کے بعد میں شبانہ کو سیر کرانے کے لیے نکلا۔ پہلے ہم سمندر پر گئے۔ سارا دن



## معالج

بنیاد اکثر تو بن گیا لیکن اسے سرکاری نوکری نہیں مل سکی۔ آدمی کامل مگر چالاک تھا۔ مطلب کھول کر بیٹھا تو وہ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ آخر اس نے ایک تجویز سوچی اور مطلب کے باہر بورڈ آفیزاں کر دیا۔ علاج کی فیس میں ڈالر، افاقہ نہ ہو تو سو ڈالر واپس۔ گپتا جی وکیل تھے... برائے نام وکالت چلتی تھی۔ انہوں نے اپنے زعم میں سو ڈالر جیتنے کا ارادہ کیا اور مطلب میں جا پہنچے۔ ”میری زبان کا ڈالنے ختم ہو گیا ہے۔“ انہوں نے مطلب میں چالاکی سے ایسا مرض بتایا جس میں افاقہ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ وہ خود ہی کرتے۔

بچے نے آواز لگائی۔ ”شیشی نمبر 22 میں سے چار بچے گلاس میں ڈال کر گپتا جی کو پلاؤ... ان کا ڈالنے بگڑا ہوا ہے۔“ معاون نے وہ سیال گپتا کو دیا تو گلاس سے منہ لگاتے ہی انہیں ابکاکی آگئی۔ ”یہ... یہ تو مٹی کا تیل ہے۔“ انہوں نے تھوکتے ہوئے احتجاج کیا۔

”مبارک ہو۔“ بنیا خوشی سے بولا۔ ”تمہارا ڈالنے لوٹ آیا۔ نکالو بیس ڈالر۔“

گپتا جی اسے قہر آلود نظروں سے گھور کر رہ گئے مگر انہیں فیس دینا پڑی۔

اس مکار پر تاؤ کھاتے، انہوں نے کچھ دنوں بعد دوسرا دار کرنے کا فیصلہ کیا اور اس بار اپنی یادداشت ختم ہو جانے کا مرض پیش کیا۔ بچے نے پھر وہی 22 نمبر والی آواز لگائی۔

گپتا جی تڑپ کر بولے۔ ”وہ تو مٹی کا تیل ہے... تم نے پھلی بار مجھے دہی پلایا تھا۔“

”مبارک... سلامت! تمہاری یادداشت لوٹ آئی۔ لاؤ بیس ڈالر۔“

چالیس ڈالر کے خسارے میں جانے کے بعد گپتا کا غصہ بڑھ گیا۔ کچھ دن گزرنے کے بعد وہ پھر مطلب پہنچے، اس بار بیٹائی جانے کا مرض بتایا۔

بچے کا منہ لٹک گیا۔ وہ اداسی سے بولا۔ ”افسوس کہ میرے پاس اس بیماری کا کوئی علاج نہیں ہے۔“

گپتا جی کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ آخر کار وہ جیت ہی گئے تھے۔ ”اب تم سو ڈالر نکالو۔“ انہوں نے بچے سے مطالبہ کیا۔

”بالکل... یہ تمہارا حق ہے۔“ بچے نے جیب سے گڈی نکال کر ایک نوٹ ان کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا؟“ گپتا جی نے بے ساختہ کہا۔ ”تمہارا دعویٰ سو ڈالر لوٹانے کا تھا... یہ تو بیس ڈالر کا نوٹ ہے۔“

”مبارک ہو۔“ بچے نے اسے زبردستی گلے لگا لیا۔ ”تمہاری بیٹائی بھی لوٹ آئی... لاؤ بیس ڈالر دو۔“ اپنا نوٹ اس نے واپس جیب میں اڑس لیا۔

کینیڈا سے آفتاب احمد کی شوخی

وہاں رہے۔ کھاتے پیتے رہے پھر شام کو واپس آئے۔ رات تک شبانہ سمیرا کے ساتھ لگی رہی۔ دونوں میں پہلے ہی دن دوستی ہو گئی تھی۔ رات شبانہ نے مجھ سے کہا۔

”کاش ہم ادھر رہ سکتے، کتنا اچھا ہے یہ کوارٹر، ادی سمیرا نے تو اپنا کوارٹر بہت سجا رکھا ہے۔“

میں نے اسے سمجھایا۔ ”کریم یہاں ملازم ہے، میں نہیں ہوں۔ میں تو سرکاری ملازم ہوں۔“

”پھر بھی تو سائیکس سے بات تو کر سکتا ہے یہ جگہ خالی پڑی ہے ہمیں دے دے۔“ وہ ہچل کر بولی۔ ”بھلے کرایہ لے لے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں سکندر شاہ کے لیے چوری جیسے کام میں تعاون کرتا تھا تو کیا وہ مجھے اپنی کونٹری کا کوارٹر نہیں دے سکتا۔ ویسے بھی خالی پڑا ہوا تھا۔ مگر مجھے ڈر لگتا تھا۔

ڈر شبانہ کی خوب صورتی اور سکندر شاہ کی اوباش فطرت سے لگتا تھا۔ اگر ہم یہاں مستقل رہتے تو سکندر شاہ کو شبانہ کا خیال آ سکتا تھا اور میں ایسا کوئی موقع آنے دینا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے شبانہ کو منع کیا ہوا تھا کہ جب سکندر شاہ کو کونٹری میں ہو تو وہ کونٹری میں نہ جائے۔ اس کا اب تک موقع تو نہیں آیا تھا

کیونکہ تقریباً ہر روز ہم میر و تفریح کے لیے صبح کے وقت نکلتے تھے جب سکندر شاہ سو رہا ہوتا تھا اور پھر وہ رات گئے واپس آتا جب تک ہم سو چکے ہوتے یا کوارٹر میں جا چکے ہوتے

تھے۔ شبانہ کی یہاں آمد کے پانچویں دن سکندر شاہ اور ہمارا آتنا سامنا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں ناشتے کے دوران طلب کیا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا۔

”فیضو خوش ہے اپنی عورت کے ساتھ۔“

”جی سائیکس، آپ کی مہربانی ہے۔“

اس نے سرسری سے انداز میں شبانہ کو دیکھا۔ ”میری کہاں اللہ سائیکس کی مہربانی ہے جو تجھے اتنی پیاری بیوی دی ہے۔ اسے خوب گھما پھرا اور اچھی طرح کھلا۔“

”ایسا ہی کر رہا ہوں سائیکس۔“ میں نے جواب دیا۔

”میسے کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لیتا۔“

ہم کونٹری سے نکلے تو شبانہ بہت خوش تھی اس نے کہا۔

”سائیکس تو اچھا ہے۔“

”ہاں پر عورتوں کے معاملے میں نہیں۔“ میں نے دبی زبان میں کہا۔ ”کیا تو نے گاؤں میں اس کے قصے نہیں سنے؟“

شبانہ ڈر گئی۔ ”ہاں تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

”اسی وجہ سے تجھے یہاں نہیں رکھ سکتا۔ سکندر شاہ



اچھا آدمی نہیں ہے۔ ورنہ میں اس سے کہوں تو شاید وہ کوارٹر دے دے۔“

اب تک شبانہ نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا اور اب سوچا تو وہ مجھ سے متفق ہو گئی۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”بس دعا کر میرا عہدہ اور تنخواہ بڑھ جائے اور میں تجھے یہاں رکھنے کے قابل ہو جاؤں۔“

”میں تو بہت دعا کرتی ہوں۔“ اس نے روہانے لہجے میں کہا۔ ”تو نہیں جانتا، تجھ سے دوری مجھے اندر سے کیسے کاٹتی ہے۔“

اب شبانہ کی واپسی میں چند دن رہ گئے تھے۔ اتوار کو میں اس کی فرمائش پر پھر اسے سمندر پر لے گیا۔ ہم سارا دن وہاں رہے۔ مجھے جمعات سے ڈیوٹی پر جانا تھا اور میں اسے منگل کو واپس چھوڑنے جاتا۔ جب ہم واپس آئے تو شبانہ کی طبیعت گری گری سی تھی۔ وہ جلدی سو گئی اور میں نے بھی اسے نہیں چھیڑا۔ صبح بھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دس بجے مجھے سکندر شاہ نے طلب کیا۔ ”فیض میرے ساتھ چل، کچھ دیر کا کام ہے۔“

”دفتر کا ساکس؟“

”دفتر سے تو چھٹی ہے، میرا کام ہے۔“ اس نے کہا۔ میں نے شبانہ کو بتایا کہ میں ساکس کے ساتھ کام پر جا رہا ہوں اور وہ آرام کرے۔ میں سکندر شاہ کے ساتھ اس کی گاڑی میں نکلا اور ہم بندرگاہ کے علاقے میں آئے۔ سکندر شاہ مجھے لے کر پچھروں والے حصے میں آیا اور اس نے کال کر کے رحیم بخش کو بلایا۔ اسے ایک طرف لے جا کر کچھ دیر اس سے بات کرتا رہا پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”اس کے ساتھ جا اور یہ جو کہے کرنا ہے، میں یہاں موجود ہوں۔“

میں رحیم بخش کے ساتھ اس کی کشتی میں روانہ ہوا۔ کچھ دیر بعد ہم کھلے سمندر میں تھے۔ رحیم بخش انجن سے کشتی چلا رہا تھا اس لیے اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ ایک گھنٹے میں ہم ماہی گیروں کے ایک چھوٹے سے گاؤں پہنچے اور وہاں کشتی کنارے روک کر رحیم بخش میرے ساتھ ایک مکان تک آیا، یہ سمندر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دروازہ بجانے پر اندر سے ایک بوڑھا آدمی نکلا۔ اس نے تپاک سے ہم سے ہاتھ ملایا اور ہمیں اندر لے گیا۔ اس نے ہمیں کولڈ ڈرنک پلائی اور رحیم بخش کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا۔ مجھے بے چینی تھی کہ ہم واپس جائیں۔ کولڈ ڈرنک کے بعد بوڑھا کھیر لے آیا اور ہم نے کھیر کھائی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اندر سے کئی

بڑے بڑے بٹل لایا جو مصنوعی ریپے کی بور یوں میں بند تھے اور ان پر پولی تھین چڑھی ہوئی تھی تاکہ اندر جو ہے وہ پانی سے محفوظ رہے۔

میں نے اٹھا کر دیکھا تو مجھے لگا کہ اس میں کپڑا یا اس جیسی کوئی چیز بھری ہے۔ بوڑھے نے مدد کی اور بٹل اٹھا کر کشتی تک لایا۔ ان کی تعداد نصف درجن تھی۔ رحیم بخش نے ان پر ماہی گیری کا جال ڈال دیا کہ کسی کو نظر نہ آئیں۔ پھر ہم واپس روانہ ہوئے۔ مگر عین بندرگاہ کے پاس انجن بند ہو گیا۔ اس کا تیل ختم ہو گیا تھا اور باقی فاصلہ ہم نے چھوڑوں کی مدد سے طے کیا۔ واپسی میں ڈیڑھ گھنٹے کا وقت لگا تھا۔ سکندر شاہ بے چینی سے ہمارا منتظر تھا۔ وہ رحیم بخش پر برس پڑا اور اسے دیر سے آنے پر سناٹا کیا۔ وہ اس سے معذرت کرتا رہا پھر اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے یہ بٹل سکندر شاہ کی گاڑی تک پہنچائے۔ رحیم بخش خود بھی گاڑی تک آیا تھا۔ جب سکندر شاہ گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اس نے آہستہ سے کہا۔

”صاحب تم سے اللہ بخش کا کہا تھا، پولیس اسے نہیں چھوڑ رہی ہے۔ ایف آئی آر کٹ گئی تو پھر بہت مشکل ہو جائے گی۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں جتنے وہ مانگ رہی ہے۔“

”دیکھتا ہوں۔“ سکندر شاہ نے ٹالنے والے انداز میں کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ مجھے شبانہ کی فکر تھی، اس کی طبیعت خراب تھی۔ اگرچہ وہاں سیرا تھی مگر مجھے پھر بھی فکر تھی۔ ہم واپس آئے تو شبانہ بے سدھ پڑی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی طبیعت اور خراب ہو گئی ہے۔ سیرا کوٹھی میں کام کر رہی تھی۔ میں اسے ٹیکسی میں ڈال کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے شبانہ کا معائنہ کیا اور بولا۔ ”اسے کمزوری ہے اور ٹھکن بھی ہے مگر خطرے کی بات نہیں ہے۔“

اس نے شبانہ کو ڈرپ لگائی اور کچھ دوائیاں دیں تو چند گھنٹے میں اس کی حالت سنبھل گئی۔ مگر جب میں اسے واپس کوٹھی لایا تو اس کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔ اس نے کہا۔ ”فیض مجھے گاؤں لے چل، اب مجھے یہاں وحشت ہو رہی ہے۔“

”ہم کل چلیں گے۔“

”نہیں ابھی لے چل۔“ وہ وحشت زدہ لہجے میں بولی۔ میں نے بہ مشکل اسے بہلایا۔ سیرا مصروف تھی ورنہ وہ آجاتی تو شبانہ اس کے ساتھ بھل جاتی۔ مگر وہ سارا دن نہیں آئی بس کریم کے ہاتھ کھانا اور چائے وغیرہ بھجواتی



بخش گرم جوشی سے ملا۔

”بیوی کے جانے کے بعد تو نے صورت ہی نہیں دکھائی۔“

”بس یار اسے چھوڑ کر آیا تو ڈیوٹی پہ لگ گیا۔ ان دنوں اور ٹائم بھی چل رہا ہے اس لیے آنے کا موقع نہیں ملا۔ آج چھٹی کا دن تھا اس لیے آ گیا۔ سائیکس سے بھی ایک کام تھا۔“

کریم مجھے اپنے کوارٹر کے برآمدے میں لے آیا۔ یہ ایک کمرے والے کوارٹر تھے جن میں ہاتھ روم اور چھوٹا سا بچن ساتھ ہی تھے اور کمرے کے آگے برآمدہ تھا۔ کریم بخش نے وہیں چار پائی ڈال رکھی تھی۔ سمیرا کوٹھی میں تھی۔ میں کریم سے گپ شپ کرتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب سمیرا آئی۔ وہ میرے اور کریم کے لیے ناشا لائی تھی۔ ہم نے ناشا کیا اس کے بعد سمیرا نے کریم کو ایک لسٹ پکڑائی۔ ”یہ سامان لے آ، مجھے جلدی چاہیے۔“

”چل فیض۔“ کریم نے مجھ سے کہا۔

”ادا کو چھوڑ دے، میں نے صاحب کو بتا دیا ہے کبھی بھی اسے بلوالے گا۔“ سمیرا بولی تو کریم مجھے چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ اسے واپس آنے میں دیر لگی اور میں اس سے پہلے ہی سکندر شاہ سے مل کر واپس چلا گیا۔ اس شام میری طبیعت خراب ہو گئی اور میں کئی دن بخار میں بھٹکتا رہا۔ ڈیوٹی پر بھی نہیں جاسکا، ایک سائیکس کے توسط سے بیماری کی چھٹی کی درخواست بھجوا دی تھی۔ تین دن بعد طبیعت بہتر ہوئی تو میں ڈیوٹی پر گیا تھا۔ ڈیوٹی کے بعد پیاس بجھانے کے لیے مانی گیروں کے علاقے کے ساتھ لگی مشین پر۔ میں ابھی رس پی رہا تھا کہ میری نظر رحیم بخش پر پڑی، میں نے اسے آواز دی۔ اس نے چونک کر دیکھا اور پھر میری طرف آیا۔ اس نے بے دلی سے ہاتھ ملایا اور اتنی ہی بے دلی سے بولا۔

”کیا حال ہے فیض محمد؟“

”ٹھیک ہے تم سناؤ، تیرا بھائی چھوٹا؟“

”کہاں؟“ وہ لٹی سے بولا۔ ”اسے چرس کے کیس

میں پھنسا یا اور دو لاکھ روپے مانگ رہے ہیں، ادھر چرس

بیچنے والا دو لاکھ کہاں سے دے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ یہاں مختلف لوگوں کا اتنا

حصہ ہوتا تھا کہ سب دے دلا کر آدمی کے پاس بہ مشکل

گزارے لائق بچتا تھا۔ میں نے ہمدردی سے کہا۔ ”یہ تو عظم

ہے، ان لوگوں سے بات کرو جو حصہ لیتے ہیں۔“

”سب سے کر لیا ہے پر کوئی ساتھ نہیں دے رہا۔“

رہی۔ رات کو میں نے شبانہ کی حالت دیکھ کر اسے زبردستی غیند کی گولی دے دی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی، ہمارا ہار جھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اس کے پاس رہوں۔ اس کی یہ کیفیت میری سمجھ سے باہر تھی۔ وہ سوئی تو میں بھی سو گیا۔ اگلے دن اٹھ کر ہم نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ میں افسردہ تھا اور شبانہ بے چین تھی۔ جب ہم سکندر شاہ کی کوٹھی سے نکلے تو اس نے مجھ سے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”فیض اب مجھے کبھی یہاں مت بلانا۔ کبھی بھی نہیں۔“

”شبانہ کیا ہو گیا ہے تجھے، ابھی پرسوں تک اتنی خوش تھی۔“

”بس مجھے کچھ ہو گیا ہے۔“ اس نے کھوئے ہوئے

انداز میں کہا۔ شاید طبیعت کی خرابی نے اس پر اثر ڈالا تھا اور وہ

بدول ہو گئی تھی۔ ہم بس میں روانہ ہوئے تو میرے خیال کے

برعکس راستے میں اس کی طبیعت ٹھیک رہی تھی۔ میں نے

احتیاطاً ڈاکٹر کی دی ہوئی ہدایات کے ساتھ رکھ لی تھی۔ مگر ان کے

استعمال کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ شبانہ راستے بھر خاموش رہی

اور اس نے مجھ سے بہت کم بات کی تھی۔ ہم گاؤں پہنچ گئے۔

میں ایک رات وہاں رہا اور اگلے دن واپس روانہ ہو گیا۔ پہلے

میں جانے لگا تو شبانہ کی ترپد کھینچوائی ہوئی تھی مگر اس بار وہ

کھوئی سی رہی اور میں اس کی وجہ اس کی طبیعت کی خرابی سمجھا

تھا۔ اتنے دن شبانہ کے ساتھ گزر کر اب اس سے جدا ہونے کو

دل نہیں چاہ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ دل میں، میں نے ارادہ پختہ

کر لیا کہ اب بھلے ایک کمرے کا مکان ملے اور اگر وہ دارے

میں آ رہا ہو تو اسے لے کر شبانہ کو بلا لوں گا۔

اس عرصے میں بابا نے میری اور ایاز کی شادی پر جو

قرض لیا تھا وہ اترنے والا تھا اور اب ایاز بکریاں چراتا تھا۔

اس نے گھر کا خاصا بڑا کر لیا تھا۔ بابا زمین پر کام کرتا تھا مگر

وڈیرے مقدر شاہ نے اسے ایک طرح سے سپروائزر بنا دیا

تھا اور بابا کو محنت والے کام نہیں کرنا پڑتے تھے۔ اگر میں

گاؤں رہتا تو بھیجتا یا کم بھیجتا تب بھی گزرا چل سکتا تھا۔ اب

میں شبانہ سے مزید دور نہیں رہ سکتا تھا۔ میں واپس آیا اور

اگلے دن سے اپنی ڈیوٹی پر آ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب

سکندر شاہ نے مجھ سے کام کا کہا تو میں اپنی ترقی کی بات

کروں گا۔ مگر اس بار سکندر شاہ نے مجھ سے کام کا کہا ہی

نہیں۔ ایک موبیلا گزر گیا اور میں نے سوچا کہ اب خود جا کر

اس سے بات کروں۔ ہو سکتا ہے کسٹینرز سے مال چوری کے

معاملے میں اب سختی ہو رہی ہو اور اس وجہ سے سکندر شاہ کو

موقع نہیں مل رہا ہو۔ ایک اتوار کو میں خود کوٹھی پہنچ گیا۔ کریم



”تم نے اس دن سکندر شاہ سے بات کی تھی۔“

”میں کرتا ہوں صاحب۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”پر وہ

بہت ضدی عورت ہے۔“

سکندر شاہ کے حوالے پر اس نے نظریں چرائیں۔

”ایک بار میرے پاس آجائے اس کی ساری ضد

”وہ بھی کچھ نہیں کر رہا ہے۔“

نکل جائے گی۔“ سکندر شاہ نے واہیات لہجے میں کہا۔

”تم اس سے ملو اور بار بار کہو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”آج رات تیار رہنا مال نکالنا ہے۔ تین بجے کے بعد کسی

”میں اسی کے پاس جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

وقت کال کروں گا۔“

”اس نے کال کر کے...“ وہ بولتے بولتے رک گیا جیسے

”میں تیار رہوں گا صاحب۔“ رحیم بخش نے کہا۔

اس نے غلطی سے بات کہہ دی ہو۔ پھر اس نے جلدی سے

”پرفیض محمد تو آج صبح کی ڈیوٹی پر تھا۔“

مجھ سے ہاتھ ملایا اور روانہ ہو گیا۔ میں رس پی چکا تھا، گلاس

”اسے چھوڑو، رات والے کو میں ہٹا دوں گا۔“

رکھ کر میں بھی روانہ ہوا مگر میرا رخ گیٹ کے بجائے دفاتر

سکندر شاہ نے کہا۔ ”بس ایک مشکل ہے۔ ظفر بیمار ہے، آج

داخل ہو رہا تھا، میں اس کے پیچھے رہا۔ شام کے وقت اکثر

مجھے خود کام کرنا پڑے گا مگر اتنا مشکل نہیں ہے۔“

اسٹاف چھٹی کر کے جا چکا تھا اس لیے عمارت تقریباً خالی تھی۔

”ٹھیک ہے صاحب، میں چلتا ہوں۔“

اگر سکندر شاہ اس وقت یہاں موجود تھا تو اس کی یقیناً کوئی

اس کے باہر آنے سے پہلے میں اس جگہ سے ہٹ

خاص وجہ ہوگی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس نے رحیم بخش کو

کر ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے اسے باہر جاتے دیکھ

کیوں بلایا تھا۔ رحیم بخش اس کے کمرے میں داخل ہوا تو

سکوں۔ وہ نکل کر چلا گیا تو میں بھی وہاں سے نکل آیا اور

میں لپک کر دروازے کے پاس پہنچا اور اس سے پہلے کہ

ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ آج میری مارننگ شفٹ تھی جو

دروازہ پورا بند ہوتا میں نے اسے روک لیا۔ اب وہ ذرا سا

چار بجے ختم ہو جاتی ہے۔ اس وقت چھ بج رہے تھے اور

دن چھوٹے ہونے کی وجہ سے شام ڈھل چکی تھی۔ کچھ دیر

میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے سات بجے کھانا کھایا اور

کھلا ہوا تھا اور مجھے اندر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ہوٹل سے اٹھ آیا کیونکہ وہاں بیٹھے رہنے کی صورت میں

رحیم بخش نے کہا۔ ”صاحب آپ نے بلایا؟“

بہت سے لوگ مجھے دیکھ سکتے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ

”ہاں، تم نے کیا سوچا؟“

کوئی مجھے دیکھے اور یاد رکھے کہ میں اس وقت بھی پورٹ پر

”صاحب اللہ بخش کی بیوی نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے،

تھا۔ ایک جگہ کچھ خالی کنٹینرز عرصے سے بے کار کھڑے

میں عزت دار عورت ہوں۔“

تھے اس میں یہاں پورٹر کا کام کرنے والے آرام کرتے

”تب میرے پاس کیا لینے آئی تھی۔“ سکندر شاہ کا

تھے۔ وہ کسی بحری جہاز کی آمد کی صورت میں دو دو دن بھی

لہجہ بگڑ گیا۔ ”اسے بولو تو جانے جائے اور وہاں پانچ دس کو

کام کرتے تھے اور دس بارہ گھنٹے کام کر کے وہ دو تین گھنٹے

خوش کرے گی تو اس کا شو ہر چھوٹ کر آجائے گا۔“

آرام کر کے پھر سے کام میں لگ جاتے تھے۔ آرام

معاملہ واضح تھا۔ اللہ بخش کی بیوی اس کی رہائی کے

کرنے کے لیے یہ کنٹینرز استعمال کرتے تھے۔

لیے سکندر شاہ کی منت سماجت کرنے لگی تھی اور اس کا عورت

میں ایسے ہی ایک کنٹینر کی چھت پر آ گیا۔ یہاں

پر دل آ گیا۔ اس نے رہائی کے لیے شرط رکھ دی مگر عورت

پرانے فوم اور گشن پڑے تھے جن سے بدبو اٹھ رہی تھی مگر

نہیں مان رہی تھی۔ رحیم بخش خاموش تھا۔ سکندر شاہ نے کچھ

محنت کشوں کے لیے اس بو کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس

دیر بعد کہا۔ ”اسے بولو بس دو دن ہیں پھر پولیس اس پر

وقت بھی یہاں تین چار محنت کش بے سدھ پڑے ہوئے

مقدمہ کر دے گی اور وہ کم سے کم پانچ سال کے لیے جیل

تھے۔ میں بھی ایک طرف لیٹ گیا اور آسمان پر نظر آنے

جائے گا۔ اگر وہ راضی ہو تو کل رات اسے میرے بچکے پر

والے تارے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ بعض انسان دوسروں

لے آتا۔“

کے لیے کس قدر باعث آزار بن جاتے ہیں۔ وقت گزر رہا

رحیم بخش نے بے غیرتی سے کہا۔ ”میں بات کرتا

رہا۔ بارہ بج گئے۔ اس دوران میں سونے والے محنت کش

ہوں اس سے۔“

اٹھ کر چلے گئے اور ان کی جگہ دوسرے آ گئے۔ کسی نے مجھ

”بات مت کرو، اسے راضی کرو۔ ورنہ تمہارا بھائی

پر توجہ نہیں دی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ سکندر شاہ اور

جیل چلا گیا تو یہ دھندا بھی تمہارے ہاتھ سے جائے گا۔“

سکندر شاہ نے اس پر مزید دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

جاسوسی ڈائجسٹ



رجیم بخش کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ جو کارروائی ہونی تھی وہ میری ڈیوٹی والے سیکشن میں ہونی تھی۔ میں دو بجے کے بعد اٹھ کر بیچے آیا۔ ایک نلکے سے منہ ہاتھ دھویا اور پھر ایک کباڑ خانے سے اپنے مطلب کی چیز نکال کر میں کنٹینرز یا رڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔

آج وہاں سناٹا تھا یعنی کوئی سرگرمی نہیں تھی۔ رات کا چوکیدار بھی نظر نہیں آ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ سکندر شاہ نے اسے یہاں سے ہٹا دیا تھا۔ میں ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں سے میں ہر طرف نظر رکھ سکتا تھا۔ پونے تین بجے کے قریب سکندر شاہ وہاں پہنچا۔ آج اوزاروں والا تھیلا اس نے اٹھایا ہوا تھا۔ اس کا آدمی ظفر بیمار تھا مگر اس نے اتنے عرصے میں سارے کام خود سیکھ لیے تھے اور وہ بھی کنٹینرز کھول سکتا تھا۔ جب وہ ایک سیکشن میں گھسا تو میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ اتنے عرصے میں اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کون سا سیکشن کہاں ہے؟ وہ سی تھری میں آیا۔ یہ بھی خاصا اندر گھسا ہوا سیکشن تھا اور یہاں سارے ہی باہر جانے والے کنٹینرز تھے۔ سکندر شاہ ایک کنٹینرز کے سامنے رکا، اس نے پہلے اوزاروں سے تالا کھولا اور اس کے بعد سیل اتار کر کنٹینرز کے دروازے کھولے۔ جیسے ہی وہ اندر گیا، میں بھی دبے قدموں اس کے پیچھے چلا گیا۔

پندرہ منٹ بعد میں نے کنٹینرز کو بند کر کے لاک کیا اور سیل لگا دی جو سکندر شاہ ساتھ لایا تھا، میں بھی اتنے عرصے میں دیکھ کر ان کاموں کو جان گیا تھا۔ پھر سارا سامان بیگ میں بھرا اور اسے لے کر جیٹی کے کنارے تک آیا۔ میں نے آس پاس دیکھا اور بیگ پانی میں پھینک دیا۔ وزنی ہونے کی وجہ سے وہ فوراً ہی ڈوب گیا۔ یہاں پانی کی گہرائی کم سے کم پچاس میٹرز تھی اس لیے بیگ کے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں واپس آ رہا تھا کہ ایک طرف سے دو افراد نمودار ہوئے، میں جلدی سے ایک ڈرم کی آڑ میں ہو گیا۔ آنے والا رجیم بخش تھا اور اس کے ساتھ ایک عورت تھی جو اللہ بخش کی بیوی تھی۔ اس کا پتا مجھے ان دونوں کی گفتگو سے چلا۔ رجیم بخش کہہ رہا تھا۔ ”ایک رات کی تو بات ہے پھر اللہ بخش چھوٹ کر آ جائے گا۔ تو چاہے تو اسے بھی پتا نہیں چلے گا۔ آج تو سکندر شاہ کے ساتھ جائے گی اور کل صبح اللہ بخش گھر آ جائے گا۔“

میں نے ملکی روشنی میں دیکھا، عورت چاند کی طرح چمک رہی تھی اور اسی وجہ سے سکندر شاہ اس کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ سکندر شاہ نے کل بلوایا تھا مگر رجیم بخش اسے آج

بے ضمیو

ہی جانے کو کہہ رہا تھا۔ مگر نہیں معلوم نہیں تھا کہ سکندر شاہ اب اسے یا کسی بھی عورت کو کبھی اپنے بچکے پر نہیں بلو اسکے گا۔ وہ کچھ دیر وہاں ر کے اور پھر آگے بڑھ گئے۔ رجیم بخش یقیناً سکندر شاہ کی کال کا انتظار کر رہا تھا جو کبھی آنے والی نہیں تھی۔ کیونکہ سکندر شاہ اس وقت کنٹینرز میں اس حالت میں بند تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اتنی مضبوطی سے باندھا تھا اور سامان میں اتنا اندر ٹھونس دیا تھا کہ وہ کسی صورت خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی وہ کسی کو مدد کے لیے متوجہ کر سکتا تھا۔ لوہے کے پائپ کی ایک ضرب نے اسے لمحے میں بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے بعد کا کام بہت آسان ثابت ہوا تھا۔

جب شبانہ میرے ساتھ واپس گاؤں گئی اور اس کی کیفیت عجیب سی تھی تب میں اسے طبیعت خرابی سمجھا تھا مگر اصل حقیقت مجھے سمیرا نے بتائی تھی۔ وہ عورت تھی اور اسی وجہ سے اس سے یہ بات برداشت نہیں ہوئی تھی۔ سکندر شاہ نے مکاری سے کام لیا۔ مجھے لے کر بندر گاہ آیا اور رجیم بخش کے ساتھ بھیج دیا۔ اس کے فوراً بعد وہ واپس آیا۔ کریم بھی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے سمیرا کو حکم دیا کہ وہ اپنے کوارٹر میں رہے اور جب تک وہ نہ بلائے وہ باہر نہ آئے۔ یہ حکم دے کر سکندر شاہ ہمارے کوارٹر میں گھس گیا۔ سمیرا اپنے کوارٹر میں رہی اور شبانہ کی کھٹی کھٹی چیخیں سنتی رہی۔ سکندر شاہ ایک گھنٹے سے بھی پہلے واپس چلا گیا اور تب سمیرا گئی اور اس نے شبانہ کی حالت درست کی۔ میں آیا تو مجھے لگا کہ سب ٹھیک ہے۔ شبانہ نے مجھے نہیں بتایا لیکن میں اسے قصور وار نہیں سمجھتا۔ اس واقعے کے نو۔۔ ماہ بعد میں باپ بن گیا تب بھی اسے قصور وار نہیں سمجھتا۔

میرا بیٹا جس کے بارے میں، میں نہیں جانتا کہ وہ میرا ہے یا نہیں۔ مگر میں اسے اپنے بیٹے کی طرح پال رہا ہوں۔ اب شبانہ میرے پاس ہے اور پھر امید سے ہے۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ میں کبھی اسے نہیں بتاؤں گا کہ مجھے سب معلوم ہے۔ یہ راز ہمیشہ راز رہے گا۔ جیسے یہ راز شاید ہمیشہ راز رہے کہ سکندر شاہ کہاں گیا۔ وہ پھر نہیں ملا۔ وہ کنٹینرز کہاں گیا، میں نہیں جانتا اور یقیناً سکندر شاہ کی لاش برآمد ہوئی ہوگی مگر وہ پھر کہاں گئی یہ بھی ایک راز ہے۔ مجھے امید ہے یہ راز ہی رہے گا۔

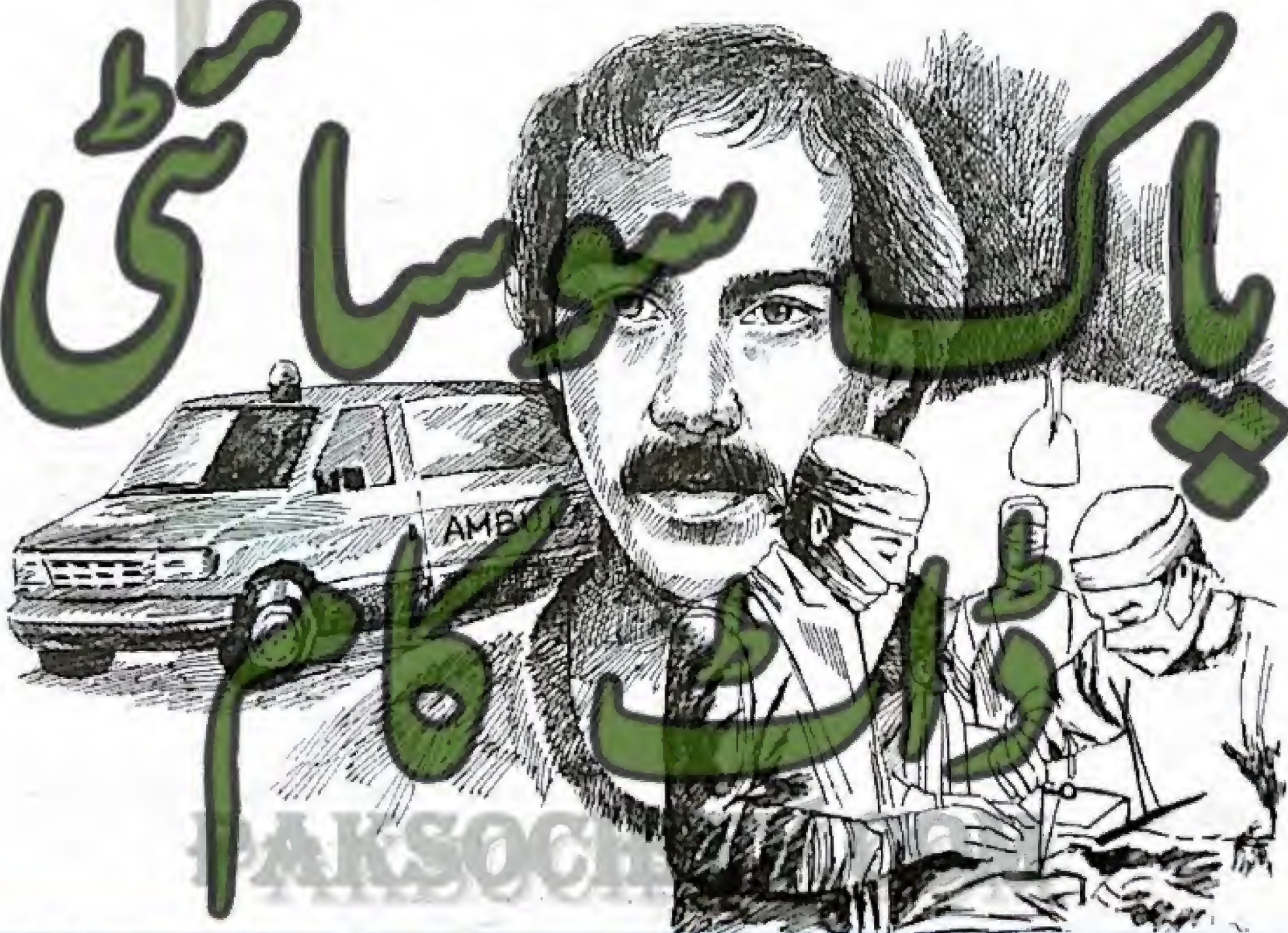


# دل

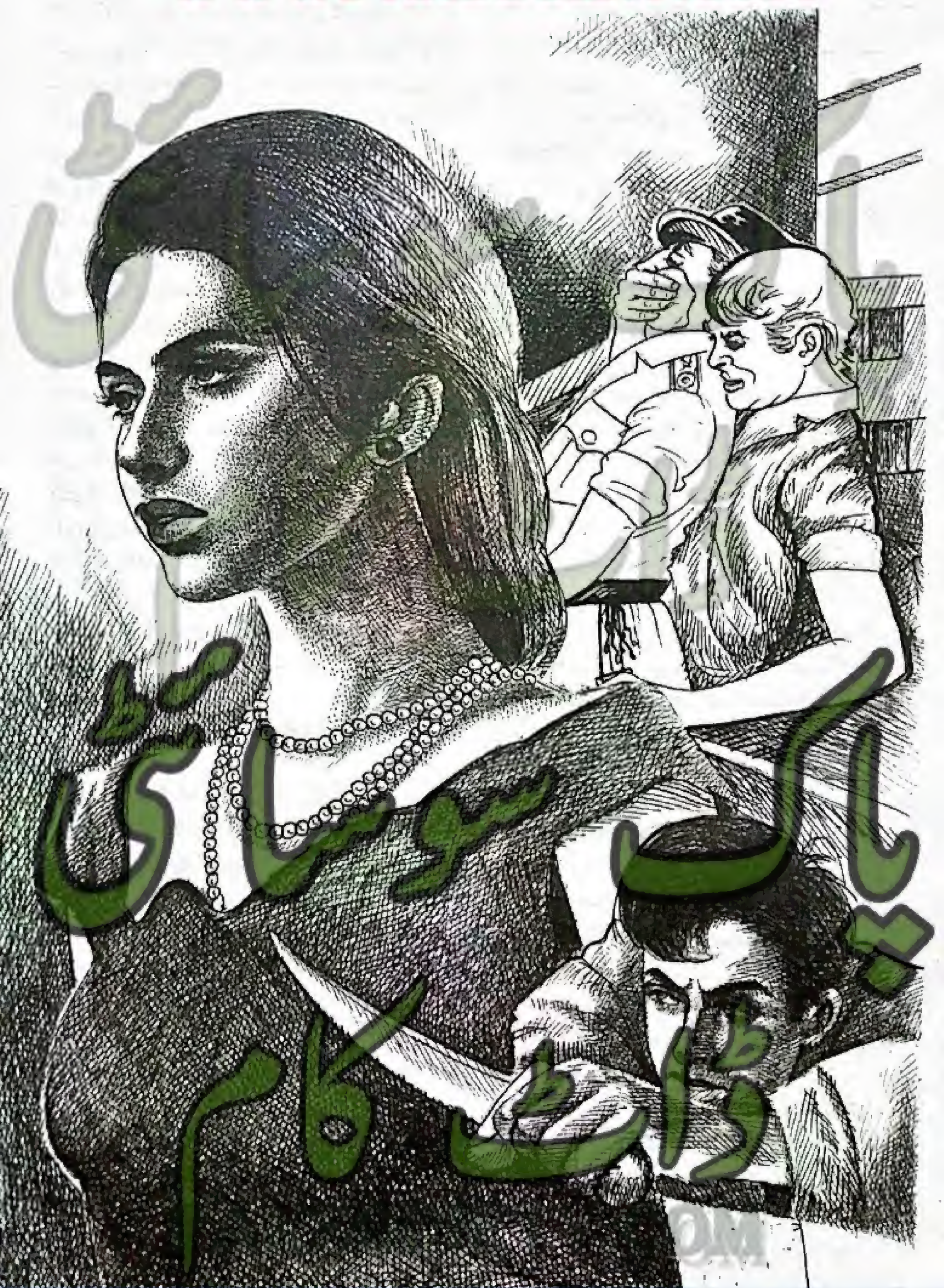
## جبار توقیر

تیس برس پہلے یہاں موبائل فون تھانہ کمپیوٹر... انسان اور انسانی رویے بہت سیدھے سادے تھے... زندگی خاصی آسان تھی... آج کے لحاظ سے اجرتیں بہت کم تھیں... لیکن پھر بھی بچت ہو جاتی تھی کیونکہ معاشرے پر حرص و ہوس کی گرفت رواج نہیں پاسکی تھی... جبار توقیر مرحوم اس دور میں اپنے انداز کے ایک مقبول اور ایوارڈ یافتہ ادیب تھے... ان کی یہ غیر مطبوعہ کہانی معراج رسول کی ایک فائل سے دریافت ہوئی... جس میں غیر مطبوعہ مگر اہم مسودے موجود تھے... قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے منفرد ذائقے والی یہ کہانی توشہ خاص کے طور پر پیش خدمت ہے۔ جس میں جابجا تین عشروں پرانی معاشرت کی جھلکیاں نمایاں طور پر موجود ہیں... حسِ مزاح... جرم اور کردار سازی کے انوکھے رنگ و روپ میں شائستگی کے ساتھ نئے نئے موڑ اختیار کرتی تحریر کے نشیب و فراز...

دولت کے گرد گھومتی تکون کے پارہ پارہ ہو جانے کا خوفی ماجرا...









جو کچھ بھی ہوا، میں اسے تقدیر کہہ کر اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا تھا۔ مجھے اس سانپوں کی ہاسی میں ہاتھ ڈالنا ہی نہیں چاہیے تھا مگر وہ جو آدمی کے اندر ایک رنگ آدمی اتر جاتا ہے، وہ میرے وجود میں بھی خدا جانے کب سے پل رہا تھا۔ میں اس کی گرفت میں آیا تو پھر پیچھے نہ ہٹ سکا۔ میرے بچاؤ کی ساری راہیں مسدود ہو گئیں اور وہ سب کچھ ہو گیا جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ہوا یوں کہ شعیب صاحب بھی اس گھر سے ایک دن منہ لٹکائے واپس آگئے اس طرح کہ ان کا وہ رنجیت سنگھ کے زمانے کا تھیلا ان کے ہاتھ میں جمبول رہا تھا۔ جس میں وہ مختلف قسم کے خلاصے بند کر کے ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے۔ ان کی وہ بالائی ہونٹ پر جمبولتی ہوئی ناک یہ احساس دلاتی تھی کہ وہ بہت بے آبرو ہو کر لوٹے ہیں۔ ان کی وہ ناک دراصل بہت ہی حساس قسم کا اینٹینا تھی۔ جب وہ بہت نیچے جھک آتی تو میں سمجھتا تھا کہ ان پر شدید بیزاری کی کیفیت طاری ہے۔ جب ان کے نتھنے پھڑکتے تھے تو مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ ان پر غم و اندوہ کی پورش بڑھ گئی ہے مگر اس روز ان پر دونوں ہی کیفیتیں طاری تھیں اور ظاہر کرتی تھیں کہ ان کے دل و دماغ پر جرم کے کوئی تصویر نازل نہیں ہو رہی ہے۔ ان کے ادراک کی اسکرین تاریک پائی جاتی تھی۔ نتھنے بھی پھڑک رہے تھے جو اس بات کی علامت تھے کہ دنیا سے ان کا جی بیزار ہو چکا ہے۔

”کیا ہوا مولانا آپ تو باقاعدہ رونے پر آمادہ نظر آتے ہیں؟“  
وہ تھیلے اپنی جھلنگ سی چار پائی پر پھینک کر کئی قسم کی رنگین عربی قاری کی گالیاں دیتے ہوئے بولے۔  
”اس نے مجھے جواب دے دیا ہے۔ اس رنگ النسا نے۔“

”اچھا یہ یعنی آپ کو جواب بھی ملتا تھا وہاں سے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا تھا کہ اب تو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگے۔“

”آپ بکو اس کرتے ہیں۔ ایک دم مجبول آدمی ہیں آپ، ہماری آج ایسی تو ہیں ہوئی ہے کہ ہم زندگی پر موت کو ترجیح دیتے آئے ہیں۔“

”اچھا یعنی تو بت بہ این جار سید۔ آخر اس پردہ نشین نے کہا کیا ہے۔ آپ نے اپنی قابلیت کے بل بوتے پر اسے مغلوب نہیں کیا؟“

”خاک مغلوب کرتے۔ وہ سامنے آتی تو ہم اس کو جاسوسی ڈائجسٹ

وہیں قتل کر دیتے۔ واللہ ایسی نالائق اور نامعقول خاتون ہے وہ۔“

”مگر ہوا کیا ہے، آپ خود کھست تسلیم کرنے والے آدمی تو نہیں ہیں؟“

”وہ... وہ... اس نے کہا کہ ہنگی کی تعلیمی ترقی میں ہم معاون ثابت نہیں ہو رہے۔“

”مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ انگریزی، حساب، فارسی، عربی اور تاریخ جغرافیہ کے علاوہ دیگر علوم میں بھی یدِ طولی رکھتے ہیں مولانا۔“

”لعنت بھیجیں ہاشمی صاحب! وہ... دراصل آدم بیزار خاتون ہے۔ ہم نے ہنگی کو پرسوں یہ سمجھایا تھا کہ ضلع انک صوبہ سرحد میں واقع ہے... جب ہم نے دسویں پاس کی تو اس وقت وہ صوبہ سرحد کا ہی حصہ تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے بعد میں اگر ردوبدل ہو گیا تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ ہنگی نے کہیں اندر جا کر خاتون کو بتا دیا۔ بس اسی بات پر وہ بھڑک اٹھی اور ہمیں ڈھائی سو روپے دے کر آج سے برخاست کر دیا۔“

”آپ نقصان میں تو نہیں رہے، پڑھایا تو آپ نے پندرہ ہی دن ہے۔“

”وہ دربان زادی خبیث نجمہ بی بی بھی یہی کہہ رہی تھی۔ مگر یہ کوئی شرافت ہے ہاشمی صاحب! ہم... ہم ایم اے، ایم او ایل ہیں۔ کیا قدر کی اس حرافہ نے ہماری۔ ہنگی تو پانچویں میں ہی پڑھ رہی ہے نا۔ میں دھوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی میٹرک بھی پاس کر سکے گی۔ ایک دم کند ذہن ہے وہ ہنگی۔ وہ میمنہ...“

”کیا نام بتایا ہے آپ نے اس کا... میمنہ! یہ کیا بات ہوئی؟“

”میمنہ ہے نام اس کا مگر ہے وہ میمنے ایسی۔ ایک دم داہیات کند ذہن نالائق غبی۔“ شعیب صاحب کی ناک کے نتھنے کچھ اور پھڑکنے لگے تھے۔

”یہ تو بہت بُرا ہوا شعیب صاحب! پہلے وہ مولانا عبدالباری بھی بہت ذلیل ہو کر نکلے تھے وہاں سے۔ ان پر بھی نالائقی کا ہی الزام تھا۔“

”وہ کچھ اور چاہتی ہے ہاشمی صاحب! کچھ اور جو میں اسے نہیں دے سکتا۔ کوئی بھی نہیں دے سکتا۔“

”نہیں ہاشمی صاحب! آپ نے ابھی بتایا تھا کہ وہ ہمیشہ پردے میں رہتی ہے اس کا ناخن تک کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ پھر وہ...“



”میں اخبار نہیں پڑھتا تو اس کی مقبول وجہ ہے۔ اس میں خوش تصویریں چھپتی ہیں۔ گندی گندی جرائم کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ میں اپنا دین، ایمان خراب نہیں کر سکتا۔ ایسے چیتھڑا اخبار پڑھ کر۔“

”ہاں آدمی کو اپنا ایمان تو ہر حالت میں درست رکھنا چاہیے۔ کیا پتا کب آدمی کو گاڑی سے باہر پھینک دیا جائے۔ موت کا تو کوئی وقت متعین نہیں ہے نا۔“ میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

مولانا نے اپنے بوٹ اتار لیے۔ ان کی جرابوں کی بُو کمرے میں پھیلنے لگی تو میں اٹھ کر کوارٹر سے محن میں نکل گیا۔ شعیب ہانگی صاحب کی سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ وہ نہ اپنی جرابیں دھوتے تھے نہ پیر، اور وہ بوٹوں کے اندر پسینے میں بھیگ بھیگ کر ایسی بدبودار ہو جاتی تھیں کہ وہ جب پیر کھولتے تھے تو چاروں اطراف کی ہوا آلودہ ہو جاتی تھی۔

اس وقت شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے، سورج غروب ہونے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ میں محن میں نکلا تو ٹھنڈی ہوائ نے مجھے یہ احساس دلایا کہ سرما اپنا رنگ دکھانے لگا ہے۔ باہر تار پر ٹکٹا کبل اوڑھ کر میں چھوٹے سے برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ اس پری ویش مخفی کے طرز عمل نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ عبدالباری بھی وہاں سے ناکام لوٹ آیا تھا۔ اب شعیب صاحب بھی بھنائے ہوئے واپس آئے تھے۔ وہ پرپوش کسی کو خاطر میں ہی نہ لاتا تھی۔ ان دونوں نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔ وہ خاتون جس کی وہ ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکے تھے، ایک وسیع و عریض کونجی میں رہائش پذیر تھی۔ اس کا باپ نبی احمد اورنگ چالیس لاکھ روپیہ نقد بینک میں اپنی بیٹی کے لیے تر کے میں چھوڑ کر انتقال کر گیا تھا اور اب وہ پری ویش مخفی اتنی بڑی دولت کی تہا مالک تھی۔ کونجی بھی اپنی مالیت کے اعتبار سے 90 لاکھ روپے سے کم کی نہیں تھی۔ اورنگ صاحب محکمہ تعمیرات کے ٹھیکے دار تھے اور اتنے کامیاب کہ کسی بھی سودے میں انہیں کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔

مخفی کی طرف سے کئی ماہ پہلے اخبار میں اشتہار چھپا تھا کہ انہیں ایک ٹیوٹر کی ضرورت ہے جو پانچویں جماعت کی انگلش میڈیم میں پڑھنے والی لڑکی کو پڑھا سکے۔ عبدالباری سے پہلے مخفی نے دو آدمیوں کو آزما کر برطرف کر دیا تھا۔ پھر باری بھی اپنی قابلیت کا لوہا نہ منوا سکا اور وہ بھی مخفی کے متولیین میں شمار ہو گیا۔ اس کا نیا ہدف مولانا محمد شعیب

”یہی تو میں حیران ہوں جناب! اب دیکھیں نا، جو کچھ بچی پڑھتی ہے اس کا روزانہ وہ امتحان لیتی ہے۔ وہ پری ویش!“

”یہ اس کا نام ہے۔ اس خاتون کا؟“

”ہاں اس کا یہی نام ہے اور مخفی قلعہ بھی کرتی ہے۔ کوئی شعر شعور کہہ لیتی ہوگی۔“

”نام تو بہت خوب صورت ہے اس کا۔“

”خدا جانے کیا چیز ہے وہ۔ مجھے تو وہ پاگل معلوم ہوتی ہے اس کا سارا انتظام دربان زادی نجمہ شاہانی ہی کے ہاتھ میں ہے۔“

”آپ اگر تیزی نہ دکھاتے تو میں قسمت آزمائی کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس بچی کو آپ سے بہتر پڑھا سکتا تھا۔“

”آپ بھی قسمت آزمائیں۔ ذلیل ہونا ہے تو وہاں ضرور جائیے۔ میں اور باری تو خوار ہو ہی چکے ہیں۔“

”مگر میں... میں اب وہاں کیسے جا سکتا ہوں؟“

”اس نجمہ کشنی نے کہا تھا کہ اگر کوئی اور اچھا استاد ملے تو میں اس کو بھیج دوں۔“

”اچھا یہ بھی کہا ہے اس نے یعنی آپ کے منہ پر ہی کہہ دیا کہ آپ تو جائیں چھٹی کریں اور کسی اور کو بھیج دیں؟“

”اور نہیں تو کیا؟ یہی تو رونا ہے میرے وہ سامنے ہوتی نا وہ بیگم پری ویش مخفی تو میں اس کو چا تو مار دیتا۔“

”اللہ اللہ! یہ کیسے نیک ارادے ہیں آپ کے۔ مگر میرا خیال ہے مولانا کہ آپ کی ناکامی میں آپ کی شیردانی کا بھی بڑا دخل ہے۔ اس موسم سرما میں تو اسے غسل کروا لیں۔“

”چپ رہیں جی آپ! یہ شرفا کا لباس ہے اور ایک استاد کے لیے نہایت ہی موزوں بھی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ نے انک ضلع صوبہ سرحد کے کھاتے میں کیوں ڈال دیا۔ یہ بھی تو زیادتی ہے۔ آپ سے پہلے حافظ نے بھی یہی غلطی کی تھی کہ اس نے بنگال ہندویش بنجشم سرقند و بخارا... کا اعلان کیا تو اس کی شامت آگئی تھی۔“

”میں کیا کرتا جناب! پہلے تو میانوالی بھی صوبہ سرحد میں تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ دونوں ضلع کس نے پنجاب میں ڈال دیے۔ بھی اس کا اعلان ہونا چاہیے تھا نا باقاعدہ مجھے کوئی الہام تو نہیں ہو سکتا تھا۔“

”آپ دراصل اخبار نہیں پڑھتے۔“



ہے۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ ڈھائی سو روپے ماہوار کا یہ سودا کوئی ایسا سستا نہیں ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے۔ باری اور شعیب بھی میری طرح سرکاری ملازم تھے۔ باری صوبائی سیکرٹریٹ میں اسسٹنٹ تھا اور شعیب صاحب ان دنوں اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ محدود آمدنی کے باعث دونوں کو اپنے ہال بچوں کی پرورش کے لیے زیادہ رقم کی ضرورت تھی۔ دونوں نے لاہور میں مکانوں کے ہوشربا کرایوں سے بچنے کے لیے بیوی بچوں کو اپنے گاؤں میں چھوڑ رکھا تھا۔ میرا حال بھی اس سے کوئی ایسا مختلف نہیں تھا۔ مجھے ان دنوں ایک بینک میں جگہ ملی ہوئی تھی مگر تنخواہ میری صرف ایک سو اکیاون روپے تھی حالانکہ میں بھی ایم اے کر چکا تھا اور وہ بھی ایم اے فارسی۔ مگر مجھے کوئی معقول ملازمت نہیں مل سکی تھی۔ یہی حال باری اور شعیب کا تھا۔ وہ دونوں بھی ایم اے تھے۔ باری نے اردو میں اور شعیب نے اسلامیات میں ماسٹرز کی ڈگریاں لے رکھی تھیں مگر ہم سب زمانے کی ناقدر شناسی کا شکار تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ ہم بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ غنی کے ہاں سے ہنگی کو ٹیوشن پڑھانے سے اگر ڈھائی سول سکتے ہیں تو وہ ضرور لینے چاہئیں۔

میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اس ہنگی میمونہ کی ٹیوشن کے لیے میں ضرور قسمت آزمائی کروں گا۔ کیونکہ ڈھائی سو روپے کی رقم معمولی رقم نہیں تھی۔ صرف ایک دو گھنٹے روزانہ کی سرگھماکی سے اگر یہ روپے مل سکتے تھے تو وہ چھوڑ دینا کسی طرح بھی ٹھنڈی نہیں تھی۔

رات کا کھانا جب مولانا شعیب پکا کر میز پر لگا چکے تو باری نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر سالن میں لقمہ ڈیو دیا۔ یہ مولانا شعیب کا احسان تھا کہ وہ صبح شام ہمارے لیے کھانا پکا دیتے تھے کہ یہ فن لطیف صرف انہی کو آتا تھا۔ ہم ان کی صرف اتنی مدد کرتے تھے کہ صبح کے برتن باری دھو دیتا تھا اور شام کے جھوٹے برتن مجھے دھونے پڑتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا میری محنت سے زیادہ مطمئن تھے کیونکہ میں برتن زیادہ صفائی سے دھو دیتا تھا۔ کوارٹر جس کا کرایہ ہم مل کر پینتالیس روپے ادا کرتے تھے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں جھاڑو مولانا شعیب دے دیتے تھے اور ہمارے کپڑے دھونی کے ہاں سے دھل کر آ جاتے تھے اور یوں وہ شستم پشتم زندگی ہم کسی نہ کسی طرح گزار رہے تھے۔

لقمہ باری نے منہ میں ڈالا تو بولا ”سبحان اللہ مولانا۔ ایسی دال تو بہادر شاہ ظفر کا بادری بھی نہ پکاتا ہوگا۔“

واللہ کیا عمدہ تڑکا لگایا ہے آپ نے۔“ وہ مولانا شعیب کی امور خانہ داری میں بے مثال مہارت کی داد بہت کھل کر دیتا تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی اگر وہ اس تعریف میں بخل کرتا تو ہم بکے پکائے گرم کھانے کی نعمت سے محروم رہ جاتے۔ مولانا کی کمزوری یہی تھی کہ وہ تعریف و توصیف کے بھوکے تھے اور ہمیں اپنی بھوک کی فکر پریشان رکھتی تھی۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں باری صاحب! مولانا کے بنائے ہوئے کھانے کے مقابلے میں تو من و سلوئی بھی پیچ ہے۔“

”استغفر اللہ! ایسا نہ کہیے ہاشمی صاحب! مجھے اتنا اونچا نہ اٹھائیں۔“

”ہاں! آپ کا دل تو آج ویسے ہی رو رہا ہوگا مگر اب میں اپنی قسمت آزماؤں گا۔ کل اس پری دس غنی کے ہاں میں جا رہا ہوں۔“

”ارے ہاشمی صاحب! آپ بھی ذلیل و خوار ہو کر رہ جائیں گے۔ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔“ باری نے مجھے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

”کچھ بھی ہو جائے۔ میں آپ دونوں کی یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ کل میرا اس سے ٹیسٹ پیج شروع ہو جائے گا۔“

”خدا آپ کی دکنیں سلامت رکھے۔ ہم آپ کے لیے دعا کریں گے۔“ باری نے ماش اور چنے کی دال پر زیادہ تیزی سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا پھر لقمے کو شاید وہ سالم ہی نگلتے ہوئے بولا۔

”ویسے مجھے مولانا کی اس بے وقت رحلت پر بہت دکھ ہوا ہے۔ وہ...“ باری نے زبردست قسم کی گالی دیتے ہوئے کہا۔

”اس کی دولت نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔“ شعیب نے کہا۔

”بہر حال، ہاشمی صاحب! ادھر سوچ سمجھ کر جائیں، وہاں آپ کی بھی دال نہیں گل سکے گی۔ وہاں ٹیوشن پڑھانا آسان کام نہیں ہے۔“

”میں سمجھ لوں گا اس سے باری صاحب!“ میں انک خلع کا کل وقوع اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ مولانا شعیب کٹ کر رہ گئے۔

اگلے دن میں دفتر سے دو بچے گھر پہنچا اور اپنے بہترین قسم کے دلائی سوٹ پر استری کرنے بیٹھ گیا۔ اسے میں بس بھی کبھار ہی پہنتا تھا۔ سفید براق لٹھے کی ٹیوں پر



جب میں ٹائی لگا چکا تو مجھے محسوس ہوا کہ عمدہ قسم کی نئی دھلی ہوئی صاف ستھری قمیص پہنتے ہی آدمی کے وجود کی رست بدل جاتی ہے۔ اپنی ساری تنخواہ میں ان دنوں خالص بھی آور عمدہ کپڑوں کی خریداری پر صرف کر دیتا تھا۔ وہ بھلے دن تھے۔ بہترین قسم کا بوٹ بیس روپے میں مل جاتا تھا اور اچھی قمیص پر آٹھ روپے سے زیادہ لاگت نہیں آتی تھی۔ جانفزا خوشبو بھی بارہ تیرہ روپے میں مل جاتی تھی۔

میں نے گڑھی شاہو کے چوک میں پہنچتے ہی ٹیکسی لی اور بڑے کروفر سے اس میں بیٹھ کر سیدھا گلبرگ جا پہنچا۔ اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ اطلاعی گھنٹی کی آواز سننے پر ایک معمر آدمی نے گیٹ کھول دیا۔

”بڑے میاں! میں مس صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرا نام انور ہاشمی ہے۔ انہیں اطلاع کر دو، کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی... میرا نام علی جو ہے۔ میں کیا کہوں بیگم صاحبہ سے؟“

”کہو کہ ہم بچی کی ٹیوشن کے سلسلے میں ان سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”جی بہت اچھا۔ میں انہیں بتاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ عمارت کے سامنے بنے تیس فٹ عرض کے لان کے کنارے کنارے پختہ روش پر چلتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں نے گیٹ اپنے پیچھے بند کیا اور اس کے پیچھے بڑے اطمینان سے چلتا ہوا برآمدے میں جا ٹھہرا۔ وہاں بید کی میز کرسیاں پڑی تھیں اور ان کی ترتیب میں قرینہ جھلکتا تھا۔

چند ہی لمحوں بعد برآمدے کا وسطی دروازہ کھلا اور ایک عورت جو سر سے پاؤں تک چادر میں ملبوس تھی۔ کانا گنجا پردہ کرتی ہوئی باہر آگئی اور بولی۔

”آپ بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتے ہیں؟“ اس کی آواز اس کے حلیے کی نفی کرتی تھی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے یقین اور ایمان سے بھی زیادہ جوان ہے۔ اس کا رنگ شہابی تھا اور ہونٹ پھول کی پتیوں ایسے نازک نازک۔ ان کی سرخی کسی تازہ زخم کا منظر پیش کرتی تھی جس میں سے لہو برس رہا ہو۔ آنکھیں سیاہ موتیوں کی سی چمک لیے ہوئے تھیں مگر ان آنکھوں میں عجیب سی وحشت ناک بے مہری تھی۔ جب وہ انہیں جھپکاتی تھی تو مجھے شجر جبر سجدہ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ پلکیں جھار ایسی صورت میں ان آنکھوں پر یوں گرتی تھیں کہ کلک ایسی آواز مجھے سنائی دیتی تھی۔ بلاشبہ وہ بہت ہی حسین عورت تھی

مگر بڑی محتاط بڑی ہی ڈھکی چھپی اور بند۔ عمر اس کی یہی کوئی پچیس سال ہوگی مگر اس نے اپنے بدن کی حشر سامانیوں پر ایک ملکہی سی مانتی چادر ڈال رکھی تھی۔ یوں جیسے وہ اپنے فتنہ گر حسن سے خوف زدہ ہو اور اسے دھول میں چھپا دینا چاہتی ہو مگر اس کے باوجود اس کے نشیب و فراز اپنی بے کل موجودگی کا اعلان کرتے رہے تھے۔ میں نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ میری آنکھوں میں ابھرتا تحیر اس نے دیکھا تو ذرا بلند آواز میں بولی۔

”کیا کام ہے آپ کو بیگم صاحبہ سے؟“

”میں بچی کی ٹیوشن کے سلسلے میں ان سے بات کروں گا۔“

”ہوں۔ اندر آجائیے۔ وہ پردے میں بیٹھ کر آپ سے بات کر لیں گی، آئیے۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے سے داخل ہوئی تو میں بھی اندر چلا گیا۔ اس دروازے میں قدم دھرتے ہی مجھے محل کے شہنشاہی ساز و سامان نے میری کم مائیگی کا احساس دلا دیا۔ پیش قیمت قالین سامنے راہداری میں بچھا تھا۔

”آپ کا نام نجمہ ہے نا؟“ میں نے اس کے قریب ہو کر دہلی آواز میں کہا۔ وہ ٹھٹھکی گئی اور رک کر اس نے کچھ ایسی نظر سے مجھے دیکھا کہ میں سمجھا کہ میرے منہ سے اپنا نام سننا اسے اچھا نہیں لگا مگر پھر اس کے شہد آکیں ہونٹ یوں کھلے جیسے کلی کھلنے کے مرحلے سے گزرتی ہے۔

”میرا نام آپ کو کس نے بتایا ہے؟“ اس نے سرگوشی کے انداز سے کہا۔

”میرا اندازہ تھا کہ آپ کا نام نون سے شروع ہوتا ہے یا آپ نور بھری ہیں یا نجمہ ہیں یا نازیہ یا... ناوک۔“

”کچھ اور بھی تو ہو سکتا ہے۔ علی جو نے بتایا ہے میرا نام آپ کو؟“ اس کے لہجے میں سرزنش بھی تھی اور ہلکی سی ستائش بھی۔

”نہیں تو... میں تھوڑا بہت علم نجوم بھی جانتا ہوں۔“

”آپ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو رہے ہیں۔ ناوک کے معنی بھی آتے ہیں آپ کو؟“

”تیر کو ناوک کہتے ہیں۔ یہی کہتے ہیں نا؟ اور آپ کو میں نے صرف ناوک نہیں بلکہ نازک انداز کہنا چاہیے۔“

میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ یوں جیسے وہ سمجھ رہی ہو کہ میں اسے بانہوں میں لے لوں گا۔ راہداری کوئی تیس فٹ لمبی اور آٹھ فٹ چوڑی تھی۔ اور اتنی تنہا پراسرار اور اشتعال انگیز کہ میں



خود اس لمحے کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ جو ہمیں اپنے حلقے میں لیے ٹھہر سا گیا تھا۔

وہ حیرت زدہ سی ہو کر میرا منہ تک رہی تھی، بولی۔  
”بڑے بے باک ہیں آپ؟ مگر براہ کرم یہ بات یاد رکھیں کہ یہ مس پر پوش مخفی کا گھر ہے اور میں ان کی ادنیٰ ملازم ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس ملازمت کے حصول میں میری مدد کریں۔“

وہ دیوار کے ساتھ لگ گئی اور تیزی سے بولی۔  
”آپ ان سے اسی اعتماد، بے باک اور کھرے لہجے میں بات کریں۔ انہیں ضرورت ہے اور وہ ناقابلِ تسخیر بھی نہیں ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھی اور راہداری کے وسط میں پہنچ کر ایک دروازہ بے آواز کھول کر اندر چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ باہر آئی اور بولی۔

”آئیے۔“ اس نے اپنی برقع نما چادر میں سے اپنا ہاتھ نکال کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دہلیز کے اندر قدم رکھ دیا۔ سامنے ایک وسیع و عریض کمراتھا جس کے وسط میں ایک شیشے کی دیوار بنی تھی۔ میرے بینک کے جنرل منیجر کے کمرے میں بھی ایسی ہی ایک دیوار تھی رہتی تھی۔ کمرے میں دبیز قالین بچھا تھا۔ ایک ہاتھ پر صوفہ بچھا تھا جس کے سامنے شیشے کی دو میزیں دھری تھیں۔ ویسا ہی صوفہ دوسری دیوار کے ساتھ بچھا تھا۔

”آپ یہاں بیٹھیں۔ بیگم صاحبہ آپ سے ابھی بات کریں گی۔“ اس نے یہ کہہ کر مجھے صوفے پر بٹھایا اور پھر تیزی سے دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ میں چند لمحوں تک اس کمرے میں پھیلی گلاب کے عطر کی دھیمی دھیمی خوشبو کو اپنی سانسوں میں جذب کرتا رہا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں سگریٹ سلگا لوں مگر پھر مس پری دس کے مزاج سے نا آشنا ہونے کے سبب میں نے اپنی اس خواہش کو سختی سے دبا دیا۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے دوسری طرف ہلکی سی سرسراہٹ کا احساس ہوا۔

”آپ کیسے تشریف لائے ہیں جناب؟“  
ایک عجیب سی آواز میری سماعت میں اتری۔ وہ آواز بہت ہی کھردری اور نیم مردانہ سی لگی جیسے پردے میں کوئی خواجہ سرا بیٹھا ہو۔

”جناب میں بیگم پری دس مخفی سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
”مخفی ہی آپ سے مخاطب ہیں اور اس شیشے میں سے

ہم آپ کو بہ خوبی دیکھ رہے ہیں۔“ میں ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ شیشہ عکاس آئینہ تھا اور میں اس میں سے اسے پوری طرح نظر آ رہا تھا۔

”میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے باریابی کی اجازت دی۔ دراصل میں آپ کی بچی کی ٹیوشن کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“

”وہ ہماری بچی نہیں بلکہ ہماری مرحومہ پھوپھی زاد بہن کی بیٹی ہے۔ ان کے شوہر بھی انتقال کر چکے ہیں۔ آپ کو کس نے ہمارے پاس بھیجا ہے؟“ اس کے لہجے میں اضطراب ابھر آیا تھا۔

”مجھے شعیب صاحب نے بتایا ہے کہ آپ نے انہیں برطرف کر دیا۔ میں نے سوچا کہ میں شاید یہ خدمت بہتر طور پر سرانجام دے سکوں۔“

”اوہ! شعیب صاحب؟ ہاں میں نے کل انہیں جواب دے دیا تھا۔ بچی کی تعلیم ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ آپ کی تعلیم؟“

”میں نے ایم اے کر رکھا ہے فارسی میں۔ ویسے بی اے تک میرے مضامین ایسے تھے کہ میں دسویں تک کے بچوں کو حساب، انگریزی، تاریخ، جغرافیہ بہ خوبی پڑھا سکتا ہوں۔“

”آئی سی۔ کیا نام ہے آپ کا؟“  
”میرا نام انور ہاشمی ہے۔“

”کہاں کام کرتے ہیں آپ؟“  
”میں بینک میں ملازم ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنے بینک کا نام بھی بتا دیا۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ مالی امور میں بھی ہمیں کچھ اچھے مشورے دے سکیں گے۔“

”میں کوشش کروں گا۔ بینک کے سلسلے میں واقعی آپ کو ہر قدم پر راہنمائی کی ضرورت ہوگی۔“

”ہم دراصل شیئرز میں انٹر سٹڈ ہیں۔ اگر آپ ان امور کو سمجھتے ہوں تو ہمیں خوشی ہوگی۔“

”میرا خیال ہے کہ میں اس معاملے میں آپ کو مناسب راستہ دکھا سکتا ہوں۔“

”آئی سی! ٹھیک ہے ہم آپ کو مونی کی ٹیوشن کے لیے تین سو روپے دے سکتے ہیں۔ اگر منظور ہو تو آج ہی سے کام شروع کر دیں۔ کوئی حوالہ تو ہو گا آپ کے پاس اپنی شناخت کا؟“

یہ بڑا کشمن مرحلہ تھا۔ میرے پاس جو بینک کا شناختی



احساس دلاری ہے کہ انور ہاشمی اپنی کھال میں رہتا۔ ورنہ شعیب اور باری کی طرح دوسرے ہی دن برطرف کر دیے جاؤ گے۔ مجھے بہر حال اپنی عزت نفس پر برستے کوڑے کو سہتے ہی بنی۔ میں نے اس کے فقرے کی تمام تر گلی کو پیتے ہوئے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”ایسا ہی ہوگا آنسو پری وٹ مٹنی صاحبہ مجھے کسی کے نجی معاملات میں دخل دینے کا مالخو لیا کبھی نہیں رہا۔“ جانے یہ بات میں نے کیسے کہہ دی میرا لہجہ واقعی زخمی تھا۔ مجھے وہ لفظ نہیں کہنے چاہیے تھے مگر وہ میرے منہ سے نکل ہی گئے۔ میرے یہ الفاظ سنتے ہی اس نے گھٹنی بجا دی۔ نجمہ شاید راہداری میں دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔ فوراً ہی اندر آ گئی۔ اسے سامنے دیکھ کر مٹنی نے بے حد محکم آمیز لہجے میں کہا۔

”ان سے کہو نجمہ کہ یہ کل جارہے آجائیں۔“ اس کی آواز اور زیادہ روکھی بلکہ ترش ہو گئی تھی۔ یہ بات وہ براہ راست بھی مجھ سے کہہ سکتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ نجمہ کے ذریعے مجھے اپنی قوت کا احساس دلاری تھی۔

”چلے صاحب میں آپ کو دروازے تک پہنچا دوں۔“ اس کی یہ بات سنتے ہی مجھے بھی طیش آ گیا۔ میں نے ترش لہجے میں کہا۔

”میں خود چلا جاتا ہوں۔ کل ٹھیک چار بجے میں یہاں پہنچ جاؤں گا۔“ مٹنی مجھے بڑھائی کے لیے تیار ملنی چاہیے۔ میں روزانہ صرف ایک گھنٹا دے سکوں گا۔ مجھے انہوں نے تین سو روپے کی پیشکش کی ہے مگر میں صرف ڈھائی سولوں گا۔ وہی رقم جو یہ دوسروں کو دیتی رہی ہیں۔ اپنی مالکن سے یہ بات کہہ دیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نجمہ کی سرد اور اندر تر جانے والی بے مہر نگاہوں کی پروا کیے بغیر تیزی سے کمرے میں سے نکل کر راہداری میں جا پہنچا۔ دروازہ میں نے جان بوجھ کر اپنے پیچھے ڈھیلّا چھوڑ دیا۔ وہ کمانیوں پر جمنا تھا ٹھک سے بلند ہوا تور راہداری میں اور اس کے ارد گرد منجمد سکوت چھن سے ٹوٹ گیا۔

میں ابھی راہداری عبور نہیں کر پایا تھا کہ نجمہ کو میں نے اپنے پیچھے تیز تیز قدم اٹھاتے دیکھا۔ قالین پر اس کے نئے مگر بد وضع سلیر گھسٹتے چلے آ رہے تھے۔

”بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ آپ کو وقت کی ہر حال میں پابندی کرنی ہوگی۔“ اس نے میرے قریب پہنچ کر کہا۔ اس کی آواز میں بھی عجیب طرح کی بے مہر جھلکنے لگی۔

”ایسا ہی ہوگا۔ مجھے اپنے وقت کی قدر و قیمت کا ان

کارڈ تھا اس پر صاف لکھا تھا کہ میں وہاں کلرک کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں اور وہ کوئی فخر و انبساط کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے کہا۔

”جی ہاں؟ یہ رہا میرا شناختی کارڈ۔“ یہ کہہ کر میں نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔ تو عین اس وقت میرے سامنے شیشے کی دیوار میں خلا سا پیدا ہو گیا۔ وہاں ایک دروازہ تھا جو کسی برقی نظام سے کھل جاتا تھا۔ اس میں سے ایک سیاہ رنگ کی ریشمی چادر میں لپٹا ہوا ہاتھ باہر آیا۔ میں نے کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ دروازہ ابھی کھلا ہی تھا کہ وہ ہاتھ پیچھے ہٹا اور پھر چند لمحوں بعد پری وٹ نے وہ کارڈ اپنے مستور ہاتھ میں پکڑ کر مجھے واپس دے دیا، بولی۔

”آئی سی، آپ وہاں کلرک ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ کی ضرورتوں کا ہم خیال رکھیں گے بشرطیکہ آپ نے اپنا فرض خوش اسلوبی سے نبھایا۔“

”میں اپنے طور پر پوری کوشش کروں گا۔“

”ہمیں حریص آدمی سے نفرت ہے۔ ہم جانتے ہیں

کہ لوگ ہماری دولت کی وجہ سے دوڑے چلے آتے ہیں

لیکن ہمیں امید ہے کہ آپ صرف اپنے کام سے غرض رکھیں

گے کیونکہ اپنے معاملات میں کسی کی بے جا دخل اندازی

ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے۔“ اچانک اس کے لہجے

میں نخوت ابھر آئی۔ ایسی نخوت جو مخاطب کو کچوکے لگاتی

تھی۔ اس میں محکم بھی تھا اور تکبر بھی۔ نسائیت کا شائبہ بھی تھا

مگر آواز کا بھاری بھر کم تاثر مجھے بار بار یہ احساس دلاتا تھا

کہ میں کسی مرد نما عورت سے مخاطب ہوں۔ کوئی اور جگہ

ہوتی کسی اور صورت حال میں وہ آواز مجھے سننی پڑتی تو میں

کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر وہاں سے ہٹ جاتا۔ مگر وہاں

مجھے تین سو روپے کی پیشکش مل چکی تھی۔ میں اپنی تمام تر

تلملاہٹ کے باوجود اس آواز میں تسک کی ڈھونڈتا رہا مگر وہ

عنصر تو سرے سے ہی وہاں ناپید تھا۔ پھر بھی میں طوعاً و کرہاً

اسے برداشت کر گیا۔ چاہنے کے باوجود وہاں سے اٹھ کر

نکل جانے کی ہمت نہیں پارہا تھا۔ میں نے دل میں کہا ٹھیک

ہے انور ہاشمی تو اس دروازے میں داخل ہوتے ہی دل سے

نکلنے دعا کی طرح شرف قبولیت پا چکا ہے۔ یہاں سے تیری

خالی ہاتھ واپسی تجھے زیب نہیں دے گی۔ مولانا شعیب اور

اس باری سے تو تو بہر حال بہتر ہے کہ تجھے پہلے ہی مرحلے

میں اس مخفی کی بارگاہ سے تین سو روپے کی نوید مل گئی ہے۔

اس نے جب بے جا دخل اندازی کے بارے میں اپنا نکتہ

نظر ظاہر کیا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ مجھے میری حیثیت کا



حیران کرتی تھی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ یوں جیسے وہ خزاں کی زد میں آکر آرزو کی ہر کونہل سے محروم ہو چکی ہو۔

کوارٹر پر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ شعیب اور باری اگلے روز اتوار ہونے کی وجہ سے گاؤں جا چکے ہیں، یہ ان کا معمول تھا۔ دوسرے دن جب میں اپنا بہترین لباس زیب تن کر کے مخفی کے دروازے پر پہنچا تو اس وقت شام کے ٹھیک چار بج رہے تھے۔ علی جو نے پہلی ہی ٹکھنی پر گیٹ کھول دیا۔ جب میں لان عبور کر کے برآمدے میں پہنچا تو نجمہ مجھے عمارت کے صدر دروازے میں کھڑی مل گئی۔ اس کے بے ڈھب لباس میں کوئی تہذیبی نہیں آئی تھی۔ سلیٹی رنگ کی بڑی سی گرم چادر سے اس نے اپنے آپ کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر پھر بھی اس کے وجود کے وہ سارے جوالا کھمبے ایسے نشیب و فراز میرے دل میں لہلہا مچانے لگے۔ اس کو دیکھ کر مجھے پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود پردگی کی آرزو میں مری جاتی ہے۔ یہ میرا موہوم سا احساس تھا۔ اس کی جھکی جھکی آنکھوں سے مجھے کچھ ایسا ہی تاثر ملتا تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ بڑے ہی سرد لہجے میں بولی۔

”آپ نے اچھا کیا۔ آپ ٹھیک وقت پر آ گئے ہیں۔“

”میں نے اپنے ذمے ایک فرض لیا ہے جسے میں اچھے طریقے سے نبھانا چاہتا ہوں۔“ وہ دروازے سے ہٹ گئی تو میں نے راہداری میں قدم رکھ دیا۔ مجھے وہ اپنے ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔ سامنے صوفے پر ایک پتلی دہلی دس سال کی بچی ایک کتاب پر جھکی تھی۔ نجمہ نے میرا اس سے تعارف کروایا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سرخ رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ بال اس کے عمو کی سے سنوارے گئے تھے اور رنگ اس کا کوٹ کے رنگ سے بڑی مشابہت رکھتا تھا۔ بچی مجھے ذہین اور تیز طرار معلوم ہوتی تھی۔ اسے یہ لوگ لاڈ میں مونی کہتے تھے۔ وہ جلد ہی مجھ سے مانوس ہو گئی۔ مولانا شعیب سے اسے بڑی شکایتیں تھیں۔ وہ شاید اسے بہت زیادہ ڈانٹتے رہے تھے۔ مجھے جلد ہی محسوس ہو گیا کہ بچی پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ وہ ہر بات بہ خوبی سمجھ لیتی تھی اور اسے ذہن نشین بھی کر لیتی تھی۔

میں اسے پڑھانے میں مصروف ہو گیا تو نجمہ دبے پاؤں باہر چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ میرے لیے پُر تکلف چائے لے آئی۔ اس چائے سے لطف اندوز ہونے کے لیے میں نے مونی کو حساب کے چند سوال حل کرنے پر لگا دیا اور

سے زیادہ احساس ہے۔“

اس نے آگے بڑھ کر بڑا سا آہنی دروازہ کھول دیا۔

”آپ کا لب و لہجہ بہت تلخ ہے۔ حالانکہ آپ ضرورت مند ہیں۔“

”ضرورت مند تو ہوں مگر میں بے غیرت نہیں ہوں۔ اپنی مالکین سے کہہ دیں کہ وہ خواجواہ مجھ سے اتنے متکبر لہجے میں پھر کبھی بات نہ کریں۔ ایسے معاملوں میں میں بہت حساس آدمی ہوں۔“ میں نے جان بوجھ کر اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ میں دراصل اس پردہ نشین کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ میں کوئی ایسا گرا پڑا آبرو باختہ آدمی نہیں ہوں اور میری ضرورت مجھے اس کی در یوزہ گری پر مجبور نہیں کر سکے گی۔

نجمہ نے تھیر آ میز انداز سے مجھے دیکھا اور بولی۔

”آپ بہت تیز مزاج آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ اپنے کسی بھی مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔“

”میرا کوئی مقصد نہیں ہے۔ ڈھائی سو روپے ماہانہ کا حصول آپ کو کوئی بڑا مقصد نظر آتا ہے؟“

”چھوٹے سے بیج پر دیوہکل درخت اگ آتے ہیں۔ کل جب آئیں تو اپنے مزاج کی یہ گری ساتھ نہ لائیں۔“ یہ کہہ کر اس نے صدر دروازہ بند کر لیا اور میں بنگلے کے خوب صورت برآمدے میں مرمرین فرش پر ٹھک ٹھک چلتا ہوا گیٹ سے باہر نکل آیا۔ گیٹ میرے پیچھے علی جو نے بند کیا۔

میرے سامنے اب دو ہی امکانات ابھر رہے تھے یا تو اگلے روز میرے لیے وہ دروازہ نہیں کھلے گا اور اگر کھل گیا تو وہ امیرزادی مجھ سے کہیں زیادہ محتاط لہجے میں بات کرے گی اور اسے یہ احساس ہمہ وقت خبردار کرتا رہے گا کہ میں کس ڈھب کا آدمی ہوں۔ اپنا لہجہ میں نے جان بوجھ کر تلخ کر لیا تھا۔ میں ان عورتوں کے ساتھ ڈھائی سو روپے کے نوٹ کتے کی طرح زمین پر منہ مار کر نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ اس پریوش مخفی کی ضرورت تھی جس کے تحت وہ مونی کے لیے ٹیوٹر ڈھونڈتی تھی۔ میں اپنی ضرورت تلے دبا اپنی خدمات پیش کر رہا تھا مگر وہ مجھے خواجواہ ہی اپنی بلند وبالا حیثیت کا احساس دلا رہی تھی۔

حیرت مجھے نجمہ کے الفاظ پر تھی۔ وہ مجھے کسی دیوہکل درخت کی نوید سنار ہی تھی۔ اس کا عندیہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی اور سرد مہری بھی مجھے

جاسوسی ڈائجسٹ



تھا کہ میں میمونہ کے لیے آ رہا ہوں۔“  
 ”انہیں احساس تو تھا مگر ان کو خبر ہی ایسی افراتفری کی  
 ملی کہ وہ رک نہ سکیں۔ ورنہ وہ آج کسی طرح بھی یہاں سے  
 نہ جاتیں۔“

”آپ کب سے ان کے پاس ہیں؟“

”پچھلے بیس سال سے... میری والدہ بیوہ ہوئیں تو  
 یہاں آ رہیں... میری پرورش اسی گھر میں ہوئی ہے۔ مخفی کی  
 والدہ میری والدہ کی سہیلی تھیں اور وہ ان کے بہت کام  
 آئیں۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاصی تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ  
 کا لہجہ یہی بتاتا ہے۔“

”ہاں میں ایف اے تک پڑھی ہوں۔ اس وقت  
 میری والدہ زندہ تھیں۔ اور ہم سرونٹ کوارٹر میں الگ رہتے  
 تھے۔“

”میں نے سنا ہے کہ مس مخفی کے والد ان کے لیے  
 ترکے میں چالیس لاکھ روپے چھوڑ گئے ہیں؟“  
 ”ہاں یہ سچ ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ  
 شادی کے لیے ان کے پیچھے لگے رہتے ہیں مگر مس مخفی نے  
 سب کو مایوس کر دیا ہے۔ اب کوئی بھی ادھر نہیں آتا۔“  
 ”وہ کس طرح؟“

”وہ اس طرح کہ اب وہ کسی سے ملتی ہی نہیں ہیں؟“  
 ”ہوں، آپ کو کوئی تنخواہ ملتی ہے یہاں کہ ویسے ہی  
 آپ ان کے روٹی کپڑے پر پڑی ہیں؟“

”مجھے یہ پانچ سو روپے مہینہ دیتی ہیں میرے والد  
 بھی ٹھیکے دار تھے۔ ریلوے کے ٹھیکے دار۔ مگر پھر ہمارا مقدر  
 ہم سے روٹھ گیا۔“

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ایسی بے آسرا زندگی ملی  
 مگر یہ اچھی تنخواہ ہے۔ اپنی تنخواہ تو دفتر میں گزینڈ افسر کو بھی  
 نہیں ملتی۔“

”وہ... وہ دراصل مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں۔  
 صرف اس لیے کہ میرے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ میں  
 نے ضد کر کے اپنی تنخواہ میں اضافہ کرایا تھا ورنہ پہلے وہ مجھے  
 صرف دو سو روپے دیتی تھیں۔“ مونی اپنے کام میں مصروف  
 تھی اور زور شور سے حساب کے سوال حل کر رہی تھی۔

نجمہ نے ایک کپ چائے کا اور میرے سامنے رکھا  
 اور معنی خیز انداز سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا آپ شادی شدہ ہو؟“

”نہیں مگر یہ سوال کیوں پوچھا آپ نے؟“

خود الگ ہٹ کر چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نجمہ میرے  
 سامنے بیٹھ کر بڑی نفاست سے چائے بنا رہی تھی، بولی۔  
 ”کل آپ کو ایک دم طیش کیوں آ گیا تھا؟“

”مس مخفی نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔ وہ کچھ زیادہ  
 ہی پراؤڈی ہیں۔“

”وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں اس لیے میں آپ کے  
 پاس بیٹھ گئی ہوں۔“

”کہاں گئی ہیں؟“

”ان کی ایک سہیلی بیمار ہیں ملتان میں، وہ ان کو دیکھنے  
 گئی ہیں۔“

”معلوم ہوتا ہے وہ پردے کی بہت زیادہ پابند  
 ہیں؟“

”یہ بات نہیں ہے۔ آپ کو دیکھ کر وہ میرا خیال ہے  
 احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ ویسے وہ پردے کی بھی  
 سخت پابند ہیں۔ برقع کے بغیر باہر نہیں جاتی ہیں۔“  
 ”کیا مطلب؟ ایسی کیا بات دیکھی تھی انہوں نے  
 میرے اندر کہ وہ میرے سامنے نہ آ سکیں؟“

”نہیں، وہ دراصل... پردہ ہی اس کی وجہ ہو سکتی  
 ہے اس احساس میں مبتلا ہیں کہ وہ بد صورت ہیں کچھ ان کی  
 صورت ایسی ہی ہے۔ چہرے پر چھچک کے داغ ہیں اور اس  
 مرض نے ان کی ایک آنکھ بھی ذرا سی کھمادی ہے۔ ویسے وہ  
 گوری چٹی ہیں اور بڑی خوش لباس بھی۔“ نجمہ نے چائے کی  
 پیالی میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟“  
 ”کیا؟“ اس نے اپنی بولتی آنکھیں میرے چہرے  
 پر جمادیں۔ کل کی طرح وہ مجھ سے گریز پانہیں رہی تھی۔

”آپ... میرا مطلب ہے مس نجمہ کہ آپ کو اللہ  
 تعالیٰ نے اتنی ساری رعنائیاں عطا کر رکھی ہیں پھر... پھر  
 آپ اپنے لباس سے کیوں اتنی غافل ہیں۔ یہ کپڑے...  
 آپ میرا مطلب سمجھ رہی ہیں نا؟“

”آپ بھول رہے ہیں کہ میں مس مخفی کی ملازمہ  
 ہوں۔ مجھے ایسا ہی لباس پہننا چاہیے جس سے میں کسی بھی  
 صورت میں ان سے بہتر نظر نہ آؤں ورنہ وہ مجھے فوراً یہاں  
 سے نکال باہر کریں گی۔“

”کیا وہ اتنی ہی حاسد طبیعت کی مالک ہیں؟“

”ہر عورت ہوتی ہے اس لیے مجھے بہت محتاط رہنے کی  
 ضرورت ہے۔“

”آج وہ کیسے آپ کو تنہا چھوڑ گئی ہیں جبکہ انہیں معلوم



”آپ کے لیے یہاں چانس ہے۔“

”کیا؟ کیا مطلب؟“

”مس مخفی رات آپ کے بارے میں کہہ رہی تھیں وہ... وہ آپ سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔“

”وہ کس طرح؟ میں نے تو انہیں ایک طرح سے بہت ناراض کر لیا تھا؟“

”مجھے معلوم ہے۔ وہ آپ نے عدا کیا تھا۔ آپ مگر بہ کشتن روز اول پر عمل کر رہے تھے۔“

”اس سے میرا نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ وہ انکار کر سکتی تھیں؟“

”نہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ ایسا رویہ ان پر کیا اثر ڈالے گا۔“

”یہ میرا منشا نہیں تھا بلکہ میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں کوئی ایسا گرا پڑا بے غیرت آدمی نہیں ہوں۔“

”ہاں، اور یہ بات وہ سمجھ بھی گئی تھیں۔ وہ آپ کی کیا کہتے ہیں اسے مردانہ وجاہت سے بھی متاثر ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”اور آپ؟ آپ کی میرے بارے میں کیا رائے ہے؟“ میں نے اسے چھوٹے ہوئے کہا۔ اس کی باتیں مجھے شہ دے رہی تھیں اور وہ جو میرا احساس تھا کہ وہ خود سپردگی کی آرزو میں مبتلا تھی اس کی مختلف قسم کی حرکات دیکھ کر اور زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔

”اپنا ہاتھ تو مجھ سے دور ہی رکھیں جناب ہاشمی صاحب! بہر حال میری رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔“

”کیوں نہیں رکھتی؟ میں تو اسے بہت اہمیت دیتا ہوں۔ آپ سے لباس کے بارے میں، میں نے اسی لیے وہ خاص بات کہی تھی۔“ میں نے اب کی بار تپائی پر دھرے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ شعلوں جیسی تپش تھی اس ہاتھ میں۔

مجھے اپنا سارا وجود آگ کی صورت دکھتا محسوس ہوا۔

”بتایا نہیں آپ نے؟“ میں نے موٹی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ سادہ لوح معصوم سی بے زبان لڑکی ابھی تک اپنے کام میں محو تھی۔ اسے گرد و پیش کی کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ نجمہ نے چند لمحوں تک اپنا ہاتھ پیچھے نہیں ہٹایا مگر پھر اچانک اس نے ہاتھ کھینچ کر سنبھلتے ہوئے کہا۔

”مجھے اپنے مرتبے کا احساس ہے۔ جہاں میں کھڑی ہوں مجھے وہیں رہنے دیں جناب انور ہاشمی صاحب قبلہ۔“

ہم دونوں میمونہ سے خاصے دور بیٹھے تھے۔

”اگر آپ کے ہاں میرا کوئی چانس ہو تو میں اسے جاسوسی ڈائجسٹ

اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا مس نجمہ صاحبہ۔۔۔۔۔“

وہ اب کی بار کھل کر مسکرا دی۔ ”آپ کو میں اچھا مشورہ دے رہی ہوں۔ مس مخفی پر آپ نے ایسا گہرا تاثر چھوڑا ہے کہ اگر آپ نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو یہ آپ کی حماقت ہوگی۔“

”کیا مطلب؟ یعنی کیا کروں میں؟“

”ان سے شادی کر لیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ وہ بد صورت ہیں۔“

”اس کے باوجود بھی یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ آپ... آپ اس سے نہیں چالیں لاکھ سے شادی کریں گے۔“

”مگر... مگر... اس سے... میرا مطلب ہے کہ یہ بات آپ کیوں کہتی ہیں مجھ سے، آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟“

”مجھے کسی فائدے کی ضرورت نہیں۔ میں تو محض ایک خادمہ ہوں اور بس...“

”جی نہیں، میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتا۔ اگر آپ میری بات پر یقین کریں تو میں آج ہی یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آپ سے زیادہ خوب صورت اور ذہین لڑکی نہیں دیکھی۔“ اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ یوں جیسے اس نے اپنی شخصیت کے تمام رموز مجھ پر عیاں کر دیے ہوں۔“

اچانک ہی وہ تیزی سے اٹھی اور دبیز قالین پر ڈولتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور پھر میمونہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کوئی ایک گھنٹے تک میں برابر اس لڑکی کو مختلف مضامین پڑھاتا رہا۔ وہ بیچاری ایسی کم مسمیٰ بچی تھی کہ سبق کے سوا اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اس پر اسکول کی استانیوں کا خوف طاری رہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اسکول میں اس پر کوئی انگلی نہ اٹھاسکے۔

شام کے پونے چھ بج رہے تھے اور میں ابھی تک اس چھوٹے سے کمرے کی آسودہ آور گرم فضا میں بیٹھا میمونہ سے سر کھپا رہا تھا۔ مجھے ٹھیک سوا پانچ بجے نکل جانا چاہیے تھا مگر میں نجمہ کے انتظار میں خواہ مخواہ ہی اس نشست کو طول دیتا چلا گیا۔

نجمہ چھ بجے پھر کمرے میں آئی اور بولی۔

”ابھی آپ کا سبق ختم نہیں ہوا ہے موٹی؟“

”جی بس ختم ہو رہا ہے آنٹی۔ ماسٹر صاحب چاہتے



ہیں کہ میں زیادہ دیر تک پڑھتی رہوں۔“  
 ”بس بہت ہو لیا۔ اب آپ جاگیں اور نہالیں۔ میں  
 نے سارا سامان غسل خانے میں رکھ دیا ہے۔“  
 ”جی آئی!“ یہ کہہ کر وہ کتابیں سینے لگی اور اسی وقت  
 باہر نکل گئی۔

”یہ اس وقت اتنی سردی میں ہجی کے نہانے کی کیا  
 تنگ ہے؟“  
 ”مالکن کا یہی حکم ہے۔ ہم سب رات کو نہا کر بستر میں  
 لیٹتے ہیں۔ خواہ سردی ہو یا گرمی۔“  
 ”اوہ، یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ آپ کی اس بے  
 مثال صحت کا راز بھی غالباً اسی غسل شب میں پنہاں ہے۔“  
 ”آپ زیادہ فخرے بازی نہ کریں اور ہاشمی  
 صاحب!“

میں اٹھ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ بدک کر پیچھے نہیں  
 ہٹی۔ اور... پھر... میں اپنے جذبوں کے سیلاب میں لیتا  
 ہوا اسے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبا۔ وہ تڑپ کر میری بانہوں  
 سے نکل اور ہنستے ہوئے بولی۔

”مجھ سے دور رہیں مسٹر ہاشمی، پلیز! میں یہ سب کچھ  
 برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ... آپ مجھے غلط سمجھے ہیں۔“  
 اس کی آنکھوں میں وحشت ناک سرد مہری اتر آئی تھی۔ وہ  
 کیفیت ایسی تھی کہ اس کے بارے میں میرے تمام  
 اندازے ملیا میٹ ہو رہے تھے۔ میں شرمندہ سا ہو کر پیچھے  
 ہٹ آیا تو وہ سر جھکا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

اگلے روز جب میں چار بجے کوٹھی پہنچا تو وہ برآمدے  
 میں میری منتظر تھی، بولی۔

”مس مخفی کا فون آیا ہے۔ وہ خود وہاں بیمار پڑ گئی ہیں  
 اور شاید ایک ہفتے تک واپس نہ آ سکیں۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے جناب! قدرت نے ہمیں نادر  
 موقع فراہم کیا ہے۔“ میں نے دلی آواز میں کہا۔

وہ پلٹ کر صدر دروازے میں داخل ہو گئی۔ علی جو  
 سامنے لان میں کھڑا ایک پودے کا معائنہ کر رہا تھا۔  
 دروازے میں داخل ہوتے ہی میں نے اسے بازوؤں میں  
 بھر لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کوٹھی میں ہر طرف  
 مکمل سکوت طاری تھا۔ چند قدم میرے ساتھ چل کر وہ  
 بولی۔

”مونی اس وقت سو رہی ہے۔ میں نے... اسے  
 ساڑھے تین بجے نیند کی گولی کھلا دی تھی۔ وہ ن کام کی شکایت  
 کر رہی تھی۔“

”یہ تو اور بھی اچھا کیا ہے آپ نے۔ اب ڈر کا ہے  
 کا۔“ اسے اٹھا کر میں مس مخفی کی خواب گاہ میں جا گھسا۔  
 عمارت کا صدر دروازہ اندر سے بند تھا اور علی جو کے اندر  
 آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

”آپ... آپ... کیا چاہتے ہیں آخر؟“ نجمہ نے  
 فوم کے گدے پر گرنے کے فوراً ہی بعد اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں... میں تو آپ ہی کو چاہتا ہوں۔“  
 ”مگر... مگر یہ کوئی قطعی فیصلہ کی بات نہیں ہے ہاشمی  
 صاحب! میں ایسے بچنے کی آپ کو اجازت نہیں دے سکتی۔“

”پھر... پھر کیا کرنا چاہیے ہمیں؟“  
 ”بہتر ہے کہ آپ یہ ٹھیل مس مخفی سے کھیلیں۔ تاکہ  
 آپ کو کچھ حاصل بھی ہو سکے۔“ وہ دیوار کے ساتھ لگی کرسی  
 پر بیٹھ کر برقی ہیئر سلکاتے ہوئے بولی۔

”فرض کریں کہ میں مس مخفی کو اپنے شیشے میں اتار بھی  
 لیتا ہوں تو اس سے کیا ہوگا، میری منزل تو آپ ہیں مس  
 نجمہ۔“

”کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟“  
 ”ہاں کیوں نہیں؟ میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا  
 ہوں۔ آپ مذاق سمجھتی ہیں اسے؟“

”تو... تو پھر آپ نرے احمق ہیں۔ روپیہ میری بھی  
 ضرورت ہے اور آپ کی بھی۔ میں مس مخفی کے دل میں آپ  
 کے لیے راہ دیکھ رہی ہوں۔ اسے میں اور ہموار کر سکتی  
 ہوں۔“

”لیکن اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ مجھے تو وہ اپنے  
 سنہری پنجرے میں بند کر کے بے بس کر دیں گی پھر آپ کیا  
 کریں گی؟“

”میں... میں آپ کی پہلی نہیں، دوسری بیوی بن سکتی  
 ہوں۔“

”وہ... وہ کس طرح۔ مخفی اس کی اجازت کیسے دے  
 سکتی ہیں؟“

”ہم ان کو یہ بات بتائے بغیر خاموشی سے شادی کر  
 لیں گے۔“

”یہ... یہ... اچھا تو یہ بات ہے مگر پر نالا تو وہ ہیں  
 رہا۔ مس مخفی تو بہر حال... دیکھیں وہ تو استروں کی مالا بن  
 جائیں گی میرے لیے۔“

”آپ پہلے ایک مرحلہ طے تو کریں۔ پھر... پھر  
 دیکھیں گے ہم کہ آگے کیا کرنا ہے۔ اسے ہم... اپنے  
 راستے سے ہٹا سکتے ہیں۔“ نجمہ نے بڑے ہی جے ہوئے

راستے سے ہٹا سکتے ہیں۔“ نجمہ نے بڑے ہی جے ہوئے

راستے سے ہٹا سکتے ہیں۔“ نجمہ نے بڑے ہی جے ہوئے

راستے سے ہٹا سکتے ہیں۔“ نجمہ نے بڑے ہی جے ہوئے

راستے سے ہٹا سکتے ہیں۔“ نجمہ نے بڑے ہی جے ہوئے

راستے سے ہٹا سکتے ہیں۔“ نجمہ نے بڑے ہی جے ہوئے



لجھ میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی آہنی سرد مہری اور سنگدلی ابھرائی تھی کہ میں سمجھا وہ میرے لیے میری آسانی اور خوش حالی کے لیے بڑے سے بڑا قدم اٹھا سکتی ہے۔

”آپ کا مطلب ہے کہ میں اس سے شادی کرنے کے بعد اسے اپنے راستے سے ہٹا دوں؟“

”ہاں! یہ کون سا مشکل کام ہے ایک ایسے جواں مرد کے لیے... ہماری زندگی کا رخ بدل سکتا ہے۔“

”مگر وہ کس طرح؟“ میں نے نجمہ کے قریب ہیٹر کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”وہ... وہ اگر آپ کی بیوی بن کر موت کی دہن بن جائے تو اس کی تمام دولت آپ کی ملکیت ہوگی اور اس دوران میں ہم خود شادی کر چکے ہوں گے۔“ اس کی یہ بات سن کر میں منجمد سا ہو کر رہ گیا۔ اس نے میری اس وارفتگی کو دیکھ کر رات ہی رات میں اپنے مستقبل کے بارے میں ایسی منصوبہ بندی کر لی تھی کہ وہ سب کچھ مجھے ناقابل یقین نظر آتا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ میں اس کی دولت پر قبضہ کرنے کے بعد اسے ہمیشہ کی نیند سلا دوں۔“ میں نے پہلی بار اسے تم کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”زندگی میں کبھی کبھی آدمی کو بہت تشنہ مگر بڑے ہی دور رس فیصلے کرنے پڑتے ہیں ہاشمی صاحب۔ جب اس مرحلے سے آدمی گزر جائے تو پھر راوی چین ہی چین لکھتا ہے اور یہ دو چار روپے کی بات نہیں پورے چالیس لاکھ روپے نقد اور اس کے دس لاکھ کے بنگلے کا معاملہ ہے۔“

”مگر پھر... پھر... ہم اس بنگلے میں تو نہیں رہ سکیں گے؟“

”کیا ضروری ہے؟ ایسے گلبرگ سے ہزار درجے بہتر آبادیاں موجود ہیں۔ جنت نظیر آبادیاں۔“

”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم پیچھے نہیں ہوگی؟“

”ثبوت؟... آپ کیا ثبوت چاہتے ہیں۔ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے میں خود بھی اپنے بس میں نہیں رہی۔ آپ کی جرات اور صاف گوئی نے مجھے اور بھی متاثر کیا ہے۔ آپ کے لیے میں اپنی مالکن سے غداری کر رہی ہوں اور کیا چاہتے ہیں آپ؟“ اس نے بڑے ہی دلفریب انداز سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ایک ایمان سوز انگڑائی لے کر اس نے سلیٹی رنگ کی چادر اتار کر الگ پھیٹک دی۔ اس کے ہوشربا پیکر کے دلاویز خطوط نمایاں ہوئے تو میں سُدھ بُدھ ہی کھو بیٹھا۔ وہ جتنی بجا کر قوم کے بیڈ پر جالیٹی

تھی اور علی جو باہر پودوں کی تراش خراش میں مصروف تھا۔ اس رات جب میں کوائرٹر پہنچا تو میں نجمہ کی لذت آگیاں یادوں میں یوں غلطاں تھا جیسے میں نے پی رکھی ہو۔ میرا دل جموم رہا تھا اور دماغ فلک پر جا پہنچا تھا۔ لاکھوں روپوں کو ہاتھ میں لے کر گھٹنے، انہیں چھونے اور ان پر اپنی ملکیت کا حق حاصل ہو جانے کے خیال نے مجھے محسوس کر دیا تھا۔ نجمہ نے مجھے زندگی کی ایسی راہ بھادی تھی کہ اگر میں اس پر چل سکتا تو ہم دنیا میں ہی اپنے لیے بہشت تعمیر کر سکتے تھے، وہ مجھ پر ایسی مہربان تھی۔ وہ بندگی تھی اور اس نے اپنے سارے خزانے مجھ پر لٹا دیے تھے۔

اگلے پانچ دن یوں گزرے کہ میں سمجھا میں اب تک جو زندگی گزارتا رہا ہوں وہ ساری کی ساری رائگاں گئی ہے۔ جینا تو مجھے اب آیا تھا۔ نجمہ نے میرے وجود میں ایسے تیز گرم چراغ روشن کر دیے تھے کہ میں سراپا نور بننا جا رہا تھا۔

مخفی چھٹے روز واپس آئی۔ جب میں اس شام چار بجے موٹی کو پڑھانے گیا تو نجمہ مجھے سیدھا مخفی کے کمرے میں لے گئی۔ وہ اس وقت اپنی نشست گاہ میں بیٹھی تھی۔ اس نے بڑا سا خوب صورت سفید گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے نجمہ کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ بلاشبہ وہ بد صورت عورت تھی۔ عمر اس کی کسی بھی طرح تیس سال سے کم نہیں تھی۔ رخسار چمکے ہوئے، ہڈیاں ابھری ہوئیں، چہرہ چمک کے داغوں نے بد نما بنا رکھا تھا۔ ایک آنکھ سے وہ بلاشبہ جھنجھکی تھی۔ نجمہ نے ٹھیک کہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اتفاق نہیں تھا۔ تنگ ساما تھا موٹے موٹے ہونٹ، ٹھوڑی غیر معمولی طور پر باریک اور آکے کو نکلی ہوئی۔ سر پر بال البتہ بہت گھنے تھے۔ قد اس کا پونے چھ فٹ اونچا تو ضرور ہی تھا۔ وہ مجھے دروازے میں داخل ہوتے دیکھ کر میرے استقبال کے لیے اٹھی اور بولی۔

”آئیے ہاشمی صاحب! ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس روز آپ سے براہ راست نہ مل سکے۔“ اس کی آواز پر مردانہ آواز کا شائبہ پڑتا تھا۔

”میں آپ کا شکر گزار ہوں خانم کہ آپ نے آج یہ عزت مجھے بخش دی۔“ میں نے ایک کرسی کے قریب رکے ہوئے کہا۔

”تشریف رکھیں۔ ہمیں نجمہ نے بتایا ہے کہ آپ موٹی کو بڑی محنت سے پڑھا رہے ہیں۔ ہم نے بھی آج دیکھا ہے موٹی آپ سے بہت مطمئن اور مانوس دکھائی دیتی



”یہ میرا فرض ہے خانم! اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔“

”یہ اچھی بات ہے۔ ہمیں آپ کی یہ فرض شناسی پسند آئی۔ ان کے لیے چائے لاؤ نجمہ۔“ اس کی یہ بات سنتے ہی خادمہ دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ دروازہ وہ اپنے پیچھے بند کر گئی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد محفل نے اپنا وہ گاؤں اتار کر الگ رکھ دیا اور بولی۔

”کمراتو گرم ہو رہا ہے۔ ہمیں اس بھاری بھر کم گاؤں سے وحشت ہونے لگی ہے۔“

”ہاں، یہ اچھا کیا آپ نے۔ ویسے بھی آپ ایسی سرو قد خاتون کو اتنے بوجھل کپڑے نہیں پہننے چاہئیں۔“ میں نے نجمہ کے بتائے ہوئے حریوں میں سے پہلا حربہ بروئے کار لاتے ہوئے کہا۔ وہ میرے منہ سے اپنے لیے سرو قد کا لفظ سن کر کھل اٹھی۔

”آپ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ صاف گولوگ ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں۔“

اصل میں صاف گوئی کی تو کوئی بات نہیں ہے خانم۔ دراصل آج کل لڑکیاں بالعموم بس ٹھکنے قد کی ہوتی ہیں۔ بالشت بھر۔ آپ کو تو ماشاء اللہ واقعی قدرِ عطا ہوا ہے۔ آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟“

”ہم نے ایم اے فلاسفی کر رکھا ہے مگر وہ ساری تعلیم بیکار رہی گئی۔ ہم اس سے کوئی بھی کام نہ لے سکے۔“

”علم بذاتِ خود ایک بہت بڑا مقصد ہے خانم! بہر حال آپ سے مل کر آج مجھے دلی خوشی ہو رہی ہے ورنہ اس روز تو میں بس ڈر رہی گیا تھا۔ آپ کی شخصیت واقعی بہت خوشگوار ہے۔“

”شکریہ ہاشمی صاحب! آپ واقعی دوسروں کو سمجھنے اور ان کو داد دینے میں بڑے شارپ اور جینئرس ہیں۔ آپ سے مل کر ہمیں بھی دلی خوشی ہوئی۔ آپ کے پاس وقت ہو تو رات کا کھانا ہمارے ہاں ہی کھالیا کریں۔ آپ کی کہنی ہم واقعی بہت انجوائے کر سکیں گے۔ اس روز ہم نے جو کچھ کہا اس کی معذرت۔“

”نہیں نہیں ایسا نہ کہیں۔ آپ نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ میں ہی بلکہ شاید کچھ زیادتی کر گیا تھا۔“

”سوٹائس آف یو۔ ذرا پلیز دیکھیں شاید یہ بیک زپ کچھ کھل گئی ہے۔ ہم ان ایڑی کیل کر رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور پشت میری طرف کر کے کھڑی ہو گئی۔ وہ

خوشبو میں نہائی ہوئی تھی اور اس کی اسکن ٹائٹ قیص کی زپ واقعی آدمی کھل گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے عمد کسی نہ کسی طرح وہ زپ کھول لی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے بائیں کندھے پر ہاتھ رکھ کر زپ اوپر کھینچی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ جان بوجھ کر میرے قریب ہو گئی ہے۔ اس کے گھنے بال جو جوڑے کی صورت میں بندھے تھے میرے سینے پر آگئے تھے۔ میں نے زپ اوپر چلائی تو وہ لڑکھڑا کر میری طرف جھکی یوں کہ اگر میں اسے سہارا نہ دیتا تو وہ فرش پر چپٹ گر جاتی۔ میں نے اسے سنبھالا تو اس کی آنکھیں منہ لگیں۔ اس کی سانسیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ وہ بڑا ہی وحشت ناک لمحہ تھا۔ اور مجھے اس سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے تھا۔ نجمہ کی ہدایت یہی تھی۔ میں نے خود پروار فستکی طاری کر کے اسے یہ احساس دلادیا کہ اس کا قرب میرے وجود میں آگ لگا گیا ہے۔ جب میں اسے دوبارہ کرسی پر بٹھا چکا تو اس کا وہ ستا ہوا مردہ سا چہرہ تہمتا لگا۔

”میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں مس محفل! مگر میں اپنے اختیار میں نہیں تھا۔“ میں نے تصنع آمیز خجالت سے کہا۔

”نہیں... نہیں! یہ... یہ بالکل فطری بات تھی۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ بار بار اس گستاخی کی تمنا کر رہی ہو۔ میں نے اس کا وہ استخوانی ہاتھ پکڑ کر بڑے بیجان خیز انداز میں دل پر رکھ لیا۔

”یہ دیکھیں۔ اس کی دھڑکن کتنی تیز ہو گئی ہے۔ لگتا ہے یہ بس ٹھہر جائے گا۔ ایک دم نکل ہو جائے گا۔ نفسیات تو آپ کا مضمون رہا ہے اس کی کیا توجیہ کریں گی آپ۔“ یہ کہہ کر میں اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اور اس کا سارا بدن جذبات کے طوفان میں لرزنے لگا تھا۔

”ہم... ہم بہت تنہا ہیں ہاشمی صاحب مگر... مگر ہم کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ کاش آپ ہماری ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتے۔“

”میں... میں آپ کی مشکل کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اگر آپ مجھ پر بھروسہ کریں تو میرا خیال ہے ہم ایک دوسرے کے ٹھیکسار سا تھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں بھی تنہا ہوں اور یہ تنہائی مجھے لے ڈوبے گی۔“

وہ اب نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے کمرے پر ہوئے رخساروں کی ہڈیاں کچھ اور نمایاں ہو گئی تھیں۔



کہہ دی ہے۔“ اس کی آواز بہت مدہم تھی۔

”واقعی؟ کیا کہا ہے انہوں نے؟“

”وہ کہتی ہیں کہ انہیں آپ کی تجویز منظور ہے۔ وہ آپ کو بہت زیادہ پسند کرتی ہیں۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا مس نجمہ ناوک۔ اب تو سارے دلدر ہی دور ہو جائیں گے مگر آپ کب تک میرے صالح نکاح میں آنا چاہتی ہیں؟“ میں نے اس سے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

”یہ ایک معرکہ تو پہلے سر کر لیں۔“ وہ مسکرائی۔

”نہیں! میں آپ کے بارے میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ یہ پھندا صرف آپ کی وجہ سے میں قبول کروں گا۔ پہلے آپ کو مجھ سے شادی کرنی ہوگی۔“

”مجھے تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی ادھر ادھر نہیں جانے دیتی۔ پہلے یہ میدان صاف کر لیں پھر ہم اپنے بارے میں سوچیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ ارد گرد بڑی محتاط نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ شادی کی تیاری شروع کر دیں۔ پانچ دس دوستوں کو لے کر آجائیں۔ میرا خیال ہے کہ اگلے بدھ کی تاریخ میں مقرر کرواؤں گی۔ میرے مشورے کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتی ہیں۔ میں نے ہی انہیں اس فیصلے پر آمادہ کیا ہے۔“

”بس ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔“

”اچھا خدا حافظ! مگر یاد رکھیں ہمیں اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق چلنا ہوگا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں اس کا انتظام کر لوں گا۔“

”کوئی ایسی تجویز سوچیں جس میں ذرا سا بھی جھول نہ ہو۔“

”اس معاملے میں بھی آپ کو ہی میری راہنمائی کرنی ہوگی۔“

”میں بھی سوچتی ہوں آپ بھی سوچیں۔“ یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔ عمارت کے صدر دروازے کے شیشوں میں سے شاید مس مخفی ہمیں دیکھ رہی تھی مگر برآمدے میں بلب کی تیز روشنی میں وہ ہمیں نظر نہیں آئی تھی۔

بدھ کے روز واقعی مس مخفی سے میری شادی ہو گئی۔ اور وہ مرحلہ جسے میں خواب میں بھی طے نہ کر سکتا تھا، یوں بہ خیر و خوبی گزر گیا کہ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ شادی میں مولانا شعیب بھی شامل تھے اور باری

”کیا آپ...“ اس نے یوں کہا جیسے وہ نیند میں بڑبڑا رہی ہو۔ آنکھیں اب بھی اس کی نیم دائیں۔ ان کا عیب چھپانے کے لیے وہ انہیں خال خال ہی کھولتی تھی۔

”ہاں مس مخفی میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے شادی کر لیں۔“ میں نے سارے تکلفات سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

وہ حیران نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے اسے میری اس تجویز کا لاشعوری طور پر احساس ہو چکا تھا۔ وہ میرے بارے میں مختلف قسم کی باتیں پوچھنے لگی۔ میں کون ہوں؟ میرا خاندان کیا ہے؟ میری پسند ناپسند کیا ہے؟ میں اس کے ہر سوال کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دیتا رہا اور ساتھ کے ساتھ یہ بھی سوچتا رہا کہ اس پر غالب آنے کے بعد میں اسے نجمہ کے منصوبے کے مطابق اگر قتل کرنا چاہوں تو کیا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ مجھے دراصل نجمہ ایسے مقام پر لے جا چکی تھی اور اس کے لیے میری مخفی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ میں نے اس سارے مرحلے سے گزر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اس راہ سے گزر جانے کے بعد میں چالیس لاکھ روپے کا مالک بن سکتا تھا اور وہ پچھلے کی ملکیت بھی میرے حصے میں آسکتی تھی۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں مس مخفی کے اس استخوانی ڈھانچے کو ساری عمر یا نہوں میں لیے بیٹھا رہتا۔

ابھی وہ میرے بارے میں کرید کرید کر سوال پوچھ رہی تھی کہ نجمہ چائے لے کر اندر آ گئی۔

”اچھا ہاشمی صاحب اس بارے میں ہم آپ کو سوچ کر جواب دیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ نجمہ نے عہد اُجھ سے آنکھ ملانے سے گریز کیا۔

جب ہم چائے پی چکے تو مس مخفی بولی۔

”میرا خیال ہے اب آپ موٹی کو پڑھا دیں۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔“ وہ اپنی سوکھی سڑی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ رہی تھی۔

میں فوراً ہی وہاں سے اٹھ گیا۔ میں نے اپنا پہلا تیر چلا دیا تھا اور وہ بڑی حد تک نشانے پر بیٹھا تھا۔

موٹی کو اس روز میں ڈیڑھ گھنٹے تک پڑھا تا رہا مگر اس دوران نجمہ ایک بار بھی ادھر نہیں آئی۔ شام کے سات بجے میں موٹی کے کمرے سے نکلا تو نجمہ مجھے لان میں مل گئی۔ مس مخفی بھی اس کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی نجمہ تیزی سے میری طرف لپکی۔ مس مخفی اس دوران دوسری طرف نکل گئی۔

”ہاشمی صاحب! آپ کو مبارک ہو۔ مس مخفی نے ہاں



بھی۔ ان کی حیرت دیدنی تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ میں مس خفی کے ہاں اتنا اونچا مقام حاصل کر لوں گا۔ وہ میری اس کامیابی پر کچھ عین غین قسم کے تہرے بھی کرتے رہے مگر میں نے ان کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ سب سے عمدہ بات یہ تھی کہ ان دونوں میں سے کسی نے بھی مس خفی کو نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ وہ اس استخوانی ڈھانچے کی مرد نما عورت سے مجھے شادی کر لینے سے ہر قیمت پر روکنے کی کوشش کرتے۔

برات میں شامل میرے دوست احباب تو واپس چلے گئے اور میں وہیں گھر داماد کی صورت میں خفی کے ہاں ہی جم کر بیٹھ گیا۔ مگر... وہ میری اذیتوں کا پہلا دن تھا۔ شب عروسی میں نے یوں گزاری جیسے کوئی زبردستی میرے منہ میں کچھ بھروسے ٹھونس رہا ہو۔ خفی میں نسوانیت کی کوئی بھی بات تو نہیں تھی پھر بھی میں نے جوں توں کر کے وہ رات اس امید پر گزاری لی کہ آج نہیں تو کل میں اس چھپکلی سے نجات حاصل کر ہی لوں گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔

یہ بات میرے لیے بے حد حیرت انگیز تھی کہ شادی میں خفی نے اپنے کسی بھی رشتے دار کو مدعو نہیں کیا تھا مگر اس سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ اللہ کے فضل سے اس کا کوئی بھی قریبی عزیز زندہ نہیں تھا۔ ایک صرف مونی کی دور پار کی پھوپھی ہی شادی میں شریک ہو سکی تھی۔

میں زندگی بھر عورتوں کے قرب سے محروم رہا تھا۔ حالات نے اس طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی لیکن جو آگ اس رات مجھے عروسی میں پہنچ کر میری حیات میں لگی، اس کا مداوا خفی کے پاس نہیں تھا۔ وہ مجھے سرما کی برسات میں بھیگی ہوئی بوری نظر آتی تھی۔ مجھے اس کی قربت سے ابکائیاں آتی تھیں مگر پھر بھی مجھے وہ زہر پینا ہی پڑا کہ خفی نے مجھ سے بے حساب توقعات وابستہ کر لی تھیں۔

رات کے دو بج رہے تھے کہ خفی کا رنگ اچانک زرد ہونے لگا۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بستر سے اتری اور بڑی ٹھیف و نزار آواز میں بولی۔

”آپ ذرا نجمہ کو جگادیں ہمارے گردے میں شدید درد اٹھ رہا ہے۔ کبھی بھی یہ درد سراٹھاتا ہے تو ہمارا بُرا حال ہو جاتا ہے۔“

”یہ تکلیف کب سے ہے آپ کو؟“

”کوئی دو سال ہو گئے۔ ڈاکٹر آپریشن کے لیے کہتے ہیں مگر میں وہ کسی طرح بھی منظور نہیں ہے۔ دوا میں کس

جاسوسی ڈائجسٹ

لیے ہیں آخر۔ پلیز ذرا نجمہ کو جگالائیں۔ یہ کھنٹی بجا دیں۔ یہ جو دیوار میں لگی ہے۔“ اس کی حالت دم بہ دم خراب ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے دیوار میں لگا کھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ اور پھر خفی کو میں نے دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ اس کا بدن درد کی شدت سے کچلا جا رہا تھا۔ اپنی چیخوں کو وہ بڑی مشکل سے دبا رہی تھی۔ یوں جیسے وہ درد زہ میں مبتلا ہو۔ ٹکے میں سر دے کر بولی۔

”یہ درد اب کی بار پورے ایک ماہ بعد اٹھا ہے اوہ میرے خدایا! اسے آج ہی ابھرتا تھا۔“ وہ ملکنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی مگر میرے لمس میں وہ اجنبیت نمایاں تھی جو مجھے اس سے دور کرتی جا رہی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد نجمہ ہمارے کمرے میں آ گئی۔ وہ اس وقت بھی سر سے پاؤں تک اس ملکبھی سی گرم چادر میں لپیٹی ہوئی تھی اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ جاگ ہی رہی تھی۔

خفی کو ٹکے میں سر دے کر روتے دیکھ کر وہ بولی۔

”کیا ہوا ہے انہیں؟“

”اوہ نجمہ! ہمارے گردے میں پھر درد اٹھنے لگا ہے پلیز ہمیں ٹیکہ لگا دو۔ ورنہ ہم مرجائیں گے۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔ ٹھہریں میں آپ کو درد کی گولی دے دیتی ہوں۔“

”کچھ کرو نجمہ جلدی کرو۔ یہ درد ہمیں مار ڈالے گا۔“

”گرم پانی کی بوتل بھی لے آئیں۔“ میں نے خفی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ وہ اب بستر پر پچھاڑیں کھا رہی تھی۔

نجمہ نے دوسرے کمرے سے لا کر خفی کو تین گولیاں کھلا دیں اور پھر گرم پانی کی بوتل درد کے مقام پر رکھ کر وہ خفی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ میرے لیے وہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا مگر اس میں بھی مجھے ایک آسودگی کا پہلو نظر آنے لگا۔ میری حیات کو خفی نے جس انداز سے جگادیا تھا، ان کی پلکوں پر نیند طاری کرنے کے لیے نجمہ میرے سامنے آ بیٹھی تھی۔ ان گولیوں نے معجزاتی اثر دکھایا اور خفی کوئی دس منٹ بعد گہری نیند میں کھو گئی۔ نجمہ ابھی تک اس کے پاس بیٹھی درد کو تسکین دینے کے لیے گرم بوتل لحاف کے اندر خفی کے پیٹ پر پھیر رہی تھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ خفی بے سدھ ہو چکی ہے تو وہ بڑی آہستگی سے پلنگ پر سے اتری۔

”آؤ...“ وہ بڑے ہی سرد لہجے میں بولی۔

”ان کا خیال رکھیں۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے فوراً بلا لیں۔ میں تیسرے کمرے میں سوتی ہوں۔“ اس نے مجھے نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ یہ کہہ کر وہ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



بچھلے ہفتے میری ساس نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدی۔ تین دن کے بعد وہ کار ڈیلر کے پاس گئی۔ ”میرا خیال ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تمہاری دی ہوئی گاڑی میں ہر قسم کی ٹوٹ پھوٹ شامل ہے؟“

”جی ہاں۔“ ڈیلر نے جواب دیا۔ ”آپ کا خیال درست ہے۔“

”تب تو تمہیں دو عدد سائیکلیں، گھر کا نیا گیٹ۔ درجن گلاب کے پودے اور گیراج کا ایک دروازہ دینا پڑے گا۔“

لودھراں سے محمد انعام کی تحقیق

”ہاں، وہ گہری نیند میں ہے مگر میری طبیعت ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئی ہے۔“

”آپ کو ادھر نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے وہ جاگ رہی ہوں، آپ انہیں نہیں جانتے ہیں۔“

”نہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ نے انہیں بڑی کاری گولی دی ہے۔ میں باقی رات آپ کے ساتھ گزاروں گا۔“

”نہیں یہ ناممکن ہے ہاشمی صاحب! پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ہمیں اپنی حدود کا احساس کرنا ہو گا۔ میں... میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔“

”آپ یہ کیسی بے رخی دکھاتی ہیں نجمہ! ہماری منزل ایک ہے آپ نے ہی مجھے یہ راستہ دکھایا ہے۔ پھر... پھر... یہ آپ کا لہجہ اتنا سرد کیوں ہے؟“

”اس کی وجہ ہے۔ آپ میرے لیے ابھی تک نامحرم ہیں۔“

”اسی لیے تو کہا تھا میں نے آپ سے کہ پہلے میں آپ سے شادی کر لیتا ہوں۔“

”وہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر جمنا کھٹنے لگی۔ راہداری تو خالی پڑی تھی، گھر میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر پیچھے ہٹی اور بولی۔

”آپ اتنی جلدی نہ کریں۔ کم از کم ایک مہینہ آپ ان کے ساتھ گزاریں اور پھر ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت ان کو راستے سے ہٹائیں۔ اس کے بعد ہم شادی کر لیں گے۔“

تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں چند لمحوں تک احمقوں کی طرح مفلکی کو دیکھتا رہا۔ اس درد کی یلغار نے اسے کچھ اور زیادہ بد صورت بنا دیا تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں کچھ اور ابھر آئی تھیں اور اس کے گورے رنگ پر پیلاہٹ ابھر آئی تھی۔ سارا ہیکہ اس کے لیے گھنیرے بالوں سے اٹا پڑا تھا اور وہی اس کی کل کائنات تھی۔ اگر وہ بال منڈوا دیتی تو کوئی بھی آدمی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عورت ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں اس کو ٹھکانے نہ لگا سکا تو... تو... میں زندگی بھر سر پر ہاتھ رکھ کر روتا رہوں گا۔

پہلی بار اس لمحے میں نے بڑے اطمینان سے برقی آتش دان کے قریب بیٹھ کر صورت حال کا جائزہ لیا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اتنی ساری اجنبیت کی دھول صاف ہو جانے کے باوجود مفلکی نے مجھ سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا جو اس کا باپ اس کے لیے تر کے میں چھوڑ گیا تھا۔ میں تو اس کے بارے میں عمداً کچھ نہیں پوچھ رہا تھا مگر اسے تو مجھ سے اس معاملے پر کوئی بات کرنی ہی چاہیے تھی اور اب... اب میری گردن اس کے شکنجے میں پھنس چکی تھی۔ اس نے مجھ سے ایک لاکھ روپے حق مہر میں لکھوا لیے تھے۔ اس وقت تو میں نے اس میں کوئی برائی نہ دیکھی مگر اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میرے گلے میں اس نے وزنی پتھر باندھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اتنی بڑی رقم اسے طلاق کی صورت میں کسی طرح بھی نہیں دے سکتا تھا اور اس نے اسی خطرے کی پیش بندی کر لی تھی۔ وہ مجھے بری طرح جکڑ چکی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹے تک میں آتش دان کے سامنے بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور پھر مفلکی کے بارے میں یہ اطمینان کر کے کہ وہ گہری نیند میں کھو چکی ہے، میں کمرے سے نکلا اور نجمہ کے دروازے پر جا پہنچا۔ میرا دل اس گھڑی بلیوں اچھل رہا تھا۔ مجھے نجمہ کے رویے کے بارے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ یہ وہی تھی جس نے مفلکی کو مجھ سے شادی کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کیا تھا۔ میرے متعلق اس نے خدا جانے اسے کیا کچھ کہا ہو گا۔ میرا راستہ اس نے صاف کیا تھا جب میں نے نجمہ کا دروازہ کھولا تو مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے بڑھ کر بانہوں میں لے لے گی مگر جیسے ہی میں اندر داخل ہوا وہ سنبھل کر بستر سے اٹھی اور سمٹ سٹکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ برقی آتش دان نے اس کے کمرے کو بھی بہت آسودہ کر رکھا تھا۔ وہ بڑے ہی بر فیلے لہجے میں بولی۔

”کیا بات ہے۔ ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“



”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھتی ہوں اگر آپ کا یہی اصرار ہے تو پھر یہی سہی مگر اس کے لیے وقت کیسے ملے گا؟“

”آپ محفل سے چار چھ دن کی چھٹی لے کر میرے مکان پر قصور جا رہیں میں وہاں آکر آپ سے شادی کر لوں گا۔“

”وہ بیمار ہیں۔ مجھے چھٹی کیسے دیں گی؟“

”کوئی بہانہ بنالیں۔ یہ تو بہت ضروری ہے نجمہ میں آپ کے بغیر اس دلچسپی کیلی بوری سے گزارہ نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھے اس سے کھن آتی ہے۔“

”ٹھیک ہے ہاشمی صاحب! ان کی طبیعت ٹھیک ہو جائے تو میں کچھ کروں گی۔“ وہ بہت ہی لیے دیے انداز میں بات کر رہی تھی اور اس کی آنکھوں کی وہ سرد مہری مجھے حیران کر رہی تھی۔ وہ مجھ سے اتنے اہم مسئلے پر یوں بات کر رہی تھی جیسے ہم کسی جانور کی خرید و فروخت پر بحث کر رہے ہوں۔ میں سمجھا وہ کردار کی بہت ہی پختہ عورت ہے اور کسی بھی طرح وہ خود کو اپنے مقام سے گرانا پسند نہیں کرتی۔ میرے دل میں اس کی قدر و منزلت کچھ اور بڑھ گئی، میرے جذبوں کی آنچ کچھ اور تیز ہو گئی۔ وہ ایسی نہیں تھی کہ میں اس سے صرف نظر کر سکتا۔ نسوانیت کا موقع وہ نجمہ میرے حواس پر بری طرح چھا چکی تھی۔ اس کے اتنے بخ بستہ لہجے سے میں مایوس تو ضرور ہوا مگر یہ سوچ کر اس کے کمرے سے باہر نکل آیا کہ مجھے اس کے پندار کو نہیں نہیں پہنچانی چاہیے کہ میرا اس کا عمر بھر کا ساتھ ہوگا۔ ہم جو کچھ ملے کر چکے ہیں، اس پر عمل کر کے ہم ایک نئی اور بھرپور زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔

محفل کے کمرے میں جب میں واپس گیا تو میں اسے دیکھ کر وحشت زدہ ہو گیا۔ اسے درد نے پھر آدبو چاٹھا اور وہ بڑی اذیت سے دو چار تھی۔ اس کے ذہن کو دوا کے اثر نے جکڑ تو رکھا تھا مگر پھر بھی وہ درد اتنا شدید تھا کہ وہ بڑے کرب ناک انداز میں بستر پر کروٹیں لے رہی تھی۔ میں نے دوبارہ کھنٹی بجا دی۔ نجمہ دوڑ کر ہمارے کمرے میں آئی تو اس کا رنگ اڑنے لگا، وہ سمجھی کہ محفل نے مجھے اس کے کمرے میں جاتے دیکھ لیا ہے۔ بڑے ہی سہے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کیا بات ہے، انہیں نیند نہیں آئی؟“

”آئی تو تھی مگر درد نے انہیں پھر نڈھال کر دیا ہے۔ دوا کا اثر ختم ہو رہا ہے۔“

میری یہ بات سنتے ہی اس نے دائیں ہاتھ کی تپائی پر

پڑا فون سنبھالا اور نمبر کھما دیا۔

وہ کسی ڈاکٹر عبرت سے بات کر رہی تھی، بولی۔

”ڈاکٹر ہماری مالکن کی حالت بہت خراب ہے۔۔۔“

پلیز آپ ابھی آجائیں ان کے گردے میں درد ہے۔“

”ہاں، آپ تو جانتے ہی ہیں۔ انہیں فوری علاج کی ضرورت ہے یہ درد ایک مہینے بعد اٹھا ہے۔“

”میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

”مس محفل! ڈاکٹر ابھی آرہے ہیں۔ پلیز آپ خود کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ اوہ یہ بوتل بھی ٹھنڈی ہو گئی۔“ یہ کہہ کر وہ بوتل کا پانی بدلنے کے لیے باہر کی طرف لپکی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر عبرت وہاں پہنچ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی اس خاندان کا پرانا ہمدرد تھا اور محفل کے اس مرض کا اسے بہ خوبی علم تھا۔ اسے میں نے شادی کی تقریب میں بھی شامل دیکھا تھا۔ اس نے محفل کا معائنہ کیا اور بولا۔

”تکلیف کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ انہیں فوراً اسپتال لے جانا ہوگا۔ میرا خیال ہے یہ گردے کا نہیں پتے کا درد ہے اور ان کا فوری آپریشن بہت ضروری ہے۔“

”تو پھر جلدی کریں ڈاکٹر! یہ تو بہت ہی برا ہوا۔ یہ ہماری شب عروسی تھی۔“ میں نے بڑے ہی نبجے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”میں سمجھتا ہوں، ہاشمی صاحب! خدا سے دعا کریں، ان کا فوری آپریشن بے حد ضروری ہے۔“ اٹھائیں انہیں میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“

اس کے کہنے پر ہم دونوں نے مل کر محفل کو اٹھایا اور ڈاکٹر کی گاڑی میں پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ علی جو کو بھی اس عرصے میں نجمہ نے جگا دیا تھا۔ وہ گھر پر ہی رہا اور ہم تینوں اسی وقت محفل کو ساتھ لے کر اسپتال جا پہنچے۔

ڈاکٹر نے اس کے لیے فوری آپریشن کا مشورہ دیا کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ پتے کے پھٹ جانے کا اندیشہ بے حد قوی تھا۔ وہ اسے خود ہی ہنگامی وارڈ سے نکال کر اسپتال کے اندرونی حصے میں لے گئے۔ اسے وہ آپریشن کے مرحلے سے گزارنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

میں اور نجمہ آپریشن تھیر کے سامنے وسیع و عریض برآمدے میں تنہا کھڑے تھے۔ نجمہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ میں نے اپنی ذہنی اذیت سے جھلا کر سگریٹ سلگایا تو وہ بہت ہی دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولی۔ ”ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہاشمی صاحب!“



”وہ کیا؟“ میں نے سگریٹ کا گھراکش لے کر کہا۔

اسپتال گھر سے سناٹوں سے لبریز تھا۔

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ پتے کا درد ہے اور...“

اور... زیر آلود پتا پھٹ جانے سے آدمی فوراً مر جاتا ہے تو میں ڈاکٹر کو بھی فون نہ کرتی۔“

”ہاں، واقعی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں نجمہ! ہم نے معالے کے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا۔ آپ نے بڑی تیزی دکھائی۔“

”دراصل میں اسے گردے کا درد سمجھتی تھی۔ حالانکہ یہ پیٹ کے دائیں حصے میں تھا۔ ہم نے ایک قیمتی موقع کھو دیا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اب بھی اس کے بچ جانے کے امکانات صفر ہیں۔“

”جی نہیں، اب وہ اسے بچالیں گے۔ ہم اسے بروقت اسپتال لے آئے ہیں۔“

”اور یہی ہماری سب سے بڑی غلطی ہے۔“

”اب آپ کو کچھ اور سوچنا پڑے گا اور جلدی۔“

”آپ فکر نہ کریں، مگر اب ہماری شادی میں کچھ اور تاخیر ہوتی نظر آتی ہے۔“

”نہیں، میں نے اس بات پر غور کر لیا ہے۔ مس مخفی کو کم از کم دس دن تو یہاں ضرور ہی لگ جائیں گے اور اس عرصے میں ہم آسانی سے شادی کر سکتے ہیں۔“ وہ بہت پُر عزم دکھائی دیتی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔“

”مگر شادی ہم آپ کے شہر قصور جا کر کریں گے۔“

”اب اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کام یہاں بھی ہو

سکتا ہے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔“

”جیسے آپ کی مرضی مگر دو دن بعد آپ دوسری بار دلہا بنیں گے تو کوئی واقف حال کیا کہے گا؟“

”یہ شادی ہم بڑی خاموشی سے کر سکتے ہیں۔ ہم شاہدرہ کے ایک مولوی کے پاس جا بیٹھیں گے۔ وہ میرا واقف کار ہے۔“

”ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ پہلے یہ معلوم کر لیں کہ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“ وہ اس دوران ایک بار بھی نہیں مسکرائی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ بے حد نجیبہ تھی اور یہی بات مجھے سب سے زیادہ حیران کرتی تھی۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈاکٹر عبرت آپریشن تھیٹر سے باہر آئے، بولے۔

”ہاشمی صاحب مبارک ہو آپ کی بیگم کی جان بچ گئی۔ بروقت آپریشن ہو گیا اگر ذرا دیر ہو جاتی تو وہ جانبر نہ ہو سکتی تھیں۔ ان کے پتے میں زہر بھر چکا تھا۔“

”ہم آپ کے شکر گزار ہیں ڈاکٹر۔“

”یہ میرا فرض تھا۔ میں ان کا پرانا خاندانی معالج ہوں۔ میرا خیال ہے انہیں یہاں کم از کم دس دن تو رہنا ہی پڑے گا۔“ پھر وہ میرا کندھا تھپتھا کر بولا۔

”ایسا تماشا بھی کسی کے ساتھ نہ ہوا ہوگا۔ یہ آپ کی پہلی رات تھی مگر اسپتال میں گزری۔“

”ان کی جان بچ جائے ڈاکٹر ایسی راتیں تو ہزاروں مل جائیں گی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ان کو ہوش آنے میں ابھی دیر لگے گی۔ آپ یہاں سردی میں ٹھہرنے کے بجائے گھر چلے جائیں اور صبح آٹھ بجے واپس آ جائیں۔“

”نہیں ہم ادھر ہی ٹھہریں گے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر!“

وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر اسی وقت واپس چلا گیا۔

مخفی کو ان لوگوں نے کچھ ہی دیر بعد ایک الگ کمرے میں پہنچا دیا۔ ہم بھی اس کے پاس جا بیٹھے۔ وہ کچھ اور زیادہ نحیف و نزار نظر آرہی تھی۔ رنگ اس کا ہلکا ہو چکا تھا۔ اس میں پہلے ہی زندگی کی اتنی حرارت کہاں تھی جو وہ اس زخم کو بھی برداشت کر سکتی۔ اس کی حالت مجھے بہت ہی ابتر نظر آتی تھی۔

وہ ساڑھے سات بجے ہوش میں آئی تو ہمیں اپنے قریب دیکھ کر بہت خوش ہوئی مگر نقاہت کی وجہ سے وہ کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ میرا ہاتھ اس نے بڑے ہی اپنائیت

بھرے انداز میں پکڑ کر اپنے کھرچے ہوئے رخساروں سے لگایا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جسم میں درد کی

ٹیس اسے اب بھی کچھ کے لگاتی تھی۔ ابھی اسے ہوش میں آئے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس کے درد میں

بے تحاشا اضافہ ہونے لگا۔ نجمہ ڈاکٹر کو بلالائی اور اس بھلے

آدمی نے پھر ایک نیند کا ٹیکہ مخفی کی نس میں گھونپ دیا اور وہ ہر شے سے بے نیاز ہو کر بے سدھ ہو گئی۔

میں نے اسی روز دس بجے نجمہ کو شاہدرہ لے جا کر امام مسجد مولوی عبدالغفور کے ہاتھ پر سو روپے رکھے اور نجمہ سے

نکاح پڑھوایا۔ نکاح نامے میں اس نے اپنا نام انجمن آرا لکھوایا، والد کا نام اس نے الہی بخش بتایا تھا۔ امام صاحب

نے وہی لکھ دیا۔ انجمن آرا کی وضاحت اس نے یہی کہ مخفی



نے اسے یونہی نجمہ کہنا شروع کر دیا تھا اور یہی نام اس کے منہ پر چڑھ گیا ورنہ اس کا پیدائشی نام انجمن آراہی تھا۔ بات معقول تھی، میں نے تسلیم کر لی۔ مجھے اس میں اعتراض کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ گواہ امام مسجد نے خود بلوا لیے تھے۔ نکاح نامہ اس نے بڑی تفصیل سے تیار کر کے ہمارے ہاتھ میں تھا دیا۔ اس دستاویز کو بڑے غور سے پڑھنے کے بعد نجمہ نے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ وہ بہت مطمئن نظر آتی تھی مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی برابر طاری تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی نظر آتی تھی۔ مخفی اسپتال میں تھی اور ہم اس روز گھر پر پہنچ کر نجمہ کے کمرے کو جگہ عروسی بنا چکے تھے۔ علی جو کو میں نے ایک ایسے کام پر قصور بھیج دیا تھا کہ وہ شام سے پہلے واپس نہیں آ سکتا تھا۔ دراصل میں نے اسے وہاں کے حکیم سے مخفی کے لیے دوا لانے کے لیے کہا تھا۔ اور اسے یہ سمجھایا تھا کہ اس دوا سے مخفی جلدی صحت یاب ہو سکتی ہے۔ موٹی ایک بچہ اسکول سے واپس آئی تو نجمہ نے اسے کھانا کھلا کر گہری غیند سلا دیا۔ اس کے لیے اس کے پاس ایک گولی موجود رہتی تھی۔ تین بچے تک ہم زندگی کے سارے ہی لذت آگیں مراحل سے گزر چکے تھے، نجمہ میری دوسری بیوی بن گئی تھی۔ چھوٹی بیگم، مگر بشارت اس کے چہرے پر پھر بھی نہیں ابھر سکی تھی۔ وہ اس وقت بھی مجھے کچھ سوچتی نظر آتی تھی۔

”کیا بات ہے تم کسی گہری سوچ میں تم ہو؟“

”آپ اپنے مقصد کو بھول رہے ہیں۔ رات آپ نے مخفی سے اس رقم کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔“

”نہیں، موقع ہی نہیں ملا اور پھر میں کوئی بات کرتا تو وہ خدا جانے کیا سمجھتی۔“

”نرے احمق ہیں آپ۔ اسے شیشے میں نہ اتار سکے۔ بہر حال، اب تو قانونی طور پر آپ ہی اس کے وارث ہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“

”اب آپ یوں کریں کہ مخفی کو اسی بیماری کے دوران ختم کر دیں۔“

”وہ کس طرح؟“

”یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔ میرا دماغ اتنا کام کرتا تو میں پہلے ہی آپ کو بتا چکی ہوتی۔ مگر یہ سب کچھ ایسے طریقے سے کریں کہ آپ پر کوئی حرف نہ آئے۔ ورنہ ہم دونوں تباہ ہو جائیں گے۔“

”یہ تو ہے مگر میری سمجھ میں کوئی طریقہ نہیں آ رہا

”میرا خیال ہے کہ آپ اس معاملے میں ابھی تک سنجیدہ نہیں ہیں۔“

”نہیں میں سنجیدہ تو ہوں مگر یہ کوئی آسان کام نہیں ہے نجمہ اقل کرنا تو شاید مشکل نہیں مگر اسے چھپا لینا ناممکن ہے اور ہم دونوں اس معاملے میں اناڑی ہیں۔“

”اس سے زیادہ سنہری موقع اور کوئی نہ مل سکے گا ہاشمی صاحب! کیا آپ کو ٹیکہ لگانا آتا ہے؟“

”ہاں، میرا خیال ہے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں نے فرسٹ ایڈ کی تربیت لے رکھی ہے۔“

”ہوں، دیکھیں ابھی دو تین دن تک مخفی کو وہ نیند کے ٹپکے لگاتے رہیں گے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ اگر کسی تندرست آدمی کو انسولین کا بڑا ٹیکہ دو تین سی سی کے قریب لگا دیا جائے اور اس کو فوری طبی امداد نہ ملے تو اس کی فوری موت واقع ہو سکتی ہے۔“ نجمہ نے نہایت ہی خوفناک اور پُر عزم لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک ابھر آئی تھی جیسی کسی بلی کی آنکھوں میں شکار کو سامنے دیکھ کر پیدا ہو جاتی ہے۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے؟“

”ہاں، میں آپ کو وہ کتاب بھی دکھا سکتی ہوں جس میں یہ بات لکھی ہوئی ہے۔ اس کا مصنف ایک ڈاکٹر ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور الماری میں سے ایک کتاب لا کر اس نے میرے سامنے رکھ دی۔ اس کے متعلقہ صفحے کو جب میں نے پڑھا تو مجھے اس کی بات پر اعتبار آ گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں اس صفحے کو غور سے پڑھ چکا تو وہ بولی۔

”آپ آج رات اس کے کمرے میں گزاریں اور جب وہ ٹپکے کے اثر سے نیند میں دھت ہو تو آپ تین سی سی انسولین بھر کر اس کے بازو میں ٹیکہ لگا دیں اور الگ ہو کر بیٹھ جائیں۔ وہ نیند آور ٹپکے کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے اپنی اس کیفیت پر بول بھی نہیں سکے گی اور ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔“

”مگر وہ موت کا سبب معلوم کر لیں گے؟“

”ایسا نہیں ہوگا۔ انسولین جسم میں تحلیل ہو جاتی ہے اور موت کے بعد اس کا کسی بھی طریقے سے سراغ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ وہ آپریشن کی وجہ سے ویسے ہی نیم مردہ جھیل ہے اور انسولین جذب کرنے کے لیے کوئی بھی غذا نہیں ہوگی اور آپ کا کام آسان ہو جائے گا۔“

اف میرے خدایا۔ اس نجمہ نے جس نے ایک



بھر پر زندگی مٹنے کے زیر سایہ گزار دی تھی اپنی محنت کو راستے سے ہٹانے کے لیے کیسا خوفناک منصوبہ سوچ رکھا تھا۔ یہ احساس مجھے آج دس سال ہے۔ کاش میں اس کے اصل مقاصد کو پہلے سمجھ سکتا مگر میں چالیس لاکھ روپے کی رقم کوٹھی میں لینے اور نجمہ کے ساتھ ایک نئی زندگی گزارنے کی آرزو میں اتنا مخمور ہو چکا تھا کہ میں نے اس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔

”ٹھیک ہے نجمہ! میں یہی کرتا ہوں۔“

”بس تو پھر آپ جائیں۔ انسو لین سرنج سوئی اور

روٹی ساتھ لے جائیں۔“

”مگر میں ٹیکہ گرم کیسے کروں گا؟“

”اسے گرم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو

مریض کی زندگی لینی ہے بھائی نہیں۔“

”پھر بھی یہ بات بہت ضروری ہے۔ ٹیکے کے بعد جتنی

بھی اس کی زندگی باقی ہوگی اس کے دوران ٹھنڈی سوئی سے

ورم بھی پیدا ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر اسپرٹ میں سرنج کو نہلا لیں۔ اور پھر پانی

سے صاف کر لیں مگر اسپرٹ اس کو انفیکٹ نہ کر دیں۔“

”بے فکر رہو۔ یہ سب کام میں باہر سے مکمل کر کے ہی

جاؤں گا۔“

”تو پھر بسم اللہ کریں۔ ابھی سے اپنا ضروری سامان

لے کر مٹھی کے پاس جا بیٹھیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کچھ ایسے

ہیجان خیز انداز سے اپنی محبت کا یقین مجھے دلا پا کہ میں سمجھا

مجھے لہلائی نشستیں میسر آ گئی ہیں۔ وہ میری زندگی کی دوسری

عورت تھی۔ مٹھی سے سر تا پا مختلف۔ رنگ و نور میں نہلائی

ہوئی۔ اس نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔

میں اسی شام انسو لین سرنج، اسپرٹ، سوئی اور روٹی

لے کر اسپتال جا پہنچا۔ مٹھی اس وقت ہوش میں تھی اور ایک

نرس اس کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر مٹھی نے اپنا وہ سوکھا

سڑا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ بڑے ہی نحیف لہجے میں

بولی۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے ڈیر! میں کب سے آپ

کی راہ دیکھ رہی ہوں؟“

”کب بیدار ہوئی ہیں آپ؟“ میں نے اس کے

پاس بیٹھ کر پوچھا۔

”میں کوئی تین بجے جا گئی تھی۔ مگر یہاں کوئی بھی نہیں

تھا۔“

اس کو مجھ سے معروف گفتگو دیکھ کر نرس باہر نکل گئی۔

”اور اب پانچ بج رہے ہیں۔ دراصل میں آپ کے بارے میں ایک حکیم صاحب سے مشورہ کرنے گیا تھا مگر اس نے کہا کہ آپ پریشن کے بعد تو اس کی دوا بے معنی ہوگی۔ آپ کی حالت ہم سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ نجمہ بھی بہت پریشان تھی۔“ میں نے یونہی بات بنانے کی کوشش کی اور اس کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے جان بوجھ کر آنکھوں پر زور ڈال کر چند آنسو بہا دیے۔ وہ میری یہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

”میں آپ کو خوشی نہ دے سکی مجھے اس کا افسوس ہے ڈیر! مگر اب فکر مٹی کوئی بات نہیں۔ میں اب جلد ہی صحت یاب ہو جاؤں گی۔ پھر ہم ماہِ غسل منانے کے لیے یورپ چلے جائیں گے اور پیرس میں رہیں گے۔“ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔

”خدا کرے آپ جلد صحت یاب ہو جائیں۔ یورپ میں کیا رکھا ہے۔ ہم یہ خوب صورت دن کہیں اور بھی گزار سکتے ہیں۔ مثلاً کوہ مری میں۔ وہاں برف باری بھی دیکھیں گے۔“

”بڑی سردی ہوگی وہاں۔“

”پیرس بھی تو بہت ٹھنڈی جگہ ہے۔“

”مگر وہاں کی بات ہی اور ہے۔ ہر گھر وہاں اندر سے گرم ہوتا ہے۔ ہوٹل بھی سینٹری ہیٹڈ ہوتے ہیں۔“

”آپ کے درد کا کیا حال ہے اب؟“

”ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے کبھی کبھی مگر اب میں پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ گردے کا درد نہیں تھا۔“

”ہاں، مجھے بھی یہی فکر تھی۔ پتے کی بات اور ہے۔ وہ نکل بھی جائے تو کوئی بات نہیں بلکہ پتے کے بغیر آدمی

زیادہ اچھا ہوتا ہے اسے غصہ نہیں آتا۔“

”آپ آج رات میرے ہی پاس رہیں۔ گھر میں

آپ کو بڑی وحشت ہوگی۔ نجمہ ویسے ہی بہت سڑی لڑکی

ہے۔ میں نے اس کی تربیت ہی اس طرح کی ہے اور اس

نے جس طرح میری خدمت کی ہے، اس کا تو میں صلہ دے

ہی نہیں سکتی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ واقعی ایسی خادمہ خال خال ہی ملتی

ہے۔“

”میں صحت یاب ہو جاؤں تو پھر میں اس کی شادی کر

دوں گی۔ اب آپ مجھے مل گئے ہیں تو میں کسی کی بھی محتاج

نہیں رہی۔ ہم کوئی ایسی خادمہ لے آئیں گے جو ہمیں نہ

جانتی ہو۔ ایسے نوکر جو گھر کا ہر بھید جانتے ہوں، زیادہ دیر



”میرا تو خیال ہے کہ آپ ان کی ضرورتوں کا بہتر خیال رکھ سکتے ہیں۔ آپ ادھر ہی ٹھہر جائیں۔ انہیں کوئی دقت ہو تو مجھے فوراً بلا لیں۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر! میں یہی رک جاتا ہوں۔“ میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ میں دراصل اس کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ مجھے گھر کی حفاظت کے خیال سے وہاں ٹھہرنے میں ابھمن محسوس ہو رہی ہے۔

اس رات ساڑھے گیارہ بجے میں نے سرنج میں تین سی سی انسولین بھر کر بڑی احتیاط سے خوابیدہ مخفی کا بازو اسپرٹ سے صاف کیا اور تیزی سے انسولین اس کے بدن میں اتار دی۔ اس کے بعد تمام چیزیں ایک پلاسٹک کے لفافے میں بند کر کے میں نے باہر پینک دیں۔ اس کام کے لیے مجھے لمبی راہداری عبور کر کے کوڑے کے ایک ڈرم تک پہنچنا پڑا تھا۔ جب میں کمرے میں واپس گیا تو انسولین اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ مخفی کا بدن پسینا پسینا ہو رہا تھا اور اس کی نبض کی رفتار طوقاں خیز ہونے لگی تھی۔ مگر نیند کا ٹیکہ کچھ اس طرح اسے جکڑے ہوئے تھا کہ اس کا ذہن بیدار نہیں ہو رہا تھا۔ غذا بھی اسے ان لوگوں نے واجبی سی دے رکھی تھی اور یہ دیکھ کر میری اپنی نبضیں چھوٹنے لگیں کہ پندرہ منٹ کے اندر اندر مخفی کا بدن ساکت ہو چکا تھا۔ میں نے دروازے کی چٹنی نیچے گرا دی تاکہ کوئی اندر آنا چاہے تو بلا روک ٹوک آ سکے۔ کسی ڈاکٹر کو اطلاع دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان لوگوں کو صبح ہی صبح صورت حال کا علم ہوتا چاہیے تھا۔ میں نے مخفی کے مردہ جسم پر کبیل کچھ اس طرح لیٹا جیسے وہ نیند میں کروٹیں لیتی رہی ہے۔ ایک خاص قسم کی بے ترتیبی میں نے اس کبیل میں رہنے دی اور پھر اپنے شدید ذہنی اضطراب پر قابو پانے کے لیے میں سکون آور گولی حلق سے نیچے اتار کر پلنگ پر دراز ہو گیا۔

میں چاہتا تو اس کے آپریشن کے زخم کے ٹائکے اس طرح ادھیڑ سکتا تھا جس سے یہی معلوم ہوتا کہ وہ سوتے میں کروٹ لینے سے کھل گئے ہیں۔ وہ نیند میں تھی اور اس کے بدن سے اسی حالت میں اُدھرے ہوئے زخم سے اتنا خون بہہ سکتا تھا کہ وہ اس تکلیف سے ہی مر سکتی تھی مگر یہ بات میرے ذہن میں آئی ہی نہیں۔ میں بستر پر لیٹا اس سارے وحشت ناک سلسلے پر غور کرتا رہا۔ کتنے ہی سگریٹ میں نے لیٹے لیٹے پھونک ڈالے۔ مگر ان کے ٹکڑوں کو میں بڑی احتیاط سے الگ رکھتا رہا۔ تاکہ کوئی اگر دیکھنا بھی چاہے تو

تک مفید ثابت نہیں ہوتے۔ نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“

”ایسا کیوں سمجھتی ہیں آپ؟ وہ آپ کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ وہ بے چاری نجمہ وہ ویسے بھی مولا مست نظر آتی ہے۔ اتنی سادہ اتنی کم کو۔“

”ہاں، اس کی یہی بات مجھے پسند ہے۔ اس میں عام لڑکیوں جیسی خود نمائی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ بڑی حسین ہے۔“

اب وہ خود کو ہم کہہ کر مخاطب نہیں کرتی تھی۔

”خیر ایسا تو نہ کہیں۔ وہ حسینوں میں شمار نہیں ہو سکتی ہے۔ آپ کے سامنے تو وہ بالکل ہیچ ہے۔“ میں نے اسے بہلانا چاہا۔ وہ خوش ہو گئی۔ میرا ہاتھ زیادہ گرم جوشی سے دبا کر بولی۔

”سچ سچ بتائیں میری کون سی چیز آپ کو زیادہ پسند ہے بس ان داغوں نے پریشان کر دیا ہے مجھے۔“

”ایسا نہ کہیں۔ یہ بھی آپ کی شخصیت میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ آپ کے یہ بال یہ گورا رنگ یہ صراحی دار گردن یہ چاہِ ذوق یہ صاف شفاف دانت، میرے لیے تو آپ سارے جہان سے زیادہ حسین ہیں۔“ میں نے اس کی انا کی کچھ اور ڈور ہلائی۔ اس کو گہرے کھڈ میں گرانے سے پہلے میں اسے تھوڑا سا خوش کر دینا چاہتا تھا کہ وہ مرے تو مایوس ہو کر نہ مرے۔

وہ اور زیادہ خوش ہو گئی اور بولی۔

”یہ کمر آ آرام وہ ہے۔ دوسرا بستر بھی موجود ہے آپ آج رات ادھر ہی سو رہیں۔ میں آپ کو بس دیکھتی رہوں گی۔“

”وہ آپ کو نیند آور ٹیکہ لگا کر ہر شے سے بے نیاز کر دیں گے۔“

”ہاں مگر وہ بھی بہت ضروری ہے ورنہ آپریشن کے بعد کا یہ درد بہت ظالم ثابت ہوتا ہے۔“

میں کتنی ہی دیر تک اس کے پاس بیٹھا اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا مگر میری حیرت اپنی جگہ قائم تھی۔ وہ اپنے روپے کے بارے میں لب نہیں کھولتی تھی۔ اس کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں کہتی تھی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے بی بی پری دس مخفی! یہ ملی چو ہے کا کھیل جلدی ختم ہو جائے گا۔

رات کے دس بجے واقعی نرس نے اسے خواب آور ٹیکہ لگا دیا۔ اور وہ گہری نیند میں کھو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر بھی ادھر آ گیا۔ وہ آخری راؤنڈ پر تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی نرس کو وہاں بٹھا دیں کیونکہ میں گھر واپس پہنچنا چاہتا ہوں۔ وہ میری یہ بات سن کر قدرے حیران ہوا،



”پرسوں میری ان سے شادی ہوئی تھی ڈاکٹر! رات کو دو بجے ان کے پیٹ میں درد اٹھا، کل صبح آپ لوگوں نے ان کا آپریشن کر دیا اور آج انہیں مار بھی دیا۔ خدا غارت کرنے تم لوگوں کو۔ میں تم سب کو جیل میں سڑوادوں گا۔ یہ علاج کرتے ہو تم لوگ۔“ میں نے غصے سے اپنے گلے کی نہیں پھلاتے ہوئے کہا۔ وہ ساری کی ساری اداکاری تھی مگر اس میں مجھے کامیاب ہونا تھا۔ ڈاکٹر خوف زدہ سا ہو کر بولا۔

”مجھے آپ سے ہمدردی ہے ہاشمی صاحب! مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے، آپ کس وقت سوئے تھے؟“

”میں بارہ بجے تک جاگتا رہا پھر میں سو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں راہداری میں کسی کے بھاگنے کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ نرسیں کسی مریض کی طرف جارہی تھیں۔ اٹھتے ہی میں نے ان کو دیکھا تو یہ پتھر ہو چکی تھیں۔“

اتنے میں ڈاکٹر سلیم کے ساتھ وہ نرس کمرے میں داخل ہوئی جس نے رات مخفی کو نیند کا ٹیکہ لگایا تھا۔ میں قہر آلود نکا ہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بہت ہی سہمی ہوئی تھی۔ اس نے بھی آتے ہی مخفی کی نبضیں دیکھیں اور پھر خوف زدہ لہجے میں بولی۔

”رات تو میں انہیں اچھی بھلی چھوڑ کر گئی تھی۔ پلنز بھی ٹھیک تھی اور بی بی بھی۔“

”تم نے بی بی کب چیک کیا تھا۔ یہ سب تمہاری حماقت کا نتیجہ ہے۔ تم نے ٹیکہ زیادہ بھر لیا ہوگا۔“

”جناب! یہ میرا پہلا دن نہیں ہے ڈیوٹی پر۔ میں آٹھ سال سے یہ کام کر رہی ہوں۔ یہ ڈاکٹر کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔ آپ کو مجھ سے اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ وہ ایک دم طیش میں آگئی۔

”میں تمہارا منہ توڑ دوں گا، تم نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔ بتاؤ انہیں کیا ہوا ہے۔ وجہ بتاؤ، یہ کیسے مر گئیں؟“

میں اس کی طرف یوں بڑھا جیسے میں اس کا منہ نوچ لوں گا۔

”پلیز، ٹیک اٹ ایزی ہاشمی صاحب! خدا کے کاموں میں کسی کا دخل نہیں ہے۔ بہر حال ہم وجہ معلوم کر لیں گے۔ ڈاکٹر سلیم آپ ڈاکٹر وارنٹی کو اطلاع دے دیں۔ آپریشن انہوں نے ہی کیا تھا۔“

”میں اپنے ڈاکٹر عبرت کو بھی بلوا لیتا ہوں جس کسی کی بھی یہ غفلت ہے اسے سزا بھگتنی ہوگی۔“ میں نے گہرے دکھ اور شدید غضب کا امتزاج اپنی آواز میں پیدا کرتے ہوئے کہا۔

اسے یہ معلوم نہ ہو کہ میں ساری رات جاگتا رہا ہوں۔

صبح کے اس وقت چار بج رہے تھے جب میں نے باہر راہداری میں کئی قدموں کی چاپ سنی۔ وہ لوگ تیزی سے دائیں طرف بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ ہمارے کمرے کے آگے سے گزرے، میں دروازہ کھول کر ان کی طرف لپکا۔ ایک نرس دو عورتوں کے ساتھ بھاگتی ہوئی تیرہ نمبر کمرے کی طرف جارہی تھی کہ ان کو متوجہ کیے بغیر میں دوڑتا ہوا ڈاکٹروں کے کمرے میں جا پہنچا۔ رات کی ڈیوٹی پر موجود دو نوجوان ڈاکٹر وہاں بیٹھے ایک چھلی سی نرس سے گفتگو میں مصروف تھے۔ میں نے جاتے ہی وہاں

افرا تفری مچادی۔

”ڈاکٹر! جلدی آئیے، میری بیوی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ... وہ بالکل پتھر ہو رہی ہے۔“

”ارے، مسز مخفی ہاشمی کی بات کر رہے ہیں آپ، کیا ہوا انہیں؟“ دونوں ڈاکٹرز نے اچھل کر اٹھتے ہوئے یہ ایک آواز کہا۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے ڈاکٹر! میں ابھی باتھ روم میں جانے کے لیے اٹھا تو دیکھا کہ مخفی بالکل بے ہوش ہیں۔ ان کی تو نبض بھی محسوس نہیں ہو رہی۔“ ڈاکٹرز نے مخفی کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

جب وہ دونوں مخفی کو دیکھ چکے تو وہ حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر تحیر ابھر آیا تھا۔ پھر وہ دونوں مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ یہ کیا ہو گیا ہے میاں! کیا کر دیا ہے تم نے۔ مگر میں نے مخفی کے ماتھے پر لب رکھ دیے تھے اور میری آنکھیں چمکنے لگیں۔

”یہ... یہ کیا کر دیا ہے تم نے ڈاکٹر! انہیں تم نے کیا کر دیا ہے۔ یہ میری شادی کی دوسری رات ہے بد بخت اناڑی ڈنگر ڈاکٹر۔“ میں نے پاگلوں کی طرح گریبان سے پکڑ کر ڈاکٹر عارف کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس نے لڑکھڑا کر پٹنگ کا سہارا لیا اور بولا۔

”میں... میں خود حیران ہوں جناب! ذرا سسٹر عذرا کو بلا لیں ڈاکٹر سلیم! یہ ناقابل یقین بات ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے مخفی کے آپریشن پر بندھی ہوئی نظر ڈالی۔ وہاں سے خون کا ایک خطرہ تک نہیں رس رہا تھا۔ پٹی بالکل صاف ستھری تھی۔ ڈاکٹر سلیم باہر نکلا تو ڈاکٹر عارف نے بے چارگی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”شادی کی پہلی رات سے کیا مراد ہے آپ کی؟“



ڈاکٹر عارف نے مخفی کے چہرے پر کھل ڈال دیا اور پھر مجھے تسلیاں دیتا ہوا ڈاکٹر سلیم اور نرس کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ ان تینوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔

میں نے اسی وقت ڈاکٹر عبرت کو فون پر بتایا کہ مجھ پر کیسی قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ میری آواز آنسوؤں میں پھیلی ہوئی تھی۔ خدا جانے اس وقت کوشش کے بغیر ہی میرے آنسو کیسے آپ ہی آپ بہنے چلے آ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ خوف وہ اضطراب وہ اپنے مہیب جرم کا احساس مجھے اندر سے کاٹتا جا رہا تھا۔ میں اپنی ہی نگاہوں سے گر گیا تھا۔ میں نے ایک ہستی کی جیتی جاگتی زندگی جسم کر دی تھی اور یہ خوف میرے اعصاب پر سوار تھا کہ اگر بھید کھل گیا تو کیا ہوگا۔ وہ پوسٹ مارٹم کر بیٹھے۔ اور انہیں معلوم ہو گیا کہ اتنی کثیر مقدار میں انسولین مخفی کے جسم میں اتاری گئی ہے تو وہ مخفی کے قاتل کو پہچان لینے میں قطعاً کوئی غلطی نہیں کریں گے۔ نجمہ نے مجھے ایسی مصیبت میں پھنسا دیا تھا کہ اس کا بہ ظاہر کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ اللہ میرے اس گناہ کی پردہ پوشی فرمائے۔ جی ہاں، مخفی کو جان سے مار دینے، اسے قتل کر دینے کے بعد بھی میں اس کے خالق حقیقی سے اپنے لیے پناہ طلب کر رہا تھا۔ اس سے زیادہ سنگین مذاق صرف ..... انسان ہی کر سکتا ہے۔ کائنات کی اور کوئی مخلوق ایسی عیاری اور ایسی سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی ہے۔

کوئی آدمہ گھٹنے بعد ڈاکٹر عبرت بھی اسپتال آ پہنچا۔ صورت حال کی سنگینی کو دیکھ کر وہ بھی سر پیٹ کر رہ گیا۔ روتے روتے میری آنکھیں دکنے لگی تھیں اور شاید میری ہچکی بھی بندھ گئی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ میں عمداً نہیں کر رہا تھا۔ وہ میرے اندر کا بے پناہ خوف تھا جو مجھے مسلسل رلا رہا تھا اور اس کا فائدہ بھی مجھے ہی پہنچ رہا تھا۔ جو کوئی بھی مجھے دیکھتا تھا مجھ سے ہمدردی جتا تا تھا۔ تسلیاں دیتا تھا۔ صبر کی تلقین کرتا تھا۔ اسے خدا کی رضا سمجھ کر مجھے سرتسلیم خم کرنے کی ہدایت کرتا تھا جب کسی کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ ایک رات کی دلہن بن کر دنیا سے منہ موڑ گئی ہے تو اسے جھٹکا سا لگتا تھا اور وہ مجھے اور زیادہ ترحم خیز نظروں سے دیکھتا تھا۔

ڈاکٹر وارثی، ڈاکٹر عبرت، ڈاکٹر کلیم اللہ اور ڈاکٹر تیموری نے مخفی کا ہا قاعدہ معائنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ مریضہ کا حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا ہے۔ یہی ان کی متفقہ رائے تھی۔ طے یہ پایا کہ پوسٹ مارٹم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سب کے سب بڑے اعلیٰ پائے کے

ڈاکٹر تھے اور مریضہ ان کے اسپتال کی چار دیواری میں مری تھی۔ وہ اس قصے کو اپنی اور اسپتال کی بدنامی سے بچنے کے لیے جلد از جلد منسوخ کرنا چاہتے تھے۔ ان پر ناقابل معافی پیشہ ورانہ غفلت کا الزام عائد ہوتا تھا۔ میری دھمکیاں بھی ڈاکٹر عارف اور ڈاکٹر سلیم نے ان کے گوش گزار کر دی تھیں۔ میں ان کے سامنے بھی روتا رہا اور انہیں کئی بار میں نے طیش کے عالم میں بے نقط بھی سنا دی تھیں اور وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ میں نے انہیں پاؤں سے یوں اکھاڑ دیا تھا کہ مخفی کی موت کا وہ لاشعوری اور شعوری طور پر اسپتال کو ہی ڈٹے دار ٹھہرا رہے تھے مگر منہ سے تو وہ یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے۔

ان کی رائے کا جب اعلان ہو چکا اور انہوں نے اپنا متفقہ فیصلہ مخفی کے کاغذات پر لکھ دیا تو میں نے فون پر بڑے ہی دکھ بھرے لہجے میں یہ خبر چند لفظوں میں نجمہ کو سنا دی۔ ایک لمحہ کے لیے تو وہ سن ہو کر رہ گئی اور پھر چیخ کر بولی۔

”یہ... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ بھی عمدہ قسم کی اداکاری کرنے لگی تھی۔

”آپ جلدی اسپتال پہنچ جائیں۔ ہم میت کو گھر لا رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ میں اس کی کوئی اور بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ اس کا دیا ہوا تیر بہت ہی مہلک ثابت ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد نجمہ فیکسی میں بیٹھ کر اسپتال آ پہنچی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ مخفی کی میت دیکھ کر وہ اس سے یوں لپٹ گئی جیسے اس کی اپنی ماں مر گئی ہو۔ اسے کمرے میں تنہا چھوڑ کر میں باہر راہداری میں جا ٹھہرا۔ میں اس ماحول میں اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہماری ذرا سی غلطی بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔

اس شام جب ہم مخفی کو سپرد خاک کر کے گھر لوٹے تو اپنی اپنی جگہ ہم دونوں ہی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہاں مخفی کے عزیزوں میں سے تو کوئی بھی نہیں تھا جو زیادہ دیر تک بیٹھا رہتا۔ علی جو اور موٹی کی حالت بہت ہی قابل رحم تھی اور ان دونوں کے گلے لگ کر جس انداز سے نجمہ بار بار روتی تھی اس سے تو میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ سے بھی کہیں زیادہ بڑی اداکارہ ہے۔ علی جو وہ دوا دیکھ دیکھ کر دھاڑیں مار کر روتا تھا جو وہ قصور سے میرے کہنے پر مخفی کے لیے لایا تھا۔ نجمہ نے رات نو بجے موٹی کو بازار سے کھانا منگو کر کھلا دیا اور پھر نیند کی گولی دے کر اسے اس نے بستر میں باندھ دیا۔ یہ کام اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔



کاغذات تیار کروالوں گا پھر میں رقم گھر ہی لے آؤں گا، اس کا بینک میں رہنا واقعی درست نہیں ہے۔ کوئی بھی دعویدار پیدا ہو سکتا ہے جس کا ہمیں علم نہ ہو۔“

”میں یہی کہہ رہی ہوں۔ آپ اب ساری توجہ اصل کام پر صرف کریں۔“

”ایسا ہی ہوگا۔ میری اصلی تے وڈی پر یوش ایسا ہی ہوگا۔“

”ہائے کتنا مزہ آئے گا جب ہم اپنے ہاتھوں سے لاکھوں کے نوٹ گن رہے ہوں گے۔ آپ نے بھی کبھی اتنے

مونی کو خدا جانے وہ کب سے اس کو بی پر ڈال چکی تھی اور کس مقصد کے لیے وہ ایسا کرتی رہی تھی، یہ بات میرے لیے کسی....! مجھے سے کم نہیں تھی۔

رات دس بجے نجمہ جب میرے کمرے میں آئی تو وہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ وہ ایسا نیم عریاں لباس پہن کر آئی تھی اور چہرہ اس کا یوں دمک رہا تھا جیسے اس نے کوئی بہت بڑی مملکت فتح کر لی ہو۔ وہ ہماری شب عروسی نہیں تھی مگر وہ اسے اسی طرح گزار دینا چاہتی تھی جیسے ہم پہلی بار مل رہے ہوں۔ ہم رات دو بجے تک محفل کی لاش پر برہنہ ناچ ناچتے رہے۔ وہ محفل ہی کا پلنگ تھا جو ہمیں آغوش میں لیے ہوئے تھے۔ مجھ پر نجمہ کی نوازشیں اس رات اپنے عروج پر تھیں۔

ہماری وہ مدہوشی ذرا کم ہوئی تو نجمہ نے گرم دودھ میں شہد ملا کر مجھے بھی پلایا اور خود بھی پیا۔ ہم دونوں ہی بہت تھک گئے تھے۔ جیسے کوئی طویل صحرائی مسافت طے کر کے وہاں تک پہنچے ہوں۔ وہ ہنستے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اب تو جتنی جلدی ہو سکے بینک سے وہ روپیہ نکال کر اپنے قبضے میں کر لیں ہاشمی صاحب! حالات کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔“

”کیا مطلب؟ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“

”آپ نہیں سمجھتے ہیں۔ قتل آخر قتل ہے۔ کسی بھی قسم کی خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم وہ روپیہ قبضے میں لے کر یہ کوٹھی بھی بیچ دیں گے اور پھر کسی اور شہر میں جا بسیں گے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کسی کو ہماری اس کارروائی پر شبہ بھی ہو سکتا ہے؟“

”عین ممکن ہے کوئی دشمن ہماری ٹوہ میں لگا ہو۔ اس علی جو کوئی لیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بی بی اپنی موت نہیں مری ہیں۔ ایک وہم سا اس کے دل میں بیٹھ چکا ہے۔ میں نے اسے سمجھا تو دیا ہے مگر پھر بھی ہمیں بہت محتاط رہنا چاہیے۔“

”ہاں یہ تو ہے مگر یہ بدحواسی بات کیونکر کہہ سکتا ہے؟“

”اے اتنا بدحواسی سمجھیں ہاشمی صاحب! وہ جتنا کم گو

ہے اتنا ہی گہرا بھی ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو میں اس کا بھی پتا صاف کر دوں گا۔ میں کسی کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔“

”نہیں، ایسا سوچیں بھی نہیں۔ یہی سب سے بڑی

دیوار تھی جسے آپ نے بڑی ہمت سے گرا لیا ہے۔ ہمیں اب اپنے مستقبل کو محفوظ کرنا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ دو چار دن میں، میں وراثت کے

## قارئین متوجہ ہوں

پچھا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاہا جا رہا ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا سہیل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 فیئر II - سٹیشن ڈینس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

حصہ اول قارئین کی خدمت میں پہنچا رہا ہے

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com



نوٹ ہاتھ میں نہیں لیے ہوں گے حالانکہ آپ بینک میں کام کرتے ہیں۔“

”میرا کام کچھ اور قسم کا ہے بہر حال، نوٹ تو میں نے منوں کے حساب سے دیکھے ہیں مگر اپنے نوٹوں کی تو بات ہی اور ہے۔“

”آپ کے دوست بھی آپ سے جلتے ہوں گے۔ وہ شعیب اور باری۔ ایک دم بے وقوف لوگ تھے وہ۔ مخفی تو ان کے سامنے آئی ہی نہیں۔ آپ نے البتہ اسے ایسا چکر دیا کہ وہ چپت ہو گئی۔“

”یہ سب کچھ حضور کی مہربانی سے ہوا ہے ورنہ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مخفی کو تم نے ایسے طریقے سے قتل کرایا ہے کہ میں خود دنگ رہ گیا ہوں۔“

”میں نے اس قسم کی طب کی بہت سے کتابیں پڑھی ہیں۔ یہ میرا شوق رہا ہے۔ آسان ترین راستہ مجھے یہی نظر آتا تھا۔“

”کیا تم عرصے سے اس منصوبے پر عمل کرنے کا سوچ رہے تھیں؟“

”ہاں مگر میں تنہا یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ میں کر بھی لیتی تو مجھے فائدہ کچھ نہ ہوتا۔“

”اس کے لیے تم نے میرا انتخاب کیا؟“

”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ بس آپ کو دیکھتے ہی میرے دل میں ہلچل مچ گئی تھی۔ میں نے پہلے ہی روز آپ کو اپنا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر میں سوچتی تھی کہ میں تو مفلس ہوں ہی، آپ کے پاس بھی کچھ نہیں ہے تو پھر ہماری زندگی شادی کے بعد بھی روتے پیٹتے گزرے گی۔ اس مرض کا علاج میں نے بہت سوچ سمجھ کر ڈھونڈا اور خدا کا شکر ہے کہ آپ نے ہمت نہیں ہاری اور میری بات مان لی۔“

”مجھے یہی کرنا چاہیے تھا نجمہ ورنہ میں اس بلا کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔“

یونہی ہم رات بھر مستقبل کے بارے میں بڑے خوب صورت منصوبے بناتے رہے۔ یہاں تک کہ پیدہ سحر نمودار ہو گیا۔ نجمہ نے بستر چھوڑ دیا اور تولیالے کر باتھ روم میں جا گئی۔ مخفی کے اس باتھ روم میں جس کے اندر وہ صرف صفائی کے لیے جایا کرتی تھی۔ اب وہ سارے کا سارا اس کی ملکیت تھی۔ کیونکہ میں اس کا تھا۔ اس نے بڑی عیاری سے مجھے مخفی کی موت سے پہلے اپنی گرہ میں باندھ لیا تھا۔

ایک مہینے اور تیرہ دن کی دوڑ دھوپ کے بعد میں نے خود کو مخفی کا تنہا اور جائز وارث ثابت کر دیا۔ وراثت کا

جاسوسی ڈائجسٹ

184

جولائی 2015ء

تقدیر نامہ کچھری سے لیتے ہی میں نے بینک سے سارا روپیہ نکلوایا اور اسے بڑے سے چرمی بیگ میں بھر کر گھر لے آیا۔

نجمہ نے وہ اتنے سارے نوٹ دیکھے تو وہ پاگل ہو گئی۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے لاکھ لاکھ کی الگ الگ ڈھیریاں بنائیں۔ اور پھر ایک ایک کر کے گننے لگی۔ اس کے چہرے کی وہ تمناہٹ میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ اتنی زیادہ خوشی میں نے شاید ہی کسی آدمی کے وجود میں ہلکورے لیتی ہوئی دیکھی ہوگی۔ نوٹوں کو گن کر نجمہ نے آہنی سیف میں بند کیا اور پھر میرے گلے میں بانٹیں ڈال کر بولی۔

”جان!“ میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ مجھے آپ جیسا بے مثال آدمی مل گیا ہے، میں آپ کی اس جرأت، دلیری اور بہادری پر آپ کو کیا پیش کروں۔ کیا انعام دوں۔ ایک میری جاں ہے سو حاضر ہے۔“ اس کی آنکھیں پھلکنے لگیں۔

”میرے لیے یہی بہت ہے نجمہ کہ تم میری ہو اور مجھ سے خوش ہو۔“ میں نے اسے بانہوں میں اٹھا کر بستر پر پھیلتے ہوئے کہا۔ وہ اس گھڑی یہی چاہتی تھی کہ میں اسے خوب زد و کوب کروں اتنا ماروں کہ اس کی ہڈیاں چٹختے لگیں۔

روپیہ ہمارے سیف میں بند تھا اور میں نے ابھی تک بینک کی ملازمت ترک نہیں کی تھی۔ محض اس لیے کہ مجھے وہ سب کچھ آہستہ آہستہ جذب کرنا چاہیے۔ دو مہینے گزر چکے تھے اور میں ان دنوں بنگلہ بیچ دینے کی کوشش میں تھا۔ اس کی قیمت ساڑھے بارہ لاکھ لگ چکی تھی مگر نجمہ کا اصرار تھا کہ ہم سولہ لاکھ سے کم نہیں لیں گے۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ بنگلہ سولہ لاکھ سے بھی زیادہ قیمت کا تھا۔ بالآخر ہمیں ایک ایسا گاہک مل گیا جو ہمیں ساز و سامان سمیت اس بنگلے کے ساڑھے سولہ لاکھ روپے دینے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے نجمہ سے مشورہ کیا تو اس کی آنکھوں میں بلب سے روشن ہو گئے۔ وہ ایک بڑی ہی ہیجان خیز کیفیت کی غماز تھی، وہ روشنی جو اس کی قلبی مسرت کا اعلان ہوتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”اب دیر نہ کریں۔ ساڑھے سولہ لاکھ بڑے غنیمت ہیں۔ اس سے زیادہ کی توقع نہیں رکھ سکتے۔“

”ٹھیک ہے عالی مرتبت میں آج ہی یہ سودا طے کر لیتا ہوں۔“

گاہک نے رجسٹری لکھوائی اور چوتھے دن ہمیں عدالت کے روبرو اس نے رقم ادا کر دی۔ نجمہ کی نوازشیں



## زبان بے زبانی

فیثا غورث انسانوں اور حیوانوں میں فرق کے بارے میں شاگردوں کو سمجھا رہا تھا۔ ”حیوانوں پر مصائب ان کے بے زبانی کی وجہ سے نازل ہوتے ہیں کیونکہ دکھ درد کا اظہار نہیں کر سکتے۔ انسانوں پر ان کی زبان مصائب و آلام لے کر آتی ہے۔ کیونکہ وہ زبان کا غلط استعمال کر بیٹھے ہیں۔“

لاکھ روپے بند کر رکھے تھے۔ نجمہ کے تمام کپڑے اور اس کا دوسرا ذاتی سامان بھی غائب تھا ریڈیو، ٹیپ اور میری ذاتی ضرورت کی ساری چیزیں وہاں البتہ موجود تھیں۔ میں سمجھا میں پاگل ہو گیا ہوں اور میری بصارت میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ میں نے بار بار آنکھیں مل مل کر پرشے کو بہ غور دیکھا۔۔۔ مگر حقیقت تو وہی تھی جو مجھے نظر آرہی تھی۔ میں نے گھبرا کر ہوٹل کے استقبالیہ کا رخ کیا۔ وہاں دو خواتین ہمہ وقت موجود رہتی تھیں۔ ان سے میں نے نجمہ کے بارے میں پوچھا تو ان میں سے ایک نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔ بولی۔ ”ہاشمی صاحب آپ ہی ہیں نا؟“

”جی میرا نام انور ہاشمی ہے۔“

”آپ نے ہی تو ایک بچے فون کیا تھا۔ میں نے میڈم سے آپ کو ملا دیا تھا۔ وہ آپ کے کہنے کے مطابق ہی صندوق لے کر یہاں سے گئی ہیں۔“

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں جناب! میں یونہی ازراہ تجسس آپ کی باتیں سنتی رہی تھی۔ آپ نے میڈم سے کہا تھا کہ میں جمشید صاحب کو بھیج رہا ہوں، آپ صندوق اور اپنے ذاتی کپڑے لے کر فوراً صدر پہنچ جائیں، بلکہ آپ نے کسی نفیس شو کمپنی کا بھی ذکر کیا تھا کہ آپ اس دکان کے سامنے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”کوئی آدمی بھی آیا تھا یہاں، کون تھا وہ؟“

”ایک لمبے چہرے پرے قد کا جوان تھا جو بڑے خوب صورت انداز سے انگریزی بولتا تھا۔ وہ ڈیڑھ بجے یہاں آیا اور میڈم نجمہ کو ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔“

”اوہ میرے خدا یا! یہ کیا ہو گیا ہے؟“

”گھبراہٹیں نہیں، وہ آپ کے لیے یہ بریف کیس چھوڑ گئی ہیں۔ میڈم کہہ رہی تھیں کہ اگر آپ یہاں آگئے تو ہم یہ آپ کو دے دیں۔ وہ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ وہ رات کو نو

مجھ پر اتنی زیادہ تھیں کہ میں اس کے ہاتھوں میں کٹہ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ وہ فضول خرچ بھی نہیں تھی۔ روپے کو سینت سینت کر رکھنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ میں نے اسے اچھی طرح آزمایا تھا۔ وہ ایک ایک پیسے کو مستقبل کے لیے محفوظ رکھتا چاہتی تھی۔ حالت یہ تھی کہ اس نے اس دوران ایک بار بھی مجھ سے شاپنگ کے لیے نہیں کہا حالانکہ وہ چاہتی تو میں اس پر لاکھوں روپے وارسکتا تھا۔ مخفی کے ڈھیروں ان سلع خوب صورت کپڑے گھر میں موجود تھے، وہ اس نے ایک ایک کر کے خود سی لیے تھے۔ وہ انہیں میں چاند جیسی حسین نظر آتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو کچھ ہم نے ایک اتنے بڑے جرم کے بعد حاصل کیا ہے کسی طرح بھی اشد ضرورت کے بغیر خرچ کیا جائے۔ میں نے اسے کہا بھی کہ ہم وہ روپیہ کسی دوسرے بینک میں رکھ دیتے ہیں۔ ہمیں وہاں سے معقول منافع مل سکتا ہے مگر اسے اندر سے مخفی کے قتل کا راز کھل جانے کے خوف نے اتنا جکڑ رکھا تھا کہ وہ اس روپے کو لاہور کے کسی بینک میں رکھنے کے حق میں نہیں تھی۔ ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہم جلد ہی کراچی منتقل ہو جائیں گے ہمارے لیے سب سے محفوظ جگہ وہی تھی۔ یہ اس کا اپنا خیال تھا حالانکہ میں نے اس وقت تک کراچی دیکھا بھی نہیں تھا۔

بشکلا فروخت کر دینے کے پندرہ دن بعد ہم نے اپنا تمام روپیہ ایک مضبوط صندوق میں بند کیا اور ضرورت کی دوسری چیزیں جن میں دو ٹیپ دو ریڈیو ایک ٹی وی اور اس قسم کی کچھ اور قیمتی اشیاء شامل تھیں اور جو ہنگامے کے سامان میں ہم نے نہیں لکھوائی تھیں، اٹھا کر ہم کراچی روانہ ہو گئے۔ علی جو کو نجمہ نے چار تنخواہیں دے کر فارغ کر دیا تھا اور موٹی کو اس نے میری تجویز کے مطابق اسکول کے ہاسٹل میں داخل کروا دیا تھا۔

کراچی پہنچ کر ہم ایک مشہور ہوٹل میں جا ٹھہرے۔ فکر مجھے اس روپے کی طرف سے تھی مگر۔۔۔۔۔ نجمہ سارا دن گھر میں بیٹھ رہنے کی عادی تھی اور ہمیں یقین تھا کہ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں ہے کہ ہم اتنی بڑی رقم ساتھ لیے پھرتے ہیں اس لیے میں نجمہ کو ہوٹل میں چھوڑ کر ہر روز شہر میں اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس باقاعدگی سے جانے لگا تھا کہ کوئی عمدہ سا بنگلا خرید سکوں۔

چوتھے روز شام کو تین بجے میں ہوٹل پہنچا تو یہ دیکھ کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا کہ ہوٹل کا وہ کمراتو جوں کا توں موجود تھا مگر وہاں نجمہ کا نام و نشان نہیں تھا۔ کمرے سے وہ صندوق بھی غائب تھا جس میں میں نے چھپن۔۔۔



بچے تک بہر حال واپس آجائیں گی۔“

میں نے وہ ہلکا سا بریف کیس اس خاتون سے لیا اور پھر پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں جا گھسا۔ بریف کیس میں نے ایک تار سے کھولا تو اس میں سے مجھے کسی مردانہ ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط ملا۔ جسے پڑھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ اس میں لکھا تھا۔

مسٹر ہاشمی!

آپ نے مس مخفی کو جب خوب صورتی سے قتل کیا ہے میں اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے خلاف جرم کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے تو یہ آپ کی خود فریبی ہے۔ اس بریف کیس میں رکھا ہوا ٹیپ سن لیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ پھانسی کا پھندا آپ کی گردن سے زیادہ دور نہیں ہے آپ مس مخفی کی ملازمہ کو جس طرح دھوکے سے اغوا کر کے کراچی لے آئے ہیں اس کا بھی حساب آپ سے ضرور لیا جائے گا، وہ چھپن۔۔۔ لاکھ روپے کی رقم جو آپ نے ہضم کر لی ہے وہ بھی آپ کو اگنی پڑے گی۔ یہ ٹیپ آپ کے جرائم کو ثابت کرنے کے لیے بہت کافی ہے۔ میں یہ خط آپ کو کس حیثیت سے لکھ رہا ہوں یہ جاننے کی کوشش نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ اس ٹیپ کی ایک نقل میں پولیس کو فراہم کر رہا ہوں۔ اپنے بچاؤ کے لیے آپ کچھ کر سکتے ہوں تو ضرور کریں مگر آپ کو تو شاید اب زمین بھی ٹھکنے سے انکار کر دے گی۔ آپ کا خیر اندیش۔

عین، میم، شین۔

وہ خط نکلیے غنجر کی طرح میرے دل میں دھنسا چلا گیا۔ بریف کیس میں سگاروں کا ڈبا ایک عمدہ قسم کا طلائی سگریٹ لائٹر، پرفیوم کی دو بڑی شیشیاں، ایک آئینہ، چند رومال، دو کنگھیاں اور ایک ٹیپ موجود تھے۔ میں نے سب چیزوں کو الگ رکھ کر ٹیپ نکال کر ٹیپ ریکارڈر میں دھنسا دیا۔ وہ چند منٹ تک یونہی بے آواز چلتا رہا پھر اس میں سے میری آواز ابھری اور وہ باتیں پھر میری سماعت سے ٹکرانے لگیں جو میں نے مختلف اوقات میں نجمہ سے کی تھیں۔ اس میں وہ باتیں بھی شامل تھیں جن میں ہم مخفی کو انسولین کے ذریعے قتل کرنے کا منصوبہ بناتے سنائی دے رہے تھے مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ سارا مکالمہ ٹیپ میں میرے اور نجمہ کے درمیان نہیں چل رہا تھا۔ میری آواز تو اس میں بالکل ہی عیاں تھی مگر نجمہ کی جگہ مجھ سے کوئی اور ہی عورت ہم کلام تھی۔ ایسی عورت جس کی آواز بہت ہی بھاری بھر کم تھی۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نجمہ کی آواز نہیں

ہے۔ بلاشبہ اپنی آواز اس نے بدلی ہوئی تھی۔ میں نے جس جگہ اپنے فقروں میں نجمہ کا نام پکارا تھا وہاں سے نجمہ کا نام بڑی مہارت سے حذف کر دیا گیا تھا اور ٹیپ ایسے طریقے سے دوبارہ تیار کی گئی تھی کہ نجمہ کے لیے فدا یہ کلمہ میرے منہ سے ادا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں نجمہ سے نہیں کسی اور ہی عورت سے مصروف گفتگو ہوں اور ہم دونوں نے مل کر مخفی کو قتل کر دینے کی سازش کی ہے۔۔۔ اور نجمہ اس سارے کھیل میں کہیں بھی موجود نظر نہیں آتی تھی۔۔۔ وہ ایک گھنٹے کی ٹیپ تھی جس کے دونوں حصے میری اور اس کھر درمی بھاری بھر کم آواز والی عورت کی گفتگو سے بھرے پڑے تھے اور اس کو سن کر یہی معلوم ہوتا تھا کہ نجمہ کا اس سارے خونی ڈرامے میں کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔

اب وہ نجمہ کسی جھید کے ساتھ مل کر چھپن۔ لاکھ کی رقم بڑی صفائی سے اڑا کر چلتی بنی تھی۔ ٹیپ بند کر کے میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ سارے پتے ان کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکے تھے اور اس پر مرے کو مارے شاہ مدار۔ اس جرم کو اس کی تمام تر جزئیات سمیت میری گردن میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ خوفناک ٹیپ یہی ثابت کرتی تھی اور میرے لیے فرار کی راہیں مسدود ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ کسی بھی وقت اپنی دھمکی پر عمل کر سکتے تھے۔

میری وحشت گونگے کے خواب ایسی ہو کر رہ گئی تھی۔ میری جیب میں اس وقت دس ہزار موجود تھے۔ وہ بھی میری خوش قسمتی تھی کہ ضروری اخراجات کے لیے میں نے پچاس ہزار روپیہ الگ رکھ لیے تھے۔ مگر اس میں سے بھی پینتیس ہزار میں نے نجمہ کے پرس میں ڈال دیے تھے۔ تاکہ محفوظ رہے۔ میں اسے اپنی وفادار اور مخلص شریک حیات سمجھے ہوئے تھا۔ وہ پندرہ ہزار روپے بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی، بیس ہزار ہم نے موٹی کے لیے ایک الگ بینک میں جمع کروا آئے تھے جہاں سے ہر ماہ اس کے ہاسٹل والوں کو ڈھائی سو روپے ملتے رہتے۔ مخفی کے بینک میں البتہ چالیس لاکھ پر دو سال میں جو منافع ملتا تھا وہ ابھی تک وہاں محفوظ تھا۔ میں تو وہ بھی نکلوا لیتا مگر اس کو میں نے عہد وہاں چھوڑ دیا تاکہ بینک والے یہ نہ سمجھیں کہ میں وہاں سے ہمیشہ کے لیے حساب ختم کر رہا ہوں۔ میں نے انہیں چالیس لاکھ کا ہی چیک لکھ کر دے دیا تھا۔ مخفی کے کاغذات سے یہ بات ثابت تھی کہ وہاں چالیس لاکھ کی رقم جمع کروائی گئی تھی۔

یہ سب کچھ تو تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں کیا کروں۔ نجمہ کی نیت صاف ظاہر تھی وہ عہد کہیں روپوش ہو



اور اس روپے کا وارث بننے کے بعد نجمہ کے مشوروں پر بعینہ عمل نہ کیا ہوتا تو وہ تو شاید کسی رات مجھے بھی نیند کی گولی کھلا کر بے ہوشی میں انسولین کا ٹیکہ لگا دیتی۔ یہ بات اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھی۔

میں نے صدر پہنچ کر نفیس شو کمپنی کی دکان ڈھونڈی مگر جب میں نے دکان دار سے پوچھا کہ وہاں کوئی جمشید صاحب بھی آئے تھے تو اس نے حیرت کا اظہار کیا، بولا۔  
”اس نام کے تو کسی آدمی کو میں نہیں جانتا ہوں جناب ویسے خیر تو ہے آپ بہت پریشان نظر آتے ہیں؟“  
”خیر ہی ہے یار! مجھے جمشید صاحب نے کہا تھا کہ وہ مجھے اس دکان پر مل جائیں گے۔“ یہ کہہ کر میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں اس دکان دار کے کسی اور سوال کا جواب دینے کی ہمت نہیں پارہا تھا۔

اس رات میں نو بجے تک شہر میں پاگلوں کی طرح گھومتا رہا۔ مگر نجمہ کا یا اس کے یار جمشید کا پتہ لگا لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ تھک ہار کر میں رات دس بجے ہوٹل میں جا لینا۔ وہ ٹیپ میرے سینے پر مونگ دیتی تھی۔ میں نے چاہا کہ اسے جلا دوں مگر نجمہ کے فریب کا وہ منہ بولتا ثبوت تھا جسے میں کھودینا عقلمندی نہیں سمجھتا تھا۔ یوں تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ عقل میرے پاس سے چھو کر بھی نہیں گزری ہے اور میں اعلیٰ درجے کا نسلی گدھا ثابت ہوا ہوں پھر بھی میں نے اپنے طور پر مصلحت اسی میں سمجھی کہ میں اسے ضائع نہ کروں۔

میں چار دن کراچی میں خوار ہوتا پھر اگر مجھے نجمہ کی صورت کہیں نظر نہیں آئی۔ پولیس نے بھی میرا تعاقب نہیں کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ مجھے اپنے طور پر راستے سے ہٹا کر کسی طرف نکل چکے ہیں مگر کہاں؟ اس سوال کا جواب مجھے نہیں ملتا تھا۔ مگر میں نے قسم کھالی تھی کہ نجمہ کو یوں نہیں نکلنے دوں گا۔ ہرگز نہیں۔

اگلے روز میں نے اپنی تمام چیزیں سمٹیں اور ہوٹل کا بھاری بھر کم بل ادا کر کے ریلوے اسٹیشن جا پہنچا۔ میری حماقت کی انتہا یہ تھی کہ میں اپنی ملازمت سے بھی استعفیٰ دے چکا تھا۔ پھر بھی میں نے یہی سوچا کہ مجھے لاہور جا رہنا چاہیے۔ وہاں پہنچ کر میں مونی سے شاید نجمہ کے بارے میں کچھ معلوم کر سکوں اگرچہ اس کم صم سی خاموش طبع لڑکی سے کسی بات کا معلوم ہو جانا مجھے محال ہی نظر آتا تھا مگر پھر بھی وہ مجھ سے کہیں زیادہ لمبے عرصے سے اس حرافہ کی زد میں رہی تھی۔ وہ بہت کچھ بتا سکتی تھی۔ یہ ایک موہوم سی امید تھی جس کے سہارے میں اگلے دن لاہور جا پہنچا۔

گنی تھی اور اپنی گمشدگی کو پولیس پر کسی بھی ذریعے سے ظاہر کر کے وہ مجھے گرفتار کروا سکتی تھی۔ پولیس یہی سمجھے گی کہ میں نے رقم کے راز کو پشت از بام ہونے کے ڈر سے اسے بھی قتل کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نجمہ مجھے دہرے قتل کے الزام میں پھانسی چڑھوا کر رہے گی۔ مجھ سے جو کام وہ لینا چاہتی تھی، بڑی پیاری سے لے چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مخفی کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے اس کی دولت حاصل نہیں کر سکے گی۔ اس کا کوئی قانونی جواز پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ مجھے اس حرافہ نے مخفی کے قتل پر آمادہ کر لیا، اس کا طریقہ بھی اس کے پاس موجود تھا۔ اس دھندے کو ابھی میں پانے تکمیل تک نہ پہنچا سکا تھا کہ اس نے مجھ سے شادی کا ڈھونگ رچا لیا۔ اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے خدا جانے یہ منصوبہ کب سے سوچ رکھا تھا مگر اسے کوئی میرے ایسا لٹوکا پٹھا نظر نہیں آیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے منصوبے میں تاخیر ہو گئی مگر جیسے ہی اسے انور ہاشمی جیسا گدھا نظر آیا، اس نے اسے پھانس لیا۔ حد یہ ہے کہ اس کتنی نے نکاح نامے پر بھی اپنا نام غلط لکھوایا تھا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ انجمن آرا اس کا نام ہرگز نہیں تھا۔ خدا جانے اس نے اپنی ولدیت کے خانے میں بھی کوئی صحیح نام لکھوایا تھا یا وہاں بھی وہ میرے منہ پر تھوک کر چلی گئی تھی۔

غصے اور تھکلاہٹ سے میرا دماغ پٹا جا رہا تھا۔ میری بے بسی کا یہ عالم تھا کہ میں نجمہ کی گمشدگی کے بارے میں پولیس سے بھی رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ نکاح نامہ بھی وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی اور میرے ماتھے پر مخفی کے خون کا دھبہ ایسا نمایاں تھا کہ میں کسی کا سامنا ہی نہیں کر سکتا تھا۔ میں چاروں طرف سے نرغے میں آچکا تھا اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کراچی ایسے بڑے شہر میں انہیں ڈھونڈوں تو کہاں ڈھونڈوں۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ نجمہ پہلے سے شادی شدہ تھی۔ اگر ایسا نہیں تھا تو وہ جمشید اسے کہاں سے اچانک مل گیا۔ ان دونوں نے مل کر میری وساطت سے اپنا راستہ صاف کیا تھا۔ ایسی خوب صورتی اور مہارت سے کہ میں بس ہاتھ ہی ملتا رہ گیا۔

میں نے وہ ٹیپ جیب میں ڈالا اور کمرے کو تالا لگا کر اسی وقت ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ صدر کے لیے جب میں نے ٹیکسی لی تو مجھے یقین تھا کہ میں ہوا کے پیچھے بھاگ رہا ہوں اس وقت تک تو خدا جانے وہ لوگ کہاں سے کہاں جا پہنچے ہوں گے۔ میں سوچ رہا تھا کہ خدا نخواستہ اگر وہ روپیا میں نے مخفی سے اپنی تحویل میں رکھا ہوتا یا میں نے مخفی کو قتل کرنے



جے رانا ہی لکھوا یا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہی شخص محمد جشید تھا اور بریف کیس میں سے مجھے جو خط ملا تھا، وہ اسی کا لکھا ہوا تھا۔

”آپ تو بہت زیادہ پریشان ہو گئے ہیں ہاشمی صاحب! آخر بات کیا ہے مجھے بھی تو بتائیں کچھ؟“

”کچھ نہیں مس ذکیہ! میں آپ سے کیا کہوں۔ یہ سب کچھ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔“

”نجمہ تو آپ کی بیوی ہیں۔ انہوں نے یہ سب کچھ آپ کو بتائے بغیر کیوں کیا ہے؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں... نجمہ پچھلے تین دن سے گھر پر نہیں ہے۔ وہ مجھے یہ کہہ کر گئی تھی کہ میں کراچی جا رہی ہوں۔ اس کی والدہ وہاں رہتی ہیں مگر وہ لاہور واپس آئی ہے تو گھر کیوں نہیں پہنچی، اچھا مجھے اجازت دیں میں دیکھتا ہوں شاید وہ گھر آ چکی ہو۔“

”یہ تو واقعی بڑی حیران کن بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ گھر پہنچ چکی ہوں گی۔ ویسے وہ بہت جلدی میں تھیں اور بینک سے ہو کر آئی تھیں۔“

”آپ کی مہربانی مس ذکیہ! ضرورت ہوئی تو میں پھر آپ سے ملوں گا۔ اس آدمی کا حلیہ آپ ذہن میں محفوظ رکھیں شاید کبھی ضرورت پڑ جائے۔“ یہ کہہ کر میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تیزی سے باہر نکل آیا۔

میرے ذہن میں عجیب سی سرخ رنگ آنکھیں چلنے لگی تھیں۔ میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا گیا تھا۔ ایک محصوم بے گناہ اور یک دہلا وارث عورت کو میرے ہاتھوں سے مروا دینے کے بعد اس کی ساری دولت سمیٹ کر وہ شیش ٹاگ کی مادہ اپنی جون بدل کر نئے قالب میں ڈھل گئی اور میری نظروں سے دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو گئی۔ میرے وجود پر عجیب سی بے یقینی کی کیفیت طاری تھی۔ مس ذکیہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دونوں بہت افراتفری میں تھے اور ہاں سے جلدی فارغ ہو جانا چاہتے تھے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لندن جانے کی تیاریوں میں ہیں۔ کیا وہ واقعی لندن جا رہے تھے یا نجمہ نے ہیڈ مسٹریس کو غلط تاثر دیا تھا۔ چند لمحوں میں اسکول کی شان دار عمارت کے باہر کھلے لان میں کھڑا سوچتا رہا اور پھر تیز حیز قدم اٹھاتا ہوا مین گیٹ سے باہر نکل گیا۔

کیسی مجھے جلد ہی مل گئی اور میں اس میں بیٹھ کر سیدھا ائرپورٹ جا پہنچا۔ میرا تمام سامان ریلوے اسٹیشن کے کلرک روم میں دھرا تھا اور میرے ہاتھ میں صرف وہ بریف

اب میرا گھر رہا تھا نہ گھاٹ۔ شعیب اور باری کے کوارٹر سے دیے ہی میں بے دخل ہو گیا تھا اس اکڑفوں میں کہ اب میرا شمار امرا میں ہونے لگا ہے کیونکہ میں نجمہ کی پھوپھی کے بھانجے کی خالہ کے لڑکے کی سالی کا حصہ بن چکا تھا مجھے ان دنوں کچھ ایسی ہی چمک پھیر یوں ایسے رشتے یاد آرہے تھے اور میرے مغز کا چنبر کھل کھل جاتا تھا۔

میں باؤلے کتے ایسی رفتار سے موٹی کے اسکول میں جا گھسا۔ ہیڈ مسٹریس مس ذکیہ نے مجھے بڑے تپاک سے خوش آمدید کہا۔ اس خوشامدی کو معلوم تھا کہ ہم بڑی رقموں کے مالک ہیں۔ میں اور نجمہ۔ موٹی کو ہم دونوں اکٹھے وہاں لے کر گئے تھے۔ وہ چائے کا پوچھنے لگی مگر میں تو اپنی ہی شکل میں مرا جاتا تھا۔ میں نے کہا وہ مجھے موٹی سے ملوا دے۔ میری یہ بات سنتے ہی وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! موٹی کو تو کل دوپہر اس کی آنٹی ساتھ لے گئی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ لندن جا رہے ہیں۔“

”ساتھ لے گئی مگر کیوں۔ یہ کیا بتا رہی ہیں آپ مجھے؟“

میں نے چیختے ہوئے کہا۔

”آپ تو ناراض ہونے لگے ہیں صاحب! وہ تو آپ کا بھی نام لے رہی تھیں کہ آپ بھی ان کے ساتھ جا رہے ہیں کیونکہ وہاں آپ اپنا کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔“

”یہ کہا تھا آپ سے اس نے؟ وہ نجمہ ہی تھی یا اور کوئی عورت تھی؟“

”بالکل وہی خاتون تھیں جو آپ کے ساتھ آئی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بینک سے اپنا ”بیس ہزار بھی لے گئی ہوں گے وہی کہہ رہی تھیں۔ انہی کے دستخطوں سے ہی وہاں ایڈوانس دی گئی تھی۔ حساب انہی کے نام سے کھلا تھا۔“

”کیا وہ تنہا آئی تھیں؟“

”جی نہیں، ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے، ایم جے رانا۔ لمبے سے قد کے گورے چٹے خوب صورت آدمی ہیں وہ... اور موٹی بھی ان سے بہت مانوس معلوم ہوتی تھی۔ نجمہ انہیں رانا صاحب رانا صاحب کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔“

میرا رنگ شاید ہلکی ہوا جاتا تھا۔ میری آنکھوں کی پتلیاں اس انکشاف پر کچھ زیادہ ہی پھیلنے لگیں۔ اب مجھے یاد آرہا تھا کہ نجمہ نے موٹی کی ولدیت کے خانے میں ایم



”وہ کاغان ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، فون نمبر بھی لکھوا گئے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے ان کا فون نمبر کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر دے دیا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ ناصر بھائی! مجھے ان لوگوں سے ایک بہت ضروری کام تھا مگر وہ مجھے مل ہی نہیں رہے تھے۔“

”کوئی بات نہیں، کوئی اور بھی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔“ اس نے بڑے ہی دلنواز لہجے میں کہا۔ بے چارہ میری بہت ہی عزت کرتا تھا۔ اس سے ہاتھ ملا کر میں اگلے قدموں ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ میرے وجود میں اب غیظ و غضب کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ میری چھری ان کے خون میں غسل کے لیے تڑپ رہی تھی۔ مجھ سے بدترین قسم کی غداری کی گئی تھی۔ میرے ہاتھ سے وہ سب کچھ نکلتا جا رہا تھا جس کے حصول کے لیے میں نے مخفی ایسی قابل رحم اور قابل صد احترام ہستی کو بے موت مار دیا تھا۔ اس کی وہ آخری وقت کی باتیں جو نیند میں کھو جانے سے پہلے اس نے مجھ سے کی تھیں، میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ بڑے ارمان تھے اس کے دل میں۔ وہ میرے ساتھ یورپ کی سیر کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ اس کا پیرس میں جا کر ماہ غسل منانے کو دل چاہتا تھا۔ مگر جس گھڑی وہ سہانے خواب دیکھ رہی تھی میرا براہ میں اس گھڑی اس کو موت کی پگھلی میں جلا کر دینے کی سوچ رہا تھا میں تو اس وقت بلاشبہ اسفل السالطین کے درجے سے بھی نیچے گر چکا تھا۔ مخفی ایسی بد نصیب دہن تھی کہ شب عروسی ہی اس کی شب آخر ثابت ہوئی۔ اس کی ساری آرزوئیں دل کی دل میں ہی رہ گئیں۔ محض اس لیے کہ خدا نے اسے ایک شیفت اور مہربان باپ کی وساطت سے چالیس لاکھ روپے عطا کیے تھے مگر اس کی اپنی ہی پروردہ کنیز اسے چاٹ گئی۔ ناگن بن کر ڈس گئی۔ اس کی چالاکی کا شکار مخفی ہی نہ ہوئی تھی میں بھی مارا گیا تھا اور اب مجھے ان سے نمٹنا تھا۔ ہر حال میں نمٹنا تھا۔

بینک پولیس اور کسٹم کی نوکری میں یہ فائدہ ہے آدی کو ہر قسم کے برے بھلے آدی سے ملنے اور راہ و رسم بڑھانے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ آدی کا بے بسی کے سبب تلے کا سانس تلے ہی نہیں رہتا۔ اوپر بھی آجاتا ہے میں کاغان ہوٹل جانے کے بجائے سیدھا وین پورہ جا پہنچا، ان دنوں کچھ کالمی پٹھان وہاں رتے تھے جو میرے جاننے والے تھے۔ بڑے زبردست قسم کے سود خور تھے وہ اور اسامیوں سے ہر قسم کی دھونس دھاندلی سے سود وصول کر لیتے تھے۔ اس مقصد کے

کیس تھا جو نجمہ میرے لیے جمشید کے خط کے ساتھ چھوڑ گئی تھی وہ بڑا خوب صورت بریف کیس تھا اور میری ذاتی ضرورت کی کئی اور چیزیں بھی اس میں سما گئی تھیں۔ اس کے دستے کے نیچے لگی شیٹے کی ایک چھوٹی سی سلائیڈ پر بڑے خوب صورت حرفوں میں ایم جے رانا لکھا ہوا تھا۔ وہ لفظ ٹاپ کر کے شیٹے کی جھری میں سے اندر گزار دیے گئے تھے۔ اور میرے کوٹ کی جیب میں اس وقت ایک تیز دھار نکیلی چھری تھی جو میں کراچی کے ہوٹل سے اٹھا لیا تھا۔

میرے سر پر اس روز ایک اور خون سوار تھا۔ مجھے وہ ہستی لے ڈوبی جس پر میں نے زندگی میں سب سے زیادہ اعتبار کیا تھا۔ ایک خون میری گردن پر چڑھ چکا تھا اور اب میں دو آدمیوں کی تلاش میں تھا جن سے مجھے مخفی کا بھی انتقام لینا تھا اور اپنا بھی۔ میں اس امید پر ہوائی اڈے کی طرف جا رہا تھا کہ اگر ان کی بات سچ تھی تو مجھے وہاں سے یہ تو معلوم ہو سکتا تھا کہ لندن کی طرف پرواز کر گئے ہیں کہ نہیں۔

ہوائی اڈے پر پہنچ کر میں بھاگتا ہوا متعلقہ شعبے میں جا پہنچا۔ وہاں مجھے اپنا ایک پرانا آشنا مل گیا۔ اس کا نام علی ناصر تھا۔ اس کا حساب میں نے ہی اپنے بینک میں کھلوا یا تھا اور وہ ایسا جرس آدی تھا کہ ہر ماہ اپنی سخاوت کا تین چوتھائی حصہ بینک میں جمع کروا دیتا تھا۔ وہ چھوٹے ہی بولا۔

”کیسے آئے ہیں ہاشمی صاحب! باکی ارسفر کریں مگر؟“

”نہیں ناصر صاحب دراصل مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ کل یا آج کی کسی پرواز سے ایم جے رانا نام کے کوئی صاحب یہاں سے کراچی یا لندن کی طرف تو نہیں گئے۔ ان کے ساتھ ایک خاتون نجمہ بھی ہیں۔“

”کوئی خاص بات ہے ان لوگوں میں، آپ کچھ گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں؟“

”بس اچھا بھلا ہوں یار! جلدی میں بھاگتا آیا ہوں نا اس لیے ذرا اکھڑا نظر آتا ہوں۔“

”آپ تشریف رکھیں میں ابھی کاغذات دیکھ کر بتاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹا اور ریکارڈ دیکھنے لگا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ کاؤنٹر پر آٹھرا اور بولا۔ ”کل شام کی فلائٹ کے لیے ایم جے رانا اور ان کی بیگم نے کراچی کے راستے لندن کا ٹکٹ لیا ہے.....“ اس کا ریزہ ریزہ ہوتا وجود پھر سے مضبوط ہونے لگا۔

”کل شام! کوئی پتا بھی لکھوایا ہوگا ان لوگوں نے؟“



لے انہوں نے خفیہ طور پر ہر قسم کے ہتھیار گھر میں چھپا رکھے تھے کہ کہیں کوئی اور نچ سچ ہو جائے تو وہ اس سے نمٹ سکیں اگرچہ وہ آتشیں اسلحہ بھی نہیں چلاتے تھے مگر اس کے دم سے ان کا رعب قائم تھا اور اب اسامیاں جانتی تھیں کہ وہ گولی مار کر بندے کا منہ بھی توڑ دیتے ہیں۔

اور اس نجمہ ٹرغل سے معاملہ کرنے کے لیے مجھے کسی ایسے ہی ہتھیار کی ضرورت تھی جو میرے ہاتھ میں رہ کر اسے مار تو سکے مگر اس پر خون کے کوئی چھینٹا مجھ پر نہ پڑے۔ میں یہی چاہتا تھا۔ میں دن پورہ پہنچ کر جب اس بڑی سی بوسیدہ حویلی کے سامنے پہنچا تو ایک راہ گیر سے پوچھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ پولیس نے ان لوگوں کو وہاں سے زبردستی نکال دیا ہے اور گرفتاری کے ڈر سے ان میں سے بہت سے آدمی بھاگ کر کابل جا چکے ہیں۔ وہ آدمی بہت خوش تھا۔ وہ موٹی سی گالی انہیں دیتے ہوئے بولا۔

”سورہ پیادے کر پانچ سو کا اسٹامپ لکھواتے تھے اور پھر چل سوچل۔ بندہ کمائے اور کابلی کھائے۔“

”اچھا ہوا یار! ان خزیروں سے جان چھوٹی۔“ یہ کہہ کر میں وہاں سے لوٹ آیا۔

اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ دن لمبے ہو چکے تھے اور موسم میں وہ پہلے ایسی بج بنگلی باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ مجھے اپنا لائحہ عمل بہت سوچ سمجھ کر تیار کرنا چاہیے تھا۔ میں ان دونوں کو تیر کے بیجوں تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔ ان کو نیست و نابود کر دینے سے کم پر میری تسلی نہ ہو سکتی تھی اور ابھی وہ میری زد میں تھے۔

میں کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک ہوٹل میں بیٹھا سوچتا رہا۔ مگر کوئی صاف سیدھی بے عیب تدبیر میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ آدمی کی بے بسی بھی دیدنی ہے۔ بھی وہ اپنے حوصلے کے پروں سے فضاؤں پر چھا جاتا ہے اور بھی وہی پر اسے اپنی گرفت میں لے کر اسے یوں دبا لیتے ہیں کہ اس کا اپنا نکلا اس کے کلیجے میں اتر جاتا ہے۔ میرا بھی اس گھڑی یہی حال تھا جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے کاغان ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا اور سامنے دلی دروازے کی روئیں اپنے عروج پر تھیں۔ اپنے عارضی قیام کے لیے انہوں نے ایسا ہی ہوٹل منتخب کیا تھا جو غیر معروف ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی جگہ ہو جہاں انسانوں کی بھیڑ ان کی ڈھال بن سکے۔ ان کی منصوبہ بندی بڑی ہی بے عیب تھی۔ اتنی مضبوط اور بے عیب کہ مجھے اس میں سے سوئی گزاری نہ بھی مشکل نظر آتی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ وہ ایم جے رانا تو میرا صورت آشنا نہیں ہے اسے میں اگر بے خبری میں جا پکڑوں تو اس پر قابو پا لینا میرے لیے کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ میں بھی تو اسے نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے ہوٹل سے اٹھ کر ایک دکان سے آدھ گز لمبی مضبوط سوئی کی رسی خریدی اور اسے جیب میں ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر پرانے کوٹوں کی ایک دکان تھی۔ وہاں سے میں نے ایک لمبا سا اور رکوٹ خریدا اور ایک ہیٹ بھی سر پر رکھ لیا، میری مونچھیں میری شناخت کا بہت بڑا سبب تھیں۔ وہ بھی میں نے ایک حجام کے استرے کی نذر کر دیں۔ میرا حلیہ اس عمل سے گزرنے کے بعد اتنا ضرور بدل چکا تھا کہ پہلی نظر میں مجھے کوئی نہ پہچان سکتا تھا۔

وہاں سے فارغ ہو کر میں لنڈے بازار کی بھیڑ سے گزرتا ہوا ایک ایسی دکان میں جا گھسا جس کے اندر ٹیلی فون کی سہولت موجود تھی۔ دکان دار بھلا آدمی تھا اس نے ٹکنی شرح پر مجھے فون کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ اس ٹیلی فون کو بھی کمائی کا ذریعہ بنا چکا تھا۔ کاغان ہوٹل کے استقبالیہ سے میرا رابطہ قائم ہوا تو میں نے پوچھا۔

”جناب یہاں ایک صاحب ایم جے رانا ٹھہرے ہوئے ہیں وہ کس کمرے میں ہیں؟“

”صاحب وہ دوسری منزل کے پانچ نمبر کمرے میں ٹھہرے ہیں۔ مگر وہ ابھی اپنی ہنگی کے ساتھ باہر گئے ہیں کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی ایک گھنٹے بعد آئیں گے۔“

”کہاں گئے ہیں وہ؟“

”وہ میرا خیال ہے انارکلی گئے ہیں کہہ رہے تھے کچھ شاپنگ کروں گا۔ ہنگی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی اسے وہ ڈاکٹر کو دکھانا چاہتے تھے۔“

”ان کی ہنگی بیمار ہے؟“

”ہاں، اسے بہت تیز بخار ہے۔ رانا صاحب بہت پریشان تھے اس کی وجہ سے، آپ کون صاحب ہیں؟“

”میرا نام واجد ہے واجد علی۔ میں اتر پورٹ سے بول رہا ہوں خیر میں نو بجے ان سے بات کر لوں گا۔ وہ لندن جا رہے ہیں نا۔ ایک پیغام دینا ہے مجھے لندن میں اپنے بھائی کے نام۔ ان کے کمرے میں فون نہیں ہے؟“

”جی نہیں! بس یہی کمی ہے ہمارے ہوٹل میں۔ آپ بہر حال نو بجے کے قریب ان سے بات کر لیں۔“ استقبالیہ کے خوش خلق کلرک نے بڑے ہی مہذب لہجے میں کہا۔ میں



رنگ ہلکی ہو چکا تھا اور بدن لرز نے لگا تھا۔ وہ اس جھکے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔ اور اسے احساس ہو چکا تھا کہ میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔

”کیا حال ہے تمہارے مسز ایم بے رانا... بہت تیزی دکھائی تم نے۔“ میں نے اس کی شرگ پر بائیں ہاتھ کا انگوٹھا ذرا ساد باتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے دور رہو، مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے۔“ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ اس کی آنکھوں کی ازلی ابدی سرد مہری میں اب اس کی نفرت بھی کھل گئی تھی۔

”اتنی جلدی مجھ سے تمہارا دل بھر گیا۔ یہ رانا صاحب کون ہیں۔“

”وہ میرا شوہر ہے۔“

”گڈ! اور وہ میمونہ۔“

”وہ مخفی کی بیٹی ہے۔ اس کے ایک گناہ کا پھل۔ مونی کا باپ کوشی کے ملازم علی جو کا بھائی تھا۔ اس نے خودکشی کر لی تھی مخفی کے باپ کے ڈر سے۔“

”اتنی بڑی بیٹی! مجھے یقین نہیں آتا۔“

”مخفی کی عمر اسیس سال تھی اور میمونہ دس سال کی ہو چکی ہے۔“

”اے تم کیوں ساتھ لے جا رہی ہو؟“

”میں اسے بے آسرا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔“

”تمہارا شوہر اتنا عرصہ کہاں رہا؟“

”وہ لندن چلا گیا تھا۔ میں نے اس سے ماں کی اجازت کے بغیر شادی کر لی تھی۔“

”تمہارا کوئی بچہ نہیں ہوا؟“

”نہیں، میں نے اس مونی کو ہی اپنی بیٹی ظاہر کر دیا تھا۔ تاکہ یہ گھرانہ بدنامی سے بچ جائے۔“

”وہ مخفی تو کہتی تھی کہ یہ مونی اس کی مرحومہ پھوپھی زاد بہن کی بیٹی ہے؟“

”وہ بات غلط تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی خود کو آپ کے سامنے اس بیٹی کی ماں ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

”کیوں؟ مجھ سے کیوں چھپائی یہ بات تم دونوں نے؟“ میں نے پوچھا۔

”مخفی اپنی جگہ آپ کو پسند کرنے لگی تھی اور میرے پیش نظر ایک اور مقصد تھا۔“

”یہ جمشید رانا صاحب اتنی دیر بعد لوٹے ہیں؟“

”ہاں اسے وہاں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ پچھلے دو سال سے لاہور میں رہ رہا تھا۔“

نے فون بند کر دیا۔ مجھے راستہ مل رہا تھا۔ نجمہ اس گھڑی اپنے کمرے میں تھابتی اور میں اس سے رسائن چھین سکتا تھا۔ وہ رسائن کو مخفی کے خون میں حد سے زیادہ انسولین گھول دینے سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کے لیے امرت بن گئی تھی۔ حالانکہ اس پر سب سے فائق حق میرا تھا۔

میں نے اپنے فلیٹ ہیٹ کو آنکھوں پر جھکایا اور کاغان ہوٹل میں جا گھسا۔ اس کی عمارت نئی تھی اور پرانی گنجان آبادی میں ہونے کے باوجود اس کو بڑے سلیقے سے تعمیر کیا گیا تھا۔

کسی سے کچھ کہے نے بغیر میں استقبال سے صرف نظر کرتا ہوا بڑے پُراعتاد قدم اٹھاتا ہال سے گزرا اور عقبی دیوار کے ساتھ بنے زینے پر پاؤں دھرتا ہوا دوسری منزل پر جا پہنچا، ایک چھ فٹ چوڑی راہداری کے دونوں طرف یہاں سے وہاں تک کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہر کمرے پر اس کا نمبر لکھا تھا۔ پانچ نمبر کمرے کے سامنے پہنچ کر میں رک گیا۔ راہداری میں اس وقت کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔ نجمہ کمرے میں موجود تھی، بولی۔

”کون؟“ اس کی آواز میں عجیب سا لوچ پیدا ہو چکا تھا۔ لفظ کون کو اس نے کچھ اس طرح گھما کر کہا کہ میرے دل میں ٹیس سی اٹھنے لگی۔ وہ آواز میرے کانوں میں کئی راتیں رس ٹپکتی رہی تھی۔ مگر... مگر... اب سب کچھ میں الٹ چکا تھا۔

”آپ کا میسج ہے یکم صاحب۔“ میں نے اپنی آواز کو مکمل طور پر بدلتے ہوئے کہا۔

مجھے دروازے کی چٹنی کرنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی تختہ ذرا سا کھلا تو میں اس کے پیچھے کھڑی نجمہ کو تختے کے ساتھ دھکیلتا ہوا اندر جا گھسا۔ وہ تیز دھار چمکتی ہوئی خون خوار چھری میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے جاتے ہی نجمہ کو بائیں ہاتھ کے حلقے میں لے کر اس کا منہ ہتھیلی سے بند کر دیا اور اپنی دونوں ٹانگوں میں اس کی ٹانگیں دبا کر دروازے پر دائیں ہاتھ سے چٹنی چڑھا دی۔ اور اسے دھکیلتا ہوا میں سیدھا غسل خانے میں جا گھسا تاکہ وہ اگر چیخنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو اس کی آواز راہداری میں کوئی نہ سن سکے۔

غسل خانے کو اندر سے بند کر کے میں نے چھری اس کی شرگ پر رکھ کر اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اس کا

جاسوسی ڈائجسٹ



ڈھیر ہو گئی۔ یوں کہ اس کے دونوں ہاتھ پہلے فرش پر لگے پھر اس کے زانو اور اس کے بعد اس کا سر سامنے کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ اور وہ الٹ کر آڑھی ترچھی صورت میں فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ میرا ہاتھ خون سے بھر گیا تھا۔

میں نے فوراً ہی ٹل کھول کر ہاتھ اور چھری کو صاف کیا اور پھر بتی جلا کر اپنے اوپر کوٹ کو اچھی طرح دیکھا۔ وہاں کوئی چھینٹا نہیں پڑا تھا۔ نجمہ کو وہیں چھوڑ کر میں نے غسل خانے کا دروازہ کھول کر باہر سے بند کیا اور کمرے میں آ گیا۔ سامنے بڑے سے نئی طرز کے سوٹ کیس پڑے تھے اور وہ مقفل تھے۔ میں نے چابیوں کے لیے ادھر ادھر ہاتھ مارا تو ایک گچھا مجھے نجمہ کے کچکے کے نیچے سے مل گیا۔ پہلی ہی چابی کام کر گئی ایک سوٹ کیس میں مردانہ کپڑے بھرے تھے۔ اور اس کے کیسے میں تین پاسپورٹ ایک موٹی کا ایک نجمہ کا اور ایک اس آدمی کا تھا جسے محمد جمشید رانا کہتے تھے۔ بلاشبہ وہ بڑا وجیہہ و ٹھیکل جوان تھا اور چہرے مہرے سے بالکل انگریز دکھائی دیتا تھا۔ میں نے سوٹ کیس کو اچھی طرح کھنگال لیا۔ اس میں سے مجھے رقم نام کی کوئی شے نہ ملی۔ میں نے دوسرا سوٹ کیس کھول دیا۔ نجمہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہاں بینک کے کچھ ایسے کاغذات تھے جن سے اس کی بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ ان لوگوں نے بیس لاکھ کی رقم ایک بینک میں جمع کروادی تھی اور وہ ایسا بینک تھا جس کے ذریعے وہ بڑی آسانی سے کسی بھی وقت اس رقم کو لندن منتقل کروا سکتے تھے۔ باقی رقم ایم جے رانا نے ایک پاکستانی بینک میں اے بی رانا کے نام سے جمع کروادی تھی۔

میری ساری محنت دھری رہ گئی تھی۔ وہ منحوس رقم دو جانوں کی بھینٹ لے چکی تھی۔ ایک کے خون کی تکیا اندر غسل خانے میں لگی تھی اور دوسری منوں مٹی تلے جادبی تھی۔ بینک کے وہ سارے کاغذات اپنی جیب میں دھرا ٹیپ اور پاسپورٹ میں نے یکجا کر کے آتشدان میں ڈال دیے۔ وہ جل کر راکھ ہو گئے تو میں بتی بجھا کر راہداری میں کھلنے والے دروازے کے ایک طرف دیوار کے ساتھ کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ چٹختی میں نے نیچے گرا دی تھی اب مجھے ایم جے رانا کا انتظار تھا۔ اس شکرے کا جس نے میرا شکار نیچے آنے سے پہلے ہی فضا میں دیوبج لیا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے ابھی بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ کسی نے بڑی تیزی سے دروازہ کھٹکٹایا اور اس کے ساتھ ہی تختے کو دھکیل دیا۔ دروازہ کھٹ سے کھلا اور راہداری میں جلتے بلبوں کی تیز روشنی کے ساتھ ہی

”اور اپنے پانچ سو روپے سے تم ہر ماہ اس کی مدد کرتی تھیں؟“  
www.paksociety.com  
”ہاں، اسے کوئی ڈھنگ کا روزگار نہیں مل سکا تھا۔“  
”وہ تعلیم یافتہ ہے؟“

”ہاں، وہ ایف اے تک پڑھا ہے۔“  
”اور تم اس سے اتنی محبت کرتی ہو کہ تم نے اپنی اتنی بڑی محنت کو میرے ہاتھوں مردادیا؟“  
”یہ اسی کا منصوبہ تھا۔ میرے شوہر جمشید کا۔“  
”جس میں میرے ساتھ نکاح کا پروگرام بھی شامل تھا؟“

”وہ میری مجبوری تھی۔ اس کی بھی اس نے ہی مجھے اجازت دی تھی۔“  
”تاکہ تم مجھ سے یہ کام آسانی سے لے سکو۔“  
”یہی سمجھ لو۔“

”اب کیا خیال ہے؟“ میں نے اپنا انگوٹھا کچھ اور زیادہ سختی سے اس کی شرگ میں دھنسا یا۔ میری چھری کی نوک اس کے سینے کی جلد میں اتنی گہری دھنسی ہوئی تھی کہ میں ذرا سا بوجھ ڈالتا تو وہ آگے چلی جاتی۔ نجمہ کی آواز بالکل سپاٹ ہو گئی تھی۔ وہ بے پناہ دہشت کے زیر اثر بے ارادہ میرے سوالوں کا جواب دیتی چلی جا رہی تھی۔  
”وہ رقم کہاں ہے؟“ میں نے اس کا گلا ذرا اور سختی سے دباتے ہوئے کہا۔

”وہ جمشید نے برٹش بینک میں جمع کروادی ہے۔“  
”اس کا مالک میں ہوں۔ مجھے وہ رقم دے دو۔ میں اتنی آسانی سے تمہیں یہاں سے نکلنے نہیں دوں گا۔“ میری یہ بات سن کر اچانک اس نے پوری قوت سے میرے جسم کے نازک اعضا پر کچھ اتنی قوت سے گھٹنے کی ضرب لگائی کہ میں درد کی شدت سے سن ہو کر رہ گیا۔ مگر اس کے ذرا سا آگے جھٹکنے کا بڑا ہی خوفناک نتیجہ نکلا، تھا اور وہ یہ میری چھری بے ارادہ اس کے سینے میں دسے تک دھنس گئی اس میں میرے ارادے کو قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔ مجھے آج تک اس بات کا افسوس ہے بے حد افسوس۔ وہ یوں اس کے دل میں اتر گئی جیسے چاقو تربوز میں دھنس جاتا ہے۔ کچھ میرا ہاتھ بہت مضبوطی سے اس چھری کے دسے پر جما تھا۔ کچھ وہ اتنی تیز اور نکیلی تھی کہ مجھے احساس اس وقت ہی ہوا جب وہ نجمہ کے دل میں اتری اور ایک دلدوز چٹختی بن کر بند غسل خانے میں پھیل گئی۔ میں نے اپنے درد کی ٹیس کو بھول کر وہ چھری فوراً ہی باہر کھینچی مگر وہ اپنا کام کر چکی تھی۔ نجمہ میرے قدموں میں



ہوٹل کا بیرا اندر آ گیا۔ کمرے کا بلب بجھا ہوا تھا مگر راہداری کی روشنی میں، میں نہا سا گیا۔ میں نے تیزی سے سیدھے ہاتھ میں پکڑی چھری کمرے کے پیچھے چھپالی۔ مگر اس کی نظر اس پر پڑ چکی تھی۔ وہ دہشت زدہ سا ہو کر پیچھے ہٹا تو میں نے جھپٹ کر اسے بالوں سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ مگر میرا وہ اسے کھینچتا ہی غضب ہو گیا اس نے اتنے دردناک انداز میں چیخ مارا کہ ساری راہداری ہل کر رہ گئی۔ اس وقت دوسرے بیرے بھی وہاں کھانا پہنچاتے پھر رہے تھے۔ ان کی تعداد تین تھی وہ سب بھاگ کر وہاں آپہنچے اتنی تیزی سے کہ میں نہ دروازہ بند کر سکا نہ اس بیرے کو چھوڑ سکا تھا۔ وہ ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخا تھا۔ میں نے بیرے کے بال چھوڑے اور ان تینوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا راہداری کی طرف دوڑا مگر میرے قدم شاید بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ اچانک میرے بوٹ کا تسمہ کھل گیا اور جیسے ہی دوسرا پاؤں اس تسمے پر پڑا میں پہلا پاؤں اٹھانہ سکا۔ میری رفتار کچھ مدھم ہو گئی تھی اور وہ تینوں بیرے چیختے ہوئے میرے پیچھے لپکے چلے آ رہے تھے۔ بارہویں قدم پر ان لوگوں نے مجھے آدبوچا۔ یوں کہ میرے ہاتھ میں چمکتی ہوئی چھری سے خود کو بچاتے ہوئے ان میں سے ایک نے میرا دایاں بازو مضبوطی سے پکڑ کر میری گردن دوسرے بازو کے حلقے میں دبایا۔ اس کے بعد مجھے بے بس کر لینا ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ میرے گرد دیکھتے ہی دیکھتے مجمع لگ گیا۔ وہ چالیس لاکھ کی رقم میری بھی سمیٹ طلب کر رہی تھی۔

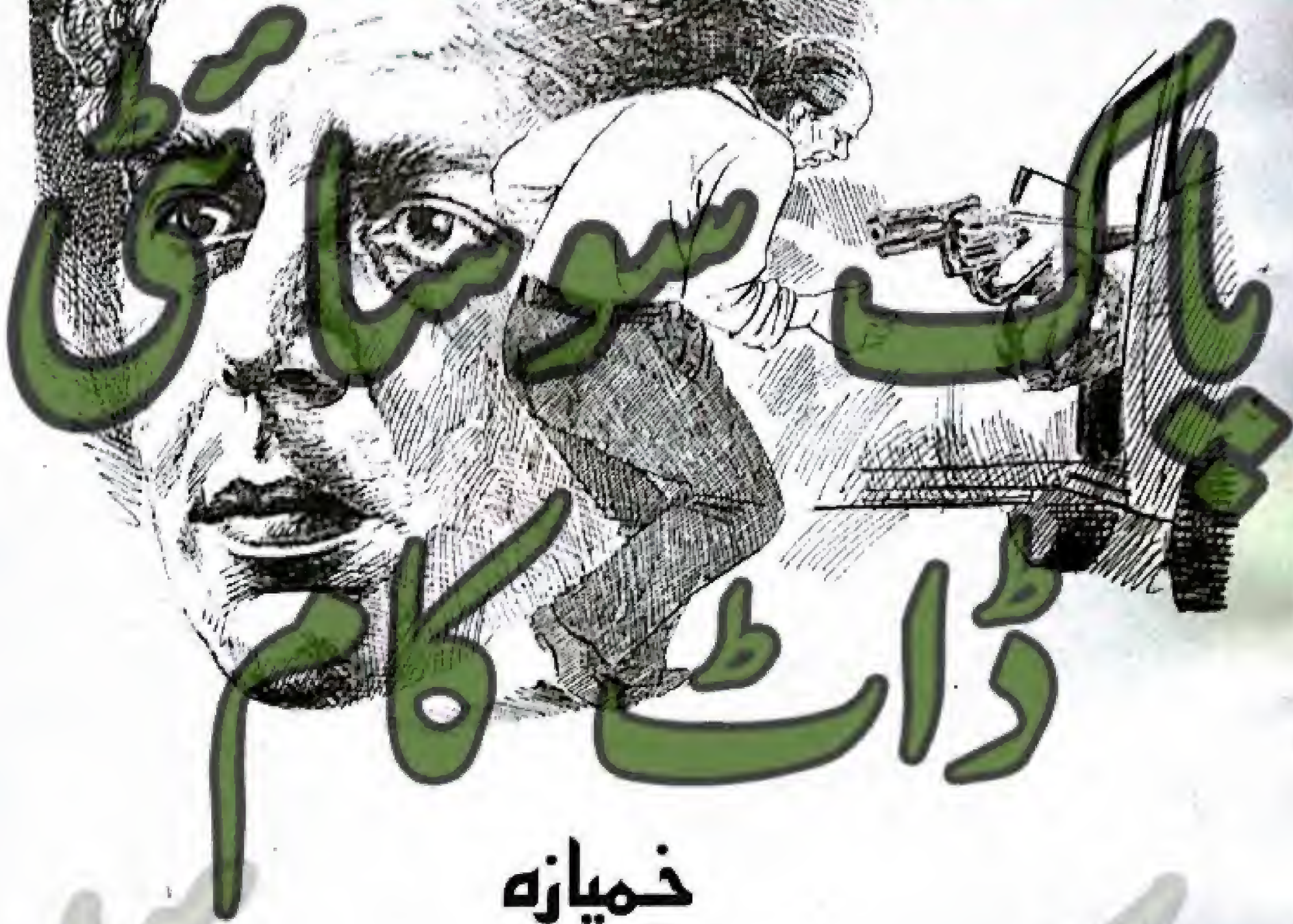
اور پھر فوراً ہی انہوں نے نجمہ کی لاش بھی غسل خانے میں دیکھ لی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد مجھے ان لوگوں نے پولیس کے حوالے کر دیا۔ وہ لوگ مجھے اسی وقت تھانے نہیں لے گئے۔ وہ نجمہ کے شوہر ایم جے رانا کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ جب بچی کو ساتھ لے کر سامان سے لدا پسندا ہوٹل میں داخل ہوا تو اپنی بیوی کے قتل کی خبر اسے مفلوج کر گئی۔ اس کا سارا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا اور پھر قانون کی چھریاں میرے لہو میں نہانے لگیں۔ مجھے بڑے ہی کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑا مگر میں نے کہہ دیا کہ میں نے نجمہ کو جوش رقابت میں اندھا ہو کر قتل کر دیا۔ میری عافیت اسی میں تھی۔ انسانی ذہن کی عیاری پر تو شاید بھی بھی وہ خود بھی حیران رہ جاتا ہوگا۔ محنتی سے میری شادی کی بات تو سب پر عیاں تھی مگر میں نے عدالت میں یہ موقف اختیار کیا کہ انہی دنوں میں نے خفیہ طور پر نجمہ سے بھی شادی کر لی تھی اور اس کا ثبوت شاہدہ کے امام مسجد مولوی عبدالغفور سے مل سکتا ہے۔ جب

محنتی اسپتال میں آپریشن کے دوران مر گئی اور اس کی تمام جائیداد کا میں وارث بن گیا تو نجمہ نے نہایت ہی عیاری سے وہ تمام روپیہ مجھ سے ہتھیا لیا اور پھر چپکے سے وہ اپنے سابقہ شوہر محمد جمشید رانا کے ساتھ فرار ہو گئی۔ اس صورت حال نے مجھے پاگل کر دیا اور میں نے کئی دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اس رات جب نجمہ کو ڈھونڈ لیا تو میں انتقام اور غیرت کی آگ میں اس طرح جل رہا تھا کہ میں نے اسے قتل کر دیا۔ کیونکہ اس نے مجھے تباہ کر دیا تھا۔ محمد جمشید رانا نے میرے اس بیان کی تمام باتوں سے لاعلمی کا اظہار کیا اس نے کہا کہ اسے نہ تو کسی رقم کا علم ہے اور نہ ہی اس بات کی خبر ہے کہ نجمہ نے کسی اور سے بھی شادی کر لی ہے۔ اس کے بیان پر میں نے کوئی تنقید نہیں کی۔ جمشید نے مجھے کسی ذریعے سے کہلوادیا تھا کہ میں اس کے بیان پر کوئی حرف گیری نہ کروں ورنہ عدالت کے سامنے وہ اس شیب کو بھی پیش کر دوں گا جس کی نقل ابھی تک اس کے پاس محفوظ تھی۔ وہ بڑی ہی خوفناک دھمکی تھی۔ جس نے میری زبان بند کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ رقم جمشید ہی کے قبضے میں رہی۔ اس نے کہہ دیا کہ نجمہ نے اسے کسی ایسی رقم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے شیب اور جمشید کے بینک کے کاغذات اس کے پاسپورٹ سمیت اسی شام جلادے تھے ورنہ جمشید کی گردن اگر گھٹنے میں پھنسی تو وہ مجھ پر محنتی کا قتل بھی بڑی آسانی سے ثابت کر سکتا تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ عدالت نے مجھے بحالت اشتعال قتل کا مرتکب قرار دے کر دس سال قید بامشقت کی سزا دے دی اور جمشید اس سارے فساد سے محفوظ رہ کر چھپن۔۔۔ لاکھ کی خلیہ رقم سمیٹ کر لندن جا پہنچا۔ موٹی کو میں نے سنا ہے وہ لاہور کے ایک یتیم خانے میں داخل کروا گیا تھا۔ میں نے اپنی یہ کہانی آپ کو سنا تو دی ہے مگر یاد رکھیں اس میں بھی میں نے اپنے قانونی تحفظ کا خیال رکھا ہے۔ شہروں اور کرداروں کے نام میں نے مکمل طور پر بدل دیے ہیں کیونکہ میری عافیت اسی میں مضمحل ہے۔ البتہ دل کا حال آپ سے کہہ کر میں آج بہت ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ غصہ مجھے یہی ہے کہ میں خواجواہ ہی ٹھن ٹھن گوپال بن کر رہ گیا۔ مگر کوئی بات نہیں لندن کون سا زیادہ دور ہے۔ میری رہائی کے دن بھی زیادہ دور نہیں ہیں۔ اس ایم جے رانا سے تو میں بہر حال نمٹ ہی لوں گا۔ اسے میں معاف کر ہی نہیں سکتا۔ وہ بہر حال میں واجب الفکھل ہے وہ دیو زاد۔

جسوسی ڈائجسٹ





## خمیازہ

سلیم انور

زندگی کی کچھ سچائیاں اس قدر تلخ ہوتی ہیں کہ ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا... وہ تندخو اور غصیلے مزاج کا مالک تھا... حالات کی سرکشی نے اسے زندگی کی رعنائیوں سے دور دھکیل دیا تھا... اور اسی سرکشی نے اسے ایک اور سرکشی پر اکسا ڈالا...

ایک بوڑھے شخص کا انتقامی جذبہ... مغرب پرستوں کی تندی و تیزی کا ایک اور شاخسانہ...

جونا تھن حسب معمول غصے میں بھرا ہوا تھا۔ اپنے اپارٹمنٹ سے اپنی زنگ آلودہ کھٹارا کار کی جانب جاتے ہوئے وہ اپنے بلاک کی درمیانی سڑک عبور کر رہا تھا۔ سڑک پار کرتے ہوئے اس نے سامنے کی طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ بس سیدھا چلتا چلا جا رہا تھا کیونکہ وہ طیش میں تھا اور اس کا خیال تھا کہ لوگوں کو خود اس کا خیال رکھنا چاہیے اور اگر سڑک عبور کرتے ہوئے کسی گاڑی نے اسے ٹکرا دی تو وہ گاڑی والے پر مقدمہ دائر کر کے اس سے بھاری رقم وصول کر لے گا۔ جیسے کہ اس کا حق بنے گا۔

اسے اس دنیا پر غصہ آ رہا تھا جس نے اسے خستہ حال اپارٹمنٹ میں پھینکا ہوا تھا اور اس کے پاس ایک کھٹارا زنگ آلودہ کار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے یہ حقیقت کبھی تسلیم نہیں کی تھی کہ وہ جس ماحول میں بس رہا تھا وہ اس کا خود اپنا ہی تخلیق کردہ تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اسکول جانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ وہ منشیات کا عادی تھا اسی لیے کہیں بھی جم کر ملازمت نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ

حاسبہ سے ڈائجسٹ 195 جولائی 2015ء



دنیا والے اس کے ساتھ کبھی بھی اچھا برتاؤ نہیں کرتے۔  
انہی خیالوں میں گم وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا سڑک  
پار کر رہا تھا کہ ایک کار والے نے اسے بیچ سڑک میں دیکھ کر  
اپنی رفتار کم کر دی۔ جونا تھن نے اخلاقاً بھی کار کے ڈرائیور  
کی طرف دیکھنا یا اس کا شکریہ ادا کرنا گوارا نہیں کیا تھا۔ بس  
ایک اچھٹی نگاہ پلٹ کر ڈالی تو دیکھا کہ کار رک چکی تھی۔  
”اس کار والے کو کیا مسئلہ درپیش ہے؟“ جونا تھن  
اندرونی اندر بیچ دتا بکھانے لگا۔

جونا تھن کو اب بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ سوچ  
رہا تھا کہ یہ بوڑھا آخر کون ہے اور اپنے آپ کو کیا سمجھ رہا  
ہے؟  
جونا تھن بوڑھے ڈرائیور کو گھورنے لگا۔ پھر جیسے  
ہوئے بولا۔ ”میں پلٹ کر واپس جا رہا ہوں۔ اگر تم مجھے  
شوٹ کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں میری پشت پر گولی چلانی  
پڑے گی جیسے کوئی بزدل کسی کو شوٹ کرتا ہے۔“  
”اوکے۔“

بوڑھے نے اسی روایتی انداز میں ’اوکے‘ کہا جیسے  
کچھ دیر پہلے روایتی انداز میں ’ہاں‘ کہا تھا۔  
جونا تھن اب بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ معاملہ کیا  
ہے۔

”تم آخر ہو کون؟“ جونا تھن جھٹکا گیا۔  
”ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔“ جواب آیا۔  
”میں جانتا ہوں کہ ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔۔۔۔۔۔“  
جونا تھن گالی دینا چاہتا تھا لیکن پھر بندوق کی نال پر نگاہ  
پڑتے ہی اس نے جملہ کھل نہیں کیا۔ ”ہاں، مجھے معلوم ہے  
کہ ہم پہلے کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ تو پھر تم مجھے  
کیوں شوٹ کرنا چاہتے ہو؟“

”میں اس دنیا پر ایک احسان کرنا چاہتا ہوں۔ میرا  
مطلب یہ نہیں کہ تمہاری کوئی اہمیت ہے، کیا سمجھے؟ اس لیے  
کہ جو سائیس تم لے رہے ہو وہ فضول ضائع ہو رہی ہیں۔“  
اس بوڑھے نے کہا۔

جونا تھن کا غصہ عروج پر پہنچ چکا تھا اور اس کا دل جاہ  
رہا تھا کہ اس بوڑھے کا چہرہ مسخ کر دے۔ اس نے بوڑھے کو  
مغلظات سنانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اسے وہ بندوق یاد آگئی  
جس کی نال اس کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی  
کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بوڑھے کو مخاطب کیا۔ ”تم مجھ  
سے کیا چاہتے ہو؟ میں تمہارے سامنے گڑگڑاؤں گا نہیں اور  
نہ ہی تم سے زندگی کی بھیک مانگوں گا۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں۔“ بوڑھے نے بھویں  
جاسوسی ڈائجسٹ

جونا تھن بھی رک گیا۔ اس کی کار کی چابیاں اس کے  
ہاتھ میں تھیں۔ وہ کار کے ڈرائیور کو گھورنے لگا۔ ڈرائیور کی  
نظریں بھی جونا تھن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

جونا تھن نے دل ہی دل میں اس ڈرائیور کو ایک  
گندی سی گالی دی اور پلٹ کر اپنی کار کی جانب چل دیا۔

جب وہ اپنی کار کے نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ وہ کار  
بھی اس کے پیچھے اس کی کار کے مقابل آ کر رک گئی تھی۔  
اس کار کا اندرونی حصہ روشن نہیں تھا اس لیے ڈرائیور ایک  
سائے کے مانند نظر آرہا تھا۔

”کیا ہے؟“ جونا تھن نے پوچھا۔  
کار سے کوئی جواب نہیں آیا۔

”تمہاری۔۔۔۔۔۔“ جونا تھن نے ایک گالی دی۔  
اب بھی کار کے ڈرائیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جونا تھن کو طیش آگیا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر گھونسا تانے  
اس کار کی جانب لپکا تا کہ اس ڈرائیور کا بھرکس نکال  
دے۔ جونہی وہ اس کار کے نزدیک پہنچا تو ڈرائیور سائڈ  
کے دروازے کا شیشہ نیچے کھسک گیا۔ ڈرائیور کی نشست پر  
گول چہرے اور چہرے سفید بالوں والا ایک شخص بیٹھا  
ہوا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا سوٹر پہنا ہوا تھا اور اس کی  
گردن میں چاندی کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی صلیب لٹک  
رہی تھی۔

”تم بڑھے، گونگے پدوڑے۔“ جونا تھن پھٹ  
پڑا۔ ”تم مجھ سے دودو ہاتھ کرنا چاہتے ہو؟“

لیکن اس شخص نے اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں دیا۔  
وہ پرسکون بیٹھا ہوا تھا اور اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے  
عاری تھا۔

جونا تھن نے مزید بڑا بھلا کہنے کے ارادے سے منہ  
کھولا ہی تھا کہ اس کی نگاہ ایک بندوق پر پڑی جس کی نال  
کار کی کھڑکی کے فریم پر لگی ہوئی تھی اور اس کا رخ عین  
جونا تھن کے پیٹ کی جانب تھا۔



اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

جونہی کو اب بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور معاملہ کیا ہے۔ کیونکہ بندوق بدستور اسی جگہ لگی ہوئی تھی اور اس نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی تھی اور نہ ہی بوڑھے کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹتی تھیں۔

جونہی نے ایک بار پھر کوشش کرنا چاہی۔

”دیکھو، مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں تمہیں بھی نہیں جانتا۔ لہذا اب میں اپنی کار کی جانب جا رہا ہوں۔“

”کیا دوسری کار لے لی؟ کیا تم اس کھٹارا تباہ شدہ کار کو ٹھکانے لگا چکے ہو۔ ایسا ہی ہے نا؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”دوسری کار.....؟“ جونہی ابھٹنے میں پڑ گیا۔ ”یہ تم کیا بے معنی باتیں کر رہے ہو؟“

”تمہاری وہ کار جس سے تم نے میری نو اسی کو پھیل دیا تھا اور پھر وہ ایک دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ تمہیں یاد آیا؟“ بوڑھے کے لہجے میں کرب تھا۔

جونہی کے سینے چھوٹ پڑے۔ یہ خفیف سا شائبہ اس کے کند ذہن کو جھنجھوڑنے لگا کہ وہ کس مشکل کا سامنا کر رہا ہے۔ تب اسے بوڑھے کے ہاتھ میں دبی ہوئی بندوق اور اس کی سرد مہر آنکھوں کا مقصد سمجھ میں آ گیا۔

”لیکن میں نے اس کی سزا بھگت لی ہے۔“ جونہی نے اپنے بچاؤ میں کہا۔

”ہاں، گاڑی سے ٹکر کی ہلاکت کے جرم کی سزا تم نے صرف آٹھ ماہ جیل میں کاٹی ہے اور اب تم رہا ہو چکے ہو۔ لیکن میری نو اسی اب بھی مردہ ہے۔ تمہیں آزادی مل چکی ہے لیکن اسے زندگی واپس نہیں ملی..... اور میری بیٹی..... اب وہ پہلے جیسی نہیں رہی۔ وہ کارنر پر کھڑی اپنی بیٹی کو سڑک پار کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور پھر.....“ بوڑھے نے اپنے شانے اچکاتے ہوئے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ ”اب وہ کبھی بھی پہلے جیسی نہیں ہو سکتی اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا، جبکہ ایک باپ کو اپنی اولاد کے لیے سب کچھ کرنا چاہیے، اس کی مدد کرنی چاہیے اور وہ کچھ کہنا اور کرنا چاہیے جو درست اور صحیح ہو۔“ بوڑھے کی انگلیاں بے خیالی میں اپنے گلے میں پڑی ہوئی چاندی کی چھوٹی سی صلیب سے الجھ رہی تھیں۔

”اوہ مائی گاڈ، یہ بوڑھا تو پاگل لگتا ہے۔“ جونہی نے سوچا۔ پھر اس نے کار کی کھڑکی کے فریم پر ٹکی ہوئی بندوق کی طرف دیکھا۔ وہ جائزہ لے رہا تھا کہ کیا وہ بندوق

پر جھپٹ سکتا ہے؟

لیکن تب ہی بوڑھے نے اپنی مکمل توجہ جونہی پر مرکوز کی۔ وہ پوری طرح چوکنا دکھائی دے رہا تھا۔

جونہی نے بندوق جھپٹنے کا خیال ذہن سے جھٹک دیا اور بوڑھے کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”میں اپنی بیٹی اور نو اسی کے لیے تو کچھ نہیں کر سکتا لیکن میں شاید تمہیں یہ باور کرا سکتا ہوں کہ درست کیا ہے۔“ بوڑھے نے کہا۔

تب جونہی کو یہ یقین آ گیا کہ اب اسے بوڑھے سے جان چھڑانی شاید مشکل ہو جائے گی۔ وہ گویا ہوا۔

”دیکھو، مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بس اچانک ہی میری گاڑی کے سامنے آ گئی تھی۔“

”وہ تو زہرا کرا سنگ سے گزر رہی تھی اور تم نہایت تیز رفتاری سے آرہے تھے۔ اس لیے کہ تم غصے سے پاگل ہو رہے تھے کیونکہ تمہیں نو کری سے نکال دیا گیا تھا۔ کیا یہ سب درست نہیں ہے، جونہی؟“

جونہی نے اپنے لہجے میں قدرے دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”تم مجھے یونہی شوٹ نہیں کر سکتے۔ اطراف میں لوگ موجود ہیں۔“ اس نے خالی سڑک پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”پولیس تمہیں پکڑ لے گی اور تمہیں بقیہ زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنی پڑے گی۔ تم مرنے تک وہیں سڑتے رہو گے۔“

بوڑھے نے جواباً بے توجہی سے شانے اچکا دیے۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”تم تو جانتے ہو کہ زندگی کتنی کٹھور ہے، جونہی..... یہ کبھی سنگین مذاق بھی کر جاتی ہے۔ جیسے کسی کو ایسی خبر ملے جو اس کے حوصلے پست کر دے اور وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو جائے۔ لیکن ساتھ ہی وہ خبر اس کے لیے ایک خوشی کی نوید بھی بن جائے۔“ بوڑھے نے خود ہی سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ شخص کہ آپ آخری درجے کے کینسر میں مبتلا اور قریب المرگ ہیں اور آپ کو جلد ہی زندگی کے جھمیلوں سے چھٹکارا ملنے والا ہے۔ اسی لیے مجھے اب کسی قسم کی کوئی پروا نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنی بندوق کی ٹال قدرے بلند کی۔ ”تم سے جلد ہی دوسری دنیا میں ملاقات ہوگی جونہی۔“ یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنی بندوق کا ٹریگر دبا دیا۔



انسان کو ذہانت اور علم کے عطیے بخشے ہیں... اس لیے اس رحمت پر دانی کی مشعل کو بجھنے نہ دینا... ہوس پرستی... خطا کاری اور دہشت پسندی کے اندھیروں میں ڈوب کر علم کی شمع کو روشن و بلند رکھنے والے سرفروشنوں کی جدوجہد مسلسل... ایک دانش مند انسان ہی زندگی کے راستوں کو اسی مشعل سے روشن کرتا ہے...

خون کی ہوئی کھیلنے والے شریکوں اور راست گوانسوں کے ٹکراؤ کی ہولناک کہانی...

## رقصِ اجل

منظرِ رامما

وہ لرزتا کانپتا ہوا لڑکا نرگس خان کو اپنے گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا ملا تھا۔

نرگس خان اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ وہ ایک مہربان اور شفیق عورت تھی۔ وہ محبت کرنے والے بچوں کی ماں اور بے انتہا خیال رکھنے والے شوہر کی بیوی تھی۔ وہ ایک بڑے اسکول میں انگلش کی ٹیچر تھی۔ انگلش کا شوق اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ اس کا باپ انگریزی کا استاد تھا اور اردو کا شاعر۔ جبکہ دونوں کی مادری





دونوں بہت ہی نفیس انسان تھے، محبت کرنے والے۔ اس لیے نرگس خان نے جب اس لڑکے کو دیکھا جو انتہائی سخت موسم میں اس کی ایک سیڑھی پر بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ نرگس خان کو ایسا لگا جیسے اس کا ارسلان اتنے سرد موسم میں اس طرح آکر بیٹھ گیا ہو۔

”کہاں سے آئے ہو بیٹا؟“ نرگس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”وہ، وہاں سے۔“ لڑکے نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ وہ یہ بھی نہیں بتا پا رہا تھا کہ وہ کس جگہ کا رہنے والا ہے۔ نرگس نے دیکھا کہ سردی کی شدت سے اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ وہ ہوا کی زد میں آئے ہوئے کسی پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ نرگس نے اس کے لیے اپنے دل میں بے پناہ ہمدردی محسوس کی۔

”نمبر ایک منٹ۔“ نرگس نے لڑکے سے کہا۔ ”میں ابھی آتی ہوں۔“

وہ گھر واپس چلی گئی۔ پانچ منٹ کے بعد واپس آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں دودھ کا ایک گلاس تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک بڑا سا کوٹ تھا۔ ”یہ لو، یہ کوٹ پہن لو۔“ اس نے وہ کوٹ لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ ”اور یہ دودھ پی لو۔ بدن میں گرمی آجائے گی۔“

لڑکے نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دونوں چیزیں اس سے لے لیں۔ اس نے دودھ کا گلاس سیڑھی پر رکھا اور نرگس کا دیا ہوا کوٹ پہنے لگا۔ یہ کوٹ نرگس کے شوہر کا تھا۔ لڑکے کے جسم پر بڑا لگ رہا تھا لیکن کسی حد تک بے رحم سردی سے اس کی بچت ہو سکتی تھی۔

نرگس اسے دلچسپی اور ہمدردی کے طے چلے جذبات کے ساتھ دیکھتی رہی۔ وہ اس لڑکے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نہ جانے کون ہے۔ کیا نام ہے؟ صورت شکل کا کتنا پیارا ہے۔ شاید کسی اچھے خاندان سے تعلق ہوگا۔ خدا جانے کہاں سے بھٹکتا ہوا اس طرف آ گیا ہے۔

لڑکے نے اس دوران میں دودھ ختم کر کے گلاس ایک طرف رکھ دیا اور ممنونیت بھری نگاہوں سے نرگس کی طرف دیکھنے لگا۔

”تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟“ نرگس نے پوچھا۔

”اکبر، اکبر خان۔“ لڑکے نے بتایا پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے نرگس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس وقت اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

”شکریہ ماں۔“ لڑکے نے کہا۔ ”اب میں چلتا ہوں۔“

نرگس بھی پکھل کر رہ گئی۔ ”ایک منٹ۔“ اس نے اپنے بیگ سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکال کر لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لو، یہ رکھ لو۔ یہ تمہارے کام آئے گا۔“

لڑکے نے ہچکچاتے ہوئے نرگس سے پانچ سو کا نوٹ لے لیا۔ کچھ دیر اسی طرح سوچتا رہا۔ جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو پھر تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ کچھ دور چل کر اس نے نرگس کی طرف دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ نرگس خان اس وقت تک اسے دیکھتی رہی تھی جب۔۔۔ امجد خان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہ اس کے پاس کھڑا ہوا حیرت سے پوچھ رہا تھا۔ ”کیا ہوا خیریت تو ہے؟ تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ تم اسکول پہنچ چکی ہو گی۔“

”وہ، وہ اکبر مل گیا تھا۔“ نرگس نے کھوئے کھوئے لہجے میں بتایا۔

”کون اکبر؟“

”اکبر خان، میں نہیں جانتی۔ بے سہارا لڑکا تھا۔ یہاں سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا کانپ رہا تھا۔ میں نے تمہارا کوٹ اسے دے دیا ہے۔“

”چلو، یہ تو تم نے اچھا کیا۔“ امجد ہنس پڑا۔ ”لیکن میڈم! ہم بھی کہاں تک لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ تم نے وہ پرانا گانا تو سنایا ہوگا۔ وہی آنسو وہی آہیں، وہی دکھ ہیں، جدھر جائیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ نرگس نے ایک گہری سانس لی۔ ”پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔“

”چلیں میڈم! میں آپ کو آپ کے اسکول تک ڈراپ کر دوں۔“ امجد نے کہا۔ ”ویسے میں یہ جانتا ہوں کہ آپ کو واک کا شوق ہے لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کے اس ناچیز شوہر کے پاس ایک عدد گاڑی بھی موجود ہے۔“

”ہاں، نہ جانے کیوں میں اس وقت پیدل چلنے کی ہمت نہیں پا رہی۔“ نرگس نے کہا۔

”تم یہیں کھڑی رہو۔ میں گاڑی لے کر آ جاتا ہوں۔“

”نہیں، اٹ اڑو کے۔“

گھر میں گاڑی رکھنے کی گنجائش نہیں تھی اسی لیے گاڑی گلی میں کھڑی کی جاتی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر نرگس نے پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔



جہاں انہیں ان کی کلاسوں میں بتایا جانے والا تھا کہ ماں کی گود سے لحد تک علم حاصل کرتے رہو۔ کیونکہ تم صرف اسی لیے انسان ہو کہ علم حاصل کرتے ہو، ورنہ تو جانور بھی اپنی ضروریات پوری کرتے اور زندہ رہتے ہیں۔

☆☆☆

گل زمان کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی۔

اس نے خود تو تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن اسے اسکول جاتے ہوئے بچے بچیاں بہت اچھے لگتے تھے۔ اس کے ماں باپ بہت غریب تھے۔ اسے تعلیم نہیں دلوا سکتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ ان کا گل زمان بھی پڑھ لکھ جائے۔

گل زمان کا باپ مزدور تھا جبکہ اس کی ماں ایک گھریلو عورت تھی۔ مجبوریوں نے انہیں اس حد تک کمزور کر دیا تھا کہ وہ اب تک زمان کو اسکول بھیجنے کے بجائے کسی کام پر لگانے کی سوچنے لگے تھے۔

لیکن کون سا کام؟

گل زمان ایک پیارا سا نازک مزاج لڑکا تھا۔ وہ زیادہ محنت کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ جب اس کے باپ کو ایک دن اس کے جاننے والے نے کہا۔ ”یارا! تو اپنے بیٹے کو کام پر کیوں نہیں لگا دیتا۔“

”وہ کون سا کام کر سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں کر سکتا۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں اس کے۔ میرے ایک جاننے والے نے ایک بڑے اسکول میں کینٹین کھول رکھی ہے اگر تو کہے تو میں اس سے بات کروں۔“

”وہاں کام کیا ہوگا؟“

”ارے بہت ہلکا کام ہوتا ہے اسکول کی کینٹین کا۔ آٹھ بجے جانا اور دوپہر کو واپس آ جانا اور کام بھی کوئی ایسا خاص نہیں ہے۔ وہاں کی جو استانیاں ہیں ان کو چائے پہنچانا اور جو بچے آئیں ان کو سنبھال لینا۔ وہاں اور بھی دو بچے ہیں، وہ بھی سہی کام کر رہے ہیں۔“

”اور پیسے کتنے ملیں گے؟“

”وہ بھی ٹھیک ہی ہوں گے۔ اپنا خرچہ تو نکال ہی لے گا۔“

”ٹھیک ہے جان، تو اس سے بات کر کے مجھے بتا دینا۔“

گل زمان کو جب یہ پتا چلا کہ اسے کسی اسکول کی کینٹین میں کام ملنے والا ہے تو وہ خوش ہو گیا۔ اس کی خواہش پوری ہونے والی تھی۔ اسکول جانے کی خواہش۔

چاروں طرف دکھ ہی دکھ تھے۔ کسی کے چہرے پر زندگی نہیں رہی تھی۔ سائے ہر طرف دوڑتے پھر رہے تھے۔ یہ سائے اپنے ساتھ خوف لے کر آتے اور لہجوں میں بہت سوں کو موت دکھا کر واپس چلے جاتے یا خود بھی اندھیروں میں گم ہو جاتے۔

ایک بار اس کے شوہر امجد نے اس سے کہا تھا۔ ”نرگس! میرا خیال ہے کہ ہم بچوں کو لے کر یہاں سے شفٹ ہو جائیں۔“

”وہ کیوں؟“

”یہاں کے حالات تو دیکھ رہی ہوتا۔“

”کیا ہمارے شفٹ ہو جانے سے یہاں کے حالات بدل جائیں گے؟“

”یہاں کے حالات تو شاید نہ بدلیں لیکن کم از کم ہمارے حالات بدل جائیں گے۔ صرف معاشی آسودگی ہی سب کچھ نہیں ہوتی، ذہنی سکون کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔“

”نہیں امجد، میں نے یہاں کی مٹی میں جنم لیا ہے اگر میں یہاں سے چلی گئی تو یہ مٹی مجھ سے شکوہ کرے گی کہ تم کیسی اولاد ہو جو ماں کو پریشانی میں چھوڑ کر بھاگ گئیں۔“

”اس کو آئیڈیلزم کہا جاتا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ دور ہو جانے کے بعد مٹی سے رشتہ کمزور پڑ جاتا ہے؟“

”نہیں، رشتہ تو کمزور نہیں ہوتا لیکن مٹی کا لمس نہیں ملتا۔ تم نے ارسلان اور فرحان کو دیکھا ہے۔ وہ دونوں جب کچھ دنوں کے لیے ایبٹ آباد اپنی خالہ کے یہاں جاتے ہیں اور جب وہاں سے واپس آتے ہیں تو کتنی دیر تک مجھ سے لپٹے رہتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہاں انہیں کوئی پریشانی ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ انہیں میرا لمس نہیں ملتا۔ لمس کو محسوس کرتے رہو تو محبت میں تازگی رہتی ہے امجد، چاہے وہ لمس رشتوں کا ہو یا وطن کا۔“

ان دونوں کے درمیان اسی قسم کی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ انٹیلیکچوئل سطح کی۔ امجد کا بھی مطالعہ بہت اچھا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے اپنے گھر میں ایک بڑی سی لائبریری بنا رکھی تھی۔ ان کے بچوں ارسلان اور فرحان کو بھی ایسا ہی ماحول نصیب ہوا تھا۔

”یہ لو تمہارا اسکول آگیا۔“ امجد کی آواز نے اسے

چونکا دیا۔

ان کی کار اسکول کے گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ ابھی اسکول کتنے ہی والا تھا۔ بچے اور بچیاں گیٹ کے اندر جا رہے تھے۔



ان بچوں سے ملنے کی خواہش جو صاف ستھری یونیفارم پہن کر اور کتابیں اٹھائے اسکولوں کی طرف جایا کرتے۔

اور ایک دن اسے اسکول کی کینٹین کے مالک کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ وہ ایک درشت مزاج شخص تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سختی تھی۔ سر کے بال بہت چھوٹے چھوٹے، جیسے فوجیوں کے ہوا کرتے ہیں۔ سامنے کے دو دانت غائب تھے اور جب وہ کسی بات پر ہنستا تو بہت بھیاٹک دکھائی دیتا۔

وہ اپنی چھوٹی چھوٹی سانپ جیسی تیز آنکھوں سے بہت دیر تک گل زمان کو دیکھتا رہا۔ گل زمان کو خوف کے ساتھ ساتھ اس سے کراہت محسوس ہونے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ کچھ دیر بعد اس نے گردن ہلائی۔ ”ٹھیک ہے، کل سے کام پر آ جانا اور سنو، سات بجے آنا ہو گا۔“

”آ جاؤں گا صاحب۔“

”کام سمجھا دیا جائے گا۔ بہت آسان کام ہے۔ اسکول کی استانیوں کو چائے دینی ہے اور ہاف ٹائم کے وقت بچوں کو بھی سنبھالنا ہے۔“

”جی صاحب، ہو جائے گا۔“

”اور ہاں، ایک بات اور..... اپنے کام سے کام رکھنا، دو بجے چھٹی ہوا کرے گی۔“

دوسرے دن سے گل زمان نے کام شروع کر دیا۔ وہ ٹھیک سات بجے پہنچ گیا تھا۔ اس کے لیے صبح اٹھنا کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے گھر والے فجر میں اٹھ جایا کرتے تھے۔ گل زمان کو بھی یہی عادت پڑی ہوئی تھی۔

پہلی صبح اس کی ماں اس کے لیے بہت بے قرار ہو رہی تھی۔ ”دیکھ گل زمان! تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ وہاں کسی سے جھگڑا نہیں کرنا۔“

”ماں، میں نے کبھی پہلے جھگڑا کیا ہے جو وہاں جا کر کروں گا۔“

”اور ہاں، کینٹین میں تو کھانے پینے کی بہت سی چیزیں ہوں گی۔“ ماں نے پوچھا۔

”ہاں ماں، بہت کچھ ہے۔ سمو، آلو کے چپس، بسکٹ اور پتا نہیں کیا کیا۔“

”لیکن پیتا تو ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا۔“

ماں نے سمجھایا۔ ”یہ بری عادت ہوتی ہے۔ بس جو میں تجھے باندھ کر دے دیا کروں وہی کھایا کرنا۔“

گل زمان کا باپ ایک طرف کھڑا ہو کر اپنی بیوی کی

باتیں سن سن کر مسکرائے جا رہا تھا۔ ”یار! تو بھی کمال کرتی ہے۔“ اس سے جب برداشت نہیں ہوا تو وہ بول پڑا۔ ”گل زمان اب اتنا بچہ بھی نہیں ہے۔ سب سمجھتا ہے اور یہ بھی تو دیکھ اس محلے کے اور کتنے بچے روزانہ کام پر جاتے ہیں۔“

”ان کی بات اور ہے نصیب خان۔“ اس کی ماں دھیرے سے بولی۔ ”یہ تو پہلی دفعہ کام پر جا رہا ہے نا۔“

”سب پہلی دفعہ ہی جاتے ہیں، تو فکر مت کر۔“

گل زمان کو اسکول کا ماحول بہت پسند آیا۔ کام بھی کوئی خاص نہیں تھا۔ اس کے علاوہ دو بچے اور بھی کام کرتے تھے۔ لیکن وہ دونوں بڑی عمر کے لوگ تھے۔ ان کے علاوہ کینٹین کا مالک ستم گر خان تھا۔ گل زمان کی سمجھ میں اس کا نام نہیں آ سکا تھا۔ ستم گر خان، یہ کیا نام ہوا۔

ہاف ٹائم کے وقت بہت زیادہ کام ہو جاتا تھا۔ بچے کلاس رومز سے اس طرح نکل آتے تھے جیسے پنجرہوں سے ننھے ننھے پرندے آزاد ہو گئے ہوں۔ وہ سب شور مچاتے ہوئے کینٹین کی طرف دوڑ پڑتے۔

اس کے بعد کینٹین کا کام شروع ہو جاتا۔ گل زمان اس لڑکے کو سمو سے دو۔ مجھے بسکٹ چائے، دو کولڈ ڈرنک، وہ فلاں ٹیچر سامنے درخت کے پاس کرسی پر بیٹھی ہے۔ اس کو چائے پہنچانی ہے۔

وہ دیکھو، وہ بچی کیا مانگ رہی ہے۔ یہ بیس پچیس منٹ بہت مصروفیت کے ہوتے تھے۔ اس کے بعد بریک ختم ہوتے ہی بچے دوبارہ اپنی اپنی کلاس کی طرف دوڑ پڑتے اور ذرا سی دیر میں سناٹا پھیل جاتا۔

اس وقت ستم گر خان پیسے گن گن کر ایک طرف رکھتا جاتا۔ اسکول بھی بہت بڑا تھا اس لیے کینٹین بھی بہت بڑی تھی اور اس کے ساتھ آمدنی بھی اچھی خاصی ہوا کرتی۔

دس بارہ دنوں کے بعد گل زمان اس ماحول سے پوری طرح مانوس ہو چکا تھا۔ اسکول کی ٹیچرز بھی اسے پسند کرنے لگی تھیں۔ سب کو اس کا نام معلوم ہو گیا تھا۔

”گل زمان دو کپ چائے جلدی سے پہنچا دو اور ہاں چینی کم۔“

”جی مس، چینی کم۔“

”گل زمان! چھ سمو سے اور چار کولڈ ڈرنک سامنے لے آؤ، ہم سامنے چبوترے پر بیٹھے ہیں۔“

اسکول کے احاطے میں ایک بڑا سا درخت تھا۔...

درخت کے چاروں طرف ایک بڑا سا چبوترہ بنا دیا گیا تھا۔

فارغ اوقات میں کئی ٹیچرز اس چبوترے پر گپ شپ کے



زنس ہے اور جہاں تک آپ لوگوں کی بات ہے۔ آپ اپنے بچوں کو تعلیم دلواتی رہیں۔ کیونکہ آپ لوگ آسمان سے اترے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ زنگس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اب میں گل زمان کو چھٹی کے بعد پڑھایا کروں گی۔ اس وقت تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا؟“

ستم گر خان نے جواب تو کچھ نہیں دیا لیکن وہ خوشخوار لگا ہوں سے زنگس خان کو دیکھنے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت تھک چکا تھا۔

اس کے پیروں میں جو پرانے جوتے تھے، وہ اب بری طرح کھس گئے تھے اور نکیلے پتھروں نے اس کے پیروں کو زخمی کر دیا تھا۔

اوپر سے سورج بھی آگ برسائے جا رہا تھا۔ اسے خود یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرف کیوں آ نکلا ہے۔ بس وہ ایک جنون کی کیفیت میں گھر سے بھاگ نکلا تھا۔

اس کا باپ انتہائی بے رحم انسان تھا۔ نماز روزہ وغیرہ کا سختی سے پابند۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے مزاج میں بلا کی سختی بھی تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر دونوں ماں بیٹے کو دھنک کر رکھ دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ تین چیزوں کو ہمیشہ مار مار کر ٹھیک رکھنا چاہیے۔

گھوڑا، عورت اور اولاد۔ گھوڑا تو اس کے پاس نہیں تھا لہذا گھوڑے کی کسر بھی وہ ان دونوں سے پوری کر لیتا۔

وہ اپنے باپ کی وجہ سے کئی بار پہلے بھی گھر سے بھاگ چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہر وقت دینی باتیں کرنے والا آدمی اندر سے اتنا بے رحم کیوں ہے۔

اس بار معاملہ کچھ اور خراب ہو گیا تھا۔ اس کے باپ نے ماں کو اس طرح مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔

اور اس دن پہلی بار ایسا ہوا کہ جب اس کا باپ اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے اپنے باپ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”بس بابا بس اب بہت ہو گیا۔“

”کیا؟“ اس کا باپ جیسے ایک دم شاک میں آ گیا ہو۔ ”تو بہ تو بہ، باپ کا ہاتھ تھامتا ہے۔ کافر ہو گیا ہے۔“

”کافر نہیں ہوا بابا، تم کو ظلم سے روک رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اب میرے سامنے یہ سب نہیں ہوگا۔ ماں بھی تو انسان ہے۔“

”وہ ایک عورت ہے بد بخت۔“

لے بیٹھ جائیں اور ساتھ میں کولڈ ڈرنک یا چائے بھی پیتی رہیں۔

گل زمان کو وہ ٹیچر بہت اچھی لگتی تھی جس کا نام زنگس خان تھا۔ وہ بہت نرمی اور شفقت کے ساتھ باتیں کیا کرتی، وہ کیشین یا چبوترے کی طرف بہت کم آیا کرتی تھی۔

عام طور پر اس کی چائے اسٹاف روم ہی میں بھیجی جاتی۔ جہاں وہ موٹی موٹی کتابوں میں الجھی رہتی یا بچوں کی کامیاں چیک کر رہی ہوتی۔

گل زمان جب اس کے لیے چائے لے کر آتا تو وہ اس سے دو چار باتیں ضرور کر لیا کرتی۔

ایک دن اس نے گل زمان سے پوچھا۔ ”تم کو پڑھنے کا شوق نہیں ہے گل زمان؟“

”بہت شوق ہے ٹیچر۔“ گل زمان نے کہا۔ ”اس میں اب اتنا سلیقہ آ گیا تھا کہ وہ اسکول کی استانیوں کو بڑے ادب کے ساتھ ٹیچر کہا کرتا۔“

”میں تمہیں کتابیں لا کر دوں گی۔“ زنگس نے بتایا۔ ”میں دو گھنٹے فارغ ہوتی ہوں۔ اس کمرے میں ہوتی ہوں۔ تم میرے پاس آ جایا کرتا، میں پڑھا دوں گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ٹیچر، لیکن میرا مالک ستم گر خان نہیں مانے گا۔ گل زمان نے کہا۔ ”وہ مجھے چھٹی نہیں دے گا۔“

”میں اس سے بات کر لوں گی۔“

لیکن جب زنگس خان نے اس سے بات کی تو اس نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”رہنے دیں ٹیچر، آپ بھی کن چکروں میں پڑی ہیں۔ یہ لوگ جہاں ہیں بس وہیں ٹھیک ہیں۔ ان کو تعلیم والیم کے چکر میں نہ ڈالیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ تعلیم بری چیز ہے؟“ زنگس نے پوچھا۔

”ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا ٹیچر، میرے خود چار بچے ہیں۔ دو لڑکیاں، دو لڑکے۔ لیکن میں نے کسی کو تعلیم کے چکر میں نہیں ڈالا۔“

”تو پھر کیا کریں گے وہ؟“

”بہت کچھ کر لیں گے۔ لڑکے گیراج میں کام کرتے

ہیں اور لڑکیوں کی شادی ہو جائے گی بس۔“

”افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم اسکول کے ماحول میں رہتے ہو۔ تم لڑکے لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرتے ہوئے دیکھ رہے ہو، اس کے باوجود تعلیم سے دور بھاگتے ہو۔“

”اسکول میں کیشین چلانا تو اپنا مجبوری ہے ٹیچر، اپنا



”تو کیا عورت انسان نہیں ہوتی۔“ وہ چیخ کر بولا۔

”اب یہ کتنا برداشت کرے گی۔“

”نکل جا یہاں سے بد بخت کافر۔“ باپ نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔ اس نے ایک طرف رکھا ہوا ایک ڈنڈا اٹھا لیا تھا۔۔۔ وہ اسے مارنا چاہتا تھا کہ اس کی ماں درمیان میں آگئی۔

”بس کر دو، رحم کرو اس پر، چھوڑ دو۔ اس کے بدلے مجھے مار لینا، لیکن اس کو ہاتھ نہیں لگاتا۔“

باپ نے برا بھلا کہتے ہوئے ڈنڈا ایک طرف پھینک دیا۔ اس نے ایک نظر اپنے بے رحم باپ کی طرف دیکھا پھر زخمی ماں پر ایک نظر ڈالتا ہوا گھر سے باہر آ گیا۔

وہ ایک جنونی کیفیت میں باہر نکلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرف جا رہا تھا۔ ہر طرف سنگلاخ چٹانیں تھیں۔ آگ برساتا ہوا سورج تھا اور پیروں کو زخمی کرنے والے پتھر تھے۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔ بہت شدید۔ ہونٹ سوکھ کر ترخ چکے تھے۔ اس نے اپنے خشک لیوں پر زبان پھیری۔ زبان بھی اب کانٹے کانٹے ہو رہی تھی۔

اچانک کچھ فاصلے پر اسے ایک آدمی جاتا ہوا دکھائی دے گیا۔ وہ آدمی پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ اس نے آواز لگا کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز بھی نہیں نکل سکی۔ وہ دوڑنے کی کوشش میں الجھ کر گر پڑا اور گرتا ہی چلا گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا ہو گا۔ وہ ایک سائے دار کمرے میں تھا۔ حالانکہ گرمی یہاں بھی بہت سخت تھی لیکن کم از کم چھت کا سایہ تو تھا۔

آہستہ آہستہ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے دو آدمیوں کو دیکھا۔ دونوں اسی علاقے کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ ان کی شکلیں یہی بتا رہی تھیں۔

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ان میں سے ایک نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

”پورا نہیں پی جانا، تھوڑا تھوڑا۔“ یہ بات تو وہ خود بھی جانتا تھا کہ جس کو پیاس نے مار دیا ہو اس کو پانی پینے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ اس نے ایک دو گھونٹ لے کر گلاس ایک طرف رکھ دیا۔ وہ دونوں اسے بہت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

وہ اب تو ان کی محسوس کر رہا تھا۔ اسے سہارا دے کر بٹھا دیا گیا۔

”نام کیا ہے تیرا؟“ ان میں سے ایک نے دریافت کیا۔ حالانکہ اس کا لہجہ نرم ہی تھا لیکن آواز بہت سخت تھی۔

”اکبر خان۔“ اس نے جواب دیا۔

”ادھر کہاں سے آ گیا؟“ دوسرے نے پوچھا۔

اکبر خان نے گردن جھکالی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ وہ کن حالات میں گھر سے نکل بھاگا تھا۔

”بتانا، ادھر کہاں سے آ گیا؟“ اس بار پہلے والے نے پوچھا تھا۔

اکبر خان نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوری کہانی سنا دی کہ وہ کس طرح اپنے باپ کے خوف سے گھر سے بھاگا ہے اور اس کا باپ کتنا بے رحم انسان ہے۔

”یارا! یہ تو بہت دکھ کی بات ہے۔“ دوسرے والے نے کہا۔ ”ایسا لوگ تو ظالم ہوتا ہے۔“

”ہاں، میرا باپ بہت ظالم ہے۔“

”اکبر خان! اب تم ہمارا دوست ہے۔“ دوسرا اس کے شانے پر ہتھکی دیتے ہوئے بولا۔ ”اب تم ہمارے ساتھ رہے گا۔ یہاں تم کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہم تم کو اچھی اچھی باتیں سکھائے گا۔ تم کو سیدھے راتے پر چائے گا۔ کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی جو بولو گے، حاضر ہو گا۔“

”بہت مہربانی جی۔ میں اب خود بھی اس گھر میں واپس نہیں جاؤں گا۔“

”شباباش تو پھر کیا ہے، اب تم ادھر ہمارے ساتھ ہے ہمارا بھائی ہے۔“

”آپ کون ہیں؟“ اکبر خان نے پوچھا۔

”ہم شہباز خان ہے اور یہ ہمارا دوست بخت آور خان۔“ پہلے والے نے اپنا اور دوسرے کا تعارف کروایا۔

”آپ دونوں یہیں رہتے ہیں؟“

”ہاں یارا، اس میں کیا ہے۔ مرد تو کہیں بھی رہ سکتا ہے۔ وہ شیر کا بچہ ہوتا ہے چلو اب تم کچھ دیر آرام کرو، ہم تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہے۔“

دونوں کمرے سے چلے گئے۔ اکبر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کن لوگوں کے درمیان آ پھنسا ہے۔ ویسے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ باہر جا کر انہوں نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ یعنی وہ اب یہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔

لیکن نکل کر جاتا بھی کہاں؟ اپنے گھر میں تو اس کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کا باپ اسے دیکھتے



نرمی اور آہستگی نہیں رہی۔ آج کل کی فلموں سے Softness ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ صرف تشدد ہے۔ نئی نئی قسم کی مشینیں اور نئے نئے ہتھیار۔ بس مارتے چلے جاؤ۔ نہ کوئی اسٹوری اور نہ کوئی تقسیم۔ ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا ہے۔“

”مجھے یاد ہے۔ ایک زمانے میں ویسٹ میں بھی کتنی خوب صورت سافٹ فلمیں بنا کرتی تھیں۔“ زگس نے کہا۔ ”بیچ بیک، سن فلاور، بٹر فلائی اور نہ جانے کون کون سی۔ ان فلموں کو دیکھ کر روح تک خوش ہو جاتی تھی۔“

”اصل بات یہ ہے کہ فلمیں اور لٹریچر وغیرہ معاشرے سے الگ ہٹ کر نہیں ہوتیں۔ جیسا معاشرہ ہوتا ہے ویسی ہی پراڈکشن مارکیٹ میں آرہی ہیں۔“

”بہر حال بچوں پر نظر رکھنا ہوگی۔“ زگس کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔

”پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ سب کو لے کر اس ملک سے نکل جاؤں۔ پھر سوچتا ہوں فائدہ کیا ہوگا۔ مسائل تو ہر جگہ ہیں، کہیں سیاسی خون ریزی ہے۔ کہیں معاشی خون ریزی اور کہیں مذہبی خون ریزی۔“

”ہمارے یہاں تو فساد کی تین وجوہات ہیں۔ ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے۔“

”وہ کون سا؟“ امجد نے پوچھا۔

”پہلے تو تین ہی ہوتی تھیں نا، زن، زمین اور زر۔ اب زبان کا بھی اضافہ کر لیں۔ ہمارے ملک میں تو اس بنیاد پر بھی خون بہایا جا رہا ہے۔“

”اور اتفاق یہ ہے کہ زبان بھی ز سے ہی ہے۔“

”نچائیں جا کر بچوں کو دیکھیں۔ وہ ناراض ہو کر گئے ہیں۔ ان کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کریں۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ امجد نے کہا۔ ”میں کونسلنگ کے ذریعے ان کے ذہن کو ڈائریکٹ کر دوں گا۔“

دروازے کی اطلاعی گھنٹی نے دونوں کو چونکا دیا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور عام طور پر لوگ کسی سے ملنے رات کے وقت نہیں آیا کرتے تھے۔

گھنٹی پھر بجی۔ دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ ٹی وی لاؤنج سے ہو کر ایک چھوٹا بیچ تھا۔ آمدورفت کا دروازہ اس بیچ میں تھا۔

زگس وہیں لاؤنج میں کھڑی رہی تھی۔ امجد خان نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے داور حیات کھڑا تھا۔ امجد خان کا رشتہ دار۔ وہ ایک باہمت اور باحوصلہ نوجوان

ہی گولی مار دیتا۔

اسے صرف ماں کی فکر تھی۔ اس کے علاوہ اس کا اور تھا ہی کون۔ پتا نہیں، اس بے چاری کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہوگا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے کی دیواروں پر ہتھیار سجے ہوئے تھے۔ آگ اگلنے والے اور موت دینے والے خوفناک ہتھیار۔ اکبر خان ان ہتھیاروں کو پہچانتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی اسی قسم کے ماحول میں گزاری تھی۔

وہ سوچنے لگا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ کیسے رہ سکتا تھا؟ ان پہاڑوں پر کیا زندگی ہوگی۔ نہ جانے یہ لوگ یہاں رہ کر کام کیا کرتے ہوں گے؟

دروازہ کھلا اور وہی دونوں کھانے کی ٹرے لے کر اندر آ گئے۔ ”اکبر خان! یہ لو تمہارے لیے گرم روٹیاں اور گوشت کا سالن۔“

اکبر خان کو حیرت تو ہوئی کہ ان لوگوں نے اس پہاڑ پر کھانے کا بندوبست کیسے کر لیا لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

زگس کے دونوں بچے ٹی وی پر مار دھاڑ کی کوئی فلم دیکھ رہے تھے۔

اس فلم میں بہت زوردار جنگ ہو رہی تھی۔ ایک ہیرو تھا جس کے پیچھے بہت سے لوگ بڑے ہوئے تھے اور وہ ان کا صفایا کرتا ہوا اپنے مشن کی تکمیل کے لیے آگے بڑھا جا رہا تھا۔ تشدد کے بھی مناظر تھے اور تشدد کے ہر منظر کو ایک نئے انداز سے فلما یا گیا تھا۔

ارسلان اور فرحان کے لیے وہ بہت مزے کی مودی تھی لیکن ان کا سارا مزہ اس وقت بکرا ہوا گیا جب امجد اور زگس کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ٹی وی آف کر دیا۔

”یہ مودی کہاں سے لے کر آئے تھے؟“ امجد نے پوچھا۔

”بابا! ہم نے کمپیوٹر سے ڈاؤن لوڈ کی تھی۔“ ارسلان نے بتایا۔

”آئندہ ایسی مودی دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ جاؤ جا کر اپنا ہوم ورک کرو۔“

دونوں بچے خاموشی سے کمرے سے باہر چلے گئے۔

”تو یہ ہے ماڈرن ازم۔“ امجد ٹی وی سے بولا۔ ”پوری دنیا جیسے تشدد کی دہائی لپیٹ میں آگئی ہے۔ کسی بھی شعبے میں



تھا۔ امجد خان نے کبھی اسے ٹوٹا ہوا اور نڈھال نہیں دیکھا تھا... ہنسا بول رہا لیکن اس وقت اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے زمانے بھر کے غم اس کے ساتھ لگ گئے ہوں۔

”ارے کیا ہوا؟“ امجد خان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم اتنے پریشان کیوں ہو؟“

”کیا بتاؤں بھائی۔“ داور حیات کی آواز اب بھی ہوئی تھی۔ ”بہت برا ہوا میرے ساتھ۔“

”آؤ اندر آ جاؤ۔“ امجد خان اس کا ہاتھ تھام کر لاؤنج میں لے آیا۔ ”پہلے بیٹھ جاؤ، پھر بات کرنا۔“

”نرگس بھی داور حیات کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔“ کیا ہو گیا بھائی؟ بھابی اور بچے تو خیریت سے ہیں نا؟“

”ہاں وہ تو خیریت سے ہیں لیکن میں خیریت سے نہیں ہوں۔“ داور حیات نے کہا۔ ”میری دنیا تباہ کر دی گئی ہے۔ میرے اسکول کو آڑا دیا گیا ہے۔“

”اوہ۔“ یہ خبر نرگس اور امجد دونوں کے لیے پریشان کن تھی۔ وہ جانتے تھے کہ داور نے اپنے اسکول کے حوالے سے کیسے کیسے خواب دیکھ رکھے تھے۔ اس نے اپنے وسائل سے اسکول قائم کیا تھا۔ اس کے پاس شہر میں دو مکانات تھے۔ اسکول کے لیے اس نے ایک مکان فروخت کر دیا تھا اور اپنے علاقے میں جا کر اسکول کھول لیا تھا۔

اس کا علاقہ پہاڑوں کے دامن میں تھا۔ ایک چھوٹا سا گاؤں۔ جہاں کے بچوں کے لیے سب سے بڑی عیاشی یہی تھی کہ وہ کسی طرح زندہ رہ سکیں۔

اسکول کے افتتاح کے موقع پر امجد خان اور نرگس بھی موجود تھے۔ انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ علاقے کے بچے اور والدین تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ پہلے ہی دن سے داخلے شروع ہو گئے تھے۔ فی الحال داور حیات نے یہ اسکول پانچویں کلاس تک رکھا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا ارادہ میٹرک تک کر دینے کا تھا لیکن اب وہ اس خبر کے ساتھ آیا تھا کہ اس کے اسکول کو آڑا دیا گیا ہے۔

نرگس اس کے لیے چائے کے ساتھ کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی لے کر آ گئی تھی۔

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

نرگس اس کے لیے چائے کے ساتھ کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی لے کر آ گئی تھی۔

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

”اور بچے؟“ امجد خان نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

”وہ سب خیریت سے ہیں۔“ داور حیات نے بتایا۔

”کیونکہ یہ کارروائی رات کے وقت کی گئی تھی۔“

”یہی ہوتا ہے اور یہی ہو رہا ہے۔“ نرگس بے چین ہو کر بولی۔ ”ہم کتابوں سے محبت رکھنے والے، شاعر، ادیب، مصنف، دانشور، فلاسفر، سائنس دان، ڈاکٹرز صدیوں کی مسافت طے کر کے کسی ایک جگہ پہنچتے ہیں اور بارود کا ایک دھماکا ہمارے خوابوں کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ ہم پھر سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ جس نئی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اس نئی امت یہ کام کر رہی ہے۔“

”اسی بات کا تو افسوس ہے بھابی۔“ داور حیات نے ایک گہری سانس لی۔

”تم نے کہیں رپورٹ کروائی؟“ امجد خان نے پوچھا۔ پھر اسے اپنے اس احمقانہ سوال پر خود بھی شرم سی آ گئی تھی۔ اب تک سیکڑوں اسکول تباہ ہو چکے تھے سیکڑوں قبریں تیار ہو چکی تھیں۔ سیکڑوں رپورٹس لکھی جا چکی تھیں۔ لیکن فائدہ کیا ہوا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔

”بھابی اور بچوں کا کیا حال ہے۔“ امجد نے پوچھا۔

”دردانہ نے تو خود کو سنبھال لیا ہے۔“ داور حیات نے بتایا۔ ”لیکن بچوں کا برا حال ہے۔ وہ اسی اسکول میں پڑھتے تھے جس کو تباہ کر دیا گیا ہے۔“

”افسوس ہوا سن کر۔“ نرگس نے کہا۔

”مجھے ان کے آنے والے دنوں کی فکر ہے۔ ان کا کیا ہو گا؟ ابھی تو وہ ذہنی مریض سے ہو گئے ہیں ان کو چپ سی لگ گئی ہے۔ ظاہر ہے انسان کو ان دیواروں اور چھتوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے جن کے درمیان وہ کچھ وقت گزار چکا ہوتا ہے۔“

”میں آپ کو ایک مشورہ دوں بھائی۔“ نرگس نے کہا۔

”ضرور دیں۔ میں ان ہی مشوروں کی تلاش میں تو یہاں آیا ہوں۔“

”آپ اپنے دونوں بچوں کو ہمارے یہاں لے آئیں۔“ نرگس نے کہا۔ ”جہاں ہمارے دو بچے ہیں وہاں آپ کے بھی آ جائیں گے۔“

”آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی بھابی۔“ داور حیات خوش ہو کر بولا۔ ”میں بھی یہی درخواست لے کر آیا تھا آپ کے یہاں ان کی پڑھائی بھی ہو جائے گی۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ”بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کر دو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کر دیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول آڑا دیا گیا۔“



وہ اپنی پرانی گاڑی میں بڑی بڑی بور یوں میں مال لایا کرتا تھا۔

مال کی بوریاں اندر اسٹور میں پہنچا دی جاتیں۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ ان بور یوں کو ستم گر خان اور باز خان کے علاوہ کوئی اور ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ کسی کو اجازت نہیں تھی۔ جب بوریاں اندر اسٹور میں پہنچ جاتیں تو ستم گر خان دروازے پر ایک موٹا سا تالا لگا دیا کرتا اور جب کینٹین میں کسی چیز کی کمی ہو جاتی تو وہ خود ہی اندر جا کر مطلوبہ سامان لے آتا تھا۔ اس معاملے میں بھی کسی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اندر اسٹور سے سامان لے کر آئے۔

ایک دن باز خان نے نصیب خان سے کہا۔ ”یارا! اس لڑکے کو ہمارے حوالے کر دے۔ تیرے پاس اس کا کام ختم ہو گیا ہے۔“

گل زمان اس وقت ان دونوں کے پاس ہی کھڑا تھا۔

”باز خان! تو کیا کرے گا اس کو لے جا کر؟“ ستم گر نے پوچھا۔

”کرنا کیا ہے یارا، بس اس کو شہزادہ بنا کر رکھے گا۔ ہمارے پاس راج کرے گا۔“

”نہیں۔“ گل زمان اچانک بھڑک اٹھا۔ ”مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں ادھر ہی رہوں گا۔“

”تجھ کو یہاں سے دگنے پیسے دوں گا۔“ باز خان نے کہا۔

”نہیں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میری پڑھائی ختم ہو جائے گی۔“

”پڑھائی۔“ باز خان چونک اٹھا۔ اس نے ستم خان کی طرف دیکھا۔ ”یارا! یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیسی پڑھائی؟ کیا اس نے اسکول میں داخلہ لے لیا ہے؟“

”نہیں، داخلہ تو نہیں لیا لیکن ایک ٹیچر اسے روز پڑھاتی ہے۔“ ستم

”اچھا، کون ہے وہ ٹیچر؟“ ستم خان نے بتایا۔

”ستم خان نے ادھر ادھر گردن کھائی۔ اسے زگس اپنے مخصوص درخت کے چبوترے پر بیٹھی ہوئی دکھائی دے گئی۔

اس کے پاس دو تین بچے بھی تھے۔ جن کو شاید وہ کچھ سمجھا رہی تھی۔

”وہ سامنے بیٹھی ہے؟“ ستم خان نے اشارہ کیا۔

”میں اس سے بات کر لوں؟“

”کیوں، تم کیوں بات کر دے؟“ گل زمان نے

”ارسلان اور فرحان کے اسکول میں تو داخلے بند ہو چکے ہیں۔“ زگس نے بتایا۔ ”لیکن میں آپ کے دونوں بچوں کو اپنے اسکول میں کر داسکتی ہوں۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہو گا۔ کیونکہ آپ کے اسکول کی پورے پاکستان میں بہت اچھی شہرت ہے۔“

”تو پھر ملے ہو گیا کہ تمہارے بچے بھی ہمارے بچوں کے ساتھ رہیں گے۔“ امجد نے کہا۔

”بس مجھے اطمینان ہو گیا۔“ داور حیات نے ایک گہری سانس لی۔ ”اب میں اپنی جدوجہد اور تیز کردوں گا۔“

”کیا مطلب؟“ زگس نے اس کی طرف دیکھا۔

”بھائی! اصل کہانی تو یہی ہے۔ اسکولوں کو نقصان پہنچانا ان کا مقصد نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد ہماری ہمت اور ہمارے حوصلے کو توڑنا ہے اور میں نے اپنے آپ سے اور اپنے خدا سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ کم از کم اس جذبے کو تو ٹھنڈا نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے وہ کتنی ہی دیواریں گرا دیں۔“

☆☆☆

گل زمان کی زندگی میں نئی اور خوش گوار تبدیلی آچکی تھی۔

کینٹین کے مالک نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ ٹیچر زگس کے پاس جا کر پڑھ لیا کرے۔ لیکن یہ اجازت صرف ایک گھنٹے کی تھی۔

گل زمان کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ زگس نے اسے دو تین کتابیں بھی لا کر دے دی تھیں۔ وہ گھر آ کر بھی ان کو پڑھتا رہتا۔

پچھلے کچھ دنوں سے وہ ایک آدمی کی وجہ سے بہت پریشان ہو رہا تھا۔ اس آدمی کا نام باز خان تھا۔ قوی بیکل چالیس اور پچاس کے درمیان۔ جس کی آنکھوں میں بلا کی پھرتی تھی۔ کسی چالاک پرندے کی آنکھوں کی طرح۔ اس کے دیدے ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے۔

پچھلے کچھ دنوں سے وہی کینٹین میں مال کی سپلائی کیا کرتا تھا۔ اس مال میں سموسوں کے علاوہ سب کچھ ہوتا۔ آلو

چپس کے پیکنگز، بسکٹ، ٹافیاں اور چاکلیٹ وغیرہ۔ اس کینٹین میں جو پرانا آدمی مال سپلائی کیا کرتا تھا وہ اب دکھائی نہیں دیتا تھا۔

نیا آدمی گل زمان کو شروع ہی سے پسند نہیں تھا۔ وہ کچھ عجیب نگاہوں سے گل زمان کو دیکھا کرتا تھا۔ گل زمان کو اس سے وحشت محسوس ہوا کرتی۔

جاسوسی ڈائجسٹ

207

جولائی 2015ء

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



پوچھا۔ ”یہ میرا معاملہ ہے۔ مجھے نہیں جانا تمہارے ساتھ۔“  
 ”اچھا، اچھا، ناراض نہ ہو۔“ باز خان نے اس کے  
 گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”سب ٹھیک کر دوں گا، جا  
 اپنا کام کر۔“

گل زمان ان بچوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو کینٹین  
 سے کھانے پینے کی چیزیں خریدنے آئے ہوئے تھے۔  
 اس دوپہر کو چھٹی کے بعد جب گل زمان نرگس کے  
 پاس اپنا ہوم ورک لے کر پہنچا تو اس نے نرگس کو بتا دیا۔  
 ”بس (اب وہ اسکول کے دوسروں بچوں کی طرح ٹیچرز کو  
 مس کہنے لگا تھا) مس، ایک آدمی مجھے اپنے ساتھ لے جا رہا  
 تھا۔“

”ساتھ لے جا رہا تھا۔“ نرگس چونک پڑی۔ ”کہاں  
 ساتھ لے جا رہا تھا۔ کون ہے وہ آدمی؟“  
 ”مس، وہ کینٹین میں سہلائی لے کر آتا ہے۔“ گل  
 زمان نے بتایا۔ ”وہ کہہ رہا تھا میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں  
 دگنے پیسے دوں گا لیکن میں نے منع کر دیا۔“

”کیا کہا تم نے؟“  
 ”میں نے کہا مجھے پڑھائی کرنی ہے۔ میں میڈم سے  
 کتابیں پڑھتا ہوں۔“  
 ”بہت اچھا کیا تم نے۔“ نرگس نے شاباش دی۔  
 ”تمہارا اصل کام اب علم حاصل کرنا ہے۔“  
 ”بات یہ ہے مس کہ وہ اچھا آدمی نہیں لگتا۔“ گل  
 زمان نے بتایا۔ ”وہ آپ کو بھی بہت غصے سے دیکھ رہا تھا کہ  
 آپ مجھے کیوں پڑھائی ہیں۔“  
 ”ہاں، بد قسمتی سے ہمارے یہاں بہت سے لوگ  
 ایسے ہی ہیں۔“ نرگس نے کہا۔ ”چلو، تم اپنا ہوم ورک  
 دکھاؤ کیا کر کے لائے ہو۔“

اس دوران اسٹاف روم میں جنید اور نوید بھی آگئے  
 تھے۔ یہ دونوں داور حیات کے بیٹے تھے۔ نرگس نے انہیں  
 اپنے ہی اسکول میں ایڈمیشن دلا دیا تھا۔  
 یہ پڑھائی ایک گھنٹے تک چلتی رہی۔ پڑھائی ختم  
 ہونے کے بعد نرگس نے ستم خان کو بلوایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس  
 نے کینٹین کے مالک سے کوئی بات کی تھی۔

”تم خان بڑے ادب سے اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔  
 ”جی میڈم! کیا آپ کو کینٹین سے کوئی شکایت ہو گئی ہے؟“  
 اس نے پوچھا۔ ”آپ تو جانتی ہیں کہ میں چیزوں کی کوالٹی  
 پر کتنا دھیان رکھتا ہوں۔“

”نہیں، ستم خان! بات کچھ اور ہے۔“ نرگس نے

کہا۔ ”مجھے یہ پتا چلا تھا کہ تمہارے پاس کوئی آدمی آیا تھا۔  
 وہ گل زمان کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کر رہا تھا۔“  
 ”ارے وہ؟“ ستم خان ہنس پڑا۔ ”میڈم! وہ تو سہلائی  
 والا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ گل زمان اس کے پاس چلے، وہ  
 اسے دگنے پیسے دینے کی بات کر رہا تھا لیکن خود گل زمان نے  
 انکار کر دیا۔“

”بس، تو اس قصے کو یہیں ختم کر دینا۔ گل زمان ذہین  
 لڑکا ہے۔ میں اسے پڑھا رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ  
 آگے جا کر کوئی اور کام کرے۔“  
 ”یس میڈم! اطمینان رکھیں۔ اسے اس کی مرضی کے  
 بغیر کہیں نہیں بھیجا جائے گا۔“

”اب تم جا سکتے ہو اور ہاں اس کا خیال رکھنا۔“  
 ستم خان نرگس کے پاس سے کینٹین کی طرف واپس  
 آ گیا۔ گل زمان بچوں کو سامان دینے میں مصروف تھا۔ گل  
 زمان کو دیکھ کر ستم خان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ ایک  
 خوشخوار سا تاثر اس کے چہرے پر ابھر آیا تھا۔  
 پھر اس نے اپنے تاثرات ٹھیک کیے اور گل زمان  
 کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ”گل زمان۔“ اس نے نرم لہجے  
 میں مخاطب کیا۔

”جی صاحب۔“ گل زمان نے اس کی طرف  
 دیکھا۔

”تم نے باز خان کے بارے میں میڈم کو کیا بتایا  
 تھا؟“

”کوئی خاص نہیں، میں نے ان سے صرف یہ کہا تھا  
 کہ مجھے کسی کے ساتھ نہیں جانا۔ کیونکہ میں چلا گیا تو میری  
 پڑھائی ختم ہو جائے گی۔“ گل زمان نے بتایا۔  
 ”تو تمہیں پڑھنے کا بہت شوق ہو گیا ہے؟“

”جی صاحب، مجھے کتابیں بہت اچھی لگتی ہیں۔“ گل  
 زمان نے کہا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ ستم خان نے اس کے  
 شانے پر ہتھکی دی۔ ”تم پڑھتے رہو، تمہیں کوئی نہیں لے  
 جائے گا۔“

گل زمان کو پہلی بار ستم خان اچھا لگا تھا۔  
 اس دوپہر کو باز خان سہلائی کا سامان لے کر آیا تو اس  
 نے گل زمان سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے بس ایک بار  
 اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھر ستم خان سے بات کرنے میں مصروف  
 ہو گیا۔

اس دن سہلائی کی دو بوریاں آئی تھیں۔ یہ دونوں



استور روم کے دروازے کی طرف لپکا اور اسی وقت دروازہ کھول کر وہ دونوں اندر آ گئے۔ گل زمان اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

ان دونوں نے اکبر خان کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ رائفل کی ٹریننگ، بم استعمال کرنے کے طریقے۔ گوریلا وار۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ اکبر خان کو یہ جان کر حیرت ہوتی تھی کہ اس کے علاوہ اور بھی کئی لڑکے تھے جن کو اس قسم کی ٹریننگ دی جا رہی تھی۔

وہ اس سے کہا کرتے۔ ”دیکھو اکبر خان، کیا اس دنیا پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے؟ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارے پاس بھی اپنی گاڑی ہو، دولت ہو، اپنا گھر ہو، اپنی زندگی ہو؟“

”کیوں نہیں چاہتا لیکن مجبوری ہی تو ہے۔“

”یہ مجبوری صرف اس لیے ہے اکبر خان کہ ہم جیسوں نے اپنی ہار مان لی ہے۔“ بخت آور خان کہا کرتا۔ ”انہوں نے میرا اور تمہارا حق چھین لیا ہے۔ یہ کافر لوگ ہیں۔ گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ عورتیں بیوٹی پارلز میں جاتی ہیں۔ کلب میں جاتی ہیں۔ لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ اسکولوں میں جا کر پڑھتے ہیں۔ فلمیں اور ٹی وی دیکھتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟“

”آپ بتائیں۔“

”یہ سب تباہی کی نشانیاں ہیں۔ خدا کا قہر آنے والا ہے اور خدا ان لوگوں سے خوش ہوگا جو ایسے لوگوں کو سزا دیں گے۔ ان کو جہنم واصل کر دیں گے، سمجھ گئے۔“

اکبر خان کی سمجھ میں کچھ باتیں آتی تھیں، کچھ بالکل بھی نہیں آتی تھیں۔ اس کے علاوہ جو دوسرے لڑکے تھے، وہ کہیں اور سے آتے اور کسی اور طرف چلے جاتے۔

اس جگہ بہت سخت اصول تھے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کرے گا۔ اپنے کام سے کام کرے گا۔ اس کے علاوہ کوئی کسی کو اصلی نام سے نہیں پکارے گا۔

اس کیمپ میں بخت آور خان کو طوفان کہا جاتا۔ شہباز خان بارود تھا۔ اکبر خان کو کبوتر کہا جاتا تھا۔ اس قسم کے نام تھے۔

کچھ لوگ آتے اور ان کے لیے کھانے پینے کی بنیادی چیزیں دے جاتے۔ یہ آنے والے بھی بہت پراسرار قسم کے لوگ تھے۔

اکبر خان کو نہیں معلوم ہو پاتا کہ یہ کون لوگ ہیں۔

بوریاں ابھی احمد راسٹور میں نہیں پہنچائی گئی تھیں۔ باز اور ستم کچھ باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ اسی وقت باز خان کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ گل زمان ان دونوں سے کچھ فاصلے پر تھا لیکن اس نے محسوس کر لیا تھا کہ فون سن کر وہ۔۔۔ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے ستم خان سے کچھ کہا اور دونوں کسی سے کچھ کہے بغیر سپلائی لانے والی گاڑی کی طرف دوڑ پڑے۔ شاید دوسری طرف سے کوئی اہم ہی خبر سننے کو ملی تھی۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ سپلائی کی بوریاں باہر ہی رہ گئی ہوں۔ کینٹین کے دوسرے ملازم گاہکوں کے ساتھ مصروف تھے۔ گل زمان نے ایک بوری کو کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ اسے استور میں رکھنا چاہتا تھا۔

استور میں داخل ہو کر گل زمان نے بوری کو ایک کونے میں پہنچانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں نہ جانے کس طرح بوری کا منہ کھل گیا۔

چاکلیٹ، بسکٹوں کے پیکٹس کے ساتھ ساتھ بے شمار گولیاں بھی بوری سے نکل کر ادھر ادھر بکھر گئی تھیں۔ گل زمان نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی، اس ماحول میں بند قوتوں کی گولیاں اس کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کینٹین کے سامان میں ان گولیوں کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی نہ کوئی خطرناک بات ضرور تھی۔

اس نے بوری کو اچھی طرح دیکھا۔ گولیوں کے علاوہ اس میں دو عدد دکلاشن کوف بھی تھیں۔

گل زمان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے۔ کیا ہو رہا تھا یہ سب؟ یہ تو بہت خطرناک بات تھی۔ کسی اسکول میں ایسے اسلحے کا کیا کام ہو سکتا تھا۔

استور میں اور بھی کئی بوریاں تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ ان میں بھی کچھ نہ کچھ بھرا ہوا ہو۔ کیا کرنا چاہیے اسے۔ خاموش رہے یا کسی کو بتادے لیکن کو کس بتائے؟

اس کی سمجھ میں یہ بات تو آ گئی تھی کہ یہ اسلحہ یونہی نہیں لایا گیا ہے۔ کوئی نہ کوئی خطرناک بات ضرور ہے۔ یہ اسکول تو بہت اچھا تھا۔ یہاں کے سب لوگ اس کے ساتھ بہت پیار اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ خاص طور پر وہ نرگس میڈم، جو اسے پوری محنت اور خلوص کے ساتھ تعلیم دے رہی تھیں۔ حالانکہ گل زمان سے ان کا کیا تعلق تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کے باوجود وہ اس کے ساتھ اتنی مہربانی سے پیش آتیں۔ گل زمان کے لیے کتابیں بھی خود ہی لے کر آتی تھیں۔ وہ میڈم کو بتادے گا۔

ہاں، وہ صرف میڈم ہی کو بتا سکتا تھا۔ وہ جلدی سے



کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں۔ اتنا ضرور تھا کہ اس کیمپ میں اکبر خان کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔

اس کے کھانے پینے کا بہت خیال رکھا جاتا۔ اس کے لیے نئے جوڑے اور جوتے لائے گئے تھے۔ اس اڈے کے ایک کمرے میں ایک بڑا ساٹی وی سیٹ بھی تھا۔ ان لوگوں نے بجلی کا بھی بہت اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ ڈی وی ڈی پلیئر کے ذریعے فلمیں بھی دکھائی جاتیں۔ عام طور پر بھارتی فلمیں ہوا کرتیں۔ کبھی کبھی انگلش فلمیں بھی دکھاتے تھے۔ اس کے اپنے گھر میں تو ایسی آزادی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ وہاں تو ہر وقت باپ کے خوف اور اس کے ظلم کا سایہ منڈلاتا رہتا تھا۔

اس دوپہر کو وہ دونوں کیمپ سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ انہیں اب اکبر خان پر اتنا بھروسہ ہو گیا تھا کہ وہ اکثر اسے چھوڑ کر۔۔۔ دو تین دنوں کے لیے چلے جاتے۔

اس دوران میں اکبر خان اپنی مرضی کی زندگی گزارتا۔ فلمیں دیکھتا۔ پہاڑیوں میں بھٹکتا رہتا۔ کھانے پینے کا بھی کوئی پرالیم نہیں تھا اس کے ساتھ۔ وہاں سب کچھ تھا۔

اس نے ایک دو بار اپنے گھر جانے کا ارادہ بھی کیا تھا صرف ماں سے ملنے۔ یہ دیکھنے کہ وہ بے چاری اب کس حال میں زندگی گزار رہی ہیں۔ باپ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کے لیے ماں ہی سب کچھ تھی لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ جس گھر سے کوئی رشتہ ہی نہیں رہا ہے، اس گھر سے اب کیا لینا دینا۔

وہ دونوں دوسرے دن آنے کا کہہ کر گئے تھے۔ کہاں گئے تھے؟ کیوں گئے تھے۔ اکبر خان کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

اسے رات بھی تنہا گزارنی پڑی تھی۔ شروع شروع میں جب ایک بار وہ دونوں باہر گئے تو اس رات اکبر خان کو بے حد خوف محسوس ہوا تھا۔ اس ویران اور پراسرار مقام پر وہ بالکل تنہا تھا۔

وہ ساری رات خوف سے سو نہیں سکا تھا۔ پہاڑوں کے درمیان چکرانے والی ہوائیں اسے روحوں کی چیخوں کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ رات خیریت سے گزر گئی تھی۔

اس کے بعد اکبر خان کو پھر کبھی خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ دونوں اکثر غائب ہو جاتے اور اکبر خان وہاں تنہا رہ جاتا۔

اس رات بھی اکبر خان تنہا ہی تھا۔ جب اس نے ایک عجیب سی چیز دیکھی۔ حالانکہ وہ بہت دنوں سے یہاں رہ رہا تھا لیکن اس صورت پر اس کی نظر پہلی بار گئی تھی۔

یہ ایک ایسی صورت تھی جس میں ایک ایسا انسان تھا جس کی سوئڈ ہاتھی کی تھی۔ اور بقیہ دھڑا انسانوں جیسا تھا۔ اکبر خان کو یاد آیا۔ یہاں جو بھارتی فلمیں دیکھنے کو ملتی ہیں ان میں بھی ایسی ہی صورت ہوتی ہے اور لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اس کو کنیش مہاراج کہتے ہیں۔ کن ہتی بابا کہتے ہیں لیکن وہ تو ہندو لوگ ہوتے ہیں۔ پھر یہ صورت ان دونوں کے پاس کیوں ہے؟

یہ راز اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ ان دونوں سے اس صورت کے بارے میں ضرور معلوم کرے گا۔

وہ دونوں دوسرے دن آئے۔ ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ آنے والے لوگوں کے چہروں سے وحشت ظاہر ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے الجھے ہوئے بال، بے ترتیب داڑھیاں۔

سب کے سب کمرابند کر کے بیٹھ گئے۔ اندر شاید کوئی میٹنگ ہو رہی تھی۔ جو بہت دیر تک چلتی رہی تھی۔ اکبر خان کے ذہن میں جو سوال تھا، وہ پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔

بخت آور خان نے اکبر خان کو بھی اسی کمرے میں بلا لیا تھا۔ اکبر خان کو بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ اتنے لوگ یہاں کیوں جمع ہوئے تھے۔

”اکبر خان۔“ شہباز خان نے اسے مخاطب کیا۔ ”کل صبح ان مہمانوں کے ساتھ تمہیں جانا ہے۔“ شہباز خان نے وحشت زدہ لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

”کہاں جانا ہے بھائی؟“ وہ ان دونوں کو بھائی کہا کرتا تھا۔

”ایک خاص کام سے جانا ہے۔ ان لوگوں کو سزا دینی ہے جو راستوں سے بھٹک گئے ہیں۔ یاد رکھو، جب ہم کوئی بڑا کام کرنے لگتے ہیں تو اس وقت ہمیں کسی سے ہمدردی نہیں کرنی ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، بچے سب برابر ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب برائیاں پھیلارہے ہیں۔ برائیاں پھیلانے والوں کو شروع ہی میں سزا دے دی جائے تو پھر آگے چل کر بھلائی ہی بھلائی ہوتی ہے۔ خدا بھی خوش ہوتا ہے کہ ہم نے بھلائی کے راستے کے کانٹے ہٹا دیے ہیں۔“



”کہو اکبر خان، تم تیار ہو؟“ بخت آور نے پوچھا۔

”لیکن بھائی، مجھے کرنا کیا ہوگا؟“

”تم اکیلے نہیں ہو گے۔ یہ خدا کے خاص بندے بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔“ شہباز خان نے ان وحشت زدہ لوگوں کی طرف اشارہ کیا جو سپاٹ چہروں کے سپاٹ تاثرات کے ساتھ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ دونوں بھی گل زمان کو اسٹور میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”تو یہاں کیوں آیا تھا؟“ ستم کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

”وہ، وہ آپ نے بوریاں باہر رکھ دی تھیں نا، تو ان کو اندر لے کر آیا تھا۔“ گل زمان نے بتایا۔

”تجھے منع کیا تھا نا۔“ ستم نے کہا۔

”ستم خان۔“ باز خان نے مداخلت کی۔ ”جانے دو بچہ ہے۔ غلطی ہو گئی ہوگی۔“

”جی، جی صاحب، غلطی ہو گئی تھی۔“ گل زمان جلدی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں۔“ باز خان نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہتھکی دی۔ ”بس آئندہ سے خیال رکھنا۔“

”جی صاحب۔“

اور اچانک باز خان نے اپنے موٹے، کھردرے اور مضبوط ہاتھوں سے گل زمان کا منہ دبا دیا، گل زمان نے خود کو چھڑانا چاہا لیکن اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

اس دوران ستم نے باز خان کا اشارہ سمجھ کر گل زمان کے گلے میں رسی ڈال کر بل دینا شروع کر دیا۔

گل زمان پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ ذرا سی دیر میں اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ وہ پھڑپھڑاتا ہوا ایک طرف گر پڑا۔ اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔

وہ دونوں کچھ دیر تک اس کی لاش کی طرف دیکھتے رہے پھر ستم نے کہا۔ ”یارا! ہم نے کہیں غلطی تو نہیں کر دی۔“

”نہیں یارا، ہم نے بالکل صحیح وقت پر یہ کام کیا ہے۔“ باز خان نے کہا۔ ”یہ لڑکا سب کچھ دیکھ چکا تھا۔ یہ جا کر اسکول والوں کو بتا دیتا۔ پھر ہمارا سارا پروگرام تباہ ہو جاتا۔“

”سوال یہ ہے کہ اس کی لاش کا کیا کیا جائے؟“

”کچھ نہیں۔ اس کو یونہی پڑا رہنے دو۔ ایک دن کی تو بات ہے، گل تو ہمارے ساتھیوں کو اپنا کام کر لینا ہے۔“

صرف ایک رات بیچ میں ہے۔ اس کے بعد پوری دنیا میں ہنگامہ مچ جائے گا۔“

ستم کچھ نہیں بولا۔ وہ گل زمان کی لاش کی طرف دیکھتا رہا۔

☆☆☆

اس رات زگس اور امجد کے ڈرائنگ روم میں ایک اہم موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔

اس گفتگو میں حصہ لینے والوں میں مقامی یونیورسٹی کے دو پروفیسرز کمال حسین اور امتیاز خان بھی تھے۔ یہ دونوں دردمند دل رکھنے والے پاکستانی اور اسلامی تہذیب کے غلبے کا خواب دیکھنے والے مسلمان تھے۔

پروفیسر کمال حسین کہہ رہا تھا۔ ”ہمیں جذباتی نعروں کے بجائے یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم اپنے اسلامی معاشرے کو کن بنیادوں پر استوار کر سکتے ہیں۔ معجزات کا دور ختم ہو گیا۔ ہم نعرہ بکبیر لگا کر توپ کے سامنے نہیں کھڑے ہو سکتے۔ کیونکہ توپ ایک ٹھوس اور غیر جانبدار حقیقت ہے۔ اسے اپنا کام کرنا ہے اور وہ اپنا کام کر کے رہے گی۔“

”آپ درست کہتے ہیں۔ ہمیں حقائق کا سامنا حقائق ہی سے کرنا ہوگا۔“

”آپ کے خیال میں کسی اور پر اثر انداز ہونے کے لیے کس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہے؟“ زگس نے پوچھا۔

”دیکھیں اس وقت پوری دنیا میں مغرب نے جس قسم کی قوتیں حاصل کی ہیں ان کے کئی پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر۔“

1- بین الاقوامی بینکنگ سسٹم کی مالک ہیں۔

2- تمام مضبوط کرنسیوں کو کنٹرول کرتی ہیں۔

3- بڑے عالمی خریداروں میں شامل ہیں۔

4- دنیا میں سب سے زیادہ تیاراشیا فراہم کرتی ہیں۔

5- سرمائے کی بین الاقوامی منڈیوں پر غلبہ رکھتی ہیں۔

6- بہت سے معاشروں میں نمایاں اخلاقی قیادت حاصل کرنے کے لیے کوششیں کر رہی ہیں۔

7- بڑے پیمانے پر عسکری مداخلت کی اہلیت رکھتی ہیں۔

8- بحری گزرگاہوں پر قابض ہیں۔

9- انتہائی اعلیٰ تحقیق کا اہتمام کرتی ہیں اور اس حوالے سے بے حد ارتقاء پا چکی ہیں۔

10- جدید ٹیکنیکل تعلیم کے شعبے میں رہنما کردار کی حامل ہیں۔

11- خلا تک رسائی پانے کے حوالے سے برتر ہیں۔



12- خلائی جہازوں کو تیار کرنے کی صنعت میں برتر

ہیں۔

13- بین الاقوامی ذرائع مواصلات کے حوالے سے

برتر ہیں۔

14- ہائی ٹیک ہتھیار بنانے کی صنعت میں برتر ہیں۔

اس کے علاوہ ان کے یہاں عمل اور قول میں تضاد بھی نہیں پایا جاتا جبکہ ہماری صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم نے تعلیم کو تعبیر ممنوعہ سمجھ لیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ خدا ہماری مدد کے لیے فرشتے آسمان سے اتار دے گا، ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔“

کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ بہت ہی سچا تجزیہ تھا لیکن بہت تلخ۔

”تو پھر اس کا تدارک کیسے ہو؟“ امتیاز خان نے پوچھا۔

”سیدھی سی بات ہے علم۔“ کمال حسین نے کہا۔ ”اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہم اپنی ثقافت اور تہذیب کی حد میں رہتے ہوئے بھی علم حاصل کر کے بہت آگے جاسکتے ہیں۔ فرانس اور جرمنی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔“

”لیکن ہم تو راستے بند کیے جا رہے ہیں۔“ امتیاز خان کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”اسی بات کا تو افسوس ہے کہ ہمارے یہاں سیاست داں تو بہت پیدا ہو رہے ہیں، لیڈر کوئی نہیں ہے اور ان دونوں کے درمیان بہت واضح فرق ہے۔ سیاست داں اگلے الیکشن تک کا ویزا رکھتا ہے جبکہ لیڈر کا ویزا اگلی کئی نسلوں تک محیط ہوتا ہے۔“

”پروفیسر ایک بات بتائیں۔ یہ جو ہمارے ملک میں تشدد کا سلسلہ چل رہا ہے، اس کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں۔“ نرگس خان نے پوچھا۔

اس کی کئی وجوہات ہیں میڈم۔“ پروفیسر کمال مسکرا کر بولا۔ ”اور آپ بھی جانتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو بیرونی سازشیں ہیں، آپ کا کیا خیال ہے کہ جو لوگ یہاں اس قسم کی حرکتیں کر رہے ہیں، ان کی لگا میں خود ان کے اپنے ہاتھوں میں ہیں؟ نہیں، یہ ڈوریاں کہیں اور سے ہلائی جا رہی ہیں۔ ریوٹ کسی اور کے ہاتھوں میں ہیں۔ پیسے اور ہتھیار باہر سے آرہے ہیں۔ ان کی باتوں میں آنے والے تو سیدھے سادے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بہت پڑھے لکھے لوگوں کو ہماری طرف بھیج رہے ہیں۔ انہیں قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ احادیث کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے حقیقی

مسائل بتائے جاتے ہیں۔ ہر قسم کے کیل کانٹے سے لیس کر کے انہیں ہماری طرف بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ بے چارے سیدھے سادے لوگ ان کو اپنا رہنما سمجھ کر ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ ان کے ٹرانس میں آ جاتے ہیں پھر وہی کرتے ہیں جو ان سے کہا جاتا ہے۔“

”سوال پھر وہی ہے کہ علاج کیا ہو؟“ امتیاز خان نے پوچھا۔

”وہی کہ انہیں قومی دھارے میں شامل کر لیں۔ ان بے چاروں کو یہ بتایا گیا ہے کہ جن کی ثقافت اور دین نہیں، تم سے الگ ہیں۔ وہ کافر لوگ ہیں۔ اب انہیں یہ بتانے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ثقافتوں کا اختلاف تو خوب صورت ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہیں پروفیسر۔“ امجد خان نے گردن ہلائی۔ ”جس طرح ایک چمن میں مختلف رنگوں کے پھول ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے الگ الگ لیکن ہوتے اسی چمن کا حصہ ہیں۔“

”ہاں، ہمیں یہی بات انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔ کل عالم اسلام کے چمن میں مختلف ثقافتوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ کوئی ٹوپی پہنتا ہے، کوئی پگڑی باندھتا ہے، کسی کا لباس شلوار ہے۔ کسی نے پینٹ پہن رکھی ہے۔ ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ سب ایک خدا اور ایک رسول کو مانتے ہیں یا نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر ہم نسل کے ساحل سے لے کر تاب خاک کا شجر ایک ہو جائیں گے۔“

نرگس ان لوگوں کے لیے دوبارہ چائے بنانے کچن میں چلی گئی تھی۔ آج کی نشست نے بہت سے سوال سامنے کھڑے کر دیے تھے۔

مسئلہ تو سامنے تھا لیکن سوال یہ تھا کہ یہ سب کیسے ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی قوم نے لیڈر نہیں بنایا بلکہ ایک بڑا لیڈر بڑی قوم بناتا ہے۔ اب ایسا لیڈر کہاں سے آنے والا ہے۔

☆☆☆

صبح ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھی۔

موسم سرما آچکا تھا۔ ہر طرف ایک خنک آمیز دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اس دھند کی چادر میں لپٹے ہوئے لوگ اپنے اپنے کاموں کی طرف جا رہے تھے۔

اسکول جانے والے بچے، بستے اٹھائے گرم کپڑوں میں لپٹے، منہ سے بھاپ اڑاتے اپنے اپنے اسکولوں کی طرف جا رہے تھے۔



سب کچھ معمول کے مطابق تھا لیکن ایک خلافت معمول بات یہ تھی کہ سہلا کی والا باز خان وقت سے بہت پہلے سہلا کی لے کر آ گیا تھا۔ اس کا آنا جانا چونکہ روزمرہ کی بات تھی اسی لیے اس پر دھیان نہیں دیا گیا تھا۔

دھوپ میں ہوم ورک مکمل کرنے والے بچوں کے لیے یہ بہت حیرت کی بات تھی کہ چھ سات انکل کینٹین کی دیوار کے اندر سے باہر آ گئے تھے۔

دونوں کو کچھ خوف بھی محسوس ہوا تھا۔ انہوں نے کلاس روم کی طرف جانے کے لیے اپنی کتابیں سمیٹ لی تھیں کہ اسی وقت ان انکلوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کیں۔ تڑتڑ کی آواز آئی اور بے رحم گولیوں نے ان محصوموں کو خون میں نہلا دیا۔ ان کی کاپیاں اور کتابیں بھی رگیں ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد ایک قیامت مچ گئی۔

گولیوں کی آواز سن کر بچے اور نیچرڈ باہر آ گئے تھے پھر ان پر قیامت نازل ہو گئی۔ ان وحشت زدہ لوگوں نے بے دریغ گولیاں برسانی شروع کر دی تھیں۔

بچے چیختے رہے، تڑپتے رہے۔ نرگس خان نے باہر سکتے کے عالم میں کھڑے ہوئے بچوں کو سمیٹ کر اندر کی طرف جانا چاہا کہ کینٹین کا مالک ستم اور باز خان اس کے سامنے آ گئے۔

اس سے پہلے کہ نرگس خان اپنے بچاؤ میں کچھ کر سکتی، کئی گولیاں اس کے بدن میں پیوست ہو چکی تھیں اور دم توڑتے ہوئے وہ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ کیا پڑھنا اور سوچنا جرم ہے۔

جب اس کی گردن ڈھلکی تو اس وقت ایک طرف سے ایک وحشت زدہ نوجوان اس کی لاش کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت حیرت اور دکھ سے نرگس کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹ کانپے۔ وہ لاش کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ رو دیا تھا۔

”ماں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”ماں! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارے احسان کا بدلہ ادا نہیں کر سکا تھا۔“ وہ اکبر خان تھا۔ ایک کانپتا ہوا نوجوان لڑکا جو نرگس کے گھر کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا تھا اور نرگس نے اسے کھانے کے لیے کچھ دینے کے ساتھ پانچ سو کا ایک نوٹ بھی دیا تھا۔

اکبر خان کچھ دیر تک روتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لباس کے اندر پہنے ہوئے جیکٹ کی پن کھینچ لی اور ایک زوردار دھماکے کی آواز گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں شامل ہو گئی۔

دفتروں کی طرف جانے والے اپنی گاڑیوں، موٹر سائیکلوں اور پبلک ٹرانسپورٹ پر سوار تھے۔ مزدوروں نے اس چورائے کا رخ کیا تھا جہاں سے انہیں روزگار مل جاتا تھا۔ زندگی رواں دواں ہو چکی تھی۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ اس شہر میں دکانیں بہت سویرے فجر کی نماز کے بعد ہی کھل جایا کرتیں اور کاروبار شروع ہو جاتا تھا۔

چائے خانے بھرے ہوئے تھے۔ آس پاس کے دکانداروں اور راہ چلتے مسافروں نے چائے کی چٹکیاں لینا شروع کر دی تھیں۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا لیکن نہیں، معمول کے مطابق ہی تو نہیں تھا۔

وہ ایک کچی کوٹھری تھی۔ بہت بڑی۔ اس کوٹھری کی دیوار اسکول کی دیوار سے ملی ہوئی تھی۔ اس کوٹھری میں اس وقت سات آٹھ آدمی جمع تھے۔

یہ وحشت زدہ چہروں کے لوگ تھے۔ جن کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور جن کے بھاری لبادوں کے نیچے بھاری ہتھیار تھے۔

ان میں سے ایک نے کوٹھری میں رکھا ہوا ایک بڑا سا برما اٹھایا اور دیوار میں سوراخ کرنے لگا۔ یہ ایک جدید انداز کا برما تھا۔ ہلکی سی گھر گھر کی آواز کے ساتھ دیوار کی ایک اینٹ ٹوٹ کر نیچے گر پڑی تھی۔

گل زمان کا پریشان حال باپ اتنے سویرے بھی اسکول کے گیٹ پر کھڑا ہوا آنے جانے والے بچوں سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ گل زمان کل سے گھر نہیں آیا تھا۔ وہ اسکول آ کر کینٹین کے مالک سے بھی ملا تھا۔ لیکن اس نے بتایا تھا کہ گل زمان اپنا کام ختم کر کے ہمیشہ کی طرح گھر کی طرف چلا گیا تھا۔

گل زمان کا باپ اسی لیے صبح سویرے اسکول کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا کہ شاید کسی بچے کو اس کے بیٹے کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔

اس نے ایک دو بچوں سے پوچھا لیکن کوئی بھی کچھ نہیں بتا پایا تھا۔ اس نے نرگس میڈم سے بھی پوچھا تھا۔ جس نے یہ بتایا تھا کہ گل زمان اس دوپہر اس کے پاس پڑھنے کے لیے نہیں آیا تھا۔

وہ دونوں چھوٹے چھوٹے بہن بھائی تھے جو اسی اسکول میں پڑھتے تھے ان دونوں کے ہوم ورک ابھی مکمل نہیں ہوئے تھے۔ اسی لیے وہ جلدی جلدی کینٹین کے سامنے والے درخت کے پاس بیٹھے ہوئے اپنا ہوم ورک مکمل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔



سراغ رساں ایڈورڈ کیلون اتنی عجلت میں تھا کہ  
ہال آف جسٹس میں تیزی سے جاتے ہوئے آرائشی پودوں  
کے لیے رکھے ہوئے سراک کے بڑے سے بکس نما گیلے  
سے نکراتے نکراتے بچا۔ اس کا رخ جائے واردات کی  
جانب تھا۔

www.paksociety.com

میٹل ڈیٹیکٹر کے پاس شریف کے ڈپٹی کھڑے  
ہوئے تھے جو آنے جانے والوں کو چیک کر رہے تھے۔  
سراغ رساں ایڈورڈ کیلون نے دور ہی سے انہیں اپنا بیچ

باریک بین ذہن کے مالک سراغ رساں کی جستجو...

آنکھوں میں دھول جھونکنا... ایک عام محاورہ ہے... جسے آپ نے بھی  
خوب پڑھا اور لکھا ہوگا... مگر اس کا عملی مظاہرہ دیکھنا کسی کسی کے  
حصے میں آتا ہے... ایک ایسے ہی دیدہ دلیر کا کارنامہ... جو سب کے  
سامنے جرم کر کے اس کا اعتراف بھی کر رہا تھا...

## دیدہ دلیر

بابر نسیم





”ہیلو! کیلون اسپیکنگ۔“  
 ”ڈیٹیکٹو، میں کمپیوٹر لیب سے جولی تھامس بول رہی ہوں۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”جب ہم پراسیکیوٹر ڈینیئل لاسن کے حالیہ کیسز کی چھان بین کر رہے تھے تو ہمیں ایک عجیب سا ربط ملا ہے۔“

”عجیب سا؟ وہ کس لحاظ سے؟“  
 ”زاچری ملر نام کا ایک فرد ہے جس کے بھائی چیئسمن کو چند ماہ قبل ڈینیئل لاسن نے منشیات کے سلسلے میں قتل کے الزام میں سزا دلوائی تھی۔“ جولی تھامس نے بتایا۔  
 ”سو تمہارا مطلب ہے کہ زاچری ملر نے اپنے بھائی کا انتقام لینا چاہا ہوگا؟“ سراغ رساں نے خیال ظاہر کیا۔

”یہ ایک قیاس ہے۔“  
 ”کیا اس کا کوئی پولیس ریکارڈ ہے؟“  
 ”اس لحاظ سے تو کوئی ریکارڈ نہیں۔ اس پر شبہ تو کیا جاتا رہا ہے لیکن کبھی اس پر منشیات کے کسی کیس سے لے کر ہتھیار استعمال کرنے کا کوئی الزام عائد نہیں ہوا۔ زاچری ملر بظاہر براہ راست کبھی کسی گڑبڑ پھیلانے کے معاملے میں ملوث نہیں پایا گیا۔ وہ اس قسم کے معاملات میں کبھی اپنے ہاتھ ہر گندے نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن لگ رہا ہے کہ چیئسمن کے معاملے میں اسی کا ذہن کار فرما رہا ہے۔ وہ کمپیوٹر کے معاملات میں خاصا طاق ہے۔“

”وہ اتنا ماہر ہے؟“  
 ”میری خواہش ہے کہ کاش میں بھی اتنی ہی عمدہ ہوتی..... میں اب بھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کسی نے جیوری شیڈولنگ کمپیوٹر کو کس طرح ہیک کر لیا تھا۔ میں نے تو کبھی کسی کو جیوری ڈیوٹی سے اجتناب برتنے کی تکلیف اٹھانے کی خاطر اس حد تک جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ جولی تھامس نے قدرے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا۔

”میں زاچری کو اٹھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“  
 سراغ رساں نے کہا۔

”اس کے لیے تمہیں زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔“  
 جولی تھامس نے کہا۔ ”وہ کمپیوٹر کے معاملے میں طاق تو ہے لیکن بظاہر وہ اتنا ماہر ثابت نہیں ہوا کہ جیوری ڈیوٹی کے ایک ممبر کے فرائض سرانجام دینے سے معذرت کر سکتا۔ وہ اس وقت ہال آف جسٹس میں وہیں موجود ہے۔ جیوری پول کے اندر۔“

سراغ رساں نے فوراً ہی ایک باوردی افسر کو اشارہ کیا۔  
 جولائی 2015ء

دکھلا دیا تاکہ وہ اسے چیک کیے بغیر گزرنے کی اجازت دے دیں۔ لیکن پھر ایڈورڈ کورکنا پڑا کیونکہ اس سے آگے ایک ذیلی عدالت کے جیوری کے ممبران کا ایک گروپ مثل ڈیٹیکٹر سے گزرے بغیر سائڈ کے چھوٹے راستے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔

جائے واردات سینٹر فلور کا مردانہ ریٹ روم تھا۔ جب سراغ رساں ایڈورڈ کیلون دروازے پر پہنچا تو چند شناسا باوردی افسران وہاں اندر موجود تھے۔ انہوں نے سراغ رساں کو پہچان لیا۔ وہ سر کی جنبش سے انہیں سلام کرتا ہوا اندر چلا گیا۔

اس نے فرش پر پڑی ہوئی لاش پہچان لی۔ مرنے والا پراسیکیوٹر ڈینیئل لاسن تھا۔

”بے چارہ ڈینیئل۔“ اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ”وہ ایک اچھا آدمی تھا۔۔۔۔۔ ایک اچھا پراسیکیوٹر۔“  
 کرائم سین انویسٹیگیٹر کیٹی میلنڈیز ڈینیئل کی لاش کے برابر میں گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی۔ وہ بولی۔ ”ہمیں آلہ قتل مل گیا ہے۔“ اس نے ایک ہینڈ گن کی جانب اشارہ کیا جو فرش پر رکھے ہوئے ایک شفاف پلاسٹک بیگ میں دکھائی دے رہی تھی۔

”کوئی گواہ؟“ ایڈورڈ کیلون نے پوچھا۔  
 ”بظاہر ڈینیئل اور قاتل دونوں ہی یہاں تہا تھے۔“ کیٹی نے بتایا۔

سراغ رساں ایڈورڈ بھی فرش پر جھک گیا اور آلہ قتل کو غور سے دیکھنے لگا۔ ”اس پر انگلیوں کے نشانات موجود ہیں؟“ اس نے جانتا چاہا۔  
 ”کسی قسم کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے ہیں۔“

”لیکن اس کے دستے پر مٹی سی دکھائی دے رہی ہے۔“ سراغ رساں نے کہا۔  
 ”یہ دیکھی تھی۔“ کیٹی نے بتایا۔ ”معلوم نہیں اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔“

سراغ رساں بولا۔ ”جب میں یہاں آنے کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو کمپیوٹر کے لوگوں نے کہا تھا کہ وہ ڈینیئل کے حالیہ کیسز کی کراس ریفرنسنگ کر رہے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی اس سے بغض تو نہیں رکھتا تھا۔“  
 ”یہ فہرست تو خاصی طویل ہو سکتی ہے۔“ کرائم سین انویسٹیگیٹر کیٹی نے تبصرہ کیا۔

اتنے میں ایڈورڈ کیلون کا سیل فون بجنے لگا۔

جاسوسی ڈائجسٹ



کیا۔ ”فوراً جیوری روم پہنچو۔۔۔ ان میں سے کسی کو کمر اخالی کرنے نہیں دینا۔“

☆☆☆

چند منٹ بعد سراغ رساں خود جیوری روم میں داخل ہوا تو باوردی پولیس افسران نے زاجیری ملر کو روکا ہوا تھا۔ وہ ایک ہارڈ پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور دو پولیس افسران اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔

”مجھے یہاں کیوں روکا گیا ہے؟“ زاجیری نے پوچھا۔

”یہ عجیب سا لگتا ہے کہ جس روز وہ پراسیکیوٹر جس کے خلاف تم عناد رکھتے تھے، قتل ہوا تو تم بھی اسی روز جیوری ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے۔“ سراغ رساں نے کہا۔

”اتفاقات تو ہوتے ہیں۔“ زاجیری نے جواب دیا۔

”تم کئی ایک جرائم میں مشتبہ قرار دیے جا چکے ہو۔“ سراغ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کمپیوٹر کو تمہارا نام جیوری ڈیوٹی سے اڑا دینا چاہیے تھا۔“

”مشتبہ تو قرار دیا جاتا رہا ہے لیکن کبھی کوئی الزام عائد نہیں ہوا، سراغ رساں! اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ میں۔۔۔۔۔ اپنے شہری فرائض کی انجام دہی کے لیے یہاں موجود نہ ہوں۔“

”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم کمپیوٹر میں طاق ہو۔“ سراغ رساں نے کہا۔ ”تو اسی سبب کوئی بھی خود کو بچانے کے بجائے جیوری ڈیوٹی میں صرف اسی صورت میں شامل کر سکتا ہے کہ کمپیوٹر کے معاملات میں ایکسپرت ہو اور جیوری میں شمولیت سے اس کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ ہو؟ وہ یہ یقین دہانی چاہتا ہو کہ ہال آف جسٹس سے پرے اس کا عین اسی وقت ذیلی عدالت میں پروگرام شیڈول ہو اور اسے یہ بھی علم ہو کہ اسے بعد میں یہیں واپس آنا بھی ہے؟“

”اگر تم مجھ پر الزام عائد کر رہے ہو تو بھلا میں کوئی بھی ہتھیار لے کر ہال آف جسٹس میں کس طرح داخل ہو سکتا تھا؟“ زاجیری ملر نے پوچھا۔

”میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ تم نے کس صحیح طریقے سے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔“ سراغ رساں نے کہا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے جب میں یہاں آ رہا تھا تو باہر موجود آرائشی پودوں کے لیے رکھے ہوئے سراک کے بڑے سے گملے سے نکراتے نکراتے بال بال بچا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں تم نے اپنی گن پہلے سے چھپا رکھی تھی۔ میں نے اس گن کے دتے

## آرڈر

جیراسٹینوف ایک مشہور امریکی اداکار ہے۔ اس نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک روز میں دوپہر کو کھانا کھانے ہوٹل میں گیا۔ کھانے کا آرڈر دیا۔ کافی دیر ہو گئی اور کھانا نہیں آیا۔ آدھ گھنٹے بعد میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں نے بیرے کو آواز دی اور غصے سے کہا۔

”میں نے جو آرڈر دیا تھا، وہ کہاں ہے؟“

نوجوان بیرے نے موڈ بانہ انداز میں پوچھا۔

”آپ نے کس چیز کا آرڈر دیا تھا جناب؟“

میں نے کہا۔ ”کچھوے کے سالن کا۔“

وہ پھر جھکا اور اسی موڈ بانہ لہجے میں بولا۔

”اگر آپ کو جلدی تھی تو آپ نے کچھوے کے

سالن کا آرڈر کیوں دیا تھا۔ خرگوش کا دیتے تو اب تک آچکا ہوتا۔“

عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی لاہور

پر ابھی بھی مٹی تلی ہوئی دیکھی ہے جو یقیناً اسی گملے کی مٹی ہے۔ جب تمہاری جیوری ذیلی عدالت سے واپس آرہی تھی تو تم نے گملے میں چھپائی ہوئی گن نکال لی تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جب بات تمہارے بھائی کے کاروبار کی آتی تھی تو تم اس معاملے میں کبھی بھی اپنے ہاتھ پیر گندے نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن اس کیس میں تم اپنے ہاتھ آلودہ کر چکے ہو۔“

”اگر تم اتنے ہی اسمارٹ ہو تو یہ بتا دو کہ میں وہ گن ہال آف جسٹس میں کس طرح لایا ہوں گا؟“ زاجیری ملر نے پوچھا۔

”جو جیوری ممبران ذیلی عدالت سے آرہے تھے انہیں میٹل ڈیٹیکٹر کو بائی پاس کرنا پڑا تھا۔ اگر وہ میٹل ڈیٹیکٹر کے اندر سے گزرتے تو ڈیٹیکٹر گن کی موجودگی کا اشارہ دے دیتا۔ پراسیکیوٹر ڈینیئل لاسن کو شوٹ کرنے کے بعد تم نے سب کی نظروں کے عین سامنے خود کو جیوری روم میں چھپا لیا۔“ یہ کہہ کر سراغ رساں نے زاجیری ملر کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ پھر اپنی جیب سے ہتھکڑی نکال کر زاجیری کے ہاتھوں میں پہناتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ اب آگے ہمیں تمہیں تلاش کرنے کی کوئی زحمت اٹھانا پڑے گی۔ تم زیر حراست ہو۔“



منصوبہ بندی... حکمتِ عملی اور پھر واردات کی عملی کارروائی... ہر چیز اپنی جگہ مکمل اور ہر محل تھی... پکڑے جانے اور قابلِ گرفت امر کا کہیں اندیشہ نہ تھا... مگر... لہو... تو لہو ہے... جب رستا ہے تو ایک قطرہ ہی بازی ڈھا دیتا ہے...

پراسرار ماحول میں متحیر کر دینے والی مختصر کہانی...

## قطرہ خون

ایس... انور

”مسز انتھونی شاید اپنے کمرے میں ہیں۔“ پیٹر انتھونی نے کہا۔ ”تم ایک منٹ انتظار کرو، میں انہیں لے کر آتا ہوں۔“

کیون کے ہونٹوں پر ایک گہری صبر آزا مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ پیٹر انتھونی کو دیکھنے لگا جو پلٹ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ سارا معاملہ قدرے پراسرار اور ناقابلِ فہم لگ رہا تھا۔ مائیک کیون سوچنے لگا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ وہ جس پر انگلی رکھ سکتا۔ اس کے باوجود اسے اس معاملے میں کچھ گڑبڑ کا احساس اسی وقت ہو گیا تھا جس لمحے پیٹر انتھونی نے پولیس اسٹیشن میں قدم رکھا تھا اور تحریری پیغام اس کے سامنے گر دیا تھا۔

یہ پیغام مسز انتھونی کے نام تھا۔ یہ ایک سپاٹ سی وھکی تھی جس سے مائیک کیون ٹھک میں پڑ گیا۔ نہ رقم کی جبری وصولی کا مطالبہ تھا اور نہ ہی اس قسم کی کوئی کوشش کی گئی تھی۔ بس موت کا وعدہ تھا۔ یہ ایک نرالا اور دل خراش پیغام تھا:

”وہ چیزیں جو انسان نہیں ہوتیں وہ انسانی حیات کو پسند نہیں کرتیں۔ تم مرنے والی پہلی انسان ہوگی۔“

پیغام میں بس یہی لکھا تھا۔ یہ پیغام باریک خط میں چھپا





ہوا تھا جس کا سراغ لگانا ناممکن تھا۔

پیٹر انتھونی بہت زیادہ آپ سیٹ تھا۔ مائیک کیون کی نظریں دہلے پتلے صاف سترے بے داغ لباس پہنے ہوئے پیٹر انتھونی پر مرکوز تھیں جو سیزھیاں چڑھ رہا تھا۔ اخبارات اکثر اس کی رنگین مزاحیہ کی داستانیں شائع کرتے رہتے تھے جبکہ دولت اور جائیداد کی حقیقی مالکہ مسز انتھونی تھی۔

یہ لگ بھگ پندرہ سیکنڈ بعد کی بات ہے جب مائیک کیون کو وہ دل خراش چٹخ سنائی دی۔

یہ ایک بلند آواز، خوف و دہشت سے بھرپور چیخ تھی جو ایک لپک دار شعلے کی طرح بلند ہوتی چلی گئی اور پھر رک گئی۔ یہ ایک نسوانی چیخ تھی۔

عین اسی لمحے پیٹر انتھونی کی چیخ بھی سنائی دی۔

مائیک کیون کے جسم کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ تیزی سے سیزھیاں کی جانب لپکا اور ایک ساتھ دو دو سیزھیاں پھلانگنے لگا۔ اوپر پہنچ کر وہ تیزی سے ہال دے کی جانب گھوم گیا۔

بائیں جانب کے دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کمرے سے پہلی روشنی چمن کر باہر نیم تاریک ہال کو روشن کر رہی تھی۔

مائیک کیون کی گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس روشن کمرے کے دروازے تک پہنچا اور پھرتی سے اندر داخل ہو گیا۔

وہ ایک زمانہ خواب گاہ تھی جو نہایت نفاست سے اور آراستہ تھی۔ بائیں جانب ایک بڑا سا نچلا بیڈ تھا جس پر گلابی رنگ کی ریشمی چادر بچھی ہوئی تھی۔ بیڈ کی پائنتی کی جانب سفید ساٹن کا ایوننگ گاؤن پھیلا ہوا تھا اور فرش پر سفید ساٹن کے ہلکے جوتے رکھے ہوئے تھے اور ان میں جوتوں کے لکڑی کے فرے بھی موجود تھے۔

اور ان جوتوں کے پاس ایک عورت کی لاش پڑی تھی جو صرف زیر جامہ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے دونوں بازو فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے حلق کے نچلے حصے میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جس سے خون کا ایک قطرہ اس کے گورے بدن پر بہتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

پیٹر انتھونی ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ داہنی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے خوف زدہ سی گھٹی گھٹی رونے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور وہ پھٹی آنکھوں سے مکمل ہوئی کھڑکی کو گھور رہا تھا۔

”وہ... وہ وہاں سے باہر نکل گیا۔“ پیٹر انتھونی نے کہا۔

”اس نے بس چھلانگ لگائی اور...“

مائیک کیون لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے

کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ کھڑکی سے نیچے ٹائلوں والے فرش کا فاصلہ پورے پچیس فٹ تھا اور دھندلی چاندنی میں کوئی بھی شے حرکت نہیں کر رہی تھی۔

پھر وہ مسز انتھونی کی جانب پلٹ گیا۔ اس کے حلق کا سوراخ ایک چھوٹے چاقو کے پھل کے شکاف سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔

مائیک کیون نے اٹھ کر پیٹر انتھونی کی طرف دیکھا جو ابھی تک دیوار کے پاس دبکا ہوا مکمل کھڑکی کو گھور رہا تھا۔

”آل رائٹ۔“ مائیک کیون نے کہا۔ ”اب تم اداکاری چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ چاقو کہاں ہے؟“

پیٹر انتھونی نے اپنے ہونٹوں کی کپکپاہٹ روکنے کے لیے انہیں دانتوں سے دبایا۔ پھر بولا۔ ”وہ... وہ چاقو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔“

”میرے خیال میں اس کھڑکی کے راستے۔ اور اس نے پچیس فٹ نیچے ٹائلوں کے فرش پر چھلانگ لگا دی تھی اور اسے کوئی چوٹ بھی نہیں آئی۔ کیا وہ مافوق البشر ٹائپ کی شے تھی۔ کیا ایسا ہی تھا؟“

پیٹر انتھونی کے دہلے پتلے وٹڈ سم چہرے پر اب خوف کے تاثرات پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ واضح دکھائی دینے لگے۔ ”وہ انسان نہیں تھا۔“

وہ دونوں ایک طویل لمحے تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور ایک بار پھر مائیک کیون کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک پراسراری سنسنی محسوس ہونے لگی۔

”آل رائٹ۔“ اس نے کہا۔ ”تو پھر وہ کیا تھا؟“

”مجھے... مجھے معلوم نہیں۔“ پیٹر انتھونی نے کہا۔ ”جب میں کمرے میں داخل ہوا تو عین اسی وقت وہ کھڑکی سے اندر آچکا تھا۔ وہ ایک بن مانس سادہ دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کی ہیئت اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا وہ مار تھا تک پہنچ چکا تھا اور اس نے مار تھا پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے اپنے راستے سے اچھال دیا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔ اس نے کھڑکی کے چھجے کو چھوا بھی نہیں۔“

”اگر وہ کھڑکی سے باہر گیا ہے تو ہم اسے تلاش کر لیں گے۔“ مائیک کیون نے کہا۔ ”اور...“ یہ کہتے ہوئے اس نے توقف کیا اور پیٹر انتھونی کو سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ”اور اگر وہ ہتھیار بھی تک نہیں پر موجود ہے تو ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔“

پیٹر انتھونی نے جیسے یہ بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنی جیب کی جانب یوں دیکھنے لگا جیسے اس سے پہلے اسے دیکھا نہیں تھا۔

”کیا... کیا یہ...؟“



لعنت ہو، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر وہ آلہ قتل تلاش نہ کر سکے تو پیٹر انتھونی کو مجرم ثابت نہیں کیا جاسکے گا۔

مائیک کیون بیڈ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بار پھر محتاط طریقے سے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر واپس آ کر دوبارہ بیڈ پر سفید ساٹن کے لباس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اپنے سیاہ رنگ کے بڑے سے جوتوں پر نظریں جمادیں۔ ان سیاہ بڑے سے جوتوں کے مقابلے میں پتلے سفید سلپرز نہایت منحنی سے لگ رہے تھے۔ پھر وہ تیزی سے اٹھا اور دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ساتھ ہی وہ انتھونی کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔

دو منٹ بعد وہ کمرے میں واپس آ گیا۔ پستہ قد پیٹر انتھونی اس کے ساتھ تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے صاف ستھرا بے داغ سیاہ رنگ کا سلک کا ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔

”ویل۔“ مائیک کیون نے کہا۔ ”تمہاری ترکیب نے تقریباً کام دکھا دیا تھا لیکن پوری طرح نہیں۔ تم نے خون کو صحیح طریقے سے صاف نہیں کیا تھا اور ایک قطرہ اندر سے رس گیا۔“

”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے کہ زنا نہ سلپرز کے فرے کا ٹوکار ڈاگر علیحدہ کر دیا جائے تو وہ ایک بہترین ہتھیار بن جاتا ہے۔“

مائیک کیون نے دھیرے سے کہا۔ ”ہم نے جوتوں کو پہلے بھی دیکھا تھا لیکن اس وقت تک ٹوکار ڈا کے نیچے سے خون کا قطرہ نہیں رسا تھا۔ لیکن اب...“ اس نے یہ کہتے ہوئے سفید ساٹن کے سلپرز کی جانب اشارہ کیا جہاں سرخ خون کا ایک دھبہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

پیٹر انتھونی نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔ ”آئی سی۔“

پھر وہ یوں اچھلا جیسے کسی اسپرنگ کے بل کھل جاتے ہیں۔ مائیک کیون نے اس پر قلابی بھری لیکن وہ اس تک نہیں پہنچ سکا۔

تب تک پیٹر انتھونی کھلی ہوئی کھڑکی سے سر کے بل نیچے چھلانگ لگا چکا تھا۔ مائیک کیون نے اپنی گن نکالی اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ لیکن پھر اس نے اپنی گن واپس ہولسٹر میں رکھ دی اور وہیں کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔

پھر دھیرے دھیرے کھڑکی سے پلٹ گیا۔

”وہ چیزیں جو انسان نہیں ہوتیں وہ شاید اس قابل ہوں کہ اگر پچیس فٹ کی بلندی سے نیچے پختہ فرش پر چھلانگ لگائیں تو انہیں کوئی چوٹ نہ آئے۔“ مائیک کیون نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”لیکن جو انسان ہوتے ہیں... وہ اگر اتنی بلندی سے سر کے بل پختہ فرش پر گر پڑیں تو ان کا زندہ بچ جانا ایک معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔“

”ہاں۔“ مائیک کیون نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ پیٹر انتھونی کو لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے اسے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا جب اس نے ہیڈ کوارٹر زفون کیا۔

اس نے پیٹر انتھونی پر اس وقت تک مسلسل کڑی نگاہ رکھی جب تک انسپکٹر، فنکٹر پرنس کے لوگ اور دیگر عملہ وہاں نہیں پہنچ گیا۔ اس نے پیٹر انتھونی کو دو افراد کی نگرانی میں چھوڑا اور انسپکٹر کو ساتھ لے کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں مسز انتھونی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

”یوں لگ رہا ہے جیسے یہ کہیں باہر جانے والی تھی۔“

انسپکٹر نے ایوننگ ڈریس اور شوز کی جانب سر کی جنبش سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مائیک کیون نے اسے وہ پوری کہانی سنادی جو پیٹر انتھونی نے بیان کی تھی۔ ساتھ ہی وہ کچھ بھی جو اس کے سامنے ہوا تھا۔

”مجھے تو یہ سب فضول بکواس لگ رہی ہے۔“ مائیک کیون نے مزید بتایا۔ ”میرا قیاس یہ ہے کہ اسے اس کے شوہر نے ٹھکانے لگایا ہے۔ وہ اسے طلاق دینے والی تھی اور اس کا مطلب ایک بڑی دولت اور جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھنا تھا۔“

”ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ آلہ قتل کو تلاش کریں۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اسے چھپا سکتا۔“

”اسے پندرہ سیکنڈ سے زیادہ مہلت نہیں ملی تھی۔“

لیکن تلاش کے باوجود انہیں آلہ قتل نہیں ملا۔

انسپکٹر کے آدمیوں نے کمرے کو ادھیڑ کر رکھ دیا، ہر جگہ دیکھ ڈالی۔ حتیٰ کہ بیڈ کے پاس رکھا ہوا لباس اور جوتے تک جھاڑ لیے۔

پیٹر انتھونی کو بلا کر بے لباس کر کے اس کی تلاشی لے ڈالی۔

پھر انسپکٹر نے مائیک کیون کی طرف دیکھا اور مایوس لہجے میں بولا۔ ”اب کیا کریں؟“

مائیک کیون اپنی بڑی سی اگلیوں سے اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا۔ اسے اپنی رگوں میں ایک بار پھر وہی عجیب سی سنسنی محسوس ہونے لگی۔ ”اس نے کہا تھا کہ وہ کوئی انسان نہیں تھا، یہ کہ اس نے اس کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی تھی۔ نیچے پچیس فٹ کے فاصلے پر اور...“ اس کا بڑا سا جڑا لٹک گیا تھا۔

”یہ سب فضول بکواس ہے۔“

انسپکٹر کے ساتھ آئے لوگوں نے ایک بار پھر پورا مکان اور نیچے زمین کا چپا چپا چھان مارا لیکن ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ بالآخر وہ لوگ تھک ہار کر ملے گئے لیکن مائیک کیون وہیں رکا رہا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا اپنی مٹھیاں سمجھ رہا تھا۔

”وہ چیزیں جو انسان نہیں ہوتیں وہ انسانی حیات کو پسند نہیں کرتیں...“ اس نے پیغام کا جملہ دہرایا۔



کاروبار چلانے کے لیے ذہانت کے ساتھ بروقت فیصلے کرنے کی صلاحیت  
بے حد اہمیت رکھتی ہے... وہ خود کو ذہین بیٹی کی عقل مند ماں سمجھتی  
تھی... اور بالآخر اس نے ایسا ثابت بھی کر دیا... ایک عام گھریلو عورت  
کی دلچسپیوں... ذہانت اور فیصلوں کی دلچسپ کتھا...

ایک مردہ شخص کے بھوت کی صورت واپسی کا سنسنی خیز ماجرا...

# بھوت کئی واپسی

محمد عفتان آزاد

پاک سوسائٹی



WWW.PAKSOCIETY.COM

پہلی بار ایسا ہوا کہ مجھے انڈر ورلڈ سے کوئی فون کال  
موصول ہوئی ہو۔ اس وقت میں پیاز کاٹ رہی تھی جب کچن  
میں رکھا ہوا سرخ رنگ کا فون بجنے لگا۔ میں نے ہی اپنے  
بچوں سے فرمائش کر کے سرخ رنگ کا فون سیٹ منگوا یا تھا  
کیونکہ میں اسے خوش بختی کی علامت سمجھتی تھی۔ میں نے  
ایمرن سے ہاتھ صاف کیے اور ریسور اٹھانے کے بجائے  
نیلے رنگ کا بٹن دبا دیا۔ اس طرح میں باتیں کرنے کے  
ساتھ ساتھ اپنا کام بھی جاری رکھ سکتی تھی۔

جاسوسی ڈائجسٹ 221 جولائی 2015ء



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



”میں چن یا نگ بن بول رہی ہوں۔“ میں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری بیٹی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ دوسری جانب سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا گیا۔

میری بیٹی چائنا ٹاؤن میں واحد پرائیویٹ سرائے رساں ہے۔ اس کا دفتر ایک دور دراز علاقے میں ہے اس لیے لوگ اپنی آسانی کے لیے گھر پر ہی فون کر کے مشورہ کر لیتے ہیں لیکن میں اسے پسند نہیں کرتی۔ میں تو ویسے بھی نہیں چاہتی کہ وہ یہ کام جاری رکھے کیونکہ اس میں بعض اوقات بدنام اور گھٹیا لوگوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے اور اپنے کام کو مناسب طریقے سے انجام دینے کے لیے وہ دوسروں کے معاملات میں ملوث ہو جاتی ہے جو کسی عورت کے لیے ٹھیک نہیں لیکن میری بیٹی ان ٹیلی فون کالز سے بالکل پریشان نہیں ہوتی بلکہ مجھے مطمئن کرنے کے لیے کہتی ہے۔

”ماں! تم کیوں فکر کرتی ہو۔ ٹیلی فون آنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ کوئی برا شخص ہمارے گھر آ رہا ہو۔“

میں اس سے بحث کرنا نہیں چاہتی ورنہ یہ ضرور کہتی کہ کوئی آئے یا نہیں لیکن اس کا پارٹنر بل اسٹیم اکثر منہ اٹھائے چلا آتا ہے جو میری نظر میں ایک گھٹیا شخص ہے اور سب سے بڑھ کر اس طرح کی فون کالز اپنے ساتھ بد قسمتی اور بُرے اثرات لے کر آتی ہیں جیسا کہ اس مرتبہ ہوا۔ کیونکہ میں فون کرنے والے کی آواز پہچان چکی تھی۔

”جیرالڈ تم۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے یہاں کیوں فون کیا، تم تو مر چکے ہو؟“

”تم نے مجھے پہچان لیا؟“ وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے؟“ میں نے کہا۔ ”ہم ایک عرصے تک پڑوسی رہ چکے ہیں۔ تم نے کئی سال تک میرے شوہر کے ساتھ مون لائٹ پولیس ریسٹورنٹ میں کام کیا ہے۔ میں نے تمہاری تجویز و تکلیف میں بھی شرکت کی تھی پھر تم کیوں واپس آ گئے، کیا تم انتقام لینے کے لیے آئے ہو۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری موت طبعی نہیں تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو میری بیٹی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی، خدا حافظ۔“

اس سے پہلے کہ میں ٹیلی فون بند کرتی، جیرالڈ بول اٹھا۔ ”چن یا نگ بن! رک جاؤ۔ میں انتقام لینے نہیں آیا

جاسوسی ڈائجسٹ

کیونکہ میں مر رہی نہیں بلکہ زندہ ہوں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بہت سے لوگ تمہاری موت کے معنی شاہد ہیں۔ کیا وہ سب جھوٹے ہیں؟“

”نہیں، میں نے اپنے آپ کو مردہ ظاہر کیا اور غائب ہو گیا۔“

”اور اب تم زندہ ہونے کا ڈراما کر رہے ہو۔ میں بھوتوں کی چالاکیاں جانتی ہوں۔“

”میری بات کا یقین کرو۔ اس کے لیے مجھے ایک بہت بڑی رقم معاوضے کے طور پر دی گئی تھی۔“

”گویا تم یہ کہہ رہے ہو کہ کسی نے تمہیں مرنے کے لیے معاوضہ دیا تھا؟“

”نہیں بلکہ اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرنے کے لیے۔“

”اور وہ معاوضہ کتنا تھا؟“

”پچاس ہزار ڈالر۔“ اس نے فخریہ انداز میں بتایا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر تمہاری موت سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو وہ اتنی بڑی رقم معاوضے کے طور پر دے گا۔“

جیرالڈ نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اس کا تعلق ٹیکس اور درآمدی ڈیوٹی کے معاملات سے ہو سکتا ہے۔ انہیں ایک غیر معروف شخص کے پاسپورٹ کی ضرورت تھی۔“

”جسے وہ کسی غیر قانونی مقصد کے لیے استعمال کر سکیں۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں اپنے مسائل میں گھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے مجھے یہ پیشکش پرکشش لگی۔“

”لہذا تم نے اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

”شاید میں پوری بات نہیں سمجھ سکا تھا البتہ میں نے وہ رقم وصول کر لی۔“

”مرنے کے لیے؟“

”نہیں، اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرنے کے لیے۔“

”تو پھر وہی کرو جس کی تم نے قیمت وصول کی ہے۔“

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ میں فون نہیں اٹھانا چاہ رہی تھی لیکن بھوت بڑے مستقل مزاج ہوتے ہیں اور میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ گھنٹی سارا دن بجتی رہے لہذا بحالت مجبوری فون اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف سے جیرالڈ ہی



## زندہ باد

ایک فرنج اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ پاکستان کی سیاحت پر آیا۔ وہ دونوں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے صدر سے گزر رہے تھے کہ اچانک ان پر بجلی کے ننگے تار آگرے۔ انہیں ایک خوفناک جھٹکا لگا اور پھر کچھ بھی نہ ہوا... لوڈ شیڈنگ شروع ہو گئی تھی۔ دونوں نے بے اختیار اچھل اچھل کر نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ”پاکستان زندہ باد... کے الیکٹرک پاکستانہ بادا“

نہ ہوتی یہ لوڈ شیڈنگ تو دونوں بے چارے جل بھن کر راکھ ہو گئے ہوتے۔

لاہور سے شاہدہ گلزار کی دریافت

اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ فیصلہ صحیح تھا۔ نئے مالکان چانگ برادران کے بارے میں خبر گشت کر رہی تھی کہ انہیں کاروبار میں تقریباً پانچ لاکھ ڈالر کا گھانا ہوا ہے گوکہ انہوں نے اپنی زبان بند رکھی ہوئی تھی لیکن لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ کسی کا کہنا تھا کہ انہوں نے یہ رقم ایک کاروبار میں لگائی تھی جو ڈوب گئی جبکہ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ پیسے چوری ہو گئے تھے۔ ایسی سرگوشیاں بھی سننے کو ملیں کہ وہ ڈویژنل اسٹریٹ پر بیٹھنے والے ساہوکاروں کے پاس بھی ادھار لینے گئے تھے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو افواہوں پر دھیان دیتے ہیں۔ البتہ اس بات کی خوشی تھی کہ میں نے کافی عرصے پہلے چانگ برادران سے جان چھڑالی تھی۔

البتہ جیرالڈ اپنی عاقبت نااندیشی اور فضول خرچی کی وجہ سے مون لائٹ پولیٹین ریسٹورنٹ کی ملازم کرنے پر مجبور تھا۔ وہ اپنی کمائی کا ایک ایک ڈالر ان چینیوں پر ضائع کر دیتا جس پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ اس نے ڈویژنل اسٹریٹ کے ساہوکاروں سے بھی ایک سے زائد مرتبہ قرض لیا تھا اور مرتے وقت بھی وہ ان کا مقروض تھا۔ کچھ لوگوں کو یہ بھی شبہ تھا کہ راؤنڈ چونگ نامی ساہوکار کا ضبط جواب دے گیا اور اسی نے جیرالڈ کو قتل کیا جب میں نے اس پر غور کیا تو مجھے یہ ایک فضول سا آئیڈیا لگا۔ راؤنڈ چونگ کوئی احمق شخص نہیں ہے۔ وہ اپنے گاہک کو کیوں قتل کرے گا۔ زندہ جیرالڈ سے تو قرض واپس ملنے کی

بول رہا تھا۔  
”تم مجھے اپنی بیٹی کا فون نمبر دے دو۔ پھر میں چلا جاؤں گا۔“

”میں نہیں دے سکتی۔“  
”کوئی بات نہیں۔ میں کسی طرح معلوم کر لوں گا۔“  
”اگر تم معلوم کر سکتے تو مجھے دوسری بار فون نہ کرتے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ مجھے لگا جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔  
”مجھے اس کی ایجنسی کا نام یاد نہیں آ رہا۔ بے فکر رہو۔ میں اسے معقول معاوضہ ادا کروں گا۔“

”یہ تو اسی وقت ہوگا اگر تم اسے تلاش کر سکو۔“  
”اسی لیے مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

”لیکن ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”میری بیٹی ایک بھوت کے معاملے میں پڑنا پسند نہیں کرے گی اس لیے تمہیں اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا ایک بیٹا اور بیوہ بھی ہے۔ اگر تمہیں ان کے نام یاد ہیں تو انہیں فون کرو۔“

”میں انہیں فون نہیں کر سکتا، مجھے اس کے لیے منع کیا گیا ہے۔“

”کس نے منع کیا ہے۔ ان لوگوں نے جن سے تم نے پیسے لیے تھے؟“  
”ہاں۔“

”تو پھر جو تمہارا دل چاہے۔“  
”فون بند مت کرنا۔ میں اپنے گھر آنا چاہتا ہوں۔“  
میں نے جیرالڈ کو اپنی بیٹی کا نمبر نہیں دیا۔ کوئی بھی ماں ایک بھوت کو اپنے بچوں کے قریب نہیں آنے دے گی۔ بہر حال میں ایسی عورت نہیں ہوں جس کے دل میں رحم نہ ہو اور نہ ہی بے وقوف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس نے ہمیشہ بیدردی سے پیسا خرچ کیا حالانکہ وہ اچھا خانہ ماں تھا لیکن میرا شوہر جیسا نہیں۔ میرے شوہر نے گھر چلانے کے ساتھ ساتھ اتنی رقم پس انداز کر لی کہ مون لائٹ پولیٹین ریسٹورنٹ میں شراکت دار بن سکے لیکن اس کی وفات کے بعد میں نے اپنا حصہ بیچ دیا کیونکہ ریسٹوران کے مالکان بدل گئے تھے۔ میرے کچھ رشتے داروں کا خیال تھا کہ مجھے اپنے حصے کی ادنیٰ قیمت لگانا چاہیے تھی لیکن میں لالچی عورت نہیں ہوں۔ مجھے ذہنی سکون چاہیے تھا جو نئے مالکان کے ساتھ ممکن نہ تھا۔

گوکہ اس بات کو کئی سال ہو گئے تھے لیکن اب مجھے



”مجھے خوشی ہے کہ تمہیں یہ چائے پسند آئی۔ اب بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں یہ پوچھنے آئی ہوں کہ کیا تم نے جبرالڈ کو قتل کیا تھا؟“

راؤنڈ چومنگ نے مجھے حیرت سے دیکھا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں اس طرح کا سوال کرنے کے لیے کس نے یہاں بھیجا ہے؟“

”جبرالڈ نے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”مجھے حیرت ہو رہی ہے کیونکہ وہ تو مر چکا ہے۔“

”ہاں، میں جانتی ہوں کہ تم حیران ہو رہے ہو لیکن میں نہیں بلکہ جبرالڈ یہ جانتا چاہ رہا ہے۔ اس کے بھوت نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ جانتا چاہ رہا ہے کہ اسے کس نے قتل کیا؟“

میں عام طور پر جھوٹ نہیں بولتی لیکن اس کیس میں تھوڑی سی غلط بیانی کرنا پڑ گئی۔ جبرالڈ نے مجھ سے یہ بات نہیں کہی تھی۔ وہ تو اپنے مرنے کا اعتراف بھی نہیں کر رہا تھا بلکہ اس نے کہا تھا کہ اس کا لاشی میں ایک بڑا انعام نکلا ہے اور اب وہ اس قابل ہے کہ اس نے اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرنے کے لیے جو معاوضہ لیا تھا، وہ واپس کر سکے۔

”میرا بیٹا بھی باپ بن گیا ہے۔“ اس نے کہا تھا۔

”میں پیسے واپس کر کے مردہ ہونے کا ڈھونگ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ دوبارہ زندگی کی طرف واپس آ جاؤں اور اپنے پوتے کو دیکھ سکوں۔“

”اس کے لیے تمہیں سراغ رساں کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ تم یہ رقم خود بھی واپس کر سکتے ہو؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ ادائیگی کس کو ہوگی۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر منظر عام پر آ گیا تو وہ سمجھیں گے کہ میں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ مجھے اس بارے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”تمہارا معاہدہ یہی تھا کہ پیسے لو اور ہمیشہ کے لیے مردہ ہو جاؤ؟“

”ہاں بہت سے لوگ اسی طرح اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرتے ہیں لیکن میں تو اس کے بعد بھی بھاگ رہا ہوں جب سے میں نے ٹائیگر چاؤ کو دیکھا ہے۔“

”ٹائیگر چاؤ؟ تمہارا کزن جو مون لائٹ پولیس ریسٹورنٹ پر چانگ برادران کا باڈی گارڈ ہے اور مون اسٹریٹ پر رہتا ہے۔ کیا تم مرنے کے بعد بھی چانگ ٹاؤن میں ٹھہرے رہے؟“

امید تھی۔ مردہ لوگ کہاں سے ادائیگی کریں گے؟

جبرالڈ کے گزشتہ طرز عمل کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ وہ میری بیٹی کو تلاش کرنے سے باز نہیں آئے گا اور ممکن ہے کہ اس میں کامیاب بھی ہو جائے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ کوئی سنگ دل عورت نہیں ہوں۔ ہر شخص کے دل میں گھر آنے کی آرزو چلتی رہتی ہے چنانچہ میں نے جبرالڈ سے کہہ دیا کہ اس کے معاملے کی تحقیقات میں خود کروں گی۔ اس سے پہلے بھی ایک موقع پر اپنی بیٹی کو ایک نفرت انگیز عورت سے دور رکھنے کے لیے جو اس کی خدمات حاصل کرنا چاہ رہی تھی، میں نے اس معاملے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے وہ مسئلہ بہت سادہ سا لگا اور میں نے اسے ڈنر سے پہلے حل کر لیا لیکن میری بیٹی کو اس سے خوشی نہیں ہوئی اور اس نے مجھ سے کہا کہ سراغ رسانی کے کام میں نہ پڑوں۔

”کیوں؟“ میں نے معصومیت سے پوچھا۔ ”کیا یہ خطرناک ہے؟“

اس سے پہلے میں نے جب بھی اپنی بیٹی سے کہا کہ وہ یہ فضول کام چھوڑ کر کوئی ڈھنگ کی ملازمت کر لے تو اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ اس میں کوئی خطرہ نہیں اور وہ مکمل طور پر محفوظ ہے لیکن اس روز اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ میں نے بھی اس پر زیادہ زور نہیں دیا لیکن اس سے کوئی وعدہ بھی نہیں کیا۔

اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد میں تیار ہو کر گھر سے نکلی اور راؤنڈ چومنگ کے دفتر کی طرف چل دی جو ڈائریکٹر اسٹریٹ پر ہی واقع تھا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ میں نے اس کے سیکریٹری کو بتا دیا تھا کہ جلدی میں ہوں اور مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ سیکریٹری نے تعظیماً سر ہلایا اور مجھے راؤنڈ چومنگ کے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میں کوئی نئی گا ہک ہوں جو بھاری سود پر کچھ رقم قرض لینے آئی ہے۔ کم از کم میرے طے سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

راؤنڈ چومنگ نے خیر مقدم کرتے ہوئے میری خیریت دریافت کی اور مجھے چائے کی پیشکش کی جو میں نے فوراً قبول کر لی کیونکہ انکار کرنا بد اخلاقی کے زمرے میں آتا۔ ویسے بھی اس نے جس چائے کا نام لیا وہ کافی مشہور اور قیمتی تھی اور مجھے کبھی اسے پینے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میں نے چائے کی تعریف کی تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔





جولائی 2015ء کے پاکیزہ کے خوش کن انداز

# پاکیزہ

کراچی

ماہنامہ

نگہت سیما کے ناول اعتبار وفا کی انکشافات سے پُر نئی قسط

قیصرہ حیات کا نیا سلسلہ وار ناول..... آخری امید بالکل ایک اچھوتے اور پُر اثر بیان کے ساتھ

زندگی خاک نہ تھی..... شیریں حیدر کا نیا نئی ناول

متاع دل میں نبیلہ ابرار نے نمایاں کیے کچھ انوکھے رنگ

عبادات و معاملات کی اصل روح سے آگاہ کرتی سارہ ملک کی بے حد دلنشین تحریر

خشیت الہی

پراختہ شجاعت

کا ایک پُر فکر مضمون

اس کے علاوہ پڑھیے فرحین اظفر، نگہت اعظمی، سحرش رانی، بشری گوندل، سویرا فلک، ریحانہ حسن نور عین و دیگر مایہ ناز رائٹرز کی پُر لطف کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ معلومات اور تفریح سے پُر مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر



”ظاہر ہے کہ نہیں، جن لوگوں نے مجھے پیسے دیے، ان کا کہنا تھا کہ میں کہیں دور چلا جاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا لیکن اپنی تدفین کے فوراً بعد ہی میں نے ٹائیگر جاؤ کو یہاں دیکھا۔“

www.paksociety.com

”گو یا تم چائنا ٹاؤن میں نہیں بلکہ کہیں اور ہو؟“  
”ہاں لیکن میں شاید تمہیں اس بارے میں کچھ نہ بتا سکوں۔“

”تمہیں اپنے سراغ رساں کو ہر بات بتانا ہوگی اگر کچھ چھپاؤ گے تو تمہارے کیس کی تحقیقات کس طرح ہوں گی؟“

”میں نے سوچا تھا کہ تمہاری بیٹی میری سراغ رساں بنے۔“

”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ بھوتوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ تمہیں جو کہنا ہے مجھ سے کہو۔“

جیرالڈ نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں میامی فلوریڈا میں ہوں۔ میں نے اس جگہ کا انتخاب بہتر موسم اور بہت اچھے گھڑ دوڑ کے میدانوں کی وجہ سے کیا۔ تم تو جانتی ہو کہ میں گھڑ دوڑ کا کتنا شوقین ہوں۔“

”مجھے یاد ہے کہ تم اپنی کمائی کا بیشتر حصہ گھوڑوں کی ریس پر لٹا دیتے تھے۔ میں بھی میامی سے واقف ہوں۔ ایک دفعہ میرے شوہر ہمیں وہاں لے گئے تھے۔ واقعی وہ خوب صورت جگہ ہے۔“

”ہاں، یہ میری پسندیدہ جگہوں میں سے ایک ہے۔ میں کئی مرتبہ یہاں آچکا ہوں اور میرا کزن بھی یہاں آکر لطف اندوز ہوتا ہے۔ اسے یہاں دیکھ کر میں بہت خوش ہوا لیکن پھر اپنا عہد یاد آگیا اور مجھے ایک بار پھر چھپنا پڑ گیا۔ مجھے ڈر ہے کہ اس نے دیکھ نہ لیا ہو۔ لگتا تو یہی تھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہا ہے لیکن اس نے مجھے آواز نہیں دی اور نہ ہی میرا تعاقب کیا لہذا میں فرض کیے لیتا ہوں کہ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ یقین جانو کہ میں نے اپنے عہد پر قائم رہنے کی پوری کوشش کی لیکن اب میں اس آنکھ مجھولی سے تنگ آچکا ہوں اور اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ اب تو میری لاشی بھی نکل آئی ہے۔ لہذا میں نے گھر واپس آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

www.paksociety.com

”ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔ اب مجھے ایک بات اور بتا دو۔ تمہیں یہ رقم کس ذریعے سے ملی تھی؟“

”ایک بڑے سے سرخ لفافے میں۔ جس پر صرف میرا نام لکھا ہوا تھا اور کچھ نہیں۔ میں نے اس لفافے کو

اپنے لیے خوش قسمتی جانا اور اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا۔ اب رقم واپس کرنے کے لیے میں یہی لفافہ استعمال کروں گا۔“

”نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے بلکہ یہ لفافہ مجھے بھیج دو۔“  
”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے میں اپنے لیے خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔“

”اس کے ساتھ ہی ان واقعات کی تفصیل بھی تحریری طور پر بھیجو گے جو تم نے ابھی بیان کیے ہیں۔ کیا تمہارے پاس اپنی مہر ہے۔“  
”ہاں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم اس بیان پر اپنی مہر بھی لگا دینا۔ یہ دونوں چیزیں مجھے آج ہی بھیج دو۔“

اب میں راؤنڈ چونگ کے دفتر میں بیٹھی جیرالڈ کے کیس پر غور کر رہی تھی اور میرے ذہن میں ایک ہی سوال ابھر رہا تھا کہ کیا ایک ایسے شخص کی مدد کرنا مناسب ہوگا جو دنیا والوں کے لیے مرچکا ہو لیکن مجھے اپنا کام تو کرنا ہی تھا۔ چاہے جیرالڈ یہی سمجھتا رہے کہ میری بیٹی اس کے لیے کام کر رہی ہے۔

”جن یانگ یں۔“ راؤنڈ چونگ نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ تم نے جیرالڈ کا بھوت دیکھا ہے؟“  
”نہیں۔“

www.paksociety.com

”پھر تو مجھے یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔“  
”ہاں، میری بات غور سے سنو۔ میں نے اسے نہیں دیکھا بلکہ اس نے مجھے فون کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جیرالڈ کا بھوت ہی تھا جبکہ وہ اس سے انکار کر رہا تھا۔“

”یعنی بھوت کا کہنا تھا کہ وہ جیرالڈ نہیں ہے۔“  
”نہیں، جیرالڈ نے کہا کہ وہ بھوت نہیں ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ نہیں مرا بلکہ کسی شخص نے اسے پیسے دے کر روپوش ہو جانے کے لیے کہا چنانچہ اسے اپنے مرنے کا ڈراما کرنا پڑا۔“ میں نے اپنی آواز اونچی کی اور بولی۔ ”اب وہ ایسی جگہ پر ہے جہاں بہت عمدہ گھڑ دوڑ کے میدان ہیں۔ اس نے مجھے اس جگہ کا نام بھی بتا دیا۔ تم جانتے ہو کہ وہ ہمیشہ سے ہی گھوڑوں پر شرطیں لگانے کا عادی ہے۔“

”ہاں، اس نے بھی صحیح گھوڑے کا انتخاب نہیں کیا اور ہمیشہ ہارتا رہا۔ تم اور چائے لو۔ تمہیں یاد ہے کہ اس نے کس جگہ کا نام لیا تھا۔“

”نہیں، تم چند ایسی جگہوں کے نام لو جہاں اچھے گھوڑے



دوڑ کے میدان ہیں۔ شاید مجھے یاد آ جائے۔“  
اس نے چند ایسے نام لیے جو میں نے پہلے کبھی نہیں  
سنے تھے پھر ایک نام پر میں نے اسے روک دیا۔  
”ہالی وڈ۔“ میں نے دہراتے ہوئے کہا۔ ”ہاں،  
میرا خیال ہے کہ اس جگہ کا نام بھی انگریزی کے حروف ابجد،  
سے شروع ہوتا ہے۔ وہ ایک گرم جگہ ہے اور اس کا کہنا تھا  
کہ اسے سورج کی روشنی پسند ہے۔“

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے یہ ڈھونگ رچانے کی  
ضرورت کیوں پیش آئی؟“ راؤنڈ چوٹنگ نے کہا۔  
”تم جانتے ہو کہ وہ عقل مند آدمی نہیں تھا۔ اس کا کہنا  
ہے کہ وہ خود بھی اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ شاید کسی کو اس کے  
پاسپورٹ کی ضرورت ہو، بہر حال وہ اس کی وضاحت نہیں  
کر سکا۔ تاہم اس کا کہنا تھا کہ اب اس بات کی اہمیت نہیں  
رہی۔ وہ صرف یہ جانتا چاہتا ہے کہ اس کی کشدگی سے کسے  
فائدہ پہنچا۔ بہر حال کیونکہ وہ مرچکا ہے اور اس کا بھوت  
مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ  
اگر اس نے مجھے بتا دیا کہ وہ کیا چاہتا ہے تو میں اس کی مدد  
نہیں کروں گی کیونکہ وہ زیادہ عقل مند نہیں ہے۔ اس لیے  
اس نے اپنے بارے میں یہ پیچیدہ کہانی گھڑی ہے لیکن اب  
مجھے اس معاملے سے دلچسپی ہو گئی ہے۔ اس لیے میں تم سے  
جانتا چاہ رہی ہوں کہ اگر تم نے جیرالڈ کو قتل نہیں کیا تو پھر اس  
کا قاتل کون ہے؟“

”نہیں۔“ راؤنڈ چوٹنگ نے کہا۔ ”میں اس بارے  
میں کچھ نہیں جانتا۔“  
میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کھڑی ہو گئی۔ وہ اخلافا  
مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا اور امید ظاہر کی کہ ہماری  
جلدی دوبارہ ملاقات ہوگی۔ گوکہ میں دو کپ چائے لی چکی  
تھی۔ اس کے باوجود قریب میں واقع ٹی پارلر میں چلی گئی۔  
جہاں میں نے ادائیگی کر کے نوڈلز خریدے اور ایک ایسی  
میز پر بیٹھ گئی جہاں سے باہر کا منظر صاف دیکھا جاسکتا تھا۔  
ابھی میں نے نوڈلز کھانا شروع کیے ہی تھے کہ راؤنڈ چوٹنگ کا  
سیکریٹری عمارت سے باہر آتا دکھائی دیا۔ میں اپنی جگہ سے  
کھڑی ہو گئی اور ویٹر سے کہا۔ ”یہ نوڈلز سنبھال کر رکھ دو۔  
میں ابھی آتی ہوں۔“

سیکریٹری کا رخ مون لائٹ پولیٹین ریسٹورنٹ کی  
جانب تھا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا اور ملبری اسٹریٹ  
کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اندر  
دیکھنے لگی۔ اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے کیشیئر سے کچھ کہا جس

نے ایک شخص کو بلا کر سیکریٹری کو اس کے ساتھ اندر بھیج  
دیا۔ چانگ برادرز کا دفتر کچن کے عقب میں واقع تھا۔  
تھوڑی دیر بعد سیکریٹری واپس آیا تو اس کے ساتھ آنے  
والے شخص کو دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ ٹائگر  
چاؤ تھا۔

یہ سب میری توقع کے مطابق تھا۔ میں واپس ٹی پارلر  
آئی اور اپنے نوڈلز ختم کرنے لگی۔ یہاں سے فارغ ہونے  
کے بعد میں ملبری اسٹریٹ پر واقع ہوٹل جن شان ہوم گئی  
جو مردوں کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرتے ہیں۔ وہاں  
میری ملاقات یونگ لی سے ہوئی جس نے چند برس قبل ہی  
اس ادارے کا انتظام سنبھالا تھا۔ اس نے میرا پرتپاک  
خیر مقدم کیا اور میرے لیے چائے منگوائی گوکہ مجھے بالکل  
خواہش نہیں تھی لیکن انکار کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ میری  
پیالی میں چائے انڈیلے ہوئے بولا۔

”کیا تم انتظامات کے سلسلے میں کوئی بات کرنے آئی  
ہو؟“

”کسے انتظامات؟ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“  
وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اپنے پیاروں کے لیے  
اس سے اچھا تحفہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ آپ پہلے سے اپنی تجہیز و  
تکفین کا بندوبست کر لیں۔ اس طرح غمزہ رشتے داروں کو  
مشکل وقت میں فیصلہ کرنے کی زحمت سے بچایا جاسکتا  
ہے۔“

مجھے غصہ آ گیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے  
مرنے کی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے ٹھک کر کہا۔ ”میں  
یہاں اپنی تجہیز و تکفین کے انتظامات کے بارے میں بات  
کرنے نہیں آئی۔ یہ ذمے داری میرے بچوں کی ہے اور  
مجھے یقین ہے کہ وقت آنے پر وہ اسے خوش اسلوبی سے  
انجام دیں گے۔ میں صرف تم سے ایک سوال پوچھنے آئی  
ہوں۔“

یونگ لی پلکیں جھپکانے لگا۔ شاید اسے میری جانب  
سے اس شدید رد عمل کی توقع نہیں تھی، وہ کھیٹا ہوتے ہوئے  
بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”جیرالڈ کی آخری رسومات یہیں ادا ہوئی تھیں۔ میں  
بھی اس وقت موجود تھی لیکن میرا سوال یہ ہے کہ تم نے یہ  
کیسے جان لیا کہ وہ جیرالڈ ہی تھا۔ کیا تم اسے پہچانتے تھے؟“  
”نہیں، ہم اپنے طور پر کوئی شناخت نہیں کرتے۔  
ہمیں جیرالڈ کی لاش مردہ خانے سے وصول ہوئی تھی۔ وہیں  
اس کی شناخت ہوئی ہوگی۔“



چانگ برادرز سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور ایک گائیڈ نے مجھے کچن کے عقب میں بنے ہوئے دفتر تک پہنچا دیا۔ میری توقع کے مطابق وہ ٹائیگر چاؤ نہیں تھا۔

”چن یانگ بن۔ تم یہاں کس لیے آئی ہو۔ جب سے ہمارا کاروباری تعلق ختم ہوا ہے، اس کے بعد میں نے تمہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا۔“ چھوٹے بھائی سی سی چانگ نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دوسرا بھائی ٹی ٹی چانگ بھی وہاں موجود تھا لیکن وہ اس طرح لا تعلق بنا بیٹھا رہا جیسے اس کے پاس میرے لیے کوئی وقت نہ ہو۔ گائیڈ کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

”میں یہاں کھانا کھانے نہیں آئی۔ البتہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں حال ہی میں بھاری مالی نقصان ہوا ہے۔“

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ سی سی یانگ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی، ہم.....“

”معاف کرنا، میں ذرا جلدی میں ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ابھی مجھے بہت سے کام کرنا ہیں۔ تمہیں مالی نقصان ہوا ہے اور میں جانتی ہوں کہ یہ رقم کہاں گئی اور تمہیں بھی اس کا پتا ہے۔“

سی سی چانگ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کے بھائی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنی ٹانگیں سیدھی کیں اور میری جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم اس بارے میں کچھ جانتی ہو تو بہتر ہو گا کہ ہمیں ابھی سب کچھ بتا دو۔“

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”شاید تمہاری تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ورنہ یہ دھمکی آمیز لہجہ اختیار نہ کرتے۔ میں یہاں کیوں آئی ہوں۔ صرف یہی بتانے کے اس بارے میں کیا جانتی ہوں۔“

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گئی اور ٹی ٹی چانگ سمجھ گیا کہ میں اس کے دوبارہ کرسی پر بیٹھنے تک کچھ نہیں بولوں گی۔ جب وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تو میں نے کہنا شروع کیا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ یہ رقم جیرالڈ نے چرائی ہے اور تم نہیں سمجھتے کہ وہ مر چکا ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ اس نے مرنے کا ڈراما اس لیے رچایا کہ تمہاری رقم چوری کر سکے۔ تم کسی حد تک صحیح ہو لیکن ایک بات بھول گئے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ تم یہ ریسٹورنٹ چلا رہے ہو، اب یہاں کا کھانا پہلے جیسا نہیں رہا، میرے شوہر کے زمانے میں لوگ دور دور سے یہاں کھانا کھانے آتے

”شناخت کرنے والا کون تھا؟ اس کا بیٹا یا بہو؟“

”مجھے یاد نہیں لیکن میں دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کمپیوٹر کی طرف مڑا اور اس پر چند الفاظ ٹائپ کرنے کے بعد بولا۔ ”لاش کی شناخت اس کے کزن ٹائیگر چاؤ نے کی تھی۔“

میں نے یونگ کا شکر یہ ادا کیا اور گھر چلی آئی۔ دوسری صبح مجھے ڈاک سے جیرالڈ کا بھیجا ہوا سرخ لفافہ مل گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور اسے سمجھ کا نمبر ملایا۔ وہ صبح سویرے میری آواز سن کر پریشان ہو گیا اور بولا۔ ”مسز چن خیریت تو ہے۔ لائیڈ یا ٹھیک ہے نا؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اس وقت وہ یہاں نہیں ہے۔ مجھے ایک معاملے میں تمہاری مدد چاہیے۔“

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”میں تمہیں ایک لفافہ بھیج رہی ہوں۔ اس پر جو انگلیوں کے نشانات ہیں، میں جانتا چاہتی ہوں کہ وہ کس کے ہیں۔“

”تم نے مجھے کیوں فون کیا۔ یہ بات اپنی بیٹی سے کیوں نہیں کی؟“

”میں یہ ضروری نہیں سمجھتی۔ تم چاہو تو اسے بتا سکتے ہو۔“

مجھے دو دن انتظار کرنا پڑا۔ بل اسے کی رپورٹ توقع کے مطابق تھی۔ میرے لیے یہ اطلاع اس لیے بھی مفید تھی کہ اس طرح میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ گوکہ بل اسے کی رپورٹ کے بغیر ہی میں یہ کیس حل کر چکی تھی اور اس نے مجھے محض ایک ثبوت ہی فراہم کیا تھا۔

”مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوئی مسز چن۔“ اس نے مجھے فون پر کہا۔ ”کیا میں تمہیں تحریری رپورٹ بھیج دوں۔“

”ہاں، وہ رپورٹ مجھے بھیجنا، میری بیٹی کو نہیں اور لفافے پر تمہارا نام بھی نہیں ہونا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔ کیا تم بتاؤ گی کہ یہ کس بارے میں ہے؟“

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ بہت بہت شکر یہ اور خدا حافظ۔“ میں نے رکھائی سے کہا۔

تحریری رپورٹ کی صورت میں ایک مستند ثبوت مل جاتا لیکن فی الحال مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ایک بار پھر باہر جانے کے لیے تیار ہوئی۔ گھر کو تالا لگایا اور مومن لائنٹ ریسٹورنٹ کی جانب چل دی، ڈائنگ ہال میں پہنچ کر میں نے



دیکھنے لگا۔ سی سی چانگ نے آہستہ سے کہا۔ ”ٹائیگر چاؤ نے ہمیں بتایا تھا کہ اسے جیرالڈ پر شبہ ہے۔ گوکہ وہ اپنے کزن پر الزام لگانا پسند نہیں کرتا لیکن اس کی بنیادی وقاداری ہم سے ہے۔“

”اگر یہ بات تھی تو یونگ لی نے کیسے یقین کر لیا کہ جس لاش کی وہ آخری رسومات ادا کر رہا ہے، وہ جیرالڈ کی ہے۔“

”ٹائیگر چاؤ کا کہنا تھا کہ جیرالڈ کی باقیات کو اس کے ایک اور کزن نے شناخت کیا تھا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ جیرالڈ نے اپنے اس کزن کو پانچ ہزار ڈالر دیے تھے تاکہ وہ اس لاش کی شناخت کے بارے میں جھوٹ بولے۔ ٹائیگر چاؤ نے اس کزن سے مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔“

”تمہیں غلط معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ٹائیگر چاؤ کی کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی اور جس کزن نے جیرالڈ کی لاش شناخت کی وہ خود ٹائیگر چاؤ ہی تھا۔“

”یہ سچ نہیں ہے۔“ ٹی ٹی چانگ نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”تمہارے لیے بہت آسان ہے کہ حقائق کو جھٹلا دو لیکن سچ یہی ہے کہ ٹائیگر چاؤ نے تمہاری رقم چرائی تھی۔ میرے پاس بینک ریکارڈ ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک بینک اکاؤنٹ ایسا ہے جو اس کے اپنے نام پر نہیں۔ امریکا میں ایسا ہوتا ہے اور ایسے اکاؤنٹ کے ساتھ مختلف نمبر جڑے ہوتے ہیں جن سے بالآخر اصل مالک کا پتا چل جاتا ہے۔“

”یہ تم نے معلوم کیا ہے تم نے.....“ ٹی ٹی چانگ اس طرح بولا جیسے میں نے کوئی غیر یقینی بات کہہ دی ہو۔ ”تم یہ سب کس طرح کر سکتی ہو؟“

”شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میری بیٹی ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہے۔ میں اکثر اس کے ساتھ کام کرتی ہوں اور ایک ذہین سراغ رساں کے لیے کسی خفیہ اکاؤنٹ کا پتا لگانا کوئی مشکل کام نہیں لیکن اس اکاؤنٹ کے بارے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات اس میں موجود رقم ہے۔“

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گئی۔ اس مرحلے پر تھوڑا ڈرامائی انداز اختیار کرنا چاہ رہی تھی اور یقین کرنا چاہتی تھی کہ دونوں بھائی میری بات توجہ سے سن رہے ہیں۔ میں نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔ ”تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ چاؤ کے خفیہ اکاؤنٹ میں ساڑھے چار لاکھ ڈالر

”برائے مہربانی کھل کر بات کرو۔ تم اس بارے میں کیا جانتی ہو۔“ سی سی چانگ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنے بھائی کو اس طرح دیکھا جیسے اسے خاموش رہنے کے لیے کہہ رہا ہو۔ ٹی ٹی چانگ دانت پیس کر رہ گیا۔

”مجھے جیرالڈ کے بھوت نے فون کیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اور یہ بات تم پہلے سے جانتے ہو کیونکہ راؤنڈ چونگ کا سیکریٹری یہاں آیا تھا اور اس نے تمہیں سب کچھ بتا دیا۔ اس کے بعد ہی تم نے ٹائیگر چاؤ کو جیرالڈ کی تلاش میں ہالی وڈ کیلی فورنیا بھیجا۔“

دونوں بھائیوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں میری معلومات پر حیرت ہو رہی تھی لیکن وہ خاموش رہے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”بد قسمتی سے ٹائیگر چاؤ کا یہ طویل سفر انکاں گیا کیونکہ جیرالڈ ہالی وڈ میں نہیں ہے۔“

”لیکن تم نے تو کہا تھا.....“ ٹی ٹی چانگ نے بولنا شروع کیا۔

”ہاں، میں نے دو وجوہات کی بنا پر راؤنڈ چونگ سے جھوٹ بولا تھا۔ پہلی وجہ تو یہ کہ میں اپنے شہرے کی تصدیق کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ تمہیں جیرالڈ کی جگہ کے بارے میں باخبر کر دے گا۔ تم اس کے یا اس کے ساتھیوں کے ساتھ کاروبار کرتے ہو لہذا اس نے بھی اپنے سیکریٹری کو اس اطلاع کے ساتھ یہاں بھیج کر تم پر احسان کیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب میں یہاں آؤں تو ٹائیگر چاؤ موجود نہ ہو۔“

”تم ایسا کیوں چاہ رہی تھیں؟“ سی سی چانگ نے پوچھا۔

”کیونکہ یہ ٹائیگر چاؤ ہی ہے جس نے تمہاری رقم چرائی تھی۔“

”ناممکن۔“ ٹی ٹی چانگ نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ٹائیگر چاؤ کئی سالوں سے ہمارا دوست اور بااعتماد ملازم ہے۔ یہ رقم جیرالڈ نے ہی چرائی ہے۔“

”اوہ، گویا تم اعتراف کرتے ہو کہ تمہاری رقم چوری ہوئی ہے، شکریہ۔ اب یہ گفتگو تیزی سے آگے بڑھ سکے گی۔ اب میں ایک سوال کرتی ہوں۔ تمہیں یہ شبہ کیونکر ہوا کہ جیرالڈ مرا نہیں بلکہ تمہاری رقم لے کر فرار ہو گیا ہے؟“

ٹی ٹی چانگ نے ایک بار پھر مجھے گھورا جیسے اسے میرا سوال پسند نہ آیا ہو لیکن کچھ کہنے کے بجائے بھائی کی طرف



میں نے چانگ برادرز کے ساتھ بہت تھوڑا وقت گزارا لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا جب میں وہاں سے رخصت ہوئی تو دونوں بھائی ٹائیگر چاؤ سے کافی ناراض نظر آ رہے تھے اور اب وہ اس پہلو پر غور کر رہے تھے کہ بل اسمتھ کی رپورٹ میں بیان کردہ ثبوتوں کی تصدیق کر کے ٹائیگر چاؤ کے خفیہ اکاؤنٹ کا کس طرح پتا چلایا جائے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتا چاہ رہے تھے کہ کس شخص کی لاش کو جبرالڈ کے طور پر شناخت کر کے دفنایا گیا لیکن یہ میرا کیس نہیں تھا البتہ میں یقین سے کہہ سکتی تھی کہ واپس آنے کے بعد ٹائیگر چاؤ کے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔

اس معے کے حل ہو جانے کے بعد جبرالڈ کی پریشانی ختم ہو گئی تھی۔ پہلے مجھے یقین نہیں تھا کہ اس کا بیٹا ولیم اور بہو کس طرح ایک بھوت کو اپنے گھر میں رکھنے اور اسے اپنے نومولود بچے کا دادا سمجھنے پر تیار ہو سکتے ہیں لیکن میری اس کامیابی کے بعد جبرالڈ بھوت نہیں بلکہ ایک زندہ انسان کے طور پر اس دنیا میں واپس آ گیا تھا۔ اس کے بیچے ہوئے پچاس ہزار ڈالر میں نے چانگ برادرز کو دے دیے تھے اور اس کے ساتھ ہی بل اسمتھ کی رپورٹ کی نقل بھی انہیں پکڑا دی تھی تاکہ وہ بقیہ ساڑھے چار لاکھ ڈالر کی برآمدگی کے لیے کارروائی کر سکیں۔ البتہ اس پر سے بل اسمتھ کا نام مٹا دیا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری بیٹی کسی طرح اس معاملے میں ملوث ہو۔

چانگ برادرز نے انعام کے طور پر مجھے ایک معقول رقم دینا چاہی لیکن میں نے اسے لینے سے انکار کر دیا کیونکہ میں ان کے لیے نہیں بلکہ جبرالڈ کے لیے کام کر رہی تھی اسی لیے میں نے اس کی دی ہوئی فیس شکر پیسے کے ساتھ قبول کر لی گوکہ میں اب بھی نہیں چاہتی کہ میری بیٹی سراغ رساں کے طور پر کام کرے اور مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ میری اس تجویز سے ضرور اتفاق کرے گی کہ اسے زندگی گزارنے کے لیے کوئی ایسا باعزت پیشہ اختیار کرنا چاہیے جو عورتوں کے لیے مناسب ہو اور اس میں زیادہ خطرات نہ ہوں تاہم اس وقت تک کے لیے میں نے اس کے دفتر کی تزئین و آرائش کروادی ہے تاکہ جو لوگ اس کی خدمات حاصل کرنا چاہیں، انہیں وہاں جا کر کوئی شرمندگی نہ ہو۔ اب اگر کسی نے مجھ سے اس کے دفتر کا پتا اور فون نمبر مانگا تو بخوشی دے دوں گی کیونکہ بیٹی کے جانے کے بعد مجھے ہی وہاں بیٹھنا ہے۔

چانگ برادرز نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے چہرے حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

”تمہاری کشیدہ رقم جس کے بارے میں تمہیں شبہ ہے کہ وہ جبرالڈ نے چرائی، وہ پانچ لاکھ ڈالر تھی۔ اس میں سے پچاس ہزار ڈالر جبرالڈ کو دیے گئے تاکہ وہ کہیں غائب ہو جائے اور اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرے۔ اس نے ان تمام واقعات کی تفصیل اپنی مہر کے ساتھ مجھے لکھ کر بھیجی ہے جن کے تحت اسے یہاں سے جانا پڑا۔ یہ تحریر میرے قبضے میں ہے لیکن اس وقت میرے پاس نہیں اس لیے آرام سے بیٹھے رہو اور مجھے اپنی بات ختم کرنے دو۔ یہ پچاس ہزار ڈالر ٹائیگر چاؤ نے ہی جبرالڈ کو دیے تھے۔“

”جن یا ٹنگ یں۔“ سی سی چانگ نے کہا۔ ”تم ایک مفروضہ شخص کی تحریر کی بنیاد پر کسی پر چوری اور دھوکا دہی کا الزام ثابت نہیں کر سکتیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں کسی ثبوت کے بغیر اتنا بڑا الزام عائد کر سکتی ہوں۔ اگر ثبوت نہ ہوتا تو یہاں کیوں آتی۔ جس لفافے میں رکھ کر جبرالڈ کو پچاس ہزار ڈالر دیے گئے۔ اس پر ٹائیگر چاؤ کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ جب تمہیں جبرالڈ پر چوری کا شبہ ہوا تو تم نے ٹائیگر چاؤ کو اسے تلاش کرنے کے لیے میامی فلوریڈا بھیجا کیونکہ تمہیں معلوم تھا کہ اسے وہ جگہ بہت پسند ہے اور مجھے یقین ہے کہ ٹائیگر چاؤ نے ہی تمہیں یہ یاد دلایا ہوگا۔“

ان دونوں بھائیوں کے تاثرات دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹائیگر چاؤ نے واپس آ کر تمہیں بتایا کہ جبرالڈ میامی میں نہیں ہے جبکہ وہ وہیں موجود تھا۔“

”لیکن ٹائیگر چاؤ تو اسے تلاش نہیں کر سکا۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ جبرالڈ جیسا بے وقوف شخص ٹائیگر چاؤ سے چھپ سکتا ہے۔ یقیناً چاؤ نے اسے تلاش کر لیا تھا لیکن وہ اسے یہاں تمہارے پاس واپس لانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو تم جبرالڈ سے اپنے پیسوں کی واپسی کا تقاضا کرتے جو اس کے پاس نہیں تھے اور جب وہ یہ بتاتا کہ اسے کسی نے پچاس ہزار ڈالر کے عوض روپوش ہونے اور اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرنے کے لیے کہا تھا تو پھر تم اصل چور کی تلاش شروع کر دیتے۔ ٹائیگر چاؤ کی اسکیم ہی یہی تھی کہ تمہیں جبرالڈ کے زندہ ہونے کا یقین دلایا جائے اور جبرالڈ بھی غائب رہے۔“





رشتہ کسی بھی نوعیت کا ہو... اسے قائم و دائم رکھنے کے لیے اعتماد انتہائی ضروری ہے... اعتماد و اعتبار کے بغیر رشتے کبھی بھی نہیں پنپ سکتے... رشتوں کی بقا کے لیے اعتماد و احترام ہی بنیادی شرائط ہیں... جب کبھی یہ اعتماد اٹھ جاتا ہے تو مضبوط سے مضبوط بندھن بھی کچی ڈور کے مانند ایک پل میں ٹوٹ جاتا ہے... اس ٹوٹی ڈور میں چاہے کتنی ہی گرہیں کیوں نہ لگادی جائیں وہ ڈور پہلے جیسی مضبوط اور پائدار نہیں بن سکتی... جس طرح شیشے میں آیا بال نہیں نکالا جاسکتا... بالکل اسی طرح کھویا ہوا... ٹوٹا ہوا اعتماد بحال کرنا بھی قطعی ممکن نہیں... ایسے ہی کچے دھاگوں کے مانند کرداروں کے بنتے بگڑتے رشتوں کی پل پل رنگ بدلتی داستان...

عقل باطن کی گہرائیوں سے ہم کلام ہو تو ہر شخص خواہشات سے بالاتر ہو جاتا ہے... طاستور انسان کے نافرست تیلے کی بربادی...

اسلام آباد کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر چیکنگ کے مراحل سے گزرتا ہوا وہ پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کے کندھے سے ایک درمیانے سائز کا سفری بیگ لٹک رہا تھا۔ اس بیگ کے علاوہ وہ کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ اپنے پیاروں کے لیے خریدے گئے بے شمار قیمتی تحائف وہ لندن کے ایک فلیٹ میں چھوڑ کر آ گیا تھا۔ اُن تحائف کو ساتھ لانے کی اب ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ جب تحفہ لینے والے ہی اس دنیا میں نہیں رہے تو وہ بے جا سوسائٹی ڈائجسٹ



”کیوں؟“ سلیم نے اُلجھ کر پوچھا۔  
 ”کس کے لیے لاتا اور کیوں لاتا؟“ اُس نے کرب  
 کے عالم میں اُلٹا سوال کر دیا۔ ”جب اُن میں سے کوئی بچا  
 ہی نہیں تو تحائف کا کیا کرتا؟“  
 ”میری بہن تو زندہ ہے ناں! اُس کے لیے ہی کچھ  
 لے آتے۔“

”اُسے کس چیز کی کمی ہے اور پھر ایسی صورت حال میں  
 اپنے ساتھ کچھ لے کر آنا مجھے مناسب نہیں لگا۔ لوگ باتیں  
 بنا نہیں گے کہ ساری فیملی تو موت کے گھاٹ اُتر گئی اور میں  
 بیوی کے لیے غیر ملکی تحائف لے کر آ گیا۔ کیا تمہیں یہ  
 مناسب لگتا ہے؟“

”سوری عاصم بھائی۔“ اُس نے معذرت کی۔ ”مجھے ایسا  
 سوال پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہ موقع نامناسب ہے۔ بس  
 ایسے ہی زبان سے نکل گیا تھا، تم نے محسوس تو نہیں کیا ناں؟“  
 وہ بولا۔ ”تمہارا قصور نہیں ہے سلیم! دراصل جس  
 پر گزرتی ہے پتا اُسے ہوتا ہے۔ میں گزشتہ کئی گھنٹوں سے  
 جس کرب سے گزر رہا ہوں، اُس کا اندازہ کوئی دوسرا کیسے  
 لگا سکتا ہے؟ ظاہر ہے تم بھی میرا دکھ محسوس نہیں کر سکتے اس  
 لیے مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔“

ایک لمحے کے لیے سلیم کے چہرے پر شرمندگی کے  
 آثار نمودار ہوئے مگر دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئے۔ وہ  
 نہایت ہی مضبوط اعصاب کا مالک تھا اور اُسے اپنے  
 احساسات و جذبات پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ چنانچہ وہ  
 سنبھلتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا دکھ بھلا میں کیوں محسوس نہیں کر  
 سکتا۔۔۔ خدا کی قسم جتنا دکھ مجھے ہوا ہے اتنا شاید ہی تمہارے  
 کسی اور دوست نے محسوس کیا ہو۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ  
 میں تمہاری طرح فطری طور پر اس دکھ کی شدت محسوس کرنے  
 سے قاصر ہوں۔ وجہ تم جاننے ہو کہ مرنے والوں سے تمہارا  
 خون کا رشتہ تھا جب کہ میرا محض زبانی کلامی رشتہ تھا۔ ظاہر  
 ہے اُن کا دکھ کوئی بھی تمہاری طرح شدت کے ساتھ محسوس  
 نہیں کر سکتا، چاہے وہ میں ہوں یا کوئی دوسرا؟“

”اگر تمہیں بھی اُن کے ساتھ ماری جاتی تو تب  
 تمہارے تاثرات کیا ہوتے۔ کیا اُس کے مرنے کا بھی تمہیں  
 اتنا ہی دکھ ہوتا جتنا مجھے؟“ اُس نے طنز سے پوچھا۔

”اللہ نہ کرے۔“ وہ تڑپ اُٹھا۔ ”ورنہ زندہ تو میں بھی  
 نہ رہتا اور تم بھی خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ زندہ اور سلامت ہے۔“  
 ”کیوں... تم کس لیے مر جاتے۔ تمہارا اُس سے  
 کون سا خون کا رشتہ ہے؟“

کون سا خون کا رشتہ ہے؟

وہ بوجھل قدموں سے پارکنگ ایرے کی طرف بڑھ  
 رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی اور دکھ کی ملی جلی کیفیت  
 طاری تھی۔ آنکھیں یوں متورم نظر آ رہی تھیں جیسے وہ بہت  
 دیر تک روتا رہا ہو۔ وہ ایک خوب گُرو اور قد آور نوجوان تھا۔  
 سُرخ و سفید چہرے پر مٹنی مٹھیں اُس کی مردانہ وجاہت  
 میں اضافہ کر رہی تھیں۔ مگر اُس وقت اُس کی حالت نہایت  
 ہی ابتر تھی۔ لباس مسلا ہوا، سر کے بال اُلجھے ہوئے اور شیو  
 بڑھی ہوئی تھی۔ ارد گرد کے ماحول سے لاتعلقی سا ہو کر جو نبی  
 وہ پارکنگ ایرے میں داخل ہوا، ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا  
 اور والہانہ انداز میں اُس سے لپٹ گیا۔

”عاصم میرے دوست میرے بھائی! یہ... یہ... کیا ہو  
 گیا ہے... کاش... کاش... ایسا نہ ہوا ہوتا... سب میرا قصور  
 ہے۔ میں اگر غفلت کا مظاہرہ نہ کرتا... تو شاید یہ جگر پاش سانحہ  
 رونمانہ ہوا ہوتا... میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کبھی  
 معاف نہیں کروں گا۔ دراصل میں ہی اُن سب کا قاتل ہوں۔“  
 نوجوان کی آواز شدت غم سے لرز رہی تھی۔

”نہیں سلیم نہیں۔“ وہ رنجیدہ آواز میں بولا۔ ”اس  
 میں تمہارا بھلا کیا قصور ہے؟ یہ سب تو تقدیر کا کھکھاتھا۔ تم  
 اگر اُس وقت اُن کے ساتھ ہوتے بھی تو کیا کر لیتے؟“

وہ بولا۔ ”اُن کے ساتھ مر تو سکتا تھا۔ تم مجھے اپنے گھر  
 کی حفاظت سونپ کر گئے تھے۔ میں نے کوتاہی کی ہے۔“

”تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا میرے دوست! یہ سب  
 فضول کی باتیں ہیں۔ اب چلو میں یہاں تماشا بننا نہیں  
 چاہتا۔ بہت سے لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔“

”اوکے۔“ سلیم نے جیب سے رومال نکال کر اپنی  
 پلکیں صاف کیں۔ ”تم ادھر ہی ٹھہرو، میں گاڑی نکال کر لاتا  
 ہوں۔“

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا جبکہ سلیم اپنی گاڑی کی  
 طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ گاڑی نکال کر لے آیا۔  
 عاصم کے سامنے گاڑی روکنے کے بعد اُس نے فرنٹ سیٹ  
 کی کھڑکی کھول دی۔ عاصم نے کندھے سے بیگ اُتار کر  
 اُسے گاڑی کی عقبی سیٹ پر پھینکا اور خود سلیم کے ساتھ فرنٹ  
 سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سلیم نے گیر لگاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا  
 دی۔ کھلی شاہراہ پر پہنچتے ہی سلیم نے سوال کیا۔ ”کیا تم خالی  
 ہاتھ آئے ہو یا پھر بانی سامان...“

”بس یہی بیگ ہے اور کچھ بھی نہیں لایا۔“ اُس نے

سپاٹ آواز میں قطع کلامی کی۔



یہ سوال بالکل غیر متوقع تھا۔ سلیم کے چہرے پر سے ایک رنگ سا آکر گزر گیا اور دل پہلو میں بے اختیار دھڑک اٹھا۔ بات اُسے تیر کی طرح لگی تھی مگر موقع مناسب نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ عاصم اس وقت بے انتہا کرب و اذیت سے گزر رہا ہے ورنہ وہ اُسے کھری کھری سنا دیتا۔ تاہم اک ذرا توقف سے وہ بولا۔ ”میں مانتا ہوں کہ میرا شہینہ سے خونی رشتہ نہیں ہے۔ میں صرف اُس کا منہ بولا بھائی ہوں لیکن تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا رشتہ خونی رشتے سے بھی بڑھ کر ہے۔ میں نے ہمیشہ اُسے سگی بہن ہی سمجھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم اس رشتے کو کس نظر سے دیکھتے ہو مگر خدا جانتا ہے کہ اگر اُسے کچھ ہو جاتا تو سب سے زیادہ دکھ بھی مجھے ہی ہوتا۔“

عاصم نے کہا۔ ”یہی وہ درد ہے جو میں گزشتہ چوبیس گھنٹے سے برداشت کر رہا ہوں۔ میرا وجود اندر سے ریزہ ریزہ ہو چکا ہے مگر میں پھر بھی زندہ ہوں۔ تم پر گزری نہیں اور تم مرنے کی بات کر رہے ہو۔“

”عاصم بھائی! میں ایک بار پھر آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ بس یوں ہی بے خیالی میں تم سے سامان کے متعلق پوچھ بیٹھا ورنہ یقین مانو اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔“

”میں جانتا ہوں... تمہیں صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اُس نے سیٹ سے پشت لگاتے ہوئے جواب دیا اور پھر آنکھیں موند لیں۔

وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ گزشتہ کئی گھنٹے اُس نے بے آرامی اور پریشانی کے عالم میں گزارے تھے۔ کوشش کے باوجود نیند کی دیوی اُس سے خفا ہی رہی تھی۔ اُس کا سارا بدن کسی پکے ہوئے پھوڑے کی طرح ڈکھ رہا تھا اور سردرد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا مگر نیند اب بھی اُس پر مہربان نہیں ہو رہی تھی۔ تاہم گزرے دنوں کی یادیں کسی فلم کی طرح اُس کے دماغ میں گردش کرنے لگی تھیں۔ ایک کے بعد ایک منظر تو اتر سے بدلتا جا رہا تھا۔ یاد ماضی کسی عذاب کی صورت اُس پر نازل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اس اندوہ ناک اور خونچکاں واقعے کی اطلاع اُسے سلیم ہی نے دی تھی۔ سلیم نہ صرف یہ کہ اُس کا گہرا دوست تھا بلکہ گزشتہ پانچ برس سے وہ اُس کی بیوی شہینہ کا منہ بولا بھائی بھی بنا ہوا تھا۔ اُس نے کبھی دوست اور بیوی کے اس رشتے کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ باتیں کرنے والے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ وہ

ہر ممکن طریقے سے اُس کے کان بھرتے رہتے تھے مگر وہ کسی کی بات کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ سلیم اُس کا محسن تھا اور محسن پر شک کرنا اُس کے نزدیک گناہ تھا۔

پانچ برس قبل سلیم نے اُسے باہر بھجوانے کا بندوبست کیا تھا۔ اُس کے لیے رقم اور پاسپورٹ کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ دیارِ غیر میں اُسے ملازمت دلانے تک، سب سلیم ہی کی کاوشوں کے طفیل ممکن ہو سکا تھا۔ چنانچہ وہ سلیم پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ اُس کے خلاف کوئی بھی ایسی ایسی بات سننا اُسے گوارا نہیں تھا۔ پانچ برس قبل اُس کے گھریلو حالات انتہائی ابتر تھے۔ دس بارہ افراد پر مشتمل کنبے کا وہ واحد کفیل تھا۔ اس کنبے میں اُس کی ایک بیوہ بہن اور تین بچے بھی شامل تھے۔ دیگر افراد میں ماں باپ، ایک بھائی اور دو بہنیں شامل تھیں۔ بھائی اور بہنیں چونکہ ابھی زیر تعلیم تھے۔ لہذا اُن کا بوجھ بھی اُس کے کندھوں پر تھا۔ اُن دنوں وہ ایک ریڈی میڈ گارمنٹس فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ تنخواہ نہایت ہی قلیل تھی۔ گزراوقات بہت مشکل سے ہو رہی تھی۔ اکثر اوقات وہ مقروض رہتا تھا۔ کبھی کبھار تو نویت یہاں تک آ جاتی تھی کہ محلے کا دکان دار اُسے ادھار دینے سے بھی انکار کر دیتا تھا۔ تب اُسے دکان دار کی منت سماجت کرنا پڑتی تھی۔ اُس کی زندگی شرمندگی کی صورت بسر ہو رہی تھی کہ ایک دن اچانک سلیم کسی فرشتے کے روپ میں اُس سے ٹکرا گیا۔

اُس روز وہ محلے کے جنرل اسٹور سے کچھ چیزیں خرید رہا تھا کہ رقم کم پڑ گئی۔ مل تیرہ سو روپے کا بنا تھا۔ جب کہ اُس کی جیب میں ایک ہزار روپے کا اکھوتا نوٹ تھا۔ اُس نے پریشانی کے عالم میں جیب سے نوٹ نکالا اور شرمندہ سا ہو کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔ ”انکل! مہربانی فرما کر باقی تین سو روپے میرے کھاتے میں لکھ دیں۔ میں ان شاء اللہ بہت جلد یہ ادھار چکا دوں گا۔“

”نہ میاں نہ۔“ جنرل اسٹور کے مالک انکل نذیر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”پہلے ہی تمہارا ادھار تمہاری استطاعت سے تجاوز کر چکا ہے۔ اب میں مزید ادھار نہیں دے سکتا... بالکل نہیں دے سکتا۔“

”پلیز انکل پلیز۔“ اُس نے منت کی۔ ”ایسا نہ کریں میں آپ کی پائی پائی چکا دوں گا۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے مجھے...“

”قارون کا خزانہ ملنے والا ہے۔“ انکل نذیر نے طنزیہ انداز میں قطع کلامی کی۔ ”ملازمت تو اب تمہاری رہی نہیں تو میرا ادھار کیسے چکا کرو گے۔ ڈاکا ڈالو گے یا پھر



نذیر کی زبانی گندی گالیاں سن کر وہ ہتھے سے اٹھ گیا اور آگے بڑھ کر اُسے مزید دو تین جھانپڑ رسید کر دیے۔ تب تماشا یوں میں سے چند لوگوں نے مداخلت کرتے ہوئے عاصم کو جکڑ لیا۔ اُس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو اُسے جکڑنے والوں میں سے ایک نوجوان قدرے سخت انداز میں بولا۔ ”کنٹرول پور سیلف یار! یہ حماقت تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔ ابھی یہاں پولیس پہنچ گئی تو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔ پلیز خود کو سنبھالو۔“

پولیس کا ذکر سن کر اُس نے اپنی جدوجہد ترک کر دی۔ تب نوجوان دوبارہ بولا۔ ”میں تمہارا ہمدرد ہوں اس لیے جو میں کہوں اُس پر عمل کرنا اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ ورنہ یہ پولیس کیس بن جائے گا۔“

اس کے بعد اُسی نوجوان کے اشارے پر عاصم کو چھوڑ دیا گیا۔ ہجوم آہستہ آہستہ چھٹنے لگا کہ اب وہاں لوگوں کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں رہا تھا۔ تاہم چند ایک لوگ بدستور انکل نذیر کو گھیرے اُس سے سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا کام ہمیشہ بھڑکتی پرتیل ڈالنے والا ہوتا ہے۔ بظاہر اپنی باتوں سے یہ لڑنے والے فریقین کو اپنے ہمدرد نظر آتے ہیں۔ مگر ان کا اصل کام تماشا دیکھنا ہوتا ہے۔ یہ کسی کے بھی ہمدرد نہیں ہوتے بس آگ لگا کر تماشا دیکھتے ہیں کہ اسی میں ان کو تسکین ملتی ہے۔ ہجوم کے چھٹتے ہی نوجوان نے عاصم کا کندھا تھپتھپایا۔ ”تم یہیں ٹھہرو، میں معاملہ سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی شر پسند شخص جزل اسٹور کے مالک کو بھڑکا دے اور معاملہ پولیس اسٹیشن تک پہنچ جائے۔“

عاصم نے اثبات میں سر ہلا دیا اور نوجوان انکل نذیر کی طرف بڑھ گیا۔ ”جناب! آپ مجھے چند منٹ دیں گے؟ میں آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

انکل نذیر نے بھڑک کر کہا۔ ”اگر تم اُس غنڈے کے حمایتی بن کر آئے ہو تو پھر میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ میں اسے جیل کی ہوا کھلا کر ہی رہوں گا۔ دادا گیری کرتا ہے اور وہ بھی انکل نذیر کے سامنے۔ میں نے کوئی چوڑیاں تو نہیں پہنی ہوئیں؟ اب تو میں اسے مزہ چکھا کر ہی چھوڑوں گا۔“

”آپ پہلے میری بات تو سن لیں پھر جودل چاہے کرنا میں آپ کو نہیں روکوں گا۔“

”بولو۔“ انکل نذیر نے کہا جانے والے انداز میں کہا۔ ”میں سن رہا ہوں۔“

”کہیں چوری کرو گے؟“

”انکل! میں کوشش کر رہا ہوں۔ بہت جلد مجھے نئی ملازمت مل جائے گی۔“ اُس نے مشکل سے غصہ ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں میاں نہیں، بہت ہو چکا ادھار۔ جب تک تم پہلے والا ادھار چکا نہیں دیتے تب تک میں مزید ادھار کسی صورت بھی نہیں دوں گا۔“

”انکل! میں محلہ چھوڑ کر بھاگ تو نہیں جاؤں گا۔“ اُس نے احتجاج کیا۔ ”پہلے بھی کئی بار میں نے آپ کا ادھار چکا یا ہے۔ اب بھی چکا دوں گا۔ میں کوئی چور اچکا تو نہیں ہوں کہ کہیں روپوش ہو جاؤں گا۔“

”واہ بھئی واہ۔“ انکل نذیر نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچایا۔ ”ایک تو ادھار اور اوپر سے دھونس... جاؤ میاں جاؤ مجھے سودا بیچنا ہی نہیں ہے۔ جا کر کوئی اور دکان دیکھو۔ دکان نہ ملے تو داتا دربار پر چلے جانا۔ خود بھی پیٹ بھر کر کھا لینا اور گھر والوں کے لیے بھی لے جانا۔“

”انکل! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔“ وہ چلایا۔ ”میری غربت پر طنز کر رہے ہیں۔ سودا نہیں بیچنا تو دکان کیوں کھول رکھی ہے۔ گھر میں بیٹھ کر آرام کیوں نہیں کرتے؟“

”بک بک بند کرو۔“ انکل نذیر ایک دم بھڑک گیا۔ ”نوٹ اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

”سودا لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“ اُسے بھی طیش آ گیا اور پھر اسی عالم میں اُس نے کاؤنٹر پر رکھا ہوا شاپنگ بیگ اٹھا لیا جس میں اُس کی خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔ ”شاپنگ بیگ رکھ دو۔“ انکل نذیر آستینیں چڑھاتے ہوئے کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر سامنے آ گیا۔ ”یہ غنڈا گردی کسی اور کو دکھانا۔“

”نہیں رکھتا، کیا کر لو گے؟“ جوابادہ پھنکارا۔

”تیری تو میں...“ انکل نذیر ایک گندی سی گالی دیتے ہوئے شاپنگ بیگ پر جھپٹا مگر یہ جرات اُسے مہنگی پڑ گئی۔ سامنے چھ فٹ کا نوجوان تھا۔ جیب خالی تھی تو کیا ہوا بازوؤں میں تو دم تھا۔ اُس نے ہاتھ گھمایا اور انکل نذیر کاؤنٹر سے جا کھرایا۔

آن کی آن میں وہاں تماشا دیکھنے والے لوگوں کا ایک ہجوم سا اکٹھا ہو گیا۔ انکل نذیر تھپڑ کھا کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اب وہ عاصم کو نہایت گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ لوگ معاملہ جاننے کے لیے دونوں سے سوالات کر رہے تھے مگر وہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ انکل



”یہاں نہیں، اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“ نو جوان نے انکل نذیر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”آرام سے بات کریں گے۔“  
”تم شاید اُسے بھگانا چاہتے ہو؟“ اُس نے شک کا اظہار کیا۔

”وہ بھاگ کر کہاں جاسکتا ہے۔ اسی محلے کا تو رہنے والا ہے۔“ نو جوان مسکرایا اور پھر منت سماجت کرتے ہوئے اُسے جہز ل اسٹور کے اندر لے گیا۔  
”بیٹھو۔“ اندر پہنچ کر انکل نذیر نے بادل ناخواستہ ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”شکریہ۔“ وہ کرسی پر بیٹھتے ... ہوئے بولا۔  
”میرا نام سلیم ہے اور میں ایک چھوٹی سی فرم کا مالک ہوں جو باہر سے گاڑیوں کے اسپئیر پارٹس درآمد کرتی ہے۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ دونوں میں ہاتھ پائی کس وجہ سے ہوئی ہے؟“  
انکل نذیر نے تو پہلے تو اُسے گھور کر دیکھا پھر ساری کہانی بیان کر دی۔ اس کے بعد جواب طلب انداز میں بولا۔ ”اب بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”آپ بالکل حق بجانب ہیں۔“ سلیم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ”لیکن وہ نو جوان بھی مجھے مجبور اور مفلس دکھائی دیتا ہے۔ شاید اُس کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ یہی تو زندگی سے بیزار دکھائی دیتا ہے۔“

”کیا تم اُسے جانتے ہو؟“ انکل نذیر نے پوچھا۔  
”نہیں، مجھے تو اُس کا نام بھی معلوم نہیں ہے۔“

”عاصم... پورا نام عاصم رشید ہے غبیث کا۔“ انکل نذیر نے تحقیر آمیز انداز میں بتایا۔ ”ملازمت چھوٹ چکی ہے اور اب سارا سارا دن ادارہ گردی کرنے کے ساتھ ساتھ غنڈا گردی بھی کرنے لگا ہے۔“

”اوکے۔“ سلیم نے سر ہلایا۔ ”اُس کے ذمے کتنی رقم ہے آپ کی؟“

”پچیس سو روپے۔“ انکل نذیر نے چونک کر بتایا۔  
سلیم نے جیب سے والٹ نکالا اور پھر اُس میں سے پچیس سو روپے نکال کر انکل نذیر کی طرف بڑھادیے۔ ”یہ لیں پچیس سو روپے اور معاملہ ختم کریں۔“

”نہیں۔“ انکل نذیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ معاملہ اب اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتا۔ پہلے وہ پولیس اسٹیشن جائے گا اور اُس کے بعد میں اُسے عدالت میں گھسیٹوں گا۔ اُس نے غنڈا گردی کی ہے۔ ہاتھ اٹھایا ہے مجھ پر، میں اُسے اتنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گا۔“

”اُس کی غنڈا گردی کا کوئی ثبوت ہے آپ کے

پاس، کوئی چوٹ، کوئی زخم یا پھر چشم دید گواہ؟“ سلیم نے پولیس والوں کے سے انداز میں پوچھا۔

”سب لوگوں نے دیکھا ہے۔ جب وہ مجھے مار رہا تھا۔ کیا ثبوت کے لیے...“

”اُن میں سے کوئی ایک بھی گواہی نہیں دے گا۔“ سلیم نے قطع کلامی کی۔ ”جب کہ میں ابھی عاصم کو ساتھ لے کر تھانے جا رہا ہوں۔ وہ آپ کے خلاف ایف آئی آر کنوائے گا اور گواہی میں دوں گا کہ آپ نے اُسے زخمی کیا ہے بلکہ جان سے ہی مارنے والے تھے کہ لوگوں نے سچ

بچاؤ کر دیا۔“ [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)  
”یہ... یہ بالکل سفید جھوٹ ہے۔“ انکل نذیر نے بوکھلا کر احتجاج کیا۔

وہ بولا۔ ”جھوٹ، جھوٹ ہوتا ہے۔ سفید یا کالا نہیں ہوتا۔ میں ابھی عاصم کو زخمی کرتا ہوں پھر دیکھتا کہ یہ جھوٹ کیسے آپ کے سچ کی دجیاں کھیرتا ہے؟ کم سے کم دو سال کی تو لگ ہی جائے گی۔“

اُس کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ انکل نذیر ایک عام شخص تھا اور کبھی تھانے کچہری کے چکروں میں نہیں پڑا تھا۔ ایک پل میں اُس کا سارا جوش و خروش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور سلیم کے ہاتھ سے نوٹ پکڑ لیے۔

سلیم نے مسکرا کر کہا۔ ”مجھے آپ کے فیصلے سے خوشی ہوئی ہے۔ خواہ مخواہ بات بڑھانے سے آپ کا اُلٹا نقصان ہوتا۔ عدالتوں کے چکر کاٹ کر آپ کے جوتے کھس جاتے مگر فیصلہ پھر بھی نہ ہو پاتا۔ یہاں عدالتوں میں سب انصاف انصاف کھیلتے ہیں، انصاف کرتا کوئی نہیں۔“

”میں تمہارے کہنے پر اُسے معاف کر رہا ہوں۔“ وہ اپنا بھرم رکھتے ہوئے بولا۔ ”ورنہ عدالتوں کے چکروں سے میں نہیں ڈرتا۔“

”میں آپ کا ممنون ہوں۔“ اُس نے اجازت طلب انداز میں انکل نذیر سے ہاتھ ملایا اور جہز ل اسٹور سے باہر نکل گیا۔  
[www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

☆☆☆

یہ عاصم کی سلیم سے پہلی ملاقات تھی اور پہلی ہی ملاقات میں سلیم نے اُسے اپنا گردیدہ بنالیا تھا۔ سلیم نے نہ صرف اُس کا قرض ادا کر دیا تھا بلکہ انکل نذیر کو بھی معاملہ آگے بڑھانے سے روک دیا تھا۔ ورنہ انکل نذیر اگر پولیس اسٹیشن چلا جاتا تو عاصم کے لیے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا۔



اس نئی ملازمت میں تنخواہ معقول تھی۔ چنانچہ اُس کی گزراوقات قابل رشک نہ سہی مگر بہتر انداز میں ضرور ہو رہی تھی۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اب اُسے گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے ادھار نہیں لینا پڑتا تھا۔ وہی انکل نذیر جو کبھی اُسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا، اب اُسے دیکھ کر سلام کرنے لگا تھا۔ دوسری طرف ثمنہ کی روز کی فرمائشوں سے بھی اُس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ اُس کی فرمائشیں اب سلیم پوری کرنے لگا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن ثمنہ کو کچھ نہ کچھ لاکر دیتا تھا۔

اُس روز عاصم آفس سے قدرے جلدی گھر لوٹا تو ثمنہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ اُس نے استفسار کیا تو ثمنہ پھٹ پڑی۔ ”مجھ سے کیا پوچھتے ہو اپنے ابا جان سے پوچھو۔ میں تو عاجز آچکی ہوں اُن کی روز روز کی نصیحتوں سے۔ جیسا حرام کر کے رکھ دیا ہے انہوں نے میرا۔“

”بھئی کچھ بتا تو چلے ایسا کیا کر دیا ہے ابا جی نے، جو تم یوں غصہ کر رہی ہو؟“ عاصم نے محل سے پوچھا۔

”میرے بھائی کو بے عزت کر کے نکالا ہے انہوں نے گھر سے، اب مجھے اس گھر میں نہیں رہنا۔“ ثمنہ نے روتے ہوئے بتایا۔

”سلیم آیا تھا کیا؟“

”ہاں آیا تھا لیکن تمہارے ابا نے اُس کے ساتھ جو کیا ہے، وہ کوئی گھر آئے دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔“

”لیکن کیوں؟“ اُس نے قدرے تحیر سے پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ میری فرمائشیں پوری کرتا رہتا ہے۔ کیا بہن کو کوئی تحفہ خرید کر دینا گناہ ہے؟ وہ بے چارہ کتنی چاہت کے ساتھ میرے لیے اتر رنگ خرید کر لایا تھا۔ لیکن تمہارے ابا جان بھلا مجھے کب خوش دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سلیم کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔“

”کیا یہ سچ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”تو اور کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ اگر یقین نہیں آتا تو جا کر اپنے ابا جی سے پوچھ لو، تمہیں سچ جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔“

وہ غصے کے عالم میں دندنا تا ہوا باپ کے کمرے میں داخل ہوا اور پھر جیسے پھٹ پڑا۔ ”ابا جی! آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟ آپ نے سلیم کو گھر سے کیوں نکالا، کیا گناہ کیا ہے اُس نے، مجھے بتائیں، یہی ناں کہ اُس نے مجھے جاب دلائی اور ثمنہ سے سکے بھائیوں کی طرح پیار کرتا ہے۔ اُس کے کتنے احسان ہیں ہم پر، آپ کو پتا بھی ہے..... کیا

اُس کی تو ضمانت دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد اُن کی دوستی اس قدر تیزی کے ساتھ آگے بڑھی کہ سلیم کا اُن کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سلیم اُن کے گھر کا ایک فرد سا بن گیا۔ عاصم کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اُس کی بیوی ثمنہ نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی تھی مگر عاصم کی طرح اُس کا تعلق بھی لوئر مڈل کلاس سے تھا۔ وہ لڑکیوں کی اُس قبیل سے تعلق رکھتی تھی۔ شادی سے قبل اُونچے اُونچے خواب دیکھتی ہیں اور اُن کے خوابوں میں خوب گروشہزادے اور خوش نما محل ہوتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے اُن کی شادی ہمیشہ کسی عاصم جیسے مفلس نوجوان سے ہو جاتی ہے۔ جن کی چادر اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ سر ڈھانپتے ہیں تو پاؤں ننگے اور پاؤں ڈھانپیں تو سر ننگا رہ جاتا ہے۔

سلیم نے اُن کے ہاں آنا جانا شروع کیا تو ثمنہ ایک بار پھر وہی خواب دیکھنے لگی۔ سلیم کی جیب ہر وقت کرنسی نوٹوں سے بھری رہتی تھی۔ اُسے بزنس سے معقول آمدنی حاصل ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ دل کا بہت کھلاتھا۔ ویسے بھی فطرتاً وہ عیاش طبع شخص تھا۔ اس لیے اپنی آمدنی فضولیات کی نذر کرتا رہتا تھا۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں جو اُسے روکتا ٹوکتا۔ سو وہ دل کھول کر یار دوستوں پر خرچ کرتا تھا۔ اُس کی عاصم رشید سے دوستی کیا ہوئی کہ ثمنہ کی تو لائری نکل آئی۔ صرف چند ملاقاتوں کے بعد ہی اُس نے ثمنہ کو اپنی منہ بولی بہن بنا لیا۔ اب ثمنہ کی وہ تشنہ آرزو میں پوری ہونے لگیں جو عاصم بھی پوری نہیں کر سکتا تھا۔ سلیم آئے دن اُس کے لیے قیمتی تحائف لانے لگا اور یوں ثمنہ خوشیوں کے جھولے میں جھولنے لگی۔ اس سے قبل وہ ہمیشہ عاصم سے لڑتی رہتی تھی۔ لیکن اب وہ بہت خوش مزاج ہو گئی تھی۔ بات بات پر قہقہے لگاتی رہتی تھی۔ عاصم بھی اُس کی خوشی میں خوش تھا۔

عاصم سمیت دیگر گھر والے بھی سلیم اور ثمنہ کے رشتے پر خوش تھے لیکن عاصم کا والد رشید احمد اس رشتے پر معترض تھا۔ وہ ہمیشہ اُن کے اس رشتے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ اسکول ماسٹر تھا اور بے حد خوددار انسان تھا۔ اُسے اپنی بہو کا یوں کسی غیر مرد سے... میل ملاپ قطعی پسند نہیں تھا۔ اکثر اوقات وہ عاصم کو سمجھاتا رہتا تھا لیکن عاصم اُس کی کسی نصیحت کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ اُسے سلیم کی دوستی پر اعتبار تھا۔ سلیم نے اُس پر بے شمار احسانات کیے تھے۔ قدم قدم پر اُس کی مدد کی تھی۔ عاصم جو جاب کر رہا تھا، وہ بھی سلیم ہی کی مرہون منت تھی۔ سلیم نے ہی اپنے تعلقات سے اُسے یہ جاب دلائی تھی۔



اپنے محسن کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرتا ہے جیسا آپ نے سلیم کے ساتھ کیا ہے۔ مجھے منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں چھوڑا آپ نے۔“

ماسٹر رشید نے پہلے تو بیٹے کو گھور کر دیکھا پھر بولے: ”تم آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے بنے ہوئے ہو تو میں کیا کروں، ایک غیر مرد کو گھر میں گھسنے دوں؟ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔“

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”اباجی! یہ پرانی باتیں ہیں۔ لوگوں کے پاس اتنی فرصت نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑاتے پھریں۔ آپ نجانے کس صدی میں جی رہے ہیں؟ یہ اکیسویں صدی کا دوسرا عشرہ چل رہا ہے۔ اب لوگ ان باتوں کو معیوب نہیں سمجھتے۔“

”مطلب اکیسویں صدی میں غیرت کے معنی بدل گئے ہیں؟“

”اباجی! خدا کے لیے یہ فضول دسو سے دماغ سے نکال دیں۔ سلیم کو میں اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور وہ بھی میرے لیے اپنے دل میں یہی جذبات رکھتا ہے۔“

وہ بولے: ”دلوں کے بھید صرف اللہ جانتا ہے۔ تجھے کس طرح معلوم ہوا کہ وہ تجھے اپنا بھائی سمجھتا ہے؟“

”اباجی! مجھے لگتا ہے کہ آپ سٹھیا گئے ہیں۔ اب کیا وہ مجھے لکھ کر دے گا کہ وہ مجھے اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ اُس نے میرے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ مجھے جاب دلائی، جیل جانے سے بچایا، انکل نذیر کا قرض اپنی جیب سے ادا کیا، شمیمہ کو وہ اپنی چھوٹی بہن سمجھتا ہے۔ کیا یہ باتیں کافی نہیں ہیں، اُسے ایک بھائی ثابت کرنے کے لیے؟“

”مجھے اُس کا تمہاری عدم موجودگی میں یہاں آنا پسند نہیں ہے۔ وہ اگر بھائی ہے تو تمہاری بیوی کا ہے جبکہ اس گھر میں میری دو جوان بیٹیاں بھی رہتی ہیں۔“

”آپ کی بیٹیاں میری بھی تو کچھ لگتی ہیں۔ کیا میں اُن کا برا سوچوں گا؟“

”اس سے برا اور کیا سوچو گے کہ ایک غیر مرد تمہارے گھر میں آتا ہے اور تم نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔“

”تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں اور شمیمہ یہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں؟“ اُس نے زچ ہو کر پوچھا۔

”یہ پٹی شاید تجھے تیری بیوی نے پڑھائی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ یہ گھر چھوڑنے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔“

”یہ دیکھو اباجی۔“ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ہمیں چمن سے

جاسوسی ڈائجسٹ

یہاں رہنے دیجیے۔ شمیمہ ایسا کچھ بھی نہیں چاہتی، یہ محض آپ کا شک ہے۔“

”چل ٹھیک ہے جو مرضی آئے کر، میں کون ہوتا ہوں تجھے روکنے والا؟ اب تو بڑا ہو گیا ہے اس لیے تجھے میری نصیحتیں بڑی لگتی ہیں مگر میری ایک بات یاد رکھنا، ایک روز تو بہت پچھتائے گا۔ تب تیرے پچھتاوے تیرے نقصان کی علامتیں نہیں کر سکیں گے۔۔۔۔۔“ وہ ٹکست خوردہ انداز میں بولے اور عاصم اُلٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایک بوجھ اُس کے ذہن سے اُتر گیا تھا۔ چنانچہ اب وہ قدرے مطمئن نظر آ رہا تھا۔

کمرے سے باہر آتے ہی اُس نے جیب سے سیل فون نکالا اور سلیم کو کال کرنے لگا۔ رابطہ ملتے ہی وہ تادم انداز میں بولا۔ ”سلیم یار! میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔ ابا جی نے جو کچھ بھی کیا ہے، بہت غلط کیا ہے۔ میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔“

سلیم نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں ہے دوست، اباجی میرے بھی بزرگ ہیں بلکہ سچ پوچھو تو انہیں میں اپنے باپ جیسا سمجھتا ہوں۔ پتا نہیں انہیں کس نے میرے خلاف بھڑکا دیا ہے۔ اس سے قبل تو انہوں نے کبھی بھی ایسے رویے کا اظہار نہیں کیا ہے۔“

”تم ناراض تو نہیں ہونا یار؟“

”بالکل نہیں۔“ سلیم نے ہنس کر کہا۔ ”باپ کی بات کا کیا برا منانا؟ تم کوئی فینشن نہ لو، یوں سمجھو کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔“

”بہت بہت شکریہ یار! یہ تو تمہارا بڑا پن ہے۔ ورنہ آج کل کے دور میں تو کوئی کسی کی نہیں سنتا۔“

”بس اب رہنے بھی دو یار! کیوں مجھے بانس پر چڑھانے کے لیے تل گئے ہو؟“ سلیم نے تہقیر لگایا۔

یوں ہی باتیں کرتے کرتے وہ شمیمہ کے پاس پہنچ گیا۔ شمیمہ کو جب پتا چلا کہ وہ سلیم سے بات کر رہا ہے تو اُس نے عاصم سے فون چھپٹ لیا۔

”ہیلو سلیم! تم ٹھیک تو ہونا؟“ اُس نے پریشانی سے پوچھا۔ ”میں... میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔ دراصل یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”بھئی! تم میاں بیوی خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ میں نے عاصم کو بتا دیا ہے کہ میں تم لوگوں سے خفا نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے انکل کی باتوں کا برا منایا ہے۔ وہ بزرگ ہیں ہمارے، جو دل چاہے کہہ سکتے



ہیں۔ کہیں عاصم نے انکل سے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟“  
 ”نہیں نہیں... عاصم بھلا اباجی سے بدتمیزی کر سکتا ہے؟“ اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”کیا عاصم تمہارے ساتھ ہے؟“ سلیم نے بدلے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”نہیں وہ باتھ روم میں ہے۔“ اُس نے مدہم آواز میں بتایا تاکہ آواز عاصم کی سماعتوں تک نہ پہنچ سکے۔  
 ”ہائے میری جان! شو۔“ سلیم پر ایک دم رومینک موڈ طاری ہو گیا۔ ”میں کتنی چاہت سے تمہارے لیے ائر رینگ خرید کر لایا تھا۔ مگر اُس بڑھے کھوسٹ نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔“

”وہ رینگ تو اب میں تمہارے ہی ہاتھوں سے پہنوں گی۔“ اُس نے شوخ مگر دھیمی آواز میں جواب دیا۔  
 ”غلام حاضر ہے جان من! حکم کرو کب لے کر پہنچوں؟“

”میں خود کل کسی وقت تمہارے فلیٹ پر آؤں گی۔ اوکے؟“  
 ”میں ابھی سے راہ دیکھنا شروع کر دیتا ہوں جان من۔“ وہ جذباتی انداز میں بولا۔ ”تم کل کس وقت پہنچو گی؟“

”یہ میں تمہیں کل صبح بتاؤں گی۔“ اُس نے مدہم آواز میں بتایا اور پھر عاصم کو باتھ روم سے نکلتے دیکھ کر بلند آواز میں بولی۔ ”اچھا سلیم بھائی پھر بات ہوگی۔ ابھی مجھے عاصم کو کھانا بھی دینا ہے۔ اوکے خدا حافظ۔“  
 ”اچھا جان من! خدا حافظ۔“ سلیم نے کس کرتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

وہ دونوں ہفتے میں دو تین بار سلیم کے فلیٹ پر ملتے اور خوب جی بھر کر انجوائے کرتے تھے۔ عاصم اس بات سے لاعلم رہا۔ بارہا اُسے سلیم پر شک کرنے کے مواقع دستیاب ہوئے مگر ثمینہ چاچلوسی سے کام لیتے ہوئے خود کو سستی سادتری ثابت کرنے میں کامیاب رہی۔ ویسے بھی عاصم سلیم پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ لہذا اُس پر کسی قسم کا شبہ کرنا عاصم کے نزدیک محسن کشی کے مترادف تھا۔ ایک دن سلیم کے فلیٹ پر پہنچتے ہی ثمینہ بولی۔ ”سلیم جانو! میں اب عاصم کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیوں نہ میں اُس سے خلع لے لوں؟“

”وہ کس لیے؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ اُسے مخمور

نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”دراصل تم ہی میرے خوابوں کے شہزادے ہو۔ عاصم سے تو میری شادی میرے والدین کی مرضی سے ہوئی ہے۔ ورنہ وہ تو مجھے پہلے دن سے ہی زہر لگتا ہے۔“

”وہ تمہیں خلع دینے کے لیے کبھی بھی راضی نہیں ہو گا۔“ سلیم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہمیں اُس سے جان چھڑانے کے لیے یا تو عدالت سے رجوع کرنا پڑے گا یا پھر کوئی اور منصوبہ بنانا پڑے گا۔“  
 ”کیسا منصوبہ؟ کیا... کیا تم اُسے جان سے مارنا...“

”احتمالاً باتیں مت کرو۔“ سلیم نے قطع کلامی کی۔  
 ”میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“  
 ”وہ کیا؟“

وہ بولا۔ ”میں اُسے ملک سے باہر بھجوا دیتا ہوں۔ اس کے بعد ہمارے مزے ہی مزے ہوں گے۔“  
 ”ملک سے باہر... لیکن کیسے؟“ اُس نے تحیر کے عالم میں پوچھا۔  
 ”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو کہ میں اُسے کیسے ملک سے باہر بھجواتا ہوں۔“

”ہائے جانو! اگر ایسا ہو جائے تو پھر تو ہم دونوں کے مزے ہی مزے ہوں گے۔“ وہ سلیم سے لپٹتے ہوئے خوشی سے سرشار لہجے میں بولی۔ ”کمائے گا وہ اور تیش ہم دونوں کریں گے۔ قسم سے زندگی کا لطف آ جائے گا۔“  
 ”ڈونٹ وری میری جان! ایسا ہی ہوگا۔“ سلیم نے اُسے بازوؤں میں بچھپتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”تو پھر یہ انتظام جلد سے جلد کرو نا؟“

”جلدی ہو جائے گا میری جان! فکر کیوں کرتی ہو... کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ دن کی طرح ہماری راتیں بھی رنگین گزرا کریں؟“

وہ بولی۔ ”نہیں رات کے وقت میں تم سے نہیں مل سکوں گی۔ دراصل اُس بڑھے کا مجھ پر کڑا پہرا ہوتا ہے۔“  
 ”اس کا انتظام بھی ہے میرے پاس مگر پھر کبھی سہی۔ ابھی وقت ضائع کیوں کرتی ہو؟“ سلیم نے جذبات سے بوجھل آواز میں جواب دیا اور پھر کمرے میں شیطان کا من پسند کھیل شروع ہو گیا۔

☆☆☆

منصوبے کے مطابق دوسرے ہی دن ثمینہ نے عاصم کو بیرون ملک جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر



لوکی؟“

”سر سر کر جی ہی لوں گی۔“ وہ مصنوعی دکھ کا شان دار مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میرا عاصم مجھ سے بے وفائی نہیں کرے گا۔ مجھے خود سے زیادہ تم پر بھروسہ ہے۔“

”لیکن میں انگلینڈ جاؤں گا کیسے؟ پاسپورٹ اور ویزا تو میں حاصل کر ہی لوں گا۔ مگر وہاں انگلینڈ میں مجھے جاب کون دے گا؟“ اُس نے اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ سب تم سلیم بھائی پر چھوڑ دو۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”وہ سب انتظام کر دے گا۔“

”نہیں بھی نہیں... اُس کے پہلے ہی ہم پر بہت زیادہ احسان ہیں۔ کیوں مجھے شرمندہ کرانا چاہتی ہو؟ سلیم..... کیا سوچے گا ہم لوگوں کے متعلق... یہی تا کہ ہم بالکل ہی گئے گزرے لوگ ہیں؟“

وہ بولی۔ ”وہ ایسا نہیں سوچتا بلکہ وہ تو خود تمہیں باہر بھجوانا چاہتا ہے۔ تاکہ ہم لوگوں کے حالات سنو جا سکیں۔ شبانہ اور ریحانہ کی شادیاں اچھے اور امیر گھرانوں میں ہوں اور ہاشم پڑھ لکھ کر بڑا افسر بن جائے۔ سلیم بھائی سے زیادہ ہمدرد تم کہیں بھی نہیں ڈھونڈ سکتے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم نے اس سلسلے میں سلیم بھائی سے خود بات کی ہے۔ بہت بے وقوف ہو تم۔ کم سے کم مجھ سے پوچھا تو ہوتا۔ اُس نے کوئی ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ہم لوگوں کا کہ ہر وقت بس ہمارے ہی مسائل حل کرتا رہے؟“

”ارے نہیں بھئی! ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”وہ تو سلیم بھائی نے خود ذکر چھیڑا تو مجھے بات کرنا پڑ گئی ورنہ میں کب اُس پر بوجھ ڈالنے کے حق میں ہوں؟“

اس کے بعد ثمنینہ نے کچھ اس طرح اُسے مستقبل کے سہانے سنے دکھائے کہ وہ فوراً ملک سے باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

دوسرے دن جب عاصم ناشا کرنے کے بعد آفس چلا گیا تو ثمنینہ نے فوراً سلیم کا نمبر ملا دیا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی سلیم نے پوچھا۔ ”سناؤ جان من! منصوبے کا کیا بتا؟“

وہ بولی۔ ”منصوبہ کامیاب ہو گیا ہے۔ تم فوراً اُسے باہر بھیجنے کا انتظام کرو۔“

”کیا... واقعی؟“

”تو اور کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔“ اُس نے جواب دیا۔

دیا۔ ادھر عاصم نے لُچ کیا اور ادھر ثمنینہ نے بیرون ملک جا کر قسمت آزمائی کرنے والوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ اُن لوگوں کا تذکرہ رخصت کے ساتھ کر رہی تھی جو کمانے کے لیے خارجی ممالک، امریکا اور یورپ کا رخ کر رہے تھے۔ عاصم چند لمحے تو بڑی توجہ سے اُس کی باتیں سن رہا تھا پھر اکتا کر بولا۔

”تو میں کیا کروں بھئی! مجھے کیوں سن رہی ہو یہ باتیں؟“

وہ بولی۔ ”عاصم! میں چاہتی ہوں کہ تم بھی باہر جا کر قسمت آزمائی کرو، کیا خبر ہمارے بھی دن پھر جائیں؟“

”تم ہوش میں تو ہو کیا کہہ رہی ہو؟“ اُس نے آنکھیں نکالیں۔ ”میں بھلا کیسے باہر جاسکتا ہوں۔ بوڑھے والدین اور چھوٹے بھائی بہنوں کو میری ضرورت ہے۔“

”اہ نہیں کو سکھ دینے کی خاطر تو میں تمہیں یہ مشورہ دے رہی ہوں۔ ورنہ ہاشم، شبانہ اور ریحانہ کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ بھائی ہونے کے ناتے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ انہیں اچھی سے اچھی تعلیم دلاؤں۔ تمہیں بھائی بہنوں کے اچھے مستقبل کے لیے یہ قربانی دینا پڑے گی۔“

”نہیں ثمنینہ نہیں۔“ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ تم یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو۔“

وہ بولی۔ ”اس میں رسک لینے والی بھلا کون سی بات ہے؟ یہاں کتنے ہی لوگ ہیں جو ملک سے باہر جاب کر رہے ہیں۔ ڈالر، پونڈ اور ریال کما رہے ہیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اس گھر میں خوش حالی آئے؟“

”دیکھو یہاں میں اچھی بھلی جاب کر رہا ہوں۔ مجھے پردیس میں دھکے نہیں کھانے۔ تم کیا چاہتی ہو کہ میں شیخوں کے ہاتھ روم صاف کرتا پھروں؟“

”انگلینڈ میں شیخ کہاں سے آگئے؟“

”اوہ تو محترمہ مجھے انگلینڈ بھجوانے کے خواب دیکھ رہی ہیں؟“ وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ”اگر وہاں مجھے کوئی گوری میم پسند آگئی تو تمہاری تو چھٹی ہو جائے گی۔ کیوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا چاہتی ہو؟“

”مجھے اپنے عاصم پر اعتماد ہے کہ وہ ایسا قدم کبھی بھی نہیں اٹھائے گا۔“

وہ بولا۔ ”انگلینڈ کی گوریاں تم جیسی کئی بے وقوف عورتوں کے اعتماد خاک میں ملا چکی ہیں۔ جو وہاں کمانے کے لیے جاتا ہے، پلٹ کر بھی واپس نہیں آتا۔“

”میں اس گھر کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھی پی لوں گی۔“

”یعنی میں اگر واپس نہ آیا تو تم میرے بغیر رہو۔“



وہ بولا۔ ”تو اسی خوشی میں آج میرے فلیٹ پر آ رہی ہوتی؟“

”نہیں جانو! اب ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ اُسے اگر ذرا سی بھی بھٹک پڑ گئی تو سارا منصوبہ چوہٹ ہو جائے گا۔“

”یہ تو تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو جان من۔“

اُس نے شکوہ کیا۔ [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

وہ بولی۔ ”ممبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ تم کچھ دن صبر کر لو، میں تمہیں خوش کر دوں گی۔“

”پھل سامنے رکھا ہو تو کون کم بخت صبر کر سکتا ہے؟“

اُس نے ایک ٹھنڈی آہ خارج کی۔

وہ ہنسی۔ ”اتنے بے صبرے مت بنو ڈیر! ہم بہت جلد ملیں گے۔ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟“

”خود سے بڑھ کر تم پر بھروسہ ہے اس لیے تو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رہا ہوں۔“

”سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی تم قاعدے میں رہو گے۔ کمائے گا وہ اور عیش ہم کریں گے۔“

”کہیں یہ خواب، خواب ہی نہ رہ جائے؟“ اُس نے دل میں چپے خدشے کا اظہار کیا۔ ”انگلیڈ جا کر اکثر لوگ سب رشتے ناتے بھول جاتے ہیں۔ اگر وہ بھی ایسا ہی نکلا تو ہمارے تو سب خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔“

”آئندہ ایسا خیال بھی دل میں مت لاتا۔ وہ مجھے یا گل پن کی حد تک چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُس پر کسی گوری کا جادو نہیں چل سکتا۔“ ثمنینہ نے پُر غرور لہجے میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ ”اتنی اُدھیائی پر مت اُڑو، نیچے گرو گی تو بہت زیادہ چوٹ لگے گی۔“

”فکر مت کرو میں نیچے نہیں گروں گی۔ بس تم اُسے جلد سے جلد کسی طرح انگلیڈ بھجوادو۔“

”اوکے میں ایک ہفتے کے اندر ہی سارا انتظام کر دوں گا۔“

[www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

ایسے ہی وقت باہر کاریڈور میں قدموں کی چاپ ابھری تو اُس نے جلدی سے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

[www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

☆ ☆ ☆

منصوبے کے مطابق سلیم نے کوشش کی اور عاصم کو دس دنوں کے اندر ہی انگلیڈ بھجوا دیا۔ جاتے ہی عاصم کو جاب بھی مل گئی۔ انگلیڈ میں سلیم کا ایک رشتے دار گاڑیوں

کے کاروبار سے منسلک تھا۔ چنانچہ اُسی کے شوروم میں عاصم کو سیلز منیجر کی جاب مل گئی۔ ماہانہ سٹیری عاصم کی توقع سے بھی زیادہ تھی۔ لہذا وہ ہر ماہ ثمنینہ کو موٹی موٹی رقمیں بھیجے لگا۔ اب ثمنینہ کی پانچوں انگلیاں بھی میں تھیں۔ اُس نے سلیم کے ساتھ مل کر شہر کی نئی آبادی میں ایک پلاٹ خریدا اور مکان کی تعمیر شروع کر دی۔ عاصم اس بات سے بے خبر شب و روز پیسا کمانے میں لگا رہا۔ ثمنینہ ہر ماہ دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت رقم ساس سر کو بھی دے دیتی تھی۔ چنانچہ گھر کی گاڑی بھی آسانی سے چل رہی تھی۔ عاصم بھی گھگھار فون پر گھر والوں سے بات کر لیتا تھا۔ تاہم ثمنینہ کو وہ .... ہفتے میں تین چار مرتبہ کال کرتا تھا۔

وہ دونوں نہ صرف عاصم کی کمائی پر ہاتھ صاف کر رہے تھے بلکہ ہر دوسری رات ثمنینہ کے بیڈروم میں رات جگا بھی منا رہے تھے۔ گھر کے دوسرے افراد چونکہ سلیم کے ساتھ ایک عرصے سے کھلے ملے ہوئے تھے۔ لہذا اُن کی طرف سے شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاہم ماسٹر رشید احمد بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ اُن کی تاڑ میں لگا رہا۔ اُسے شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ ثمنینہ اور سلیم کے درمیان ناجائز مراسم ہیں۔ لیکن اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ اب تک اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا۔ دراصل وہ انہیں رنکے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ ہر رات اُسے جلدی نیند آ جاتی تھی۔ حالانکہ عاصم کے جانے سے قبل وہ ہمیشہ دیر سے سویا کرتا تھا۔

ماسٹر رشید رات کو سونے سے قبل باقاعدگی سے دودھ پینے کا عادی تھا اور یہ دودھ ہمیشہ اُس کی ٹیبل پر ثمنینہ ہی رکھا کرتی تھی۔ اُس رات جب وہ عشا پڑھ کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹا تو اُسے گرانی شکم کی شکایت ہو گئی۔ حالانکہ کھانا بھی اُس نے معمول سے زیادہ نہیں کھایا تھا۔ دودھ کا گلاس حسب معمول ٹیبل پر رکھا ہوا تھا مگر آج دودھ پینے کو اُس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اُس کی بیوی خدیجہ بیگم چند لمحے تو غور سے اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر پوچھا۔ ”کیا بات ہے آج آپ پریشان لگ رہے ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟“

وہ بولا۔ ”ہاں بس ٹھیک ہی ہوں۔ تم ایسا کرو یہ دودھ پی لو یا پھر ہاشم کو دے دو۔ میں آج نہیں پیوں گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔“

اُس نے کہا۔ ”ارے نیک بخت! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ذرا پیٹ بھرا بھرا سا محسوس ہو رہا ہے اس لیے



میں دودھ نہیں لینا چاہتا۔ یہ نہ ہو کہ پیٹ میں گڑبڑ ہو جائے اور ساری رات ٹوائٹ کے چکر کاٹا رہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ تو پھر آج میں ہی دودھ پی لیتی ہوں۔“ خدیجہ بیگم نے بستر سے اٹھتے ہوئے جواب دیا اور پھر آگے بڑھ کر دودھ کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا دیا۔

دودھ پینے کے بعد وہ دوبارہ سو گئی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ خدیجہ بیگم کے خزانے کو بچنے لگے لیکن وہ جاگنارہا۔ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، کتنی ہی دیر گز گئی مگر آج خلاف توقع اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ جب کہ خدیجہ بیگم معمول سے تھوڑی دیر قبل ہی سو گئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا اسی سوچ میں غرق تھا کہ معا اُس کے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”اوہ... اب میں سمجھا۔“ اُس نے مدھم سی آواز میں خود کلامی کی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ دودھ نشہ آور ہوتا ہے۔ شاید اس میں خواب آور گولی کھولی جاتی ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ دماغ نے سوال کیا۔

اس ”کیوں“ کافی الفوراً اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ دوبارہ سوچنے لگا۔ ایک بار پھر اُس کے دماغ میں روشنی سی لگی اور پھر اس ”کیوں“ کا جواب بھی اُسے مل گیا۔ ”ہاں بالکل یہی بات ہے۔“ اُس نے پھر خود کلامی کی۔ ”یہ شہینہ اور سلیم کی پلاننگ ہے۔ وہ مجھے خواب آور گولی کھلا کر یقیناً منہ کالا کرتے ہیں لیکن اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ بالکل نہیں ہونے دوں گا۔“

کمرے میں زیر و پا اور بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ساتھ والی ٹیبل پر اُس کی رسٹ واچ اور نظر کا چشمہ رکھا ہوا تھا۔ اُس نے چشمہ لگا کر وقت دیکھا تو رات کے بارہ بجتے والے تھے۔ وہ بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُس کا رخ شہینہ کی خواب گاہ کی طرف تھا۔ جو طویل کاریڈور کے کنارے واقع آخری کمرہ تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ کمرے کے اندر سے دھیمی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔ ان آوازوں میں شہینہ کی ہنسی بھی شامل تھی۔ ماسٹر رشید کا خون کھولنے لگا اور پھر اُس نے کمرے کے دروازے کو ایک دم کھول دیا۔

شہینہ اور سلیم آنے والی افتاد سے بے خبر تھے کہ معاً کمرے کا دروازہ کھلا اور پھر ”چٹ“ کی آواز کے ساتھ ہی کمرہ دودھیا روشنی میں جگمگا اٹھا۔ سامنے موجود منظر دیکھ کر

جاسوسی ڈائجسٹ

ماسٹر رشید پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے کبھی سنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کسی دن ایسا بے حیائی کا کھیل اُس کے گھر میں کھیلا جائے گا۔ چند لمحے تو اُس پر سکتے کی حالت طاری رہی۔ اس کے بعد وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”بے حیا عورت! یہ میرا گھر ہے جسے تم نے عیاشی کا اڈا بنا رکھا ہے۔ آج تجھے میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

سلیم اور شہینہ اس دوران نہ صرف تن ڈھانپ چکے تھے بلکہ اچانک نکلنے والے جھٹکے سے بھی سنبھل چکے تھے۔ چنانچہ اُسے جارحانہ انداز میں شہینہ کی طرف بڑھتا دیکھ کر سلیم نے فوراً مداخلت کی۔ ”رُک جاؤ بڑے میاں! ورنہ جان سے جاؤ گے۔“ سلیم نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول لہرایا۔

”تم... تم مجھ پر گولی چلاؤ گے؟“ وہ غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اُنی ہمت ہے تجھ میں؟“

”تم اگر مجبور کرو گے تو ضرور چلاؤں گا۔ بہتر ہوگا کہ جو دیکھا ہے، اُسے خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ کسی سے ذکر کیا تو بے موت مارے جاؤ گے۔“ اُس نے دھمکی آمیز لہجے میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم آستین کے سانپ نکلو گے اور یوں اپنے دوست کی عزت پہ ڈاکا ڈالو گے؟ تم نے میرے بیٹے کے بھرم کا خون کیا ہے۔ بہن اور بھائی کے مقدس رشتے کا مذاق اڑایا ہے۔ تم پر اللہ کا تہر نازل ہوگا۔“ ”بڑے میاں! تمہارے بیٹے کا بھرم ہمیشہ مجھ پر قائم رہے گا۔“ اُس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ ”تاہم اب تم پر سے اُس کا بھرم ضرور اٹھ جائے گا۔“

”ہنس... میں تجھے چھوڑوں گا نہیں... تم نے... تم

”غصہ تمہاری صحت کے لیے مضر ہے باباجی۔“ اُس نے طنزیہ لہجے میں قطع کلامی کی۔ ”بقول تمہارے میں آستین کا سانپ ہوں اور سانپ کا کیا بھروسہ کسی کو بھی ڈس سکتا ہے۔ تم تو اپنی زندگی جی ہی چکے ہو، کم سے کم اپنی جوانی ہوتی بیٹیوں کا ہی خیال کرلو۔ تم کیا چاہتے ہو کہ وہ بے چاریاں کسی کومنہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہیں؟ جاؤ اور آرام سے سو جاؤ، منہ بند رکھو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ بہت نقصان اٹھاؤ گے۔“

یہ کھلی دھمکی تھی۔ گو کہ ماسٹر رشید موت سے نہیں ڈرتا تھا لیکن بیٹیوں کے خوف ناک انجام کے متعلق سوچ کر وہ لرز اٹھا۔ سلیم کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر اُس





# سیریس ٹائجسٹ

میں نیا سحر انگیز طویل سلسلہ

## شیش محل

ہر دلعزیز اور معروف قلم کار

# اسما قادری

کے قلم سے ستمبر 2015ء کے شمارے میں منفرد صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

کبھی خوش امید اور کبھی مایوس کن جذبات میں

ابھی زندگی کے تیکھے انداز... آپ کی دلچسپی کا ہر رنگ لیے



فل گئی۔ ”ٹھیک ہے میں عاصم سے بات کر لیتی ہوں۔“ وہ  
 رضا مند ہو کر بولی۔ ”مگر اس وقت لندن میں سجانے ٹائم کیا  
 ہوگا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ عاصم سو رہا.....“

”تم کو گولی مار دیار!“ اُس نے جھنجھلا کر بات کاٹی۔  
 ”تم بس عاصم سے بات کرو اور اُسے یقین دلاؤ کہ اُس کے  
 باپ نے واقعی تمہاری عزت تار تار کرنے کی مذموم کوشش کی  
 ہے۔ جب کہ تم نے بڑی مشکل سے اپنی عزت بچائی ہے  
 اور یہ کہ اب تم اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی ہو کیونکہ وہ  
 دوبارہ بھی ایسی مذموم حرکت کر سکتا ہے اور ہاں کال کرتے  
 وقت فون کا سپیکر آن رکھنا۔“

”او کے میں ثرائی کرتی ہوں۔“ اُس نے ٹیبل پر رکھا  
 ہوا سیل فون اٹھایا اور عاصم کا نمبر ملا دیا۔  
 دوسری جانب سے عاصم کی ہیلو سنائی دی تو وہ رونے  
 لگ گئی۔ انداز ایسا تھا کہ اداکاری کے بجائے حقیقت کا  
 گمان ہوتا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے تو اُس کی اداکاری پر سلیم بھی  
 حیران رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شہینہ اتنی اچھی  
 اداکارہ ہوگی۔

عاصم نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ ”شمینہ! میری جان مجھے بتاؤ بات کیا ہے؟ یوں رو کر مجھے تکلیف تو نہ دو۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں شاید یقین نہ آئے مگر میں تمہیں پھر بھی بتاؤں گی۔ دراصل... دراصل... بات...“ جملہ اُدھورا چھوڑ کر وہ پھر رونے لگی۔ یہاں تک کہ اُس کی ہنسی بندھ گئی۔

عاصم نے پریشان ہو کر کہا۔ ”تمہارے آنسو گواہی دے رہے ہیں کہ تم سچی ہو۔ پلیز اب بتادو کہ بات کیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”انکل۔۔۔ انکل نے... ابھی کچھ دیر  
قبل... میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے... م... میں اب  
س گھر میں... نہیں رہ سکتی... مجھے ان سے ڈر لگتا ہے...  
... وہ پھر کسی وقت بھی ایسی حرکت کر سکتے ہیں۔“ اُس نے  
لک رک کر بات پوری کی اور ایک بار پھر رونا شروع  
کر دیا۔

دوسری طرف سے عاصم چلا رہا تھا۔ ”نہیں نہیں... جھوٹ ہے... جھوٹ ہے... کہہ دو کہ جھوٹ ہے۔ ورنہ تنہ مقدس رشتے پر سے میرا اعتبار اٹھ جائے گا۔“

مگر وہ عاصم کی بات سننے کے بجائے روئے چلے  
 رہی تھی۔ جب عاصم کو چلاتے ہوئے کافی دیر گزر گئی تو وہ  
 راکی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اسی لیے تو میں تمہیں بتانا نہیں

وہ بولی۔ ”روؤں نہ تو اور کیا کروں؟ انکل ساری بات عاصم کو بتادیں گا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔“

”یہ تمہارا وہم ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یقین کرو وہ بڑھا مرنے جاوے گا مگر یہ بات عاصم کو نہیں بتائے گا۔“

”کیوں نہیں بتائے گا جب کہ سب کچھ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے۔“

وہ بولا۔ ”اُس لیے کہ وہ ایک باپ ہے اور دنیا کا کوئی بھی باپ اپنی بیٹیوں کا بُرا نہیں چاہتا۔ چاہے وہ اس بڑھے کی طرح بڑھا لکھا ہو یا چٹا اُن پڑھے۔“

”لیکن جب عاصم چھٹی پر آئے گا تو تب کیا ہوگا؟“

اُس نے دل میں چھپے خدشے کا اظہار کیا۔ ”تب تو یہ بڑھا چُپ نہیں رہے گا نا؟“

”اس کا حل بھی ہے میرے پاس۔“ وہ چہرے پر خباثت آمیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ”تم ایسا کرو ابھی عاصم کو کال کرو اور اُسے بتاؤ کہ اُس کے باپ نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ تھوڑی بہت رونے کی اداکاری بھی کر لیتا تا کہ اُسے کسی قسم کا شبہ نہ رہے۔“

”نن... نہیں یہ میں نہیں کر سکتی۔“ وہ ایک دم بوکھلا گئی۔ ”ایک سفید بالوں والے بزرگ پہ اتنا گھٹا وٹا الزام لگانا ٹھیک نہیں ہے۔ مجھ پر اللہ کا قہر نازل ہو جائے گا۔“

وہ بولا۔ ”تم اگر اللہ کے قہر سے ڈرتی رہو گی تو پھر عاصم کا قہر تم پر ضرور ٹوٹے گا۔ پہلے اس قہر سے بچو بعد میں توبہ کر لینا۔ مرنے سے پہلے تک توبہ کے دروازے کھلے ہی رہتے ہیں۔“

ہائے رے انسان کی خوش فہمی! پچارہ ساری زندگی  
توبہ کی اُمید میں گناہ پر گناہ کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن توبہ کی  
معادت ہزاروں میں سے کسی ایک کو ہی نصیب ہوتی ہے۔  
لہٰذا بھی اُس وقت توبہ کی اُمید میں یہ گناہ دُعا گناہ کرنے پر



بھوم

وہ بولا۔ ”تم اُس کی فکر مت کرو، مجھے معلوم ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہوگی اور کیا کر رہی ہوگی؟“

”آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ

”تمینہ...“

”ناشا کرو بیگم۔“ اُس نے سپاٹ لہجے میں قطع کلائی کرتے ہوئے کہا۔ ”عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔“

جواب میں خدیجہ بیگم اُسے محض گھور کر رہ گئی۔ ناشا کرنے کے بعد بچے اسکول و کالج روانہ ہو گئے۔ جب کہ اُن کی بڑی بیٹی فرحانہ برتن سمیٹ کر کچن کی طرف چل دی۔ اب ناشتے کی سن پر وہ میاں بیوی تیارہ گئے۔

”اب بتاؤ، بات کیا ہے؟“ خدیجہ بیگم نے سوال کیا۔

وہ بولا۔ ”ہماری بہو ایک بدکار اور بد چلن عورت ہے۔ گزشتہ رات میں نے اُسے سلیم کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ صبح سویرے ہی اپنے میکے کی طرف بھاگ گئی ہے۔“

”یہ... یہ... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ سلیم تو اُس کا بھائی ہے؟“ خدیجہ بیگم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”مم... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ سلیم اور تمینہ اس طرح کی گھناؤنی حرکت... نہیں بھی نہیں... آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“

”تم احق کی احق ہی رہو گی۔“ وہ طیش میں آ کر بولا اور پھر گزشتہ رات والا واقعہ بغیر کسی لگی لپٹی کے اُسے سنادیا۔

”ارے تو پھر فوراً عامم سے بات کرو نا؟“ اُس نے پریشانی کے عالم میں سوال کیا۔

”نن... نہیں۔“ ماسٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر میں نے عامم کو کچھ بتایا تو سلیم ہماری بیٹیوں کا دشمن بن جائے گا۔ جب تک عامم چھٹی کر کے نہیں آ جاتا تب تک ہمیں اس راز کو راز ہی رکھنا ہوگا۔“

وہ بولی۔ ”آپ اگر اسی طرح ڈرتے رہے تو وہ ڈائن وار کر جائے گی۔ میری مانو تو ابھی عامم کو کال کر کے ساری بات بتا دو۔ اللہ مالک ہے جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“

”قطعاً نہیں، سلیم بہت خطرناک آدمی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ہماری بیٹیوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔“

”آپ سمجھتے کیوں نہیں؟“ وہ جھنجھلا گئی۔ ”یہ بہت

چاہتی تھی کہ تم میرا اعتبار نہیں کرو گے۔ مگر عامم! یہی سچ ہے۔ تمہیں اگر یقین نہیں آتا تو میں کوئی بھی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“

وہ بولا۔ ”میں... میں کیسے یقین کر لوں کہ اباجی اس حد تک کر سکتے ہیں؟ تمینہ! خدا کی قسم مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا۔“

”تم اگر مجھ پر شک کر رہے ہو تو پھر میرے پاس اپنی سچائی ثابت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ میں ابھی اسی وقت خودکشی کر لیتی ہوں۔“ اُس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں تمینہ، نہیں۔“ وہ چلا یا۔ ”تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گی۔ تمہیں میری قسم... بولو کہ تم دوبارہ اپنی جان لینے کی بات نہیں کرو گی۔“

”بے عزت ہو کر جینے سے بہتر ہے کہ میں عزت کے ساتھ اپنی جان دے دوں۔“

”نن... نہیں مجھے تم پر اعتبار ہے۔“ اُس نے بوکھلا کر جواب دیا۔ ”تم صبح ہوتے ہی اپنے گھر چلی جانا۔ اس ماسٹر رشید سے میں خود منٹ لوں گا۔“ نفرت کی شدت سے عامم نے اُسے اباجی کہتا بھی گوارا نہیں کیا۔

”ٹھیک ہے، میں صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گی۔“

اس کے بعد عامم نے چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

”یہ ہوئی ناں بات، کمال کی ایکٹنگ کی ہے تم نے۔ اب ہو گی باپ بیٹے کی جنگ۔“ سلیم نے تمینہ کو داد دیتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ”آؤ اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے فلیٹ پر چلتے ہیں۔ وہیں سے صبح کے وقت تم اپنے گھر چلی جانا۔“

”چلو۔“ تمینہ مسکرائی۔ ”تمہارا فلیٹ ٹھیک رہے گا۔ یہاں تو بڈھے نے سارا مزہ کر کر کر دیا۔“

☆☆☆

صبح ماسٹر رشید اور اُس کے گھروالے جاگے تو تمینہ غائب تھی۔ سبھی گھروالے پریشان ہو گئے مگر ماسٹر رشید مطمئن تھا۔ وہ یوں ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ناشتے کی میز پر خدیجہ بیگم چند لمحے تو اُسے گھورتی رہی پھر بولی۔ ”آپ تو ایسے مطمئن بیٹھے ہیں جیسے ہماری لاٹری نکل آئی ہو؟ کوئی پروا ہی نہیں ہے آپ کو بہو کے غائب ہونے کی۔“



کر پاکستان پہنچ جاؤ۔“ سلیم نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔

”مگر کیوں سلیم؟“ اُس نے حیرانی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔ ”مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے۔ اور... اور یہ تم رو کیوں رہے ہو، خیر تو ہے نا؟“

”کچھ بھی نہیں بچا یا۔“ سلیم نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

”سلیم... سلیم...“ وہ چلا یا۔ ”خدا کے لیے مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے؟“

”وہ... وہ اٹکل... آنٹی... تمہاری بہنیں... بھائی اور بھانجے... سب کے سب... م... ما...“ بات ادھوری چھوڑ کر اُس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ شاید شدتِ غم سے وہ بول ہی نہیں پار رہا تھا۔

عاصم کے منہ سے ”نہیں“ کی آواز چیخ کی صورت برآمد ہوئی اور پھر وہ جیسے پتھر کا بن کر رہ گیا۔ سل فون اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دبیز قالین پر گر گیا۔ چند لمحوں تو اُس پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھ گیا۔ ”نہیں نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ روتے روتے چیخ کر کہتا اور پھر رونے لگتا۔ دوسری طرف سل فون سے سلیم کی ہلکی ہلکی ”ہیلو، ہیلو“ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مگر عاصم اپنے ہوش و حواس میں ہوتا تو سل فون کی طرف متوجہ ہوتا۔ آخر کار سلیم نے نا اُمید ہو کر کال ڈس کنکٹ کر دی۔

عاصم نجانے کتنی ہی دیر اسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ روتے روتے اُس کی آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا مگر وہ پھر بھی رو رہا تھا۔ اچانک اُس کا سل فون بجنے لگا۔ اُس نے بادلِ ناخواستہ سل فون اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پر سلیم کا نام جھللا رہا تھا۔ کال ریسیو کرنے کو اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر اُس نے کال ریسیو کر لی۔ تب سلیم نے اس اندوہ ناک واقعے کے بارے میں اُسے ساری تفصیل بتادی۔ سلیم کے مطابق یہ ڈکیتی کی واردات تھی مگر عاصم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ڈاکوؤں کی بچوں کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟“ تفصیل سننے کے بعد اُس نے غمزہ انداز میں پوچھا۔ ”اور... اور میری معصوم بہنوں کا کیا قصور تھا؟ مزاحمت تو غالباً میرے بھائی اور باپ نے کی ہوگی؟“

سلیم نے کہا۔ ”اس بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں میرے بھائی! تم بس چھٹی لے کر پہنچ جاؤ، اُن کی جھجھک و گھٹنیں

نازک معاملہ ہے۔ آپ کی خاموشی آپ کو مجرم بنا دے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈائن عامم سے بات کر کے اُس کے کان بھرے، آپ خود ہی عامم کو ساری سچائی بتادیں۔“

بیوی کی بات دل کو لگتی تھی۔ اُس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر بولا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو میں ابھی اپنے کمرے میں جا کر عامم سے بات کرتا ہوں۔“ وہ اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

اُس کا سل فون بستر کے ساتھ والی ٹیبل پر رکھا تھا۔ اُس نے سل فون اٹھایا اور عامم کا نمبر ملا دیا۔ چونگی ٹیل کے بعد عامم کی خمار آلود ہیلو سنائی دی تو وہ بولا۔ ”بیٹے! میں تمہارا ابو بات کر رہا ہوں۔ دراصل مجھے تم سے ایک بہت ہی سیریس مسئلہ ڈسکس...“

”مر گیا آپ کا بیٹا۔“ عامم نے نفرت انگیز لہجے میں قطع کلامی کی۔ ”آئندہ مجھے کال مت کرنا۔ ورنہ میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں گا۔“

بیٹے کا لہجہ اور لفظ بتا رہے تھے کہ بازی اُس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ تاہم اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بیٹے! مجھے نہیں معلوم کہ تم سے کیا کہا گیا ہے اور کس نے کہا ہے۔ مگر خدا جانتا ہے کہ...“

”میں نے کہہ دیا ہے نا کہ مجھے کچھ نہیں سنا۔“ عامم نے دوبارہ بات کاٹی۔ ”پھر آپ کیوں اور کس لیے اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے ہیں؟ آپ نے تو مجھے منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں چھوڑا۔ ثمنینہ آپ کی بیوہ ہے اور بیوہ بچی کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن آپ نے اس مقدس رشتے کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔“

”یہ... یہ تم... لگ... کیا... کہہ رہے... ہو؟“

عامم کی بات سن کر اُسے یوں لگا جیسے کسی نے اُسے سر بازار بے لباس کر دیا ہو، اُس کی زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی۔ بولنے کے لیے اب کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ فون ہاتھ میں لیے وہ یوں ساکت و جامد تھا جیسے کوئی سنگی مجسمہ ہو۔ دوسری طرف سے عامم کب کا کال منقطع کر چکا تھا۔ مگر وہ بدستور فون کان سے لگائے ہوئے تھا۔ ایسے ہی بیٹھے بیٹھے اُسے بہت دیر گزر گئی تو وہ اٹھا، ٹیبل کی دراز سے ایک نوٹ بک نکالی اور کچھ لکھنے لگا۔

☆☆☆

ابھی اس واقعے کو ہوئے چند دن ہی گزرے تھے کہ ایک روز اچانک عامم کو سلیم کی طرف سے کال موصول ہوئی۔ ”عامم میرے دوست! تم پہلی فرمت میں چھٹی لے



بھوم

ہو رہا ہے۔ مگر میں اپنی پروفیشنل ذمہ داری سے مجبور ہوں ورنہ یہ موقع ایسی گفت گو کے لیے نہایت نامناسب ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے برا نہیں منائیں گے؟“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! مجھے اب کچھ بھی اچھا برا نہیں لگتا۔ آپ کو جو کچھ بھی پوچھنا ہے، بلا جھجک پوچھیں۔۔۔۔۔ دیے آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ میں ملک سے باہر رہتا ہوں۔“

”آپ مجھے۔۔۔۔۔ شیردل کے نام سے پکار سکتے ہیں۔“ وہ کیپ اُتار کر نیل پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے سینے پہ لگی نیم پلیٹ تو آپ نے پڑھ لی ہوگی۔“

”پڑھ چکا ہوں۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”آپ سوال کیجیے۔“

”سلیم سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“ انسپکٹر نے پہلا سوال کیا۔

وہ بولا۔ ”سلیم میرے لیے ایک بھائی کی طرح ہے۔ اگر آپ کو اُس پر کسی قسم کا شک ہے تو پھر آپ کی تفتیش غلط رخ پر جا رہی ہے۔“

”یعنی بھائی کی طرح ہے مگر بھائی نہیں ہے؟ آپ کے کہنے کا یہی مطلب ہے نا؟“ انسپکٹر نے اُس کی بات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

”ہاں۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میرا اُس سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن مجھے اُس پر کسی قسم کا بھی شک نہیں ہے۔ اُس نے بے شمار احسانات کیے ہیں مجھ پر۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، سلیم ہی کے دم سے ہوں۔“

”میں نے ابھی تک اُس پر کسی قسم کا بھی شک نہیں کیا۔ تاہم میں اُس سے چند سوالات ضرور کرنا چاہوں گا۔“

”سوری انسپکٹر صاحب! میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔“ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ سے کس نے اجازت مانگی ہے؟“ انسپکٹر مسکرایا۔

”یہ تو میری ڈیوٹی ہے جو بہر صورت مجھے سرانجام دینی ہے۔ آپ چاہیں بھی تو مجھے اس اقدام سے نہیں روک سکتے۔ کیونکہ یہ کارہ سرکار ہے اور کارہ سرکار میں آپ تو کیا کوئی بھی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔“

”یہ تو آپ زیادتی کر رہے ہیں انسپکٹر صاحب۔“

اُس نے احتجاج کیا۔ ”سلیم میرا دوست ہے اور مجھے اپنی جان سے بھی پیارا ہے۔ میں اُس کی بے عزتی کسی صورت بھی برداشت نہیں کروں گا۔“

”بھی تو کرنی ہے نا؟“

”مم۔۔۔ میں اُن سب کو غرورہ کیسے دیکھوں گا۔“ وہ پھر رو دیا۔ ”اُن کی زندہ صورتیں میرے ذہن میں محفوظ رہنے دے سلیم! مم۔۔۔ میں برداشت نہیں کر سکوں گا، تم ہی انہیں قبروں میں اُتار دو۔“

”یہ دنیا داری کے تقاضے ہیں میرے دوست! تمہیں باپ اور ماں کے جنازے کو کندھا دینا ہی پڑے گا۔ شہینہ بھی تو تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔“

سلیم کافی دیر تک اُسے سمجھاتا رہا۔ آخر کار اُسے سلیم کی بات ماننا ہی پڑی اور وہ دو ماہ کی چھٹی لے کر وطن واپس آ گیا۔

معا گاڑی کے ٹائرز چیلے، اُسے ایک جھٹکا لگا اور وہ ماضی سے نکل کر حال میں پہنچ گیا۔ گاڑی رک چکی تھی۔ اُس نے سامنے دیکھا تو گاڑی کے آگے سے بھینسیں روڈ کراس کر رہی تھیں۔

سلیم نے جھنجھلا کر کہا۔ ”پتا نہیں اس ملک کے لوگوں کو کب عقل آئے گی اور کب یہ سڑکوں کے کنارے مویشی چرانا چھوڑیں گے؟“

جواب میں وہ خاموش رہا۔ سلیم نے روڈ خالی ہوتے ہی گاڑی آگے بڑھادی۔ لگ بھگ وہ تین گھنٹوں کے اندر گھر پہنچ گئے۔ جہاں ایک ساتھ نو بیٹیں عاصم کی منتظر تھیں لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا۔ گھر میں عاصم کے تقریباً دو روز دیک کے تمام رشتے دار موجود تھے۔ وہ ایک ایک میت سے لپٹ کر روتا رہا۔ دوست رشتے دار اُسے ہنسی جھوٹی تسلیاں دیتے رہے۔ مگر آج ہر تسلی اُس کے غم کی شدت کم کرنے میں ناکام رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جنازے اٹھائے گئے تو وہ لوگوں کے ہجوم کے ساتھ قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنازے پڑھے گئے اور پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے ہی اُس کے سارے گھر والوں کو زمین میں اُتار دیا گیا۔ قبرستان سے فارغ ہو کر جونہی وہ لوگوں کے ساتھ اپنے گھر تک پہنچا تو گیٹ کے سامنے ہی ایک پولیس دین موجود تھی۔

www.paksociety.com

پولیس انسپکٹر ایک چہرے پر بدن والا خوب صورت سانو جوان تھا جس کی آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ سب سے پہلے اُس نے پولیس والوں کے روایتی انداز سے ہٹ کر عاصم سے اظہارِ عزیت کیا اور پھر شائستہ انداز میں بولا۔ ”گوکہ آپ سے سوال و جواب کرنا مجھے بہت معیوب محسوس







ہے صاف صاف الفاظ میں پوچھیں۔“

اُس کے انداز میں اُجھکن تھی۔ چنانچہ انسپکٹر چوکنا ہو کر بولا۔ ”بی بی! نو جیتے جاگتے بے گناہ انسان قتل ہوئے ہیں اور پولیس کی کفایت ہمیشہ گھر سے ہی شروع ہوتی ہے۔ آپ کی بیزاری دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ کچھ جانتی ہیں مگر بتانا نہیں چاہتیں۔“

”یہ وہم ہے آپ کا۔ میں اگر کچھ جانتی تو ضرور بتاتی۔ مجھے بھلا کچھ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اوکے... تو یہ بتائیں کہ یہ سلیم آپ کا کیا لگتا ہے؟“

”بھائی ہے۔“ اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

انسپکٹر بولا۔ ”جہاں تک مجھے معلوم ہے تو آپ کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ تو پھر یہ سلیم شاید آپ کا کوئی کزن وغیرہ ہوگا؟“

”وہ میرا منہ بولا بھائی ہے۔“

”یعنی آپ کا اُس سے کوئی رشتہ نہیں ہے؟“ انسپکٹر نے پرجوش انداز میں پوچھا۔

”کیا منہ بولا رشتہ آپ کے نزدیک رشتہ نہیں ہے؟“ انسپکٹر نے ہوا میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ کے پڑوسی وغیرہ تو آپ دونوں کے اس رشتے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؟“

”مم... میں سمجھی نہیں... آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ وہ پل بھر کے لیے بوکھلا گئی۔

”یہی کہ آپ کے اور سلیم کے درمیان کوئی چکر وغیرہ چل رہا ہے۔ جسے آپ کے مقتول سرپرست نہیں کرتے تھے۔ اُن کا اور سلیم کا ایک بار جھگڑا بھی ہوا تھا، کیا یہ سچ ہے؟“

”بکو اس کرتے ہیں ہمارے پڑوسی۔“ وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ ”دراصل وہ ہمیں آگے بڑھتا دیکھ کر حسد اور جلن کا شکار ہو گئے ہیں اس لیے مجھ پر اُلٹے سیدھے الزام لگاتے رہتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں حسد اور جلن سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

وہ بولی۔ ”دراصل میرے شوہر عاصم کو سلیم نے ملک سے باہر بھجوایا ہے۔ سلیم نہ صرف میرا منہ بولا بھائی ہے بلکہ عاصم کا بھی قریبی دوست ہے۔ ہمارے اس رشتے کے متعلق میرے شوہر کو بھی اچھی طرح معلوم ہے لیکن لوگوں سے ہماری ترقی ہضم نہ ہو سکی اس لیے وہ میرے اور سلیم کے

رشتے کو غلط رنگ دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔“

”یعنی آپ کے سرور سلیم کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا؟“

”بالکل بھی نہیں۔“ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بلکہ میرے سرور عاصم کو اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔“

”مطلب وہ آپ دونوں کے اس رشتے سے خوش تھے؟“

”بلا شک و شبہ خوش تھے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اوکے۔“ انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ایک لیڈی کانسٹیبل کو بلا کر کہا۔ ”اس بی بی جی کو لے جاؤ اور اس کے آرام کا خصوصی خیال رکھنا ہے۔ مجھے شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔“

”ڈونٹ وری سر۔“ ٹرانٹ سی لیڈی کانسٹیبل ذومعنی انداز میں ہنستے ہوئے بولی۔ ”میں آپ کی توقع سے بھی زیادہ اس بی بی کا خیال رکھوں گی۔“

اُن دونوں کے جانے کے بعد انسپکٹر نے سلیم کو طلب کر لیا۔ سلیم ایک کانسٹیبل کی معیت میں اندر داخل ہوا اور سلام کرنے کے بعد جواب طلب نظروں سے انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

”تشریف رکھیں۔“ انسپکٹر نے کرسی کی جانب اشارہ کیا اور پھر کانسٹیبل کو دو بہترین چائے لانے کا کہا۔

”ہاں تو مسٹر سلیم! کیا خیال ہے، سوالات کا آغاز کیا جائے؟“ انسپکٹر نے مسکرا کر پوچھا۔

”کیوں نہیں جناب! یہ تو آپ کی ڈیوٹی ہے۔ آپ پوچھیں مجھے جو کچھ بھی معلوم ہوگا، میں بلا جھجک بتاؤں گا۔“

”اوکے تو یہ بتائیے کہ آپ کی اور عاصم کی دوستی کس طرح اور کیسے ہوئی؟“

”بس ویسے ہی ہو گئی جس طرح سب کی ہوتی ہے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب تو نہ ہوا۔“ انسپکٹر معترض ہوا۔

”ٹھیک ہے میں آپ کو ساری کہانی سنا دیتا ہوں۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر انکل نذیر کے جنرل اسٹور میں پیش آنے والا واقعہ انسپکٹر کے سامنے بغیر کسی لگی لپٹی کے بیان کر دیا۔

جب وہ واقعہ سنارہا تھا تو اُس دوران کانسٹیبل چائے کے دو گرما گرم کپ انسپکٹر کی ٹیبل پر رکھ گیا تھا۔ انسپکٹر نے ایک کپ اُس کی طرف کھسکا دیا جب کہ دوسرا کپ خود اٹھا



لیا۔ ”ہاں تو مسٹر سلیم!“ وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔  
 ”میں نے سنا ہے کہ عاصم کے والد مقتول رشید احمد آپ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟ اگر آپ نے جھوٹ بولا تو یقیناً آپ پھنس جائیں گے اس لیے جواب سوچ سمجھ کر دینا۔“

سوال سن کر لمحہ بھر کے لیے وہ کش مکش کا شکار ہو گیا مگر چہرے کے تاثرات سے اُس نے انسپکٹر کو پتہ نہ چلنے دیا۔ ویسے بھی وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ چنانچہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ بولا۔ ”ہاں انکل رشید واقعی مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔“

”گڈ، آپ نے سچ بول کر ایک معزز شہری ہونے کا ثبوت دیا ہے۔“ انسپکٹر نے توصیفی انداز میں کہا۔ ”اب ذرا یہ بھی بتا دیجیے کہ آپ دونوں کے بیچ جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟“

”وہ جی بس ایک عام سی گھریلو بات تھی۔ آپ جان کر کیا کریں گے؟“

”دیکھیے مسٹر سلیم! یہ کوئی عام سا معاملہ نہیں ہے۔ نو انسانوں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کیا گیا ہے۔ آپ اگر سب کچھ ہمیں نہیں بتائیں گے تو پھر ہم قاتلوں تک کیسے پہنچیں گے؟ آپ کو ہمارے ساتھ مکمل تعاون کرنا پڑے گا۔ یہی آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔“

”وہ جی دراصل میں شہینہ کے لیے ایک تحفہ لے کر گیا تھا۔ جس پر انکل رشید کو غصہ آ گیا اور پھر ہم دونوں کے بیچ ٹوٹو میں ہو گئی۔ مگر یہ تو بہت بُرائی بات ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”لیکن میں نے تو کچھ اور سنا ہے؟“  
 ”وہ... وہ کیا جی؟“ اُس نے حیرت اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔

”یہی کہ تو عرصے سے چند روز قبل بھی آپ دونوں کے بیچ کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا؟“ انسپکٹر نے ہوا میں تیر چلایا۔  
 ”نہیں... نہیں جی... آپ کو کیسے پتا؟“ غیر ارادی طور پر اُس کے منہ سے نکلا تو انسپکٹر شیر دل معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

”مسٹر سلیم!“ معا انسپکٹر بد لے ہوئے لہجے میں بولا۔  
 ”میں تمہاری زبان سے صرف سچ سنا چاہتا ہوں۔“ اس بار اُس نے اُسے ”آپ“ کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔ ”بہتر ہوگا کہ خود ہی سچ بول دو ورنہ منہ کھلوانے کے میرے پاس اور بھی طریقے ہیں۔“

”مم... میں کچھ نہیں جانتا جی۔“ اُس نے نفی میں

سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”او کے... اس کا مطلب ہے کہ تم سیدھی طرح نہیں مانو گے۔ مجھے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔“  
 ”جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو پھر مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ اُس نے ہمت کا مظاہرہ کیا۔

”واقعی تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ انسپکٹر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”او کے اب تم سے کل صبح ملاقات ہوگی۔“

اس کے بعد اُس نے کانشیل کو آواز لگائی تو وہ فوراً حاضر ہو گیا۔ ”حکم سر۔“ کانشیل نے سلیوٹ کیا۔

”اُسے لے جا کر حوالات میں بند کر دو اور حوالدار الطاف سے کہو کہ اُسے صاحب بلار ہے ہیں۔“ انسپکٹر نے حکم دیا۔

”بہت بہتر جناب۔“ کہتے ہوئے کانشیل سلیم کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ جب کہ انسپکٹر شیر دل سامنے رکھی قافل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد ایک موٹا تازہ حوالدار اجازت لے کر اندر داخل ہوا اور انسپکٹر کو سلام کرتے ہوئے بولا۔  
 ”حوالدار الطاف حاضر ہے جناب! حکم کیجیے۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”الطاف! آج رات یوں سمجھو کہ تمہارا امتحان ہے۔ تم نے اس حوالاتی کورٹ بھر پلک بھی نہیں جھپکنے دینی۔ لیڈی کانشیل فرزانہ کو بھی بتادو کہ اُس نے شہینہ کو نہیں سونے دینا۔“

”بے فکر رہے جناب! ایسا ہی ہوگا۔“ حوالدار نے فرماں برداری سے جواب دیا تو انسپکٹر نے اُسے جانے کا اشارہ کر دیا۔

☆☆☆

دوسرے روز صبح سویرے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد شیر دل کا فیس جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایسے وقت گھریلو ملازم نے آکر اُسے بتایا۔ ”جناب! کوئی عاصم نامی شخص آپ سے ملنے کے لیے آیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چائے وغیرہ پلاؤ میں آرہا ہوں۔“

ملازم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چلا گیا۔ جب کہ وہ یونی فارم پہننے لگا۔ یونی فارم پہن کر اُس نے قہر آدم آئینے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لیا اور پھر مطمئن ہو کر ٹیبل پر رکھی دو تین قاتلیں اٹھاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اب اُس کا رخ ڈرائنگ روم کی جانب تھا۔

جاسوسی ڈائجسٹ

250

جولائی 2015ء



بھوم  
”آپ بھی اگر تفتیش کی زد میں آگئے تو میں اس سے  
گریز نہیں کروں گا۔“ اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور  
عاصم بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

”آپ کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے؟“

وہ بولا۔ ”ہاں... دراصل میں اس اُلجھن میں ہوں  
کہ ڈاکو کبھی بے جا خون خرابا نہیں کرتے تو پھر انہوں نے  
آپ کی فیملی کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں کیا۔ اگر لوٹنا ہی  
اُن کا مقصد تھا تو پھر انہیں یہ خون ریزی کرنے کی کیا  
ضرورت تھی؟ زیادہ سے زیادہ آپ کے والد یا پھر بھائی نے  
مزاحمت وغیرہ کی ہوگی۔ عورتیں اور بچے تو مزاحمت کرنے  
سے رہے۔ مجھے یہ کسی دشمن کی کارروائی لگتی ہے۔ کوئی ایسا  
دشمن جس کے لیے آپ کے سب گھر والے خطرے کا الارم  
تھے۔ اب آپ سوچ کر بتائیے کہ آپ کا ایسا کوئی دشمن  
تھا؟“

”میں اس بارے میں لاعلم ہوں۔“ اُس نے بے بسی

سے جواب دیا۔

”تو پھر میری تفتیش کے راستے میں روڑے کیوں  
انکاتے ہو؟“ انسپکٹر نے قدرے بُرا مان کر پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”آپ کی بات دل کو لگتی ہے۔ لہذا آپ اپنی تفتیش جاری  
رکھیں۔ اب میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں  
ہوگی۔“

”گڈ نائٹ! بات۔“ انسپکٹر مسکرایا۔ ”اب آپ  
بے فکر ہو جائیں، بہت جلد قاتل کی گردن میرے ہاتھوں  
میں ہوگی۔“

”اوکے۔“ وہ انسپکٹر سے ہاتھ ملا کے..... رخصت  
ہو گیا۔

فیئر دل پولیس اسٹیشن پہنچا اور فوراً ٹمپین کو پیش کرنے  
کا حکم دیا۔ وہ لیڈی کانسٹیبل کے ساتھ جب انسپکٹر کے  
سامنے پیش ہوئی تو اُس کی حالت بہت بُری تھی۔ ایک ہی  
رات میں جیسے وہ آدمی ہو کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ انسپکٹر شیردل  
کے حکم کے مطابق اُس پر کسی قسم کا جسمانی تشدد نہیں  
کیا گیا تھا۔ اُسے صرف ساری رات زبردستی جگا کر رکھا  
گیا تھا۔ چنانچہ اُس کی خوب صورت آنکھوں کے گرد سیاہ  
حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ریٹھی زنجیریں جھاڑ جھنکاڑ کے مانند  
اُلجھتی ہوئی تھیں اور لباس میں سلونیں پڑ چکی تھیں۔  
انسپکٹر نے ایک نظر اُس کا جائزہ لیا اور پھر مسکراتے ہوئے  
بولا۔ ”تشریف رکھیے ٹمپین بی بی۔“

جونہی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو عاصم اُسے  
دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”پلیز تشریف رکھیے۔“ وہ عاصم کے ساتھ گرم جوشی  
سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ”حکم کیجیے کیسے تشریف آوری  
کی زحمت کی؟“

عاصم نے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! میں کل رات سے  
نہیں سویا۔ پلیز آپ میری وائف اور دوست کو چھوڑ دیں۔  
مجھے اُن پر یقین ہے وہ بے قصور ہیں۔ وہ اس قدر گھناؤنا جرم  
کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ آپ نے ڈکیتی  
کی واردات میں خواہ مخواہ اُن بے چاروں کو ملوث کر دیا  
ہے۔“

”ڈونٹ وری مسٹر عاصم! وہ اگر بے گناہ ہیں تو میں  
آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کوئی اُن کا بال بانکا بھی نہیں  
کر سکتا۔“

وہ بولا۔ ”جناب! میں مقتولین کا وارث ہونے کے  
ناتے آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ اُن دونوں کو چھوڑ دیں۔  
مجھے اپنی بیوی اور دوست پر پورا اعتماد ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں  
کر سکتے۔“

”آپ جذباتی ہو کر سوچ رہے ہیں مسٹر عاصم! میں یہ  
تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ دونوں اس گھناؤنی واردات میں ملوث  
ہیں۔ مگر اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ نہ کچھ  
جانتے ضرور ہیں۔ آپ آج شام تک صبر کر لیں، اگر وہ  
دونوں بے گناہ ہوئے تو بغیر کسی سفارش کے رہا ہو جائیں  
گے ورنہ اُن کی قسمت کا فیصلہ عدالت کرے گی۔“

”میں آپ کے شک کی وجہ جان سکتا ہوں؟ آپ کو  
کون سا ایسا اہم کلیو ملا ہے کہ آپ نے اُن دونوں کو گرفتار  
کر لیا؟“

”وقت آنے پر یہ بھی بتا دوں گا۔ بس آپ تھوڑا سا  
صبر کر لیں۔“

”صبر... کیسے صبر کر لوں انسپکٹر صاحب!“ وہ جھنجھلا  
اُٹھا۔ ”میرے سارے گھر والے بے دردی کے ساتھ قتل  
کر دیے گئے۔ شہیے میں میری بیوی اور دوست سلاخوں کے  
پیچھے چلے گئے۔ مگر آپ ہیں کہ پھر بھی مجھے صبر کی تاکید  
کر رہے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟“

”عاصم صاحب! آپ میرے ایک سوال کا جواب  
دیں گے؟“ انسپکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔  
وہ بولا۔ ”بس اب یہی کسر رہ گئی تھی۔ اوکے، مجھے بھی  
تفتیش میں شامل کر لیں۔“



”خدا کے لیے...م...مجھے سونے دیجیے انسپکٹر صاحب۔“ وہ منمنائی۔ ”میرا سر درد سے پہنا جا رہا ہے۔ م...میں مر جاؤں گی...پکیز پکیز...میں سونا چاہتی ہوں۔“

”سچ بولو گی تو ضرور سونے دیا جائے گا۔ ورنہ یوں ہی جاگ جاگ کر پاگل ہو جاؤ گی۔“ انسپکٹر نے بے رحم انداز میں جواب دیا۔

نام باپ پر لگا یا تھا۔ مجبور اور بد قسمت باپ کی آخری کال کے الفاظ یاد آئے۔ اُن لفظوں میں کس قدر درد تھا اور سچائی جیسے چھلک رہی تھی مگر وہ بد بخت تھا، باپ کے بجائے ایک مکار عورت پر اعتبار کر بیٹھا۔ سوچ سوچ کر وہ پچھتا رہا تھا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں وہ اٹھا اور باپ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ جب سے وہ آیا تھا ابھی تک باپ کے کمرے میں اُس نے قدم نہیں رکھا تھا۔ اس کی وجہ وہ نفرت تھی جو باپ کے خلاف ثمنینہ نے اُس کے دل میں پیدا کی تھی۔

وہ یوں پشیمانی کے انداز میں کمرے کے اندر داخل ہوا جیسے اُس کا باپ زندہ ہو اور کمرے میں بیٹھا اُسے ملامت کرنے کا خطر ہو۔ لیکن کمرہ بالکل سناں تھا۔ کمرے میں موجود ہر چیز پر گرد کی ایک موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ سامنے ہی بالکل دیوار کے ساتھ اُس کے باپ کا بیڈ تھا۔ بیڈ سے چند فٹ اوپر دیوار میں بیوستہ ایک چوبی الماری تھی۔ جو نہ صرف بند تھی بلکہ اُسے تالا بھی لگا ہوا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ اُس کی ماں کا بیڈ تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا باپ کے بیڈ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ ایسے ہی وقت بے اختیار اُس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ درد مکیں پانی کا روپ دھار کر اُس کا چہرہ بھگونے لگا۔ روتے روتے اُسے کئی لمحات بیت گئے۔ مگر آج اُس گھر میں کوئی ایک بھی نہیں تھا جو اُسے تسلی دیتا۔ اُس کے آنسو پونچھتا، اُسے گلے لگا کر اُس کی بلائیں لیتا یا پھر اُس کی پشت سہلاتے ہوئے کہتا۔ ”بیٹے! مرد کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔“

رونے سے غم کی شدت کچھ کم ہو گئی تو وہ اٹھا اور ٹیبل کی دراز سے چابی نکال کر چوبی الماری کھولی اور اندر سے باپ کی چیزیں نکال کر بیڈ پر ڈھیر کرنے لگا۔ ان چیزوں میں زیادہ تر روزمرہ کے استعمال کی اشیاء تھیں۔ جن میں باپ کے تہ شدہ کپڑے، جوتے، چند کتابیں، پنشن بک اور ڈائری نما ایک نوٹ بک تھی۔ اس نوٹ بک میں ماسٹر رشید اکثر گھریلو حساب کتاب درج کیا کرتا تھا۔ اُس نے نوٹ بک اٹھا کر کھولی تو صفحات کے درمیان سے ایک تہ شدہ کاغذ نکل کر بیڈ پر گر گیا۔ اُس نے تہ شدہ کاغذ اٹھا کر دیکھا تو اُس کے ایک کونے میں لکھا تھا۔ ”عاصم کے لیے۔“ اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کاغذ کی تہیں کھولیں اور نظریں تحریر پر جمادیں۔ ماسٹر رشید نے لکھا تھا۔ عزیز از جان پیارے بیٹے عاصم کے نام

”ک...کیا سچ؟“

”یہی کہ عاصم کی میلی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”م...مجھے کیا بتا جی...م...میں تو اپنے گھر میں تھی۔ میرا مطلب ہے کہ میکے میں تھی۔“

وہ بولا۔ ”ثمنینہ بی بی! تمہیں جو عزت دینی تھی، وہ میں کل دے چکا ہوں۔ اب ”آپ جناب“ والے القاب نہیں چلیں گے۔ لہذا جو کچھ تمہیں معلوم ہے مجھے بتادو، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کم سے کم سزا ہو۔“

”م...میں کچھ بھی نہیں جانتی جی۔“ وہ رونے لگی۔

”بی بی! یہ تھانہ ہے۔ یہاں آنسو بہانے سے جان نہیں چھوٹی بلکہ سچ بولنے سے چھوٹی ہے۔ بولو تم کیا جانتی؟“

”م...میں کچھ نہیں جانتی۔“ اُس نے روتے روتے جواب دیا۔

”فرزانہ!“ انسپکٹر نے لیڈی کانسٹیبل کو مخاطب کیا۔

”اے لے جاؤ اور زندہ چھلکی والا قاتل آؤ۔“

”بس سر۔“ کہتے ہوئے فرزانہ نے اُسے بازو سے پکڑا اور تقریباً کھینچتے ہوئے باہر لے گئی۔

☆☆☆

عاصم پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا اور پھر بیڈ پر گر سا گیا۔ اُس کی سماعتوں میں رہ رہ کر انسپکٹر شیردل کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ”ڈاکو بھی بھی بلا وجہ کی خون ریزی پسند نہیں کرتے۔ یہ کسی دشمن کی کارروائی لگتی ہے۔ کوئی ایسا دشمن جس کے لیے آپ کے سب گھر والے خطرے کا لام تھے۔ خطرے کا الارم تھے۔ خطرے کا الارم تھے۔“ لفظ ہتھوڑے کی طرح اُس کی سماعتوں پر برسنے لگے۔

”شاید مجھ سے کہیں بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔“

اُس نے خود کلامی کی اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایسے ہی وقت ماضی کے واقعات کی ایک فلم سی اُس کے دماغ میں چلنے لگی۔ اُسے ثمنینہ پر سلیم کی بے انتہا مہربانیاں یاد آئیں، ساتھ ساتھ بوڑھے اور جہاں دیدہ باپ کی سختیں یاد آئیں پھر ثمنینہ کا الزام یاد آیا جو اُس نے عاصم کے ٹیک



السلام علیکم! بیٹے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی بھر خوش و خرم رکھے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا یہ خط تمہیں تب ملے گا جب میں اس دنیا میں نہیں ہوں گا۔ نجانے مجھے کیوں یقین سا ہو چلا ہے کہ میں قطعی موت نہیں مردوں گا۔ اگر میرا یہ یقین سچ ثابت ہو جائے تو پھر میری موت کے ذمے دار میری بہو ثمینہ اور اُس کا دوست سلیم ہوں گے کیونکہ اُن دونوں کو میں نے گزشتہ رات ثمینہ کے بیڈ روم میں نہایت ہی شرم ناک حالت میں دیکھا ہے۔ وہ دونوں بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ بہن بھائی کے مقدس رشتے کو پامال کر رہے تھے۔ تب میں نے انہیں برا بھلا کہا تو سلیم نے مجھ پر پستول تان کر مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے کسی کے سامنے زبان کھولی تو وہ میری دونوں چھوٹی بیٹیوں کو منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ میں نے خوف کے مارے یہ بات کسی کو بھی نہیں بتائی۔ مگر جب صبح کے وقت میں نے ثمینہ کو گھر سے غائب پایا تو پھر مجبوراً مجھے یہ بات تمہاری امی کو بتانا پڑی۔ اس کے بعد تمہاری امی ہی کے مشورے پر میں نے تمہیں کال کی مگر تب تک وہ ڈائن ٹھینہ تمہارے کان بھر چکی تھی۔ لہذا تم نے میری بات سننے کے بجائے اُلٹا مجھ پر الزام لگا دیا۔ بیٹے! میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ بس دُکھ ہے تو صرف اس قدر کہ تم نے مجھے اعتبار کے قابل نہیں سمجھا۔ بہر کیف میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ اگر تم ثمینہ کی اصلیت جان جاؤ تو پھر اُس سے قطع تعلق کر لیتا۔ خواہ مخواہ کی دشمنی مول مت لیتا۔ سلیم بہت خطرناک آدمی ہے۔

خدا حافظ

تمہارا ابد نصیب باپ ماسٹر رشید احمد

باپ کا خط پڑھنے کے بعد وہ دیر تک روتا رہا، دل ہی دل میں خود کو کوستا رہا۔ جب روتے روتے تھک گیا تو ثمینہ اور سلیم سے انتقام لینے کے منصوبے سوچنے لگا۔ پہلے تو اُس نے انسپکٹر شیردل سے مدد لینے کا سوچا مگر پھر خود ہی یہ پلان رد کر دیا۔ آخر کار بہت دیر کے بعد ایک بے داغ پلان اُس نے تیار کر لیا۔ اب اُسے مناسب وقت کا انتظار تھا۔

ادھر پولیس اسٹیشن میں اُسی روز سلیم اور ثمینہ نے اقبال جرم کر لیا تھا۔ انسپکٹر شیردل کا نفسیاتی حربہ اس بار بھی کامیاب ثابت ہوا تھا۔ چنانچہ دونوں مجرموں کو اسی روز جیل کے حوالات میں منتقل کر دیا گیا کہ اب انہیں سزا دینا یا بری کرنا عدالت کی ذمہ داری تھی۔

☆☆☆

دس بارہ دنوں کے بعد ایک بار پھر عاصم انسپکٹر شیردل کے ڈرائنگ روم میں اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ انسپکٹر شیردل بڑی حقارت سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے اُسے گھورنے کے بعد انسپکٹر بولا۔ ”مجھے آپ سے اس قدر کرنے کی اُمید نہیں تھی۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں، میں نے پہلا شخص دیکھا ہے جو اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے لہو کا سودا کرنا چاہتا ہے۔“

وہ بولا۔ ”مجبوری ہے انسپکٹر صاحب! میں جانتا ہوں کہ اس ملک کا قانون انہیں شک کا موقع دیتے ہوئے بری کر دے گا۔ کوئی چشم دید گواہ تو ہے نہیں میرے پاس تو پھر کیس لڑنے کا کیا فائدہ؟ اس سے بہتر ہے کہ میں کیس لڑنے کے بجائے خون بہا لے لوں؟ مذہب اور قانون دونوں اس کی اجازت دیتے ہیں۔“

”لیکن تجھے یقین ہے کہ انہیں سزا ہو جائے گی پھر آپ کیوں انہوں کا خون بیچنا چاہتے ہیں؟“

”انہیں سزا ہو بھی گئی تو مرنے والے تو واپس نہیں آئیں گے نا؟“

انسپکٹر نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ آپ ابھی تک اُس بے وقار اور قاتل عورت کو بھولے نہیں ہیں۔ اب بھی آپ کا دل اُس کے نام پر دھڑکتا ہے۔“

”میں اُس پہ کب کی لعنت بھیج چکا ہوں۔“ اُس نے حقیر سے جواب دیا۔

”ماسٹر عاصم! میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ خون بہا لینے کے بجائے کیس لڑیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اُن دونوں کو موت کی سزا ضرور ہوگی۔“

وہ بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! آپ مجھ سے کہیں بہتر جانتے ہیں اس ملک کے قانون کو، یہاں انصاف کوئی نہیں کرتا۔ سب اپنی جیبیں بھرتے رہتے ہیں۔ اُن کی بلا سے کوئی مرے یا جیے، انہیں صرف اور صرف اپنی...“

”بے وقوف مت بنو۔“ انسپکٹر نے قطع کلامی کی۔

”کیس کی پیروی تو کرو، پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں ہوگا جناب! سوائے اس کے کہ میں یہ کیس ہار جاؤں گا۔ پلیز مجھے مجبور مت کریں۔“

”اوکے۔“ انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جیسے آپ کی مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ خون بہا دلانا عدالت کا کام ہے پولیس کا نہیں۔ قاتلوں کے وکیل سے رجوع کرو یا پھر سید حاجیل جا کر اُن دونوں سے ملاقات کر لو۔“

”ٹھیک ہے جناب! تو پھر مجھے اجازت دیجیے۔“



اُس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”ان شاء اللہ بہت جلد دوبارہ ملاقات ہوگی۔“

”خون بہا لینے کے بعد مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔“

اُس نے بے دلی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”میں بزدلوں کو پسند نہیں کرتا۔“

”خون بہا لینے کے بعد میں اس ملک سے واپس انگلینڈ چلا جاؤں گا۔“

”میری طرف سے جہنم میں چلے جانا۔“ انسپکٹر نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

وہ سلیم اور شمیمہ کے مشترکہ وکیل کے ساتھ سینٹرل جیل میں داخل ہوا تو وکیل نے کہا۔ ”خصوصی ملاقات کی اجازت جیلر سے لینا پڑے گی۔“

اُس نے کہا۔ ”اسی لیے تو آپ کو ساتھ لایا ہوں سر! اس خصوصی ملاقات کا انتظام آپ کو کرنا ہے اور ہاں آپ بے فکر رہے خون بہا لینے کے بعد میں آپ کو بھولوں گا نہیں بلکہ آپ کا خصوصی شکریہ ادا کروں گا۔“

”ڈونٹ وری سرا“ وکیل نے خوشی سے دانت نکالے۔ ”میں ابھی انتقام کیے دیتا ہوں مگر جیلر کو بھی راضی کرنا پڑے گا۔“

”کوئی بات نہیں وہ بھی کر لیں گے۔“ اُس نے جیب سے والٹ نکالا، اُس میں سے چند بڑے نوٹ نکال کر وکیل کی طرف بڑھادیے۔ ”کیا خیال ہے کافی رہیں گے یا مزید بھی دوں؟“

”کافی ہیں سر۔“ وکیل مسکراتا ہوا جیلر کے آفس کی جانب بڑھ گیا۔

وکیل کی کوششوں سے نصف گھنٹے کے اندر ہی سلیم اور وہ ایک دوسرے کے آنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں اُن کے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ سلیم کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر ندامت دیکھتا دے کے تاثرات تھے۔

”تمہارا بچھتاوا اور ندامت اب بے معنی ہیں۔“ عاصم نے پہل کی۔ ”تم دونوں کو پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔“

وہ بولا۔ ”تم یہی بتانے آئے ہو مجھے؟“

”نہیں۔“ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تم دونوں سے ایک سودا کرنے آیا ہوں۔“

”کیسا سودا؟“ سلیم کے چہرے پر حیرت تھی۔

”تمہاری اسپر پارٹس درآمد کرنے والی فرم کتنی

مالیت کی ہوگی؟“ اُس نے اُلٹا سوال کر دیا۔

”اُس کی مالیت تو کروڑوں میں ہوگی مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ یہ فرم تمہیں موت کی سزا سے بچا سکتی ہے۔“ اُس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھا، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ سلیم کے چہرے پر حیرت دوچند ہو گئی۔

”میں نے کہہ تو دیا ہے کہ سودا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ فرم تمہیں میرے نام کرنا پڑے گی۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔

”او کے تو پہلے یہ دیکھ لو، پھر بات کریں گے۔“ اُس نے ایک تہ شدہ کاغذ جیب سے نکال کر اُس کی طرف بڑھادیا۔

سلیم نے ناگوار انداز میں کاغذ لیا، اُس کی تھیں کھولیں اور پھر پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ پڑھتا گیا توں اُس کی رنگت اڑتی چلی گئی۔

”یہ... یہ... کیا ہے؟“ کاغذ پڑھنے کے بعد سلیم نے خوف زدہ لہجے میں سوال کیا۔

”یہ میرے باپ کے اُس خط کی فوٹو کاپی ہے جو میں عدالت میں بطور ثبوت پیش کروں گا۔ انسپکٹر شیردل کہتا ہے کہ اس خط کی موجودگی میں چشم دید گواہ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے، اچھی طرح سوچ لو فرم پیاری ہے یا اپنی زندگی؟“

”میں سوچ کر جواب دوں گا۔“

”تو سوچو میں تمہارے فیصلے کا منتظر ہوں مگر ذرا جلدی کرنا ابھی مجھے تمہاری قاتل محبوبہ سے بھی ایک سودا کرنا ہے۔“

”مم... میں اپنے وکیل سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“ اُس نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔

عاصم نے کہا۔ ”یہ مشورہ تمہارے وکیل نے ہی دیا ہے۔ وہ باہر موجود ہے۔ بلاؤں اُسے؟“

”ہاں... میں اُس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”انصاری صاحب! اندر آجائے آپ کے کلاسٹ کو آپ کی ضرورت ہے۔“ عاصم نے قدرے بلند آواز میں وکیل کو پکارا۔

انصاری فوراً کمرے میں داخل ہوا اور بلا تمہید بولا۔

”سلیم صاحب! عاصم ٹھیک کہتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے پاس بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں نے ہی اسے منت

ساجت کر کے خون بہا لینے کے لیے راضی کیا ہے۔“



”لعل... لیکن تم... میں تو برباد ہو جاؤں گا۔“ سلیم نے بوکھلائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔  
انصاری بولا۔ ”بربادی کو آبادی میں بدلتے دیر نہیں لگتی مگر زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ سو چومت بس ہاں کہہ دو۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ سلیم نے نہ چاہتے ہوئے بھی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

سلیم کے جانے کے بعد اُس نے ثمنینہ سے ملاقات کی تو وہ بھی خون بہا میں وہ بنگلا دینے کے لیے راضی ہو گئی جو اُس نے عامم کی محنت کی کمائی سے تعمیر کرایا تھا۔ عامم اندر ہی اندر خون کے گھونٹ پیتا رہا مگر بظاہر وہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اُس سے ملا تھا۔

وکیل کے ساتھ رخصت ہوتے وقت وہ ثمنینہ سے بولا۔ ”فکر نہ کرو راضی نامہ کے ساتھ ساتھ تمہیں طلاق نامہ بھی ملے گا۔ اب تم دونوں کو بہن بھائی بننے کا ڈھونگ نہیں رچانا پڑے گا۔“

☆☆☆

چند روز کے اندر ہی سارے معاملات طے پا گئے۔ سلیم کی فرم اور ثمنینہ کا بنگلا عامم کے نام منتقل ہو گئے تھے۔ چنانچہ بظاہر وہ بڑا خوش اور مطمئن تھا۔ سلیم کے وکیل کو بھی بطور نذرانہ اُس نے خاصی رقم ادا کی تھی۔ خون بہا لینے کے بعد عامم نے باقاعدہ تحریری طور پر سلیم اور عامم کو معاف کر دیا تھا۔ جس دن سلیم اور ثمنینہ کو جیل سے رہا ہونا تھا اُسی دن عامم نے ثمنینہ والے بنگلے میں ایک پارٹی کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس پارٹی میں انسپکٹر شیردل اور سلیم کے وکیل کے علاوہ عامم کے چند پڑوسی اور رشتے دار مدعو تھے۔ پارٹی کا ٹائم دوپہر دو بجے کے لگ بھگ رکھا گیا تھا۔ چنانچہ ایک بجتے ہی مدعوین پہنچنے لگے۔ ڈیڑھ بجے تک قریب قریب تمام مہمان پہنچ گئے۔ اب انہیں ثمنینہ اور سلیم کا انتظار تھا، جو اس پارٹی کے مہمان خصوصی تھے۔ کیونکہ عامم کو انہیں سب مہمانوں کی موجودگی میں معاف کرنا تھا۔

سب لوگ خوش تھے اور آپس میں گپ شپ لگا رہے تھے۔ جب کہ چند ایک لوگ ٹی وی پر معروف ٹاک شو دیکھنے میں محو تھے۔ مگر انسپکٹر شیردل.... بیزار سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اُس کی شکل دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اُسے جبر آپائی میں لایا گیا ہو۔ عامم کافی دیر سے اُس کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔ اُسے انسپکٹر کی ناراضی کی وجہ بھی

معلوم تھی لیکن وہ مجبور تھا۔ وہ انسپکٹر کا مشورہ مان کر کیس نہیں لڑ سکتا تھا۔ لہذا خون بہا لے کر اُس نے قاتلوں سے صلح کر لی تھی۔ یہ پارٹی بھی اسی مقصد کے لیے منعقد کی گئی تھی۔

عامم مہمانوں سے ہائے ہیلو کرتا ہوا انسپکٹر شیردل کے پاس پہنچ گیا۔ ”کیسے ہیں سر آپ؟“ عامم نے ہنس کر پوچھا۔ انسپکٹر شیردل نے ناگوار نظروں سے اُسے گھورا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اس قدر لالچی نکلیں گے۔ اس بنگلے اور فرم کا آپ کیا کریں گے؟“

”یہ بنگلا اور وہ فرم اب میرے کہاں رہے ہیں؟“ وہ مسکرایا۔ ”دونوں کو بیچ دیا ہے میں نے۔“

وہ بولا۔ ”بنگلا اور فرم نہیں بلکہ آپ نے اپنوں کا لہو بچا ہے۔“

”دیکھیے سرا!“ وہ پھر مسکرایا۔ ”جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔ پلیز اب غصہ تھوک کر پارٹی انجوائے کیجیے۔ ویسے بھی کل صبح میں واپس انگلینڈ چلا جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری یادوں میں آپ کی اُتری ہوئی شکل محفوظ ہو رہے؟“

”اوہ... تو آپ چاہتے ہیں کہ میں قہقہے لگاؤں؟“ اُس نے جل کر پوچھا۔

”اس میں حرج ہی کیا ہے؟“

”داد دینا پڑے گی بھی! آپ کے حوصلے کی۔“ انسپکٹر کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ ”مجھے آپ کی تعریف بیان کرنے کے لیے لفظ ہی نہیں مل رہا۔“

”آپ صرف ہنس دیجیے۔ میں سمجھوں گا کہ آپ نے میری تعریف کر دی ہے۔“

ایسے ہی وقت اچانک اُس حال نما کمرے میں خاموشی چھا گئی اور سب کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جم کر رہ گئیں۔

بریکنگ نیوز میں ایک مرد اور عورت کو دکھایا جا رہا تھا۔ دونوں گولیوں سے چھلنی تھے۔ جب کہ نیوز چینل کا نمائندہ چلا چلا کر دوڑے کی تفصیل بیان کر رہا تھا۔ ہال میں موجود سب لوگوں کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مرنے والے سلیم اور ثمنینہ تھے۔ جنہیں نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے جیل روڈ پر گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ نیوز چینل کا نمائندہ بتا رہا تھا کہ موٹر سائیکل سوار موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ تاہم پولیس انہیں سرگرمی کے ساتھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

خبر سن کر انسپکٹر شیردل نے مشکوک نگاہوں سے عامم کی طرف دیکھا اور پھر ایک دم مسکرا دیا۔







## ٹکراؤ

سریم کے حنان

کچھ لوگوں کی زندگی کا دستور عجب طرح کا ہوتا ہے... وہ ساری عمر زخم خوردہ ہی رہتے ہیں... ایسے زخموں سے چور چور جن سے ہر دم لہور سستا رہتا ہے... خوشی آتی ہے پل بھر کے لیے پھر الم کا سیل رواں... وہ وقت اور لمحات کی قید میں اس طرح جکڑ جاتے ہیں کہ کھلی فضاؤں کی خواہش کے باوجود آزادی و تروتازگی سے کوسوں دور حسرتوں سے کھڑے دیکھتے رہتے ہیں... خوابوں اور خواہشات کی دسترس سے دور جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ایک مسلسل جنگ کا سامنا کرنے والوں کی دردناک داستان...

زندگی کے لازوال اندھیروں میں روشنی کی کرن کے  
مستلاشی... بے کارواں و بے سائبان نشینوں کا قصہ غم

والی خوب صورت لڑکی تھی۔ خاص طور سے دہانہ اور ستواں ناک بڑی تھی مگر اس کے مجموعی خدو و خال بہت دلکش تھے۔ اس کے بال اور آنکھیں سرمئی رنگ کی تھیں۔ شہابی رنگت اسے مزید دلکش بناتی تھی۔ جسم کی بناوٹ مضبوط لیکن اس میں نسوانیت کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کا تعلق امن و امان اور ملکی سلامتی کے لیے کام کرنے والی ایک فورس سے تھا۔ وہ ان سو لڑکیوں کے بیچ میں شامل تھی جسے غیر ملکی فوج نے اسپیشل ٹریننگ دی تھی اور ان دنوں وہ محکمہ داخلہ کے لیے کام کر رہی تھی۔ صوفیہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے کوئی ملازمت کی۔ وہ اس چھوٹے سے فلیٹ سے نکل رہی تھی جو اسے حکومت کی طرف سے ملا تھا کہ اس کے موبائل نے تیل دی۔ اس نے دروازہ لاک کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

”صوفیہ۔“ دوسری طرف سے کسی نے گھر درے لہجے میں کہا۔

”بات کر رہی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

صوفیہ کی آنکھ الارم سے کھلی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر الارم بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ شاور لے رہی تھی۔ تو لیے سے جسم خشک کر کے اس نے پہلے سے استری کیا ہوا لباس پہنا۔ ناشتے کا وقت نہیں تھا۔ دفتر کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ اس جنگ زدہ ملک میں بہت عرصے بعد کسی قدر امن و سکون آیا تھا۔ اگرچہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ مزاحمت کار سرگرم تھے۔ ان سے نمٹنے کے لیے غیر ملکی فوج سے تربیت یافتہ مقامی فورس بھی کام کر رہی تھی۔ مگر وہ مزاحمت کاروں پر پوری طرح قابو پانے میں ناکام رہے تھے۔ سرکاری مشینری کا آلہ کار ہونے کی بنا پر وہ جانتی تھی کہ اس ناکامی کی بڑی وجہ سرکاری اہلکاروں کی نااہلی اور بدعنوانی تھی۔ گزشتہ چودہ برسوں میں بہت بڑی تعداد میں غیر ملکی امداد ملک میں آئی مگر اس کا بہت کم حصہ ترقیاتی کاموں پر خرچ ہوا تھا۔ ملک کے چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر باقی ملک میں حکومتی رٹ بہت کم رہ گئی تھی۔

صوفیہ تقریباً پچیس برس کی کھڑے اور بڑے نقوش



”میں تمہارا چچا زاد شہزاد بات کر رہا ہوں۔“ اس نے تعارف کرایا۔ ”تمہاری چھوٹی بہن ماہ نور کل سے غائب ہے۔ اس کے ساتھ اس کی سبلی رضیہ بھی غائب ہے۔ دونوں چلتے پر پانی بھرنے گئی تھیں اور اس کے بعد واپس نہیں آئیں۔ مقامی پولیس کا کہنا ہے انہیں اغوا کر لیا گیا ہے مگر اغوا کاروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔“

”میں آرہی ہوں۔“ صوفیہ نے کہا اور کال کاٹ دی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی چھوٹی کار میں تیزی سے دفتر کی طرف جارہی تھی۔ وہاں اس نے جاتے ہی اپنے باس سے چھٹی مانگی اور اس نے انکار کر دیا۔ صوفیہ کو اسی کی توقع تھی۔ ادارے میں اس کے اور دوسری خواتین اہلکاروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا۔ شدید قسم کے مردانہ معاشرے میں لوگوں کے لیے یہ بات آج بھی قابل قبول نہیں تھی کہ عورتیں ان کے شانہ بشانہ دفتر میں کام کریں۔ خاص طور سے وہ کام جو ترقی یافتہ دنیا میں بھی مردوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ جنس کی تفریق تو عام بھی ہی، جنس کی بنیاد پر

انہیں ہراساں بھی کیا جاتا تھا۔ کئی بار صوفیہ نے سوچا کہ وہ ملازمت چھوڑ دے، اس سے پہلے کہ کوئی اس کے ہاتھ سے قتل ہو جائے۔ ایسا کئی بار ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

صوفیہ باس کے کمرے سے باہر آئی اور پھر دفتر سے بھی نکل گئی۔ اس نے پہلے ہی ذہن بنا لیا تھا کہ انکار کی صورت میں اسے کیا کرنا ہے۔ یہ جاب معمولی سی چیز تھی۔ ماہ نور کے سامنے ساری دنیا کے عہدے بھی اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اگر وہ مضبوط اعصاب کی نہ ہوتی تو اس وقت دھاڑیں مار کر رو رہی ہوتی۔ ایک گھنٹے بعد وہ برقع میں روپوش ایک مسافر بس میں گاؤں کی طرف جارہی تھی۔ اس کا گاؤں دارالحکومت سے کوئی دو گھنٹے کی مسافت پر شمال مغرب میں تھا۔ کسی زمانے میں یہ بڑی آبادی والا ہنستا ہستا گاؤں تھا مگر چار عشروں سے جاری جنگ نے اسے برباد کر دیا تھا۔ اس کے زیادہ تر گھر کھنڈر تھے اور یہاں انسانوں سے زیادہ گتے بلیاں بستے تھے۔ صوفیہ نے اپنی زندگی کے ابتدائی دس سال اسی گاؤں میں گزارے تھے۔

[WWW.PAKSOCIETY.COM](http://WWW.PAKSOCIETY.COM)





# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](http://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](http://twitter.com/paksociety1)



صوفیہ قتل و غارت گری کے دوران میں پیدا ہوئی۔ اس کے خاندان کے نصف لوگ جنگ میں ہونے والی بمباری میں مارے گئے تھے۔ اس کے بعد ہونے والی لڑائیوں میں مزید لوگ مارے گئے۔ صوفیہ کا باپ جرگے کی ایک لڑائی میں قتل ہوا تھا۔ صوفیہ کا چچا جو سرکاری ملازم تھا، اسے دارالحکومت لے گیا۔ وہ پڑھا لکھا اور نئے زمانے کا آدمی تھا۔ اس نے ایک غیر ملکی عورت سے شادی کی تھی جو غیر ملکی افواج کے ساتھ آئی تھی۔ وہ بہ طور سب کنٹریکٹر کام کرتی تھی۔ چچا نے صوفیہ کو وہاں لکھایا پڑھایا۔ اس کی حوصلہ افزائی پر صوفیہ نے انٹرنل فورس کی ٹریننگ کے لیے درخواست دی اور اسے چن لیا گیا۔ ایک سال کی کڑی تربیت کے بعد اسے سرکاری ملازمت مل گئی۔ جس سال اسے ملازمت ملی اسی سال اس کا چچا اپنی بیوی کے ساتھ اس کے ملک منتقل ہو گیا۔ اسے وہاں کی شہریت مل گئی تھی۔ اس نے جاتے ہوئے صوفیہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے بھی اپنے پاس بلانے کی کوشش کرے گا۔

گاؤں میں ماں کے ساتھ ماہ نور تھی۔ وہ اس سے آٹھ سال چھوٹی تھی مگر اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت تھی۔ صوفیہ کی خواہش تھی کہ وہ بھی اس کے پاس شہر آجائے مگر ماں گاؤں اور ماہ نور دونوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے ماہ نور اس کے پاس شہر نہیں آسکی مگر اس نے گاؤں سے پڑھا تھا۔ ان کی کچھ زمین تھی جس پر بادام اور کاجو کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ان سے ملنے والی رقم زیادہ تو نہیں تھی مگر اس آمدنی سے اس خاندان کا گزارا ہوتا تھا۔ صوفیہ کے لیے دنیا میں بس یہی دو فرد تھے۔ ابھی اسے ایک چھوٹا قلیٹ ملا ہوا تھا مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی اسے ذرا بڑا گھر ملا، وہ ماں اور ماہ نور کو یہاں لے آئے گی۔ اگر ماں نے انکار بھی کیا تو وہ اس کی ایک نہیں سنے گی۔ گاؤں میں اس کا اور ماہ نور کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ شہر میں وہ پھر بھی محفوظ تھے۔ اگر چچا اسے باہر بلاتا تو وہ ماں اور ماہ نور کو بھی ساتھ لے جاتی۔

ماہ نور نے اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی اور اب فارغ تھی کیونکہ وہاں لڑکیوں کے لیے اس کے بعد کوئی تعلیمی ادارہ نہیں تھا۔ صوفیہ چاہتی تھی کہ وہ شہر آئے اور آگے تعلیم حاصل کرے۔ یہاں بہت سے تعلیمی ادارے کھل گئے تھے، جہاں اعلیٰ تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ان کا معاشرہ پچھلے پندرہ سال میں بہت بدل گیا تھا۔ جو بچے جہالت کی آغوش میں پیدا ہوئے تھے اب وہ یونیورسٹیز سے تعلیم حاصل کر

رہے تھے اور ان میں سے بہت سے بیرون ملک سے پڑھ کر آئے تھے۔ مگر اب بھی ملک کا ایک بڑا حصہ جہالت کی تاریکیوں میں گم تھا۔ صوفیہ جانتی تھی کہ یہ تعلیم ہی ہے جو کسی ملک اور قوم کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ مگر اس نے جو سوچا تھا، وہ پورا نہیں ہو سکا۔ ماہ نور کے بارے میں خبر سن کر اس کے اندر کیا حالت ہوئی، یہ وہی جانتی تھی۔ وہ گاؤں اور پھر گھر پہنچی تو اس کی ماں سکتے کی کیفیت میں تھی۔ پولیس صرف اتنا معلوم کر سکی تھی کہ ایک جیب میں چند افراد چھپے تک آئے اور زبردستی ان دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے گئے۔

یہ کوئی نئی اور پہلی بار ہونے والی واردات نہیں تھی۔ اس جنگ زدہ ملک میں آئے دن لوگ ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوتے تھے۔ لڑکیاں اور عورتیں اغوا ہوتی تھیں۔ خاص طور سے بے سہارا اور ایسی عورتیں جن کا کوئی محافظ مرد نہ ہو، وہ بہت آسانی سے غائب ہو جاتی تھیں۔ مسلسل جنگ، اسلحے کی بہتات اور منشیات کی آمدنی نے بے شمار ایسے جرم پیشہ گروہ پیدا کر دیے تھے جن کا کام ہی جرائم کو فروغ دینا اور اس سے آمدنی اور آسائشیں حاصل کرنا تھا۔ صوفیہ جانتی تھی کہ اسلحے اور منشیات کے بعد اب بردہ فردشی اس ملک میں ایک نفع بخش کاروبار بن چکا ہے۔

صوفیہ دو دن گاؤں میں رہی اور جب ماں کی طبیعت سنبھل گئی تو وہ دوبارہ شہر روانہ ہوئی۔ مگر وہ ڈیوٹی پر نہیں گئی، اسے معلوم تھا یوں بغیر اجازت جانے پر اس کے خلاف چارج شیٹ تیار ہوگی اور ممکن ہے اسے ملازمت سے برطرفی کا پروانہ بھی تمھارا دیا جائے۔ اس نے قلیٹ سے اپنا ضروری سامان لیا اور اپنا حلیہ بدلا۔ وہ ایک سرحدی علاقے کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس وقت وہ ایک نوخیز لڑکے کے روپ میں تھی۔ اس نے پکڑی سمیت روایتی لباس پہن رکھا تھا اور اس کے شانے پر کلا شکوف لٹکی ہوئی تھی۔ یہ سرحدی آبادی مکمل طور پر اسمگلروں اور جرائم پیشہ افراد پر مشتمل تھی۔ یہاں قلعے نما عالی شان مکانات تھے جو اسمگلنگ کے سامان سے بھرے پڑے تھے۔ اس میں وہ سامان بھی تھا جو بیرون ملک سے آتا تھا اور وہ سامان بھی جو یہاں سے جاتا تھا۔ صوفیہ نے ایک ہوٹل میں کمرالیا اور رات کی تاریکی میں اس کی کھڑکی سے پہلے نیچے اتری اور پھر تاریک راستوں سے ہوتی ہوئی آبادی کے آخری حصے کی طرف بڑھی۔ اس نے چست سیاہ لباس پہن رکھا تھا، اس میں اس کی نسوانیت نمایاں تھی مگر اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس حیثیت سے پکڑی جاتی ہے۔ پکڑے جانے کی صورت



اسے ہدایت دے کر صوفیہ باہر آئی اور تالے کو یوں اٹکا دیا کہ وہ لگا ہوا نظر آئے۔ دوسرے کمرے میں بھی لڑکیاں ملیں اور یہاں بارہ تھیں مگر گل ان میں بھی نہیں تھی۔ اب اسے ان لوگوں سے نمٹنا تھا۔ اس کے پاس خود کار رائفل تھی مگر اس نے پستول کو ترجیح دی کہ یہ خاموش تھا۔ تیسرا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ڈیک وہیں چل رہا تھا۔ صرف ڈیک نہیں چل رہا تھا بلکہ گانے کی لے پر دو لڑکیاں رقص کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہیں مجبور کیا گیا ہے۔ ان کے جسموں پر نوچتے کھسوٹنے کے نشانات نمایاں تھے۔ ان کے رقص سے لطف اندوز ہونے والے چار افراد جب تک سنبھلتے اور اپنے ہتھیار اٹھاتے، صوفیہ ان میں سے تین کو شوٹ کر کے چوتھے کو شانے میں گولی مار کر زخمی کر چکی تھی۔ تربیت کے دوران اس نے شارپ شوٹر کی کیٹگری میں دوسرا نمبر حاصل کیا تھا۔ مگر اسے اپنی تربیت آزمانے کا پہلی بار موقع ملا تھا۔ لڑکیاں سہم کر ایک کونے میں جا گھسی تھیں۔ صوفیہ نے زخمی سے پوچھا۔ ”یہاں کا انچارج کون ہے؟“

”سیر شاہ۔“ وہ کراہ کر بولا۔ ”لیکن وہ یہاں نہیں ہے۔“

”یہاں دو کمروں میں لڑکیاں قید ہیں، باقی لڑکیاں کہاں ہیں؟“

”میں نہیں جانتا یہاں اتنی ہی ہیں۔“ وہ بولا۔ صوفیہ نے اس کے ماتھے پر پستول کی نال رکھی اور دوسرے ہاتھ سے ماہ نور کی ایک تصویر نکال کر اس کے سامنے کی۔ ”یہ لڑکی کہاں ہے؟“

پستول کی نال ماتھے پر محسوس کر کے وہ سورما کانپنے لگا اور اس کے منہ سے بڑی مشکل سے آواز نکلی۔ ”وہ کل جا چکی ہے۔“

”کہاں۔۔۔ کس کے پاس؟“

”سرحد پار۔“ اس نے جواب دیا۔ ”نیا روز کے پاس۔“

”نیا روز۔“ صوفیہ نے زیر لب کہا۔ ”تمہارا شکر یہ۔“

اس نے کہتے ہوئے ٹریگر دبا دیا، اس نے مرنے والے کا انجام نہیں دیکھا۔ آج سے پہلے اس نے کسی کو نہیں مارا تھا اور اگر ماہ نور کا معاملہ نہ ہوتا تب بھی اتنی آسانی سے اس کا ہاتھ نہ اٹھا مگر وہ پورے یقین اور معلومات کے

میں اسے اپنا انجام معلوم تھا۔ وہ چھپتی چھپاتی ایک بڑے احاطے والے مکان تک آئی اور پھر کمند ڈال کر دیوار پر چڑھی۔ اس پر خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں مگر اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ اس نے ایسی ہی مشکلات سے نمٹنے کی مکمل تربیت حاصل کی تھی۔ وہ اسی کمند کی مدد سے دوسری طرف اتر گئی۔ اندر کہیں ہلکی آواز میں ڈیک چل رہا تھا جس پر ایک واہیات گانا بج رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مکان میں موجود لوگ جاگ رہے تھے۔ وہ پہلے اس حصے تک آئی جو تار یک تھا۔ یہاں دو دروازے تھے اور دونوں پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے لباس سے دو باریک پنیں نکالیں اور ان کی مدد سے ایک منٹ سے پہلے ایک تالا کھول لیا۔ اندر تاریکی تھی۔ اس نے اندر آ کر ایک چھوٹی ٹارچ جلائی تو اسے فرش پر کئی لڑکیاں سوتی نظر آئیں۔ ان کی حالت تباہ تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہیں دور دراز سے اغوا کر کے لایا گیا تھا اور وہ یہاں قید تھیں۔ ان کی تعداد نو تھی۔ صوفیہ ان کے چہروں پر روشنی مار کر دیکھنے لگی مگر ان میں کوئی ماہ نور نہیں تھی۔ اسی اثنا میں ایک لڑکی کی آنکھ کھل گئی اور اس نے سبے لہجے میں پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

”تمہاری ہمدرد۔“ صوفیہ نے نرم لہجے میں کہا۔ اس نے ہاتھ میں موجود سا کلنسر لگا پستول پیچھے کر لیا تھا۔ ”یہ تمہیں اغوا کر کے یہاں لائے ہیں؟“

لڑکی نے سر ہلایا۔ ”مجھے دو ہفتے پہلے اغوا کیا تھا۔“ ”یہ لڑکیاں؟“ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ مختلف جگہوں سے آئی ہیں مگر سب اغوا کر کے لائی گئی ہیں۔“ لڑکی ہوشیار اور بڑھی لکھی لگ رہی تھی۔ اس کی عمر سولہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ یہاں موجود تمام ہی لڑکیاں ہیں سے بچے کی تھیں۔ صوفیہ نے پوچھا۔

”کیا ان لوگوں نے تمہارے ساتھ جسمانی زیادتی کی ہے؟“

لڑکی اس کا مطلب سمجھ گئی، اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بس بچی نہیں کیا ورنہ انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جب موقع ملتا ہے ہمیں نوچتے کھسوٹتے ہیں اور گندی حرکتیں کرتے ہیں۔ زبردستی ہم سے بھی کرواتے ہیں۔“

صوفیہ کا خون کھول اٹھا۔ ”میں ان لوگوں سے نمٹتی ہوں تب تک تم ان لڑکیوں کو جگا لو اور ان سے کہنا کہ آواز نہ نکالیں۔“



ساتھ آئی تھی کہ یہ گردہ ملک میں اغوا ہونے والی ستر فیصد وارداتوں کا ذمے دار تھا۔ کچھ لڑکیاں مقامی طور پر فروخت کر کے باقی کو وہ بیرون ملک اور خاص طور سے مڈل ایسٹ بھیج دیتا تھا جہاں ان کی بہت مانگ تھی۔ اس نے پورے مکان کی تلاشی لی اور پھر لڑکیوں کو ان کے کمروں سے نکالا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ خاموشی سے نزدیک ہی بنی سرکاری فوج کی چوکی تک چلی جائیں اور اغوا کاروں کے بارے میں بتائیں لیکن اس کا ذکر نہ کریں۔ اگرچہ اس کی امید کم تھی کہ سرکاری حکام اس مکروہ دھندے سے بے خبر ہوں گے۔ انہیں ان کا پورا حصہ ملنا ہوگا اس لیے صوفیہ کو زیادہ امید نہیں تھی کہ لڑکیاں واپس اپنے گھروں کو پہنچ سکیں گی۔

[www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

جب سب لڑکیاں مکان سے نکل گئیں تو اس نے وہاں موجود کچھ دھماکا خیز مواد مکان میں جگہ جگہ فٹ کیا اور مرنے والوں کی لاشوں پر پیٹرول ڈالا جو اسے وہیں مل گیا تھا۔ اپنا کام کر کے وہ مکان سے نکل آئی۔ وہ واپس ہوئی آئی اور اسی راستے سے کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ پورا قصبہ زوردار دھماکے سے گونج اٹھا۔ تباہ شدہ مکان سے اٹھنے والے شعلے اتنی دور سے بھی واضح دکھائی دے رہے تھے۔ اب اسے امید ہوئی کہ بات دارالحکومت تک جائے گی اور شاید یہ لڑکیاں بچ جائیں۔ اسے پروا نہیں تھی کہ لڑکیاں اس کے بارے میں بتا دیں گی، وہ زیادہ سے زیادہ اس کا حلیہ بتا سکتی تھیں یا پھر تصویر میں موجود ماہ نور کا حلیہ۔ کل صبح اس کے کمرے سے حیات خان نکلے گا۔ وہ ماہ نور کو پانے میں ناکام رہی تھی مگر اسے اطمینان تھا کہ اس نے اس جیسی بہت سی لڑکیوں کو بچا لیا تھا۔

☆☆☆

یاسر اپنے کمرے میں تھا کہ اسے ماجد کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ وہ باقاعدہ گرج رہا تھا اور اس کی گرج کے پس منظر میں روہینہ کی دبی دبی آواز آرہی تھی۔ آج پھر روہینہ کی شامت آئی تھی اور ماجد کے ہاتھوں اس کی بے عزتی ہو رہی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی آئے دن ماجد اسی طرح بے چاری روہینہ پر گرجتا برستا تھا اور کبھی اس کا غصہ بڑھتا تو وہ اس پر تشدد بھی کرتا تھا۔ روہینہ، ماجد کی بیوی تھی اور یاسر روہینہ کا بیٹا تھا مگر ماجد اس کا باپ نہیں تھا۔ وہ اس کا سوتیلا باپ تھا۔ آج سے سات سال پہلے جب وہ صرف دس سال کا تھا تو اس کا سگا باپ جو ماجد کا بہترین دوست تھا، پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا۔ قتل سے چند گھنٹے

پہلے یاسر کا باپ ابصار، ماجد کے ساتھ کہیں گیا تھا اور یہ ماجد ہی تھا جس نے روہینہ کو اس قتل کی اطلاع دی تھی۔ اس نے صرف اطلاع نہیں دی بلکہ وہ روہینہ اور یاسر کو لے کر اس گھر سے بھی نکل گیا جہاں وہ رہتے تھے۔

یاسر نے ہوش سنبھالنے کے بعد گھر میں بہت عجیب سا ماحول دیکھا تھا۔ اس کے لیے دنیا صرف دو رشتوں پر مبنی تھی۔ ماں اور باپ۔ اس میں سے بھی باپ کا رشتہ اس کے لیے صرف خوف کی علامت تھا کیونکہ ابصار جب گھر آتا تو وہ یاسر کو اپنے سامنے دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ذرا سی غلطی پر وہ اسے مارتا تھا اور اس بات کی پروا نہیں کرتا تھا کہ یاسر بہت چھوٹا اور کمزور سا لڑکا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ باپ کے گھر میں آتے ہی وہ کوشش کرتا کہ اس کے سامنے نہ آئے۔ صرف وہی نہیں اس کی ماں بھی ابصار کے سامنے ڈری سہی رہتی تھی۔ یاسر نے ان دونوں کے سوا اور کسی رشتے دار کو نہیں دیکھا تھا جب اس نے ہوش سنبھالا اور اسے بولنا آیا تو اس نے روہینہ سے رشتے داروں کے بارے میں پوچھا۔ ”ماں کیا ہمارے رشتے دار نہیں ہیں؟“

”ہیں۔“ روہینہ نے کہا۔ ”لیکن وہ اس ملک میں نہیں ہیں۔ پڑوس والے ملک میں ہیں۔“

”تب ہم یہاں کیوں ہیں؟“

”کیونکہ مجھے تیرا باپ شادی کر کے یہاں لے آیا ہے۔“ روہینہ بے بسی سے بولی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ صرف سولہ سال کی تھی جب اس کے باپ نے اسے بھاری رقم کے عوض ابصار کو فروخت دیا۔ اگرچہ اس خرید و فروخت کی دستاویز بھی بنی تھی جسے عرف عام میں نکاح نامہ کہتے ہیں۔ مگر عملاً یہ ایک انسان کی فروخت تھی۔ یہ رواج عام تھا اس لیے روہینہ احتجاج نہیں کر سکی۔ ابصار کا تعلق پڑوسی ملک سے تھا اور وہ اسے اپنے ملک لے آیا۔ یہاں آنے کے بعد روہینہ کو اندازہ ہوا کہ وہ خاصا پیسے والا شخص تھا۔ وہ شمالی صوبے کے دارالحکومت کے ایک شاندار مکان میں رہتا تھا اور اس کے پاس دنیا کی ہر سہولت اور آسائش تھی۔ وہ عمر میں روہینہ سے خاصا بڑا تھا۔ شاید پینتیس سال کا تھا۔ اس لحاظ سے روہینہ اس سے پورے اکیس برس چھوٹی تھی۔

روہینہ اس کے شاندار مکان میں ایک بیوی کے بجائے زرخیز کنیز کی طرح رہ رہی تھی۔ ابصار نے یہ شادی عیاشی کے لیے کی تھی۔ اسے بیوی کی ضرورت نہیں تھی۔ بالکل اسی طرح اسے اولاد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مگر



## شکراؤ

یاسر کے بعد ابصار نے کوئی ایسا بندوبست کیا تھا کہ روبینہ پھر ماں بننے نہ پائے۔ وہ اسے کئی بار ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس نے جو دوائیاں دی تھیں، وہ ابصار اسے اپنے ہاتھ سے اپنے سامنے کھلاتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کا اور کوئی بچہ نہیں ہوا اور یاسر اکلوتا ہی رہا۔ ان دنوں وہ چھٹی کلاس میں تھا کہ ایک صبح اسکول جانے کے لیے تیار کرنے کے بجائے روبینہ نے اسے عام کپڑے پہنائے اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر تقریباً خالی ہاتھ اس گھر سے نکل گئے جو گزشتہ دس سال سے ان ماں بیٹے کا مسکن تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ گاڑی ابصار نہیں بلکہ اس کا دوست ماجد چلا رہا تھا۔ یاسر حیران تھا اور روبینہ روہا نسی ہو رہی تھی۔

ماجد سرخی مائل لمبے بالوں اور گھنی مونچھوں والا سخت گہرے شخص تھا۔ یاسر بچپن سے اسے دیکھتا آیا تھا کیونکہ وہ آئے دن ان کے گھر میں براجمان ہوتا تھا۔ روبینہ اور یاسر اسے یکساں ناپسند کرتے تھے۔ جب تک ابصار سامنے ہوتا ماجد شریف بن کر رہتا تھا مگر جیسے ہی اسے موقع ملتا وہ روبینہ کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کے سامنے آنا روبینہ کی مجبوری تھی کیونکہ کھانا دہی بناتی اور لگاتی تھی۔ ابصار کو کسی اور کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں تھا اسی طرح وہ چاہتا تھا کہ کھانے کے دوران روبینہ اس کے آس پاس رہے۔ جب ماجد ہوتا تو وہ ساتھ ہی کھاتا تھا اور اس وقت روبینہ کو اس کی نظریں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ ماجد میں اس سے زیادہ کی امت نہیں تھی کیونکہ ابصار روبینہ کے معاملے میں بہت حساس تھا۔ البتہ یہ حساسیت میاں بیوی کے رشتے کے حوالے سے نہیں تھی۔ وہ اسے اپنی زر خرید سمجھتا تھا اور اس پر صرف اپنا حق سمجھتا تھا۔

جس صبح وہ نکلے ابصار رات ہی ماجد کے ساتھ کہیں گیا تھا۔ اور وہ خاصا تیار ہو کر گئے تھے۔ یعنی پوری طرح مستحکم ہو کر۔ ان کے پاس چھوٹے ہتھیار بھی تھے اور خود کار رائفلیں بھی۔ یاسر نے بچپن سے پیسے اور آسائشوں کے ساتھ گھر میں اسلحے کی بہتات بھی دیکھی تھی بعض اوقات تو ان کے گھر میں بڑی بڑی پیٹیوں میں اسلحہ آتا اور پھر کہیں جاتا تھا۔ کھلا اسلحہ بھی بے شمار تھا۔ کھلا اسلحہ تو سامنے تھا مگر جب پیٹیوں میں اسلحہ آتا تو ابصار روبینہ اور یاسر کو ان کے کمروں تک محدود کر دیتا تھا۔ ابصار اپنے طور پر بہت احتیاط کرتا تھا مگر ایک گھر میں رہنے والوں سے اس طرح کی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ یاسر نے بھی بہت کچھ دیکھا تھا۔ یہ بھی پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ ابصار اور ماجد خوب مسلح ہو

روبینہ سترہ سال کی ہونے سے پہلے ماں بن گئی تھی۔ نا تجربے کاری کی وجہ سے اسے اپنے حمل کا علم بھی بہت تاخیر سے ہوا تھا۔ جب ابصار کو پتا چلا تو اس نے روبینہ کا حمل ضائع کرانا چاہا مگر ڈاکٹر نے بتا دیا کہ اس صورت میں اس کی جان کو خطرہ ہوگا۔ ابصار اسے بڑی رقم دے کر لایا تھا کیونکہ روبینہ بہت خوب صورت تھی اس لیے وہ اپنی سرمایہ کاری ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بادل نا خواستہ اس نے یاسر کی دنیا میں آمد کو قبول کیا تھا۔ البتہ یاسر سے اس کا رویہ ایسا تھا جیسے روبینہ اسے جہیز میں ساتھ لائی تھی۔

روبینہ خود ابصار کے ظلم کا شکار تھی مگر یاسر کو اس سے بچانے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ اسے یاسر کے مستقبل کا بھی بہت خیال تھا۔ خود وہ انگوٹھا چھاپ تھی کیونکہ اس کا تعلق جس خاندان سے تھا وہاں صدیوں سے کسی عورت نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ مگر وہ چاہتی تھی کہ یاسر پڑھے لکھے۔ یاسر چار سال کا ہوا تھا تو روبینہ نے نہ جانے کیسے ابصار کو راضی کر لیا کہ وہ اسے اسکول میں داخل کرائے۔ پیسے کی کمی نہیں تھی اس لیے یاسر کو بہت اعلیٰ درجے کے اسکول میں داخل کرایا گیا مگر ماں کے توسط سے ابصار نے یاسر کو ذہن نشین کرادیا تھا کہ اسے کوئی دوست نہیں بنانا ہے اور اسکول میں گھر کی کوئی بات نہیں بتانی ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اسے فوری اسکول سے اٹھالیا جائے گا اور جو سزا ملے گی، وہ اس کے علاوہ ہوگی۔

چار سال کی عمر میں یاسر سزا کے مفہوم سے اچھی طرح آشنا ہو گیا تھا۔ اس نے ماں کی ہدایات پر بہت سختی سے عمل کیا۔ گھر کے ماحول اور باپ کے سلوک کی وجہ سے جو اسے باہر جانے اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتا تھا۔ اسے اپنا اسکول پہلے دن ہی بہت اچھا لگا۔ یہاں کھیلنے کے لیے بے شمار بچے تھے۔ البتہ اس نے یہاں کسی کو دوست بنانے سے گریز کیا۔ صورت شکل اور رنگ و روپ میں یاسر بالکل ماں پر گیا تھا۔ اس کی خوب صورتی دیکھ کر ٹیچرز اور کلاس فیلوز اس کے نزدیک آنا چاہتے تھے مگر وہ اپنی ذات میں گم رہا۔ اس نے کسی کو خود سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اسکول جانا اس کے لیے جہنم سے نکل کر جنت جانے کے مترادف تھا اس لیے وہ بہت خوش تھا۔

گھر میں اس کا دل اسی وقت لگتا تھا جب ابصار گھر میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ دعا کرتا کہ اس کا باپ گھر سے کہیں دور چلا جائے اور کبھی واپس نہ آئے مگر اس کی یہ دعا خاصی دیر میں جا کر پوری ہوئی تھی اور وہ بھی ادھورے انداز میں۔



کر کہیں گئے تھے۔ مگر یہ پہلی بار ہوا تھا کہ ابصار کی واپسی نہیں ہوئی تھی اور ماجد نے غلٹ میں آکر روئینہ کو کچھ بتایا تو اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ یا سر بار بار پوچھ رہا تھا کہ ماں کیا ہوا ہے؟ روئینہ اسے چپ کر رہی تھی مگر ٹھیک سے چپ اسے ماجد نے کرایا جب اس نے ایک جگہ گاڑی روکی۔ پلٹ کر یا سر کو تھپڑ مارا اور خونخوار لہجے میں بولا۔

”اب زبان کھولی تو کاٹ دوں گا۔“

ایک تھپڑ نے یا سر کو ایسا گنگ کیا کہ کئی گھنٹے کے طویل سفر میں اس نے پھر زبان ایک بار بھی نہیں کھولی۔ روئینہ اسے خود سے لگائے روٹی رہی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بابا کہاں ہے؟ اور وہ ماجد کے ساتھ کیوں جا رہے تھے؟ دونوں سوالوں کا جواب اسے منزل پر پہنچ کر ملا۔ وفاقی دارالحکومت کے پاس یہ ایک کھنڈر نما تاریخی یادگار تھی جس کا اب اوپری گنبد نما حصہ سلامت رہ گیا تھا۔ ماجد نے گاڑی وہاں روکی اور ان دونوں سے نیچے اترنے کو کہا۔ مسلسل ڈرائیو سے چھاڑی گرم بھی ہو گئی تھی مگر یہاں اسے کسی سے بات کرنی تھی۔ اس نے موبائل پر کسی کو کال کی۔ اس زمانے میں موبائل نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ چھوٹے سیٹ آتے تھے اور موبائل سگنل بھی زیادہ طاقتور نہیں ہوتے تھے۔ یہاں بھی سگنل کا مسئلہ تھا اس لیے ماجد کو چیخ چیخ کر بات کرنی پڑ رہی تھی اور وہ کسی کو بتا رہا تھا۔

”بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ شہر یار والی پارٹی کا۔۔۔ ہاں میں اور ابصار گئے تھے۔۔۔۔۔ پر جھگڑا ہوا اور فائرنگ میں ابصار مارا گیا۔۔۔۔۔ میں بہت مشکل سے جان بچا کر نکلا ہوں۔ میرے ساتھ ابصار کا بیوی بچہ بھی ہے۔ مجھے کچھ دن کے لیے جگہ چاہیے۔ ٹھیک ہے، پتا بتاؤ۔“

ماجد بین اور کاغذ نکال کر پتا نوٹ کرنے لگا تو یا سر نے روئینہ سے پوچھا۔ ”بابا مر گیا ہے کیا؟“

اس نے سر ہلایا اور پھر رونے لگی مگر اس کا رونا شوہر کے لیے نہیں تھا، وہ تو اپنے اور یا سر کے مستقبل کے لیے رو رہی تھی۔ اسے آگے تاریکی دکھائی دے رہی تھی۔ ابصار جیسا بھی تھا ان کے لیے تو وہی پناہ گاہ تھا۔ اب وہ بغیر پناہ کے ہو گئے تھے۔ موبائل پر بات کر کے ماجد ان کے پاس آیا اور انہیں گاڑی میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ دارالحکومت کے پاس مین ہائی وے پر یہ بستی آباد ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ اب یہاں اچھے مکان بھی بننے لگے تھے ورنہ کچھ عرصے پہلے تک یہ صرف گاؤں شمار ہوتا تھا۔ ماجد نے ہائی وے سے گاڑی اندر موڑی اور ایک نئے تعمیر شدہ کئی منزلہ مکان کے

جاسوسی ڈائجسٹ

سامنے گاڑی روکی اور اتر کر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور ان دونوں کو لے کر مکان کی تیسری منزل پر آیا۔ یہ دو کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ مگر صاف ستھرا اور فرش تھا۔ پانی، بجلی اور گیس سمیت وہاں ہر سہولت تھی۔ ماجد نے روئینہ سے کہا۔

”تمہیں اور یا سر کو یہاں رہنا ہوگا۔ جب تک تمہاری عدت ختم نہیں ہو جاتی۔“

روئینہ نے شاید پہلی بار پوچھا۔ ”ابصار کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”یہ اسی کی غلطی تھی۔“ ماجد نے الزام دینے والے انداز میں کہا۔ ”اس نے خطرے کا صحیح اندازہ نہیں کیا ورنہ ہم اپنے ساتھ تین چار آدمی لے جاتے۔ دوسری پارٹی نے دیکھا کہ دو آدمی ہیں تو ان کی نیت خراب ہو گئی۔ میں بھی زخمی ہوا ہوں۔“ ماجد نے اپنی شلوار کا پانسچہ اوپر کیا تو نیچے خون آلود پٹی بندھی تھی۔ ”مگر جان بچ گئی، ابصار اپنی حماقت کا شکار ہو گیا۔“

روئینہ رونے لگی۔ جب اس کا دل ہلکا ہوا تو اسے اپنی اور یا سر کی فکر ہوئی۔ ”ہم گزرا کسے کریں گے؟“

”فکر مت کرو ہر چیز ملے گی مگر کچھ عرصے چھپ کر رہنا ہوگا۔ دشمن اب میری اور تمہاری تلاش میں ہیں۔“

”میری تلاش میں کیوں؟“

روئینہ کے اس سوال پر ماجد جاتے ہوئے پلٹ آیا اور اس نے روئینہ کے پاس آکر آہستہ سے کہا۔ ”رقم کا معاملہ ہے۔ ہمیں ان کی بہت بڑی رقم دینی تھی اور جب رقم نہیں ملی تو انہوں نے ہتھیار استعمال کیے۔ مگر تم فکر مت کرو، میں مسئلہ حل کر لوں گا۔ اب مجھے ابصار کا حساب بھی لینا ہے ان سے۔ ادھر ایسے رہنا کہ آس پاس والوں کو بھی پتا نہ چلے اور باہر مت جانا۔ میں شاید ایک دو دن میں آؤں۔“

”تم کہاں رہو گے؟“ روئینہ نے پوچھا تو غالباً ماجد اس کے سوال میں چھپا ہوا اصل سوال بھانپ گیا۔ اس نے جواب دیا۔

”تمہیں اور تم فکر مت کرو میں صرف دیکھ بھال کرنے آؤں گا یہاں رکوں گا نہیں۔“

روئینہ نے سکون کا سانس لیا ورنہ وہ ڈر رہی تھی کہ ماجد نے بھی یہیں رہنے کا فیصلہ کیا تو وہ کیسے مزاحمت کرے گی۔۔۔۔۔ خود کو اس سے کیسے محفوظ رکھے گی۔ روئینہ ابھی سٹائیکس کی ہوئی تھی مگر دیکھنے میں چوبیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ یا سر جتنے بڑے بیٹے کی ماں تو ہر گز نہیں دکھائی دیتی



پھینک دی تھی۔ خبر میں روہینہ یا یاسر کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا۔ گویا پولیس کو ان کے بارے میں علم ہی نہیں تھا اور یہ اچھی بات تھی۔

”ماما کیا بابا غلط کام کرتا تھا؟“ یاسر نے پوچھا۔  
 ”وہ غلط کام ہی کرتا تھا۔“ روہینہ نے لٹی سے کہا۔  
 ”میں نے غلطی سے بھی اسے اچھا کام کرتے نہیں دیکھا۔“  
 یاسر ذہین تھا اور اس کے ذہن میں بھی وہی خیال آیا جو روہینہ کے ذہن میں آیا تھا، اس نے پوچھا۔ ”ماما یہ چاچا ہمیں یہاں کیوں لایا ہے؟“

”میں نہیں جانتی۔“ روہینہ نے جواب دیا۔  
 ”ماما ہم کہیں اور نہیں جاسکتے؟“ یاسر نے بے چین ہو کر کہا۔ ”مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا ہے۔“  
 ”نہیں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”میں یہاں کسی کو نہیں جانتی اور کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔“

یاسر بھی اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ فی الحال ماجد کا سہارا ضروری تھا۔ وہ ان کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ ورنہ باقی ان کا کوئی ہمدرد اور دوست نہیں تھا۔ ماجد دو کے بجائے چار دن بعد آیا۔ وہ ان کے لیے کھانے پینے کا تازہ سامان اور ایک بڑا سا شاپر لایا تھا اور وہ زیادہ دیر نہیں رکا اور بس سامان اور کچھ ہدایات دے کر چلا گیا۔ اس میں خاص ہدایت یہ تھی کہ وہ یہاں سے باہر نہ جائے اور ساتھ ہی اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ فرار کا بھی نہ سوچے۔ یہاں ان کی نگرانی کی جارہی تھی۔ اگر وہ یہاں سے نکل بھی گئی تو ابصار کے قاتلوں کے ہتھے چڑھے گی جو اسے شد و مد سے تلاش کر رہے تھے تاکہ اس سے اپنا پیسا وصول کر سکیں۔ روہینہ کے پاس پیسا نہیں تھا اس لیے وہ دوسرے طریقے سے وصول کرتے۔ روہینہ کا پہلے بھی فرار کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر ماجد کی بات نے اسے سہا دیا۔ اتنا تو وہ سمجھتی تھی کہ دشمنوں والی بات میں جھوٹ نہیں تھا اور وہ سچ سچ اتنے سفاک تھے کہ اسے اور اس کے بیٹے کو جانوروں کی طرح کاٹ ڈالتے۔ اسے مارنے سے پہلے بار بار مارتے۔ اس نے ماجد کو یقین دلایا۔

”میں یہاں سے باہر جھانکوں گی بھی نہیں۔“

”اسی میں تمہاری عافیت ہے۔“ ماجد نے اسے

گھورتے ہوئے کہا۔ ان دنوں اس نے اپنا حلیہ بدل لیا۔ اس نے ہال کر یوکٹ کرا کے انہیں سیاہ رنگ سے ڈاکی کرالیا تھا اور موٹھیں صاف کر دی تھیں۔ وہ شلواری قمیص کے بجائے جین اور ٹی شرٹ میں تھا۔ یہاں آتے ہوئے اس نے سن

تھی۔ ابصار کے ساتھ مشکلات تھیں مگر اس نے آسائشیں بھی خوب دی تھیں۔ کھانا پینا اور آرام تھا۔ اس وجہ سے روہینہ کے حسن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ شاید اضافہ ہی ہوا تھا۔ اس کے آبشار جیسے گھنے سرخی مائل سنہرے بال کمر سے نیچے آتے تھے۔ جلد یوں دکھتی تھی جیسے اندر بلب روشن ہوں اور سبک ناک نقشبے کے ساتھ اس کا بدن کسی قدر بھاری مگر متناسب تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت حسین ہے اور یہی اس کی فکر کی وجہ تھی۔ ماجد کے جانے پر اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

مگر وہ جانتی تھی کہ ماجد پر اس گھر کے دروازے مستقل بند نہیں کر سکتی۔ شاید جلد یا بدیر اسے یہ دروازہ کھولنا پڑے۔ ماجد نے ٹھیک کہا تھا، وہاں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ فریج کھانے کی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں تازہ اشیاء بھی تھیں اور شن بند کھانے بھی۔ کچن میں منزل واٹر اور سافٹ ڈرنک کی بڑی بوتلوں کے بڑے پیک رکھے تھے۔ چائے، کافی اور شربت کے تمام لوازمات تھے۔ ٹیڑا پیک کے ساتھ خشک دودھ بھی تھا۔ یہ سامان اتنا تھا کہ وہ مہینے بھر گزارا کر سکتے تھے۔ مگر ان کے پاس کپڑے نہیں تھے۔ ماجد نے اسے صرف قیمتی چیزیں اور کچھ کاغذات لینے کو کہا تھا۔ روہینہ کو تجوری کا نمبر پتا نہیں تھا یہ بھی اسے ماجد نے بتایا تھا۔ تجوری میں لاکھوں روپے کیش کے ساتھ سونا اور جواہرات بھی تھے۔ کاغذات کئی فائلوں کی صورت میں تھے مگر روہینہ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے نہیں جان سکی کہ کاغذات کس قسم کے تھے۔ مگر رقم اور دوسری چیزوں کی مالیت کا اسے علم تھا۔ اس میں روہینہ کا زیور بھی تھا۔

ماجد نے یہ سب ایک بڑے سوٹ کیس میں بھرا۔ نوٹوں کی سو کے قریب گڈیاں تھیں۔ سوٹ کیس کار میں ان کے ساتھ تھا مگر جب ماجد نے انہیں یہاں چھوڑا تو سوٹ کیس ساتھ لے گیا تھا۔ روہینہ کو بعد میں خیال آیا مگر پہلے بھی آتا تو وہ اسے کہاں روک سکتی تھی۔ وہ ماجد کے ہاتھ میں زندہ بدست مردہ تھی۔ یاسر ابھی بچہ تھا، اس کا سہارا نہیں بن سکتا تھا۔ گھر میں ٹی وی تھا اس سے ان کا وقت اچھا گزرتا۔ روہینہ نے رات کے وقت ٹی وی لگایا تو اس میں ابصار کے مارے جانے کی خبر بھی تھی۔ پولیس کے مطابق ویران علاقے سے ملنے والی لاش پولیس کو مطلوب جرائم پیشہ ابصار شاہ کی ثابت ہوئی تھی۔ وہ منشیات، اسلحے اور انسانی اسلگنگ میں پولیس کو مطلوب تھا۔ پولیس کے مطابق اسے اس کے مخالف جرائم پیشہ افراد نے قتل کر کے لاش اس ویرانے میں



ماجد کو اس رد عمل کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ ذرا ادب گیا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ”یہ مجبوری ہے، میں تمہارے اور اپنے دشمن سے نمٹ رہا ہوں اور جلد میں ان کا خاتمہ کر دوں گا اس کے بعد ہم آزاد ہوں گے۔ لیکن اگر تم اس جگہ نہیں رہنا چاہتیں تو میں نے ایک جگہ اور دیکھی ہے۔ وہاں تم لوگ باہر بھی نکل سکو گے۔ جگہ بھی خوب صورت ہے۔“

یہ جگہ اوپر پہاڑوں میں ایک چھوٹا سا لیکن خوب صورت ہنگامہ ثابت ہوئی۔ اس پوری پہاڑی پر دولت مندوں نے اپنے ہنگامے بنوائے ہوئے تھے۔ روبینہ اور یاسر جس ہنگامے میں رکے وہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس میں تمام سہولتیں تھیں۔ وہاں ایک چوکیدار اور اس کی بیوی خادمہ کے طور پر کام کرتے تھے۔ یہاں آکر روبینہ اور یاسر کو کسی قدر آزادی کا احساس ہوا تھا۔ مگر یہاں ٹی وی نہیں تھا۔ بجلی تھی اور دوسری سہولتیں بھی تھیں۔ سڑک اس ہنگامے سے کوئی دو کلومیٹر زور سے گزرتی تھی اور وہاں سے یہاں تک ایک کچا پکارا راستہ آتا تھا۔ ماجد نے یہاں بھی روبینہ کو خبردار کیا کہ وہ یہاں سے جانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ ان کے دشمن ابھی تک آزاد تھے اور ان کی تلاش میں تھے۔ روبینہ نے اس سے کہا۔ ”میں بالکل خالی ہاتھ ہوں اور ایسے میں کہاں جا سکتی ہوں۔“

عدت کے باقی دن روبینہ نے یہیں گزارے تھے اور یہیں اس کا جبراً ماجد سے نکاح ہوا۔ ایک دن وہ اچانک ہی نکاح خواں اور دو افراد کو لے کر آیا اور اس سے تقریباً زبردستی نکاح پر اقرار کرایا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھے کے نشانات لیے۔ روبینہ روتی رہ گئی مگر بیٹے کی وجہ سے مجبور تھی۔ ماجد نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس سے نکاح پر راضی نہیں ہوئی تو وہ اسے اور اس کے بیٹے دونوں کو دشمنوں کے حوالے کر دے گا۔ یاسر کی خاطر اسے ماننا پڑا۔ اس کے باوجود اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ شادی کی رات وہ رونے کی وجہ سے ماجد سے پٹی تھی۔ ایک رات میں اسے پتا چل گیا کہ وہ ایک درندے کے چنگل سے نکلنے کے بعد دوسرے درندے کے پنجوں میں پھنس گئی ہے اور وہ اسے تا عمر ادھیڑتا رہے گا۔ دوسرے کمرے میں دبا ہوا یا سراہنی ماں کی سسکیاں سنارہا اور خود بھی روتا رہا۔ اسے لگا جیسے اس کا باپ زندہ ہو کر واپس آ گیا ہو۔ جب وہ زندہ تھا اور روبینہ اس کے ساتھ ہوتی تب بھی اس کی راتیں روتے گزرتی تھیں۔

گلاس لگائے ہوئے تھے جو اب اس کی ٹی شرٹ کے گریبان میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ کھانے پینے کے سامان کے ساتھ ان کے لیے کچھ ریڈی میڈ سوٹ بھی لے کر آیا تھا۔ دوسرے شاپر میں کپڑے تھے۔ یاسر کے کپڑے اسے پورے آئے مگر روبینہ کے سوٹس کو کاٹ چھانٹ کی ضرورت تھی۔ گھر میں سلائی مشین بھی تھی۔ روبینہ نے اس پر کپڑے اپنے ناپ کے لحاظ سے کر لیے۔ وہ زیادہ تر فارغ ہوتی تھی کیونکہ ناشتے کے بعد ایک ہی وقت کھانا بنانا پڑتا تھا جو دونوں ٹائم چل جاتا تھا۔

یاسر اسکول چھوٹنے کے بعد بور ہوتا تھا اور کبھی کبھی ماں سے پوچھتا کہ وہ اسکول بھی جائے گا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب روبینہ کے پاس بھی نہیں تھا مگر وہ اسے سلی دیتی کہ جلد وہ اسکول جاسکے گا۔ جیسے ہی حالات نارمل ہوئے اور وہ اپنے گھر واپس گئے۔ روبینہ کو اب بھی امید تھی کہ وہ اپنے گھر واپس جاسکے گی۔ اسے ابصار سے نہ سہی لیکن اس گھر سے انسیت ہو گئی تھی۔ وہ خود کو اور یاسر کو بھلانے کے لیے اکثر ٹی وی لگا کر رکھتی تھی۔ باہر وہ جانیں سکتی تھی مگر دل جب زیادہ گھبراتا تو بالکونی میں آ جاتی جہاں سے دور ہائی وے کے ساتھ آس پاس کی عمارتوں اور خالی جگہوں کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ یہاں زیادہ آبادی نہیں تھی اور جو لوگ رہ رہے تھے وہ بھی آپس میں ملتے جلتے نہیں تھے۔ اتنے عرصے میں کسی نے ان کے گھر کا دروازہ نہیں بجایا تھا۔ خود تو وہ باہر جاتے نہیں تھے۔

باہر دیکھ کر اور ٹی وی سے کب تک دل بہلاتی۔ ایک مہینے بعد وہ اور یاسر دونوں کی برداشت جواب دینے لگی۔ خاص طور سے یاسر باقاعدہ آنسوؤں سے روتا کہ اسے باہر جانا ہے اور روبینہ بہت مشکل سے اسے بہلاتی تھی۔ اپنے آپ کو وہ اس سے زیادہ مشکل سے بہلاتی تھی۔ کبھی بھی اس کا دل چاہتا کہ یاسر کو لے کر یہاں سے نکل جائے مگر اسے خود کو یاد دلانا پڑتا کہ باہر کی دنیا ایک خوب صورت عورت کے لیے اچھی نہیں ہے۔ اسے قدم قدم پر ماجد جیسے لوگ ہی ملیں گے۔ بس یہی سوچ کر وہ خود کو روک لیتی تھی۔ انہیں یہاں ایک مہینہ رہنا پڑا تھا۔ اس دوران میں ماجد تین چار بار ہی آیا تھا اور وہ بھی بس کھڑے کھڑے آتا تھا۔ سامان، ہدایات اور ڈھکی چھپی دھمکیاں دے کر چلا جاتا۔ ایک مہینے بعد وہ آیا تو روبینہ اس پر پھٹ پڑی۔ اس نے غصے سے کہا۔ ”کیا تم نے ہم ماں بیٹے کو جانور سمجھا ہوا ہے جو یہاں بند کر کے رکھا ہے۔ آتے ہو اور کھانا ڈال کر چلے جاتے



باتوں کا اتنا شعور نہیں تھا۔ مگر اب وہ بڑا ہورہا تھا اور ماجد بے شک اس کی ماں کا شوہر سی لیکن وہ اس کا باپ نہیں تھا اس لیے جب وہ اس کے سامنے یا اس کے آس پاس ہوتے ہوئے روبینہ کے نزدیک آتا تو یاسر کے اندر غصہ ابھرنے لگتا تھا۔ ایسے موقع پر وہ وہاں سے دور چلا جاتا۔ اس نے ایک بار سنا کہ روبینہ ماجد سے کہہ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں تمہاری بیوی ہوں مگر یاسر کا تو خیال کیا کرو۔“

”اس کی کیا جرات؟“ ماجد غرایا۔

”بات جرات کی نہیں ہے۔ اگر وہ تمہارا سگا بیٹا ہوتا تب بھی تم ایسا ہی کرتے۔“

”سگا ہو یا سوتیلا میرے سامنے کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔“ ماجد نے جواب دیا تھا۔ اس کے بعد وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرنے لگا تھا۔ شاید وہ یاسر کو اکسارہا تھا کہ وہ احتجاج کرے یا کچھ بولے تو اسے مار پیٹ سکے۔

اب تک تو اسے موقع نہیں ملا تھا۔ کار میں مارے جانے والے پہلے تھپڑ کے بعد اس کا ہاتھ صرف روبینہ پر چل رہا تھا۔ روبینہ اس بات کو سمجھ رہی تھی اس لیے وہ اکثر یاسر کو سمجھاتی تھی کہ وہ خود پر قابو رکھے۔ ماجد کی کسی بات سے مشتعل نہ ہو۔ یاسر دے لفظوں میں شکایت کرتا تھا کہ ماجد اس کے ساتھ بہت سختی اور اہانت آمیز انداز میں پیش آتا ہے۔ مگر روبینہ کے سمجھانے پر وہ خاموش ہو جاتا اور خود پر قابو رکھتا تھا۔ وقت مشکل اور آسانی سے گزرتا رہا۔ آسانی یہ تھی کہ کوئی مالی مسئلہ نہیں تھا۔ ابصار کی طرح ماجد نے بھی گھر میں کھلا کھاتا رکھا تھا۔ وہ نہ صرف روبینہ کو بلکہ یاسر کو بھی کھلا خرچ دیتا تھا۔ ان کی ضرورت اور آسائش کی ہر شے بن کہے آ جاتی تھی۔

ابصار کی تجوری سے نکلنے والا باقی سارا مال اور

دستادیزات ماجد نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں البتہ اس نے

روبینہ کا زیور اسے دے دیا تھا۔ یہ دو کلو گرام سے زیادہ وزن

کا زیور تھا جو ابصار اسے وقفے وقفے سے دیتا رہا تھا۔ تجوری

میں موجود رقم بھی ماجد نے اسے نہیں دی تھی۔ البتہ بعد میں

اس نے کسر پوری کر دی تھی۔ گھر کے خرچ کے علاوہ بھی وہ

اسے بڑی رقمیں دیتا رہتا تھا اور کبھی پلٹ کر حساب نہیں لیا۔

اسے باہر لے جاتا تو ساری ادائیگیاں خود کرتا تھا۔ یوں

روبینہ کے پاس موجود رقم جمع ہوتی رہی تھی اور اس وقت بھی

اس کے پاس بیس بائیس لاکھ کی رقم تھی جو اس کی الماری میں

موجود تھی۔ یاسر کا خرچ اس کے پاس آتا تھا اور موجود رہتا

نکاح کے فوراً بعد ماجد اسے دارالحکومت کے پاس اس پوش آبادی کے ایک شاندار بنگلے میں لے آیا۔ یہ جگہ سی زمانے میں فارمز کے لیے مختص کی گئی تھی مگر اس نے یہاں زمینیں لے کر ان پر شاندار گھر اور ذاتی فارم ہاؤس بنوا لیے تھے۔ پوش ایریا ہونے کی وجہ سے یہاں تمام سہولتیں تھیں اور یہاں کی سیکورٹی کی وجہ سے کوئی غیر متعلقہ فرد علاقے میں گھس نہیں سکتا تھا۔ ماجد جو دھندے کرتا تھا، ان میں دشمنیاں لازمی تھیں اور شاید اسی وجہ سے اس نے یہاں گھر لیا تھا۔ یہ جگہ اسے ہنگی پڑی تھی مگر اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اس نے خود کو محفوظ کر لیا تھا اور یہاں بیٹھ کر وہ اپنا دھندہ زیادہ آسانی اور محفوظ طریقے سے چلا سکتا تھا۔ اس نے بنگلے کی سیکورٹی بھی بہترین کرائی تھی۔ اس کی بلند دیواروں پر خاردار تاریں لگی تھیں جن میں کرنٹ دوڑتا تھا۔ داخلی گیٹ آٹو میٹک طریقے سے کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ بنگلے میں کیمرے لگے ہوئے تھے۔ کسی مداخلت کی صورت میں کئی طرح کے الارم تھے جو بج اٹھتے اور وہ خبردار ہو جاتا۔

اگرچہ کوٹھی ایک کنال پر تھی جو یہاں کے لحاظ سے چھوٹی تھی مگر روبینہ اور یاسر کے لیے یہ خاصی بڑی تھی۔ وہ اس سے پہلے جس گھر میں رہتے آئے تھے، وہ اس سے آدھا تھا۔ روبینہ نے چند دن میں رو دھو کر اپنے مقدر پر مبر کر لیا تھا۔ اس کی ذات پھر شوہر کے ستم کا نشانہ تھی مگر اسے یاسر کے مستقبل کا سوچنا تھا۔ اب اس کی واحد امید اس کا بیٹا تھا۔ اگر وہ کسی قابل ہو جاتا اور وہ ماجد کے چنگل سے نکل جاتے تو ان کی زندگی شاید کچھ سکون سے گزرتی۔ ماجد شاید یاسر کو آگے بڑھانے کے حق میں نہیں تھا مگر روبینہ نے کسی طرح اسے راضی کر لیا۔ اسے دارالحکومت کے ایک اچھے اسکول میں داخل کرایا۔ اس کے پاس کوئی سرزنش نہیں تھی اس لیے اسے ٹیسٹ لے کر داخل کیا گیا اور یاسر نے اتنا اچھا ٹیسٹ دیا کہ اسے ساتویں کلاس میں داخلہ مل گیا۔ فارغ دونوں میں وہ از خود چھٹی کلاس کا کورس پڑھتا رہا تھا۔

چند مہینے کے وقفے کے بعد ان کی زندگی تقریباً اسی ڈگر پر چلنے لگی۔ جب تک ماجد گھر میں نہیں ہوتا تھا سکون ہوتا اور جب وہ آ جاتا تو یاسر کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کمرے سے نہ نکلے۔ ابصار کی طرح ماجد اوباش ہی نہیں بے پردا بھی تھا۔ اسے پردا نہیں ہوتی تھی کہ اس کی بیوی کا ایک نوجوان ہوتا بیٹا بھی ہے۔ وہ اکثر روبینہ کے معاملے میں حد کر اس کر جاتا تھا اور وہ بے چاری شرمندہ ہوتی تھی۔ ابصار بھی ایسا ہی کرتا تھا مگر ایک تو یاسر اس کا بیٹا تھا اور دوسرے اسے ان



تھا جب یاسر کو ضرورت ہوتی وہ اس سے لے لیا کرتا تھا۔

مگر اس کے علاوہ سب مشکل ہی تھا۔ رو بینہ پر تو باہر جانے پر پابندی تھی۔ یعنی وہ اکیلے اور ماجد کے بغیر باہر نہیں جاسکتی تھی۔ البتہ یاسر کے باہر جانے پر پابندی نہیں تھی۔ یہ شاید ماجد کی مجبوری تھی مگر یاسر خود بھی باہر رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ گھر میں ہوتا تھا۔ اس کا کوئی دوست یا بے تکلف واقف کار نہیں تھا۔ ماجد نے بھی اسے اسکول اور محلے میں دوستی سے منع کیا تھا اور اسے خبردار کیا تھا کہ اگر اس نے کوئی حماقت کی تو اس کا نتیجہ وہی نہیں اس کی ماں بھی بھگتے گی۔ بہر حال ماجد کو اس حوالے سے بھی شکایت کا موقع نہیں ملا تھا۔ یاسر کی ساری توجہ تعلیم پر تھی اور گھر میں وہ فارغ اوقات میں ٹی وی دیکھتا یا پڑھتا تھا۔ اس کی پاکٹ منی کا زیادہ حصہ کتابیں اور ماہانہ رسائل کی خرید میں لگتا تھا۔ ماجد کو اس کا پڑھنا اچھا نہیں لگتا تھا مگر اس نے بھی یاسر کو اس حوالے سے کچھ کہا نہیں تھا۔

☆☆☆

یاسر ہائی اسکول کا آخری امتحان دے چکا تھا اور اس کا رزلٹ آگیا تھا مگر ابھی اس نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ آگے کیا کرے۔ ماجد کا کہنا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کام کرے۔ (اگرچہ رو بینہ اور یاسر جانتے ہی نہیں تھے کہ اس کا اصل دھندا کیا ہے کیونکہ وہ گھر میں نہ تو کچھ لاتا تھا اور نہ لے جاتا تھا اور نہ ہی ان لوگوں کے سامنے کسی سے فون پر بات کرتا تھا۔ بس انہیں یہ احساس تھا کہ ماجد بھی اچھا کام نہیں کرتا ہے) مگر رو بینہ چاہتی تھی کہ وہ آگے پڑھے اور یونیورسٹی میں داخلہ لے۔ یاسر کا رجحان آئی ٹی کی طرف تھا اور وہ سوفٹ ویئر انجینئر بننا چاہتا تھا۔ اس نے رو بینہ سے بھی کہہ دیا تھا اور وہ ماجد کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی گفتگو میں کچھ وقت گزر گیا تھا اور یاسر کو خطرہ تھا کہ اس کا ایک سمسٹر ضائع نہ ہو جائے۔ اگرچہ عمر مسئلہ نہیں تھی وہ اٹھارہ کا ہونے والا تھا اور اس کے پاس ابھی پڑھنے کے لیے خاصا وقت تھا۔

اسکول بھی نہیں رہا تو اس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا۔ وہ ٹی وی اور رسائل و کتب سے دل بہلانے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی زیادہ بوریت ہوتی تو بایک لے کر نکل جاتا۔ رو بینہ سادہ سی عورت تھی اسے زیادہ باتیں کرنا نہیں آتی تھیں اور دنیا کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کی ساری کائنات اس کا گھر اور اس کا بیٹا تھا۔ شوہر سے بس ایک برائے نام تعلق تھا۔ جسے انیت بھی نہیں کہا جاسکتا

تھا۔ وہ بھول نہیں سکتی تھی کہ ماجد نے اسے پر جبراً قبضہ کیا تھا اور وہ اسے برداشت کرتی تھی کہ ایسا کرنا اس کی مجبوری تھی۔ اسے انتظار تھا کہ اس کا بیٹا کسی قابل ہو جائے تو شاید اسے ماجد کے اس جہنم سے نجات مل سکے۔ مگر اس کے آثار بھی نہیں تھے۔ کیونکہ یاسر کسی صورت ماجد جیسے خطرناک آدمی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس لیے رو بینہ نے اپنا معاملہ اوپر والے پر چھوڑا ہوا تھا کہ وہی اس کے لیے بہتری کرے۔ یاسر آج صبح سے باہر نکلا ہوا تھا کیونکہ موسم بارش کا تھا اور ایسے میں اسے باہر جانا اچھا لگتا تھا۔ وہ باہر نکلا تو بارش ہو گئی اور وہ ہلکی رفتار سے بایک ویران سڑکوں پر گھماتا رہا۔ کئی گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو شرابور تھا۔ کچھ دیر وہ باہر ہی رک کر پانی جھاڑتا رہا۔ اندر لاؤنج سے ماجد کے چلانے کی آواز آرہی تھی اور وہ اس کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں نے ٹھیکا نہیں لے رکھا کہ دوسرے کی اولاد کو پالتا رہا ہوں۔“

”وہ بچہ ہے۔“

”وہ بچہ نہیں ہے اب بڑا ہو گیا ہے اور اس گھر میں رہنا ہے تو وہ کرنا پڑے گا جو میں کہوں گا۔“

”اس کا باپ تمہارا دوست تھا اور تم نے ہی از خود یہ ذمے داری لی تھی۔“ رو بینہ نے اسے یاد دلایا۔ ”میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھ سے شادی کرو۔“

”بہت زبان چلنے لگی ہے تیری۔“ ماجد غرایا اور ایسی آواز آئی جیسے اس نے رو بینہ کو کھینچ مارا پھر وہ گرجا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا، اب یاسر میرے ساتھ کام کرے گا یا وہ اس گھر میں نہیں رہے گا۔“

”وہ پڑھے گا۔“ رو بینہ پھر بولی۔ وہ مار کھانے کے باوجود ماجد کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ”تم اپنا کام خود کرو۔ میرا بیٹا کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔“

”غلط کام۔“ ماجد بولا اور شاید اس نے رو بینہ کے بال پکڑ لیے تھے۔ ”میں جو کرتا ہوں اس کی وجہ سے تم دونوں ماں بیٹے عیاشی کر رہے ہو اور تم اسے غلط کام کہہ رہی ہو؟“

”یہ بھی تمہاری مرضی ہے تم ہماری خاطر نہیں کر رہے ہو۔ دوسری بات یہ کہ یاسر اپنے باپ کی دولت پر پلا بڑھا ہے وہ دولت جو اس کی تجوری سے نکلی تھی اور تم سوٹ کیس میں ڈال کر لے گئے تھے۔“

”وہ صرف ابصار کی رقم نہیں تھی، اس میں میرا حصہ بھی تھا اور پھر میں اس کے دشمنوں سے نمٹتا رہا، اس میں



دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

# کمر بیلٹ

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسٹمز ڈائجسٹ  
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

مقامی سطح پر ہر ماہ حاصل کریں اپنے مقامی دفتر پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد  
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے  
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر  
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے  
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر  
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیئر 11 ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

بہت خرچ ہوا۔ تمہارا کیا خیال ہے یہ سب فری میں ہو گیا جو  
آج ہم سب آزادی سے بیٹھے ہیں۔ پھر میں تم دونوں کو بھرتا  
رہا ہوں۔ کھلا پیسا دیتا رہا ہوں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ روہینہ کا حوصلہ برقرار تھا۔  
”یاسر کوئی غلط کام نہیں کرے گا وہ پڑھے گا اور شریف آدمی  
کی زندگی گزارے گا۔“

”لگتا ہے تم اس طرح نہیں مانو گی۔“ ماجد نے کہا اور  
پھر تھپڑ کی آواز آئی۔ ماجد نے اسے گلے سے پکڑا ہوا تھا اور  
بے رحمی سے اسے مار رہا تھا۔ ایک تھپڑ کے بعد اس نے پھر  
ہاتھ بلند کیا تھا کہ عقب سے یاسر نے کہا۔

”میں آپ کے ساتھ کام کروں گا۔“

ماجد کا ہاتھ رک گیا اور اس نے مڑ کر یاسر کو دیکھا جو  
گیلے کپڑوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے جوتوں سے بدستور  
پانی بہہ رہا تھا۔ ماجد نے سنا نہیں تھا۔ اس نے سمجھا کہ شاید  
یاسر اسے ماں کو مارنے سے روک رہا ہے۔ ”کیا۔۔۔ کیا کہا  
تم نے؟“

”میں کہہ رہا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ کام کروں  
گا۔“

ماجد کے پُر وحشت چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی،  
اس نے روہینہ کی طرف دیکھا۔ ”ساتم نے اپنے بیٹے کا  
فیصلہ؟ یہ میرے ساتھ کام کرے گا۔“

ماجد نے روہینہ کا گلاب تک جکڑا ہوا تھا۔ اس کی  
سانس رک رہی تھی مگر اس نے نفی میں سر ہلا کر یاسر کو منع کیا۔  
ماجد ہنسا اس نے روہینہ کا گلا چھوڑ دیا۔ ”تم اسے منع کر رہی  
ہو مگر اس گھر میں وہی ہو گا جو میں چاہوں گا۔ میرے بعد  
اسے ہی یہ سارا کام دیکھنا ہے اور اسے کام آنا چاہیے۔“

روہینہ اس کی طرف آئی۔ ”تو نے یہ کیا کیا؟“  
”ماما میں کام کروں گا اور پڑھوں گا بھی۔“ وہ دھیمے

لہجے میں بولا۔ ”میں فیصلہ کر چکا ہوں۔“

ماجد دیوانوں کی طرح ہنسا۔ ”ساتم نے یہ فیصلہ کر چکا  
ہے۔ یہ اتنا سالا کا فیصلہ کر چکا ہے۔ تم نے غلط کہا تھا، یہ بچہ  
ہے۔ یہ بڑا ہو گیا ہے اور فیصلے کر سکتا ہے۔“

یاسر نے ماجد کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”میں آپ کے  
ساتھ کام کروں گا جو آپ کہیں گے وہ کروں گا مگر اب آپ  
ماما پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔“

یاسر نے کہا اور اپنے کمرے میں آ گیا، روہینہ اس  
کے پیچھے تھی۔ وہ اسے سمجھا رہی تھی کہ وہ ماجد کو انکار کر  
دے۔ وہ کیا کر لے گا انہیں مارے گا اور گھر سے نکال دے



گا۔ وہ اس کے لیے بھی تیار تھی۔ یاسر نے اپنے لیے لباس نکالا اور واش روم میں آکر تبدیلی کرنے لگا۔ باہر روبینہ مسلسل بول رہی تھی۔ اس کا انداز ہڈیانی ہو گیا تھا۔ یاسر کپڑے بدل کر باہر آیا تو روبینہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”یاسر تو ایسا نہیں کرے گا۔ سنا تو نے تو اس کے ساتھ کام نہیں کرے گا۔“

”ماما اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میرے منع کرنے پر ماجد ہمیں مارے گا اور گھر سے نکال دے گا تو آپ اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہیں۔“

”تو جانتا ہے اسے؟“

”ہاں میں اب جان گیا ہوں۔“ یاسر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ان دنوں ماجد بہت پریشان اور ہمہ وقت غصے میں ہوتا تھا۔ یہ دو دن پہلے کی بات تھی۔ یاسر صبح اٹھا اور ناشتے کے لیے باہر آیا تو اس نے اتفاق سے ماجد کے خاص کمرے کا دروازہ کھلا پایا۔ وہ اسے ہمیشہ لاک رکھتا تھا۔ یہ کمر اس کا دفتر تھا اور وہ یہیں سارے کام نمٹاتا تھا۔ یاسر کو خیال آیا اور وہ اندر آیا۔ تب اس نے دیکھا کہ میز پر رکھا ہوا کمپیوٹر آن تھا اور بڑے سے ایل سی ڈی پر اسکرین سیور آن تھا۔ اس نے ماؤس ہلایا تو اسکرین سیور ختم ہو گیا۔ تب اس نے دیکھا کہ ایک فولڈر کھلا ہوا تھا جس میں بہت سی میڈیا فائلز تھیں۔ اس نے سب سے اوپر والی فائل کو کلک کیا اور ایک ویڈیو آن ہو گئی۔ ویڈیو کیمرہ ایک کمرے میں بچے لوہے کے پٹنگ پر یعنی ایک لڑکی کو دکھا رہا تھا۔ لڑکی کے جسم پر معمولی سا شلوار تھیں تھا اور وہ بہت حسین اور دلکش لڑکی تھی۔ یاسر نو جوان تھا، وہ اس منظر سے متاثر ہوا تھا۔ لڑکی ساکت تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے سو رہی ہے یا پھر بے ہوش ہے۔ پٹنگ پر اسپرنگ والا گدا تھا جس پر لڑکی کا جسم کسی قدر ترچھا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ اوپر تھے۔ یاسر نے غور کیا تو اسے لڑکی کے ہاتھ ہتھکڑیوں سے پٹنگ کے سرہانے والے پائپ سے بندھے دکھائی دیے۔ یعنی لڑکی کو اس جگہ جبراً رکھا گیا تھا۔

اس کمرے کی لان والی دیوار پوری شیشے کی تھی اور اس پر چوڑی پٹی والی سفید جھالریں لگی ہوئی تھیں جن میں کہیں کہیں خلا تھا۔ یاسر نے دیکھا کہ ماجد موبائل پر بات کرتے ہوئے لان میں ٹہل رہا ہے۔ شاید اسی کال کی وجہ سے وہ باہر گیا تھا اور غلٹ میں دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔ یاسر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے آنے سے پہلے یہاں سے چلا جائے کہ اسکرین پر ہونے والی حرکت

نے اسے متوجہ کیا اور اب کمرے میں ایک شخص اور آیا تھا اور یہ ماجد تھا۔ یاسر نے اس کے بڑھے ہوئے سرخ بالوں سے اسے پہچان لیا۔ ابصار کے مارے جانے کے بعد اس نے کچھ عرصے کے لیے حلیہ بدلاتا تھا۔ مگر جب وہ روبینہ سے شادی کے بعد انہیں اس گھر میں لایا تو اس نے پھر وہی حلیہ اپنا لیا تھا۔ ویڈیو میں وہ صرف پتلون میں تھا اور اس کا اوپری جسم عریاں تھا۔ یاسر کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ماجد اس لڑکی کے ساتھ کیا کرنے جا رہا تھا۔

ماجد جھکا اور اس نے لڑکی کا منہ ہلایا۔ وہ یوں کسمانے لگی جیسے گہری نیند میں ہو۔ اب ماجد بستر پر چڑھ گیا اور سیدھا ہوتے ہوئے اس نے اچانک پوری قوت سے لڑکی کے منہ پر تھپڑ مارا۔ یاسر اچھل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ ماجد وحشی آدمی ہے مگر وہ اس بے ہوش اور حسین لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ پھر ماجد کا ہاتھ رکا نہیں اور وہ لڑکی کے چہرے پر مسلسل تھپڑ مارتا رہا۔ ذرا سی دیر میں اس نے اسے لہو لہان کر دیا تھا۔ لڑکی کے ناک منہ سے خون نکل رہا تھا اور اب وہ تڑپ رہی تھی مگر بے بسی سے مار کھانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر وہ یو ختم ہو گئی۔ یاسر نے جلدی سے ویڈیو پلیئر بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔ اسے سی کی خشکی میں بھی پسینا آ گیا تھا۔ ماجد جس طرح لڑکی کو مار رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے اسے ختم کر دیا ہوگا۔ وہ بہت سفاک شخص تھا۔ یاسر کمرے سے نکلا اور لاؤنج کی طرف آیا تھا کہ باہر سے آنے والی گیلری سے ماجد نمودار ہوا، اس نے کمرے کا کھلا دروازہ دیکھا اور یاسر کو آواز دی۔

”کیا تم کمرے میں گئے تھے؟“

”نہیں۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ ”میں اپنے کمرے

سے آ رہا ہوں۔“

یاسر کہہ کر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ ماجد اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آیا۔ مانیٹر پر اسکرین سیور آن تھا۔ اس نے ماؤس ہلایا تو اسکرین سیور ہٹ گیا۔ فولڈر اوپن تھا۔ ماجد سوچ میں پڑ گیا۔

☆☆☆

اس دن یاسر نے جانا کہ اس کا سوتیلا باپ کس قدر خوفناک آدمی ہے۔ نہ جانے وہ لڑکی کون تھی اور کس جرم کے پاداش میں ماجد نے اس پر اتنا بہیمانہ تشدد کیا تھا؟ وہ بہت کم عمر تھی شاید سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ نقوش سے وہ شمالی



”کہیں بھی لے چلو۔“ وہ بولی اور اچک کر اس کے عقب میں بیٹھ گئی۔ ”بس یہاں سے نکلو۔“

”کیا مطلب کہیں بھی لے چلوں؟“ یاسر کسمایا کیونکہ اس نے بیٹھتے ہی اسے کمر سے پکڑ لیا تھا۔ وہ اس سے چپک کر بیٹھی اور یاسر اس کے بدن کی نرمی و گرمی محسوس کر سکتا تھا۔ وہ اس کے کان میں بولی۔

”اپنے گھر کی طرف چلو۔“

یاسر نے بایک آگے بڑھائی۔ ”تم جانتی ہو کہ میرا گھر کہاں ہے؟“

”نہیں۔“ وہ بولی۔ ”لیکن تمہارا گھر کہیں نہ کہیں تو ہو گا۔“

دس منٹ بعد ایک گنجل آگیا۔ یاسر نے بایک روکی تو وہ اچانک ہی اتر گئی۔ ”تمہارا شکر یہ۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ یاسر نے کہا۔ ”ویسے کیا تمہیں یہیں تک لفٹ چاہیے تھی؟“

وہ مسکرائی۔ ”ہاں لیکن تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ چھوٹی سی لفٹ دے کر تم میرے کتنے کام آئے ہو۔“

”ویکم۔“ یاسر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارے کام آیا۔“

اس نے بایک آگے بڑھا دی کیونکہ اس دوران میں گنجل کھل گیا تھا اور پیچھے موجود گاڑیوں کے ہارن بج رہے تھے۔ بیک مرر میں اسے لڑکی وہیں کھڑی دکھائی دی تھی۔

یاسر نے اس کا نام بھی نہیں پوچھا۔ اس کا خیال تھا یہ لڑکی ان بہت سے لوگوں میں سے ایک ہے جو انسان کو بھی راہ چلتے

چلتے ہیں۔ کچھ دیر ساتھ رہتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں کبھی نہ ملنے کے لیے۔ ان کے ہنسلے کا گیٹ ریموٹ سے

کھلتا تھا اور ایک ریموٹ یاسر کے پاس بھی تھا۔ یہ اس کی بایک کی کی چین سے لگا ہوا تھا۔ گھر کے نزدیک آکر اس

نے ریموٹ کا بٹن دبایا اور گیٹ کھلتے ہی اندر آگیا۔ اس نے پورچ میں بایک روکی تو ماجد لان میں کھل رہا تھا اور کسی

سے موبائل پر بات کر رہا تھا۔ وہ چہرے سے پریشان دکھائی دے رہا تھا اور اس کی آواز بلند تھی۔ یاسر نے اندر

جاتے ہوئے سنا۔

”اسے ہر صورت تلاش کرو۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔ وہ میرے چار قیمتی ترین آدمی مار چکی ہے۔۔۔ تم

لوگوں کو کس لیے اتنی بڑی رقمیں دیتا ہوں۔۔۔ مجھے ہر صورت اس کا پتا چاہیے۔۔۔ معاملہ اب میری برداشت

علاقے یا پڑوسی ملک کی لگ رہی تھی جہاں سے روبینہ کا تعلق بھی تھا۔ لڑکی کو باندھنے کا انداز، وہ جگہ، وہاں لگا ہوا کیمرا اور ماجد کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ سب پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس نے بچپن میں گھر میں اسلحہ آتے جاتے دیکھا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ اور ماجد اسلحے کے تاجر تھے شاید وہ منشیات بھی اسمگل کرتے ہوں لیکن اس ویڈیو نے اسے بتایا تھا کہ ماجد کا شاید ایک دھندا اور بھی تھا۔ یہاں آنے کے بعد اس نے اس گھر میں کچھ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ ماجد نے اس جگہ کو اپنے کاروبار سے بالکل الگ رکھا تھا اور وہ یہاں سے صرف رابطے کرتا تھا اور احکامات جاری کرتا تھا۔ کوئی اس سے ملنے بھی نہیں آتا تھا۔ پھر جب اس نے ماجد کو روبینہ پر جبر کرتے دیکھا تو اسے خوف ہوا کہ کہیں ماجد اس کی ماں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک نہ کرے۔ اس لیے وہ مان گیا کہ وہ اس کے ساتھ کام کرے گا۔ اس ایک اقرار کے بعد گھر میں سکون اور خاموشی چھا گئی تھی مگر یاسر کو لگ رہا تھا کہ اس خاموشی و سکون کے پیچھے کوئی بڑا طوفان ہے۔

اس نے کام کے ساتھ پڑھنے کو بھی کہا تھا اور ماجد نے اس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس نے کچھ یونیورسٹیز کے پراسپیکٹس حاصل کر لیے تھے اور انہیں بھر کر جمع کر دیا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے ٹیسٹ اور انٹرویو کے لیے بلا لیا۔ وہ جس یونیورسٹی میں چاہ رہا تھا، اسے وہاں داخلہ مل گیا۔ روبینہ کے پاس موجود رقم سے اس کی سارے سال کی فیس اور دوسرے اخراجات کی رقم بہت آسانی سے نکل آئی۔ اسے ماجد سے مانگنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور اس کا آرام سے داخلہ ہو گیا۔ کلاسز شروع ہوئیں تو اس کا دن کا نصف یونیورسٹی میں گزرنے لگا۔ صبح وہ یونیورسٹی جاتا اور کلاسز لیتا۔ ایک بجے کلاسز آف ہو جاتیں تو وہ لائبریری چلا جاتا اور ایک دو گھنٹے وہاں رہتا تھا۔ وہ تقریباً تین بجے گھر کے لیے نکلتا تھا۔ اس دن وہ گھر جانے کے لیے ڈرائیٹ یونیورسٹی سے نکلا تھا وہ باہر آیا تو سڑک کے ساتھ کھڑی ایک لڑکی نے اسے روک لیا۔

”کیا تم مجھے لفٹ دے سکتے ہو؟“

لڑکی کسی قدر گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے باریک کپڑے کے کرتے کے نیچے اسکن فٹ ٹاپ پہنا ہوا تھا۔

کرتے سے اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ اس کے ساتھ نیلی جینز تھی۔ وہ خوش شکل اور خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کے بایک

شانے پر ایک بڑا ونڈ بیگ تھا۔ یاسر نے آج تک کسی لڑکی کو بایک پر لفٹ نہیں دی تھی مگر وہ اسے منع نہیں کر سکا۔ ”تمہیں



سے باہر ہو گیا ہے میں نے اسے پکڑنے کا پورا پلان بنا کر دیا اور وہ تمہارے منہ پر.... کر نکل گئی۔“

یاسر ایک لمحے کو ٹھنکا تھا۔ بات کسی عورت کے بارے میں ہو رہی تھی۔ ماجد کس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً اپنے آدمیوں سے بات کر رہا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ کوئی عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو ان لوگوں کو نقصان پہنچا کر نکل جائے۔ کم سے کم ماجد کے الفاظ سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ داخلی دروازے کے پاس تھا کہ ماجد نے اسے عقب سے آواز دی۔ ”ادھر آؤ۔“

وہ پلٹ کر آیا۔ ”جی؟“

”یونیورسٹی سے آرہے ہو؟“ ماجد نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔

”جی۔“ اس نے پھر کہا۔

”پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“

”اچھی ہے۔“

ماجد نے دھواں خارج کرتے ہوئے اسے پُر خیال نظروں سے دیکھا۔ ”پڑھائی جاری رہے گی، کام کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میں تیار ہوں۔“ اس نے محتاط انداز میں کہا۔

”خوب۔“ ماجد نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، جا کر فریش ہو جاؤ۔“

جب تک یاسر نے فریش ہو کر کھانا کھایا، ماجد کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اس نے یاسر سے کہا۔ ”کے ایف سی چلے جاؤ۔ وہاں ایک شخص تمہیں ملے گا وہی کام بتائے گا۔“

”کیسا کام؟“ یاسر نے پوچھا تو ماجد کا سوڈ آف ہو گیا، اس نے غرا کر کہا۔

”بولا ہے کہ کام وہی بتائے گا۔“

یاسر ہچکچا رہا تھا اور جب ماجد نے اسے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ باہر نکل گیا۔ وہ روہینہ سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ کمرے میں لیٹی ہوئی تھی، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے سوچا نہیں تھا کہ ماجد اسے اتنی جلدی کسی کام پر روانہ کر دے گا۔ ماجد نے اسے جس طرح جانے کو کہا تھا، وہ پھر ہمت نہیں کر سکا کہ ماں کے پاس جائے اور اسے بتائے کہ ماجد اسے کہیں بھیج رہا ہے۔ اسے قطعی علم نہیں تھا کہ اسے کس شخص سے ملنا تھا اور وہ اسے کیا کام بتاتا۔ وہ بایک پر کے ایف سی پہنچا اور وہیں کھڑا ہو گیا۔ ماجد نے کہا تھا کہ مطلوبہ شخص اسے وہیں ملے گا اور کیونکہ اس نے اس کی کوئی نشانی نہیں بتائی تھی اور نہ ہی رابطے کا نمبر دیا تھا اس لیے

لازمی تھا کہ وہی آدمی اس سے رابطہ کرتا۔ وہ کھڑا ہوا تھا کہ ایک پرانے ماڈل کی واکس وٹکین وہاں آ کر رکی۔ یہ کم سے کم بھی تیس برس پرانی گاڑی تھی اور اب سڑکوں پر بہت کم نظر آتی تھی۔ مگر اس کی حالت بہترین تھی اور اس کے چاروں ٹائر یوں چمک رہے تھے جیسے ابھی ڈلوائے گئے ہوں۔ انجن کی آواز بھی بہت معمولی سی تھی۔

وٹکین سے ایک بوڑھا اور مہذب سا شخص اتر ا۔ اس نے نارٹل موسم میں پتلون کے ساتھ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ آنکھوں پر نظر کی عینک تھی اور اس کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی عمر پچاس کے آس پاس تھی۔ قامت متوسط اور جسم مضبوط تھا۔ وہ دھیرے قدموں سے کے ایف سی کے اندر گیا۔ یاسر نے اسے سرسری نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ اب تک آس پاس موجود اور آنے جانے والے افراد کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ ان میں سے کون ہو سکتا ہے اور کون نہیں۔ بوڑھے کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ اس کے ذہن میں تھا کہ جو شخص اس سے ملتا، وہ جلیے سے ہی بد معاش نظر آتا۔ بوڑھا تقریباً بیس منٹ بعد اندر سے برآمد ہوا اور اس نے ہاتھ میں دو شاپرڈ اٹھار کھے تھے۔ ایک میں کھانے کو کچھ تھا اور دوسرے میں کولڈ ڈرنک کے پیک تھے۔ دونوں شاپرڈ خامسے بڑے تھے۔ وہ اس نے لے جا کر دین میں رکھے اور پھر پلٹ کر یاسر کے پاس آیا۔ اس نے بلا تمہید کہا۔

”میرے ساتھ چلو۔“

یاسر نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ ”آپ کے ساتھ مگر کیوں؟“

”تمہارے باپ نے تمہیں میرے پاس ہی بھیجا ہے۔“ وہ بولا اور وٹکین کی طرف پلٹ گیا۔ یاسر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے ساتھ چلے یا وٹکین میں جائے۔ اس نے بایک چھوڑی اور اس کے پیچھے لپکا۔

”میں کیسے چلوں، بایک پر؟“

”نہیں وٹکین میں۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”بایک یہیں چھوڑ دو، میں تمہیں بعد میں یہیں ڈراپ کر دوں گا۔“

یاسر نے مجبوراً بایک وہیں چھوڑی اور اس کے ساتھ وٹکین میں آ بیٹھا۔ بوڑھے نے وٹکین اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ وہ خاموش تھا۔ یاسر نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میرا نام یاسر ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ بوڑھے نے کہا اور کولڈ ڈرنک والے شاپرڈ سے کاغذی گلاس نکالنے پیک کولڈ ڈرنک نکال کر



نے اچانک ہی ویکن ایسی ہی ایک چھوٹی لیکن جدید آبادی کی طرف موڑ دی۔ اسے باقاعدہ بسایا گیا تھا اور یہ کوئی ترقی یافتہ گاؤں نہیں تھا۔ یہاں اونچے اور درمیانی طبقے کے افراد رہتے تھے جن کا روزگار ہائی وے کے آس پاس تھا۔ یہاں دن میں بھی سناٹا اور ویرانی تھی۔ ویکن ایک چھوٹے سے پارک کے ساتھ روک کر بوڑھے نے اس سے کہا۔ ”تم نہیں روکو اور اگر میں آدھے گھنٹے میں نہ آؤں تو تم ویکن لے کر چلے جانا اور ماجد کو بتا دینا۔ میری بات سمجھ گئے ہو۔“

یاسر نے سر ہلایا تو بوڑھا اتر کر پارک میں داخل ہوا اور پھر اسے کراس کر کے دوسری طرف موجود ایک چھوٹے سے بنگلے میں داخل ہو گیا۔ اس کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یاسر گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اسے موبائل کا خیال آیا جو سامنے ہی خانے میں موجود تھا مگر نہ جانے کیوں وہ موبائل نکالنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دس منٹ گزرے اور پھر بیس منٹ گزرے۔ پچیس منٹ کے بعد وہ بار بار بنگلے کی طرف دیکھنے لگا۔ اٹھائیسویں منٹ پر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور جیسے ہی تیسواں منٹ پورا ہوا اس نے ویکن اسٹارٹ کرنا چاہی اور اسی لمحے بوڑھا بنگلے سے نمودار ہوا اور چہل قدمی کرتا ہوا ویکن کی طرف آنے لگا۔ یاسر کھسک کر اپنی سیٹ پر واپس آ گیا۔ بوڑھا آ کر بیٹھا اور اس نے ویکن اسٹارٹ کر کے واپس موڑ دی۔ وہ ہائی وے کی طرف جا رہے تھے۔ یاسر نے اسے بتایا۔

”اگر آپ ایک منٹ اور دیر کرتے تو میں یہاں سے جا چکا ہوتا۔“

بوڑھے نے کوئی رد عمل نہیں دیا۔ یاسر کی توجہ اس کے ہاتھ پر گئی اور اسے لگا جیسے وہاں خون ہو۔ مگر یہ اس کا خون نہیں تھا بلکہ کسی اور کا خون تھا جو اس کے ہاتھ پر لگ گیا تھا اور صاف کرنے پر بھی پوری طرح صاف نہیں ہوا تھا۔ بوڑھے نے اس کی نظر محسوس کی اور پھر غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ موڑ لیا۔ یاسر گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بوڑھا اس بنگلے میں کیا کرنے گیا تھا؟ اس کے ہاتھ پر کس کا خون لگا ہے؟ بوڑھے نے گاڑی کو ہائی وے پر شمال کی طرف موڑا تو اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وہ واپس جا رہے تھے، وہ مزید دور جا رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد بوڑھے نے کہا۔ ”تمہیں بھوک لگی ہے تو اس میں کھانے کے لیے برگر ہے۔“

مگر اسے بھوک نہیں تھی۔ البتہ اس نے کولڈ ڈرنک کا ایک پیک نکالا اور اسے کھول کر پینے لگا۔ اس سے فارغ ہو

اس کا ڈھکن ہٹانے لگا۔ ”تمہارے باپ نے بتایا تھا۔“  
”وہ میرا باپ نہیں ہے۔“ یاسر نے بے ساختہ کہا۔  
اس کے لیے ناقابل برداشت تھا کہ ماجد کو اس کا باپ سمجھا جائے۔

”باپ نہیں ہے؟“ بوڑھے نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

”نہیں باپ ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ وہ سوتیلا باپ ہے۔“

بوڑھے نے یوں سنا جیسے اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو اور وہ ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ کولڈ ڈرنک پینے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ویکن شہر سے باہر جانے والی ہائی وے پر آ گئی۔ یاسر بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“  
”شمال کی طرف۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔

”ہماری منزل کیا ہے؟“ یاسر کا لہجہ تیز ہو گیا۔  
”کوئی نہیں۔“ بوڑھے نے خالی ہو جانے والا گلاس کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ یاسر نے محسوس کیا کہ وہ اس کے سوالوں کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ماجد جیسے شخص کے ساتھ اس شخص کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ اپنی صورت اور چلنے سے تو وہ کسی یونیورسٹی کا پروفیسر لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ روہینہ کو کال کر کے بتا دے اور ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ اچانک بوڑھے نے کہا۔  
”تمہارے پاس موبائل ہے؟“

”ہاں ہے۔“  
”دکھانا۔“ بوڑھے نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے موبائل نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ بوڑھا شاید کال کرنا چاہ رہا تھا مگر اس نے موبائل بند کر کے اسے ویکن کے ڈیش بورڈ کے خانے میں ڈال دیا۔ یاسر نے پوچھا۔

”یہ کیوں؟“  
”نو موبائل۔“ بوڑھا بولا۔ ”واپسی پر تم لے سکو گے۔“

”کہاں سے واپسی پر؟“  
”جہاں ہم جا رہے ہیں۔“

اس جواب کے بعد مزید سوالوں کی گنجائش نہیں تھی۔ شہری آبادی ختم ہو گئی تھی اور اب وہ ایسے ویرانوں سے گزر رہے تھے جہاں کہیں کہیں چھوٹی آبادیاں تھیں مگر بیشتر جگہوں پر ہائی وے کے ساتھ قدرتی مناظر تھے۔ بوڑھے



ڈاکٹر کہہ سکتے ہو۔“

”ڈاکٹر۔۔۔ ایم بی بی ایس؟“

”نہیں؟“

”آپ نے پی ایچ ڈی کی ہے؟“

”بعض لوگ اپنی فیلڈ میں بہت ماہر ہو جاتے ہیں

اور انہیں ڈاکٹر کہا جانے لگتا ہے، میں اسی قسم کا ڈاکٹر ہوں۔“

”آپ کی فیلڈ کیا ہے؟“

”جو میں کرتا ہوں۔“

”آپ کیا کرتے ہیں؟“

”جلد تھم دیکھ لو گے بیٹے۔“ اس نے بیزاری سے کہا

اور ٹھلٹا ہوا ذرا دور چلا گیا۔ لیکن کا پچھلا خانہ ڈرائیونگ

کپارٹ سے الگ تھا اور اس کا دروازہ پیچھے کی طرف تھا۔

یاسر نے پیچھے آکر اس کا اینڈل گھمایا مگر خانہ لاک تھا پھر اس

نے دیکھا کہ دروازے پر اضافی تالے کے لیے جگہ بنی تھی

اور اس پر مضبوط تالا بھی لگا ہوا تھا۔ یعنی عقیبی جیسے کا دو گنا

حفاظتی انتظام تھا۔ اس میں آخر ایسی کیا چیز تھی جس کی

حفاظت کے لیے اتنا تردد کیا گیا تھا۔ اب اسے یہ سادہ نظر

آنے والا بوڑھا پراسرار لگنے لگا تھا۔ اپنے سوتیلے باپ سے

بھی زیادہ پراسرار۔ ماجد جیسا تھا ویسا ہی نظر آتا تھا مگر ڈاکٹر

نامی یہ بوڑھا جیسا نظر آتا تھا ویسا نہیں تھا۔ وہ ٹپکتے ہوئے

آگے گیا اور پھر واپس آیا۔ اس نے یاسر سے کہا۔

”ذرا آگے ایک چھوٹا سا تالا بہہ رہا ہے۔ نہانے کے

بارے میں کیا خیال ہے؟“

یاسر آج تک ہاتھ روم سے باہر نہیں نہایا تھا۔ ”مجھے

تیرنا نہیں آتا ہے۔“

”پانی زیادہ گہرا نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا اور ویگن

کی چابیاں نکال کر اسے لاک کر کے تالے کی طرف روانہ ہو

گیا۔ یاسر اس کے پیچھے تھا۔ جب وہ تالے تک پہنچا تو ڈاکٹر

کپڑے اتار کر صرف کسی قدر لمبی نیکر میں آگیا تھا۔ جسم سے

وہ اتنا بوڑھا نہیں لگتا تھا، اس کا جسم جوانوں کی طرح پُر

گوشت اور پٹھوں سے بھرپور تھا۔ تالا واقعی چھوٹا تھا۔ مشکل

سے چھ فٹ چوڑا اور تین ساڑھے تین فٹ گہرا تھا۔ اس میں

بہنے والا پانی شفاف تھا مگر دھارا تیز نہیں تھا۔ ڈاکٹر اس کے

کنارے دھیرے سے اندر اتر گیا اور کچھ دیر بعد سوائے سر

کے اس کا پورا جسم پانی میں تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے پانی کی

ٹھنڈک اور تازگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا پھر اس نے یاسر

کی طرف دیکھا۔ ”آ جاؤ پانی مزے کا ہے۔“

یاسر کا دل چاہ رہا تھا مگر اس کے پاس نیکر نہیں تھی اس

کر وہ اوتھنے لگا اور کچھ دیر بعد پشت سے سر نکا کر سو گیا۔ پھر

پلکے سے جھپٹنے سے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ شام ہو

گئی تھی اور کچھ ہی دیر میں تاریکی چھانے والی تھی۔ لیکن

ایک کچے راستے پر جا رہی تھی۔ ہائی وے ذرا ہی پیچھے رہ گئی

تھی اور اس سے گزرتی گاڑیوں کا شور یہاں تک آرہا تھا۔

لیکن کی رفتار بہت سست تھی مگر اس کے باوجود جھپٹنے لگ رہے

تھے۔ اس نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بوڑھے کی طرف

دیکھا۔ ”ہم کہاں ہیں؟“

بوڑھے نے پوری توجہ سے ڈرائیو کرتے ہوئے

جواب دیا۔ ”ایک جنگل میں۔“

اس کا جواب اس حد تک ٹھیک تھا کہ وہ جس کچی

سڑک پر جا رہے تھے، اس کے دونوں طرف گھنے اور اونچے

درختوں پر مشتمل جنگل تھا۔ یاسر نے گہری سانس لی اور

بولاً۔ ”میرے باپ۔۔۔ میرا مطلب ہے سوتیلے باپ نے

مجھ سے کہا تھا کہ مجھے کام کرنا ہے اور اسی لیے اس نے آپ

کے پاس بھیجا تھا۔“

”تم کام ہی کر رہے ہو میرا ساتھ دے کر۔“

”آپ نے اس مکان میں کیا کیا تھا؟“ یاسر نے

پوچھا اور اس کی نظر بوڑھے کے ہاتھ پر گئی مگر اب وہ صاف

تھا۔ بوڑھے نے ایک بار پھر صفائی سے اس کے سوال کا

جواب گول کر دیا۔ [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

”ہمیں کسی کی تلاش ہے۔“

”کیا وہ مکان میں مل گیا تھا؟“

”نہیں مگر اس سے ایک پتلا ہے۔“

”ہم وہیں جا رہے ہیں؟“

”شاید۔“ بوڑھے نے جواب دیا اور اس نے

اچانک وین درختوں کے درمیان ایک خالی جگہ گھما کر روک

لی۔ انجن بند ہوا تو یک دم سناٹا چھا گیا۔ یہاں سناٹے میں

اس کول انجن کی آواز خاصی محسوس ہو رہی تھی۔ بوڑھے نے

سیٹ بیلٹ کھولی اور نیچے اتر گیا۔ یاسر بھی دروازہ کھول کر

نیچے اتر آیا۔ شہر کے برعکس یہاں موسم خوشگوار اور خنک تھا۔

ہوا میں پودوں اور پھولوں کی خوشبو تھی۔ ہلکی سی نمی بتا رہی تھی

کہ آس پاس کہیں پانی بھی تھا۔ بوڑھا یوں چہل قدمی کر رہا

تھا جیسے جسم کھول رہا ہو۔ اس وقت وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے

وہاں پر اکیلا ہو۔ یاسر ویگن کی باڈی سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے کہا۔

”مجھے ابھی تک آپ کا نام نہیں معلوم ہے۔“

بوڑھے نے رک کر اسے دیکھا اور بولا۔ ”تم مجھے

جاسوسی ڈائجسٹ



”آہ۔“ ڈاکٹر استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ”آج سے تیس سال پہلے ڈاکٹری اور انجینئرنگ اور آج کل ایم بی اے اور آئی ٹی۔ کیا ہمارے ہاں اور شعبے نہیں ہیں۔“

”ہیں مگر مجھے آئی ٹی میں دلچسپی ہے۔“

”جن کو نہیں ہوتی وہ بھی ان ہی شعبوں میں مگھتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ جاننے کا رواج ہی نہیں ہے کہ آدمی کو اصل میں کس شعبے سے دلچسپی ہے۔“

”آپ کو کس شعبے سے دلچسپی ہے۔“

”جس میں میں ہوں۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”میں نے بہت جلد جان لیا تھا کہ میں کون سا کام اچھے طریقے سے کر سکتا ہوں اور میں آج تک وہی کر رہا ہوں۔“

اس بار ڈاکٹر کے بہم انداز نے اسے بے سکون نہیں کیا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ ان لوگوں میں سے جو زبان سے بتانے کے بجائے عمل سے وضاحت کرتے ہیں۔ وہ جو اندر سے تھا ویسا اوپر سے نظر نہیں آتا تھا۔ اب تک یاسر نے اسے خاصی حد تک جان لیا تھا اور اگر وہ اس کے ساتھ کچھ وقت اور رہتا تھا تو باقی بھی جان جاتا۔ ماجد نے اسے بلا وجہ اس شخص کے ساتھ نہیں بھیجا تھا۔ ”آپ ماجد کے ساتھ کام کرتے ہیں؟“

”میں معاوضے پر کام کرتا ہوں۔“

”آپ فری لانسر ہیں؟“

”ہاں۔“ اس نے پہلی بار کسی سوال کا واضح جواب دیا۔

”آپ جانتے ہیں، ماجد کیا کام کرتا ہے؟“

”تم جانتے ہو؟“ ڈاکٹر نے الٹا سوال کیا۔

”نہیں۔“

”جب تم بیٹے ہونے کے باوجود نہیں جانتے تو میں کیسے جان سکتا ہوں؟“

”میں اس کا نام نہاد بیٹا ہوں۔“ یاسر نے تلخی سے کہا اور پہلی بار اپنے بارے میں زبان کھولی۔ ”اس نے تقریباً زبردستی میری ماں سے شادی کی اور اب ہم اس کے گھر میں یوں زندگی گزار رہے ہیں جیسے چڑیا کو سونے کے پنجرے میں قید کر دیا جائے۔“

ڈاکٹر ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اور تب یاسر کو احساس ہوا کہ وہ جذبات میں آکر ایک ایسے شخص کے سامنے ماجد کے بارے میں بات کر گیا ہے جو اصل میں ماجد کا ملازم ہے۔ یاسر نے گہری سانس لی۔ ”سوری میں جذبات میں آکر بول گیا۔“

لیے وہ کپڑے اتار کر انڈر ویئر میں جھینپتا ہوا پانی میں آ گیا۔ زندگی میں پہلی بار بہتا پانی جسم پر بہت اچھا لگا تھا، وہ بھی ڈاکٹر کی طرح پورا جسم پانی میں کر کے بیٹھ گیا۔ اسے ذرا مشکل ہوئی مگر جلد اس نے خود کو بہاؤ کے خلاف سیٹ کر لیا۔ ڈاکٹر نے اچانک پوچھا۔ ”تم نے کبھی کسی کو قتل کرنے کا سوچا؟“

یاسر کے ذہن میں بے اختیار ماجد کا خیال آیا جب وہ اس کی ماں پر ظلم کرتا تھا تو اسے کئی بار اسے قتل کرنے کا خیال آیا تھا مگر وہ صرف سوچ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر کے پوچھنے پر اسے خیال آیا مگر اس نے جھوٹ بولا۔ ”نہیں آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟“

”اعداد و شمار کے مطابق انسانوں میں سے ہر ایک ہزار پانچ سو بار حواں شخص قاتل ہوتا ہے مگر باہرین کہتے ہیں کہ باقی ایک ہزار پانچ سو گیارہ لوگ جو کبھی قتل نہیں کرتے، وہ اس کی کبھی نہ بھی خواہش ضرور رکھتے ہیں۔“

”آپ نے کبھی کسی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچا۔“

”میں سوچتا نہیں ہوں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا اور کنارے رکھے سگار کو اٹھا کر لائینر سے سلکایا اور ایک گہرا کش لیا۔۔۔ تمباکو کی خوشبو بتا رہی تھی کہ یہ بہت اعلیٰ درجے کا سگار ہے۔ یاسر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا مگر اس نے پھر توجہ نہیں دی اور سگار سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ چند منٹ بعد پانی میں دو تین بار اپنا سر ڈبو کر وہ باہر نکل آیا۔ ”بس اب باہر آ جاؤ۔ تاریکی چھانے والی ہے۔“

یاسر بھی باہر آ گیا دونوں نے درختوں کی آڑ میں اپنے کپڑے پہنے اور واپس وین کی طرف آ گئے۔ اندر بیٹھتے ہی ڈاکٹر نے کھانے والا شاپر کھول لیا تھا اور کھانے میں مصروف ہو گیا پھر اس نے یاسر کی طرف شاپر بڑھایا۔ اب اسے بھی بھوک لگ رہی تھی اور اس نے شاپر لے لیا۔ شاپر میں خاصی چیزیں تھیں۔ یاسر کا پیٹ بھر گیا تو اس نے ہاتھ روک کر ایک کولڈ ڈرنک کا پیک نکال لیا۔ ڈاکٹر سست روی اور دل جمعی سے کھا رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے لگ رہا تھا جو ہر کام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے شاپر آدھا کر دیا۔ کھانے کے بعد اس نے بھی کولڈ ڈرنک لی اور بولا۔ ”تم پڑھ رہے ہو؟“

”ہاں یونیورسٹی میں میرا پہلا سمسٹر ہے۔“

”کس شعبے میں؟“

”آئی ٹی۔“



”میرا خیال ہے ہمیں کچھ آرام کر لینا چاہیے۔“ ڈاکٹر نے یوں کہا جیسے اس نے یاسر کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس نے اپنی نشست ذرا پیچھے سرکائی اور سر لگا دیا۔ ”ہمیں صبح سے پہلے اٹھنا ہے۔“

گرمیوں کی راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ وہ نوبے سوئے تھے اور عین اس وقت جب ساری رات بے چین رہنے کے بعد یاسر کی آنکھ لگی تھی تو ڈاکٹر نے اسے اٹھا دیا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا۔ ڈاکٹر فریش لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ گاڑی کی نشست پر سونے کا عادی تھا۔ اس نے کہا۔ ”جا کر منہ ہاتھ دھو آؤ مگر احتیاط کرنا اس وقت پانی میں کیڑے مکوڑے اور چھوٹے جانور ہو سکتے ہیں۔“

ابھی آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ یاسر منہ دھو کر آیا تو ڈاکٹر ایک کسی قدر بڑا بیگ شانے پر لادے جیسے تیار تھا۔ اس یاسر نے ویگن لاک نہیں کی تھی اور چابی اندر لگی چھوڑ دی تھی۔ ”آؤ چلیں۔“

”کہاں؟“ یاسر نے اس کے ساتھ آتے ہوئے کہا۔ ”اس طرف۔“ ڈاکٹر نے ہاتھ سے ہائی وے کے مخالف سمت اشارہ کیا۔ وہ ہائی وے سے کوئی نصف کلومیٹر دور تھے۔ درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے تاریکی کی وجہ سے انہیں ہر قدم پھونک کر رکھنا پڑتا تھا۔ یہاں درختوں میں تاریکی تھی اور ڈاکٹر نے روشنی کے لیے کچھ نہیں کیا تھا اور وہ بہت دے قدموں چل رہا تھا۔ مشکل سے کوئی سوگز بعد وہ ایک پتھر اور لکڑی سے بنے چھوٹے سے مکان تک پہنچے جسے چاروں طرف سے گھنے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ یاسر حیران رہ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ جس جگہ رہے ہیں، اس کے قریب ہی کوئی مکان بھی ہوگا۔ ورنہ دیکھنے میں یہ جگہ بالکل ویران لگ رہی تھی۔

اس وقت کسی قدر روشنی ہونے لگی تھی اور یہاں سے مکان اور پیچھے کھڑی ویگن دونوں نظر آرہے تھے۔ مکان کا ایک حصہ اور قطعی حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرا حصہ اور سامنے والا حصہ نظروں سے اوجھل تھا۔ عقب میں بپاٹ دیوار تھی اور اس میں صرف ایک کھڑکی تھی۔ جو لکڑی کے مضبوط تختوں سے بنی ہوئی اور بند تھی۔ ڈاکٹر نے بیگ نیچے رکھا اور پھر اپنا کوٹ اتارا۔ اس کے بعد اس نے بیگ سے ایک بلیٹ پروف جیکٹ نکال کر پہنی۔ اس پر دوبارہ اپنا کوٹ پہن لیا۔ پھر اس نے لوہے کی ایک ڈیڑھ فٹ لمبی سیاہ سلاخ نکالی جس کے سرے پر گول مٹھنی ہوئی تھی۔ وہ اس نے کوٹ کی آستین میں کر لی اور آہستہ سے کہا۔ ”تم یہیں رکو

گے اور کچھ بھی ہو جائے ویگن پر نظر رکھنا۔“

یاسر نے سر ہلایا تو ڈاکٹر ذرا گھومتے ہوئے مکان کے سامنے والے حصے کی طرف جانے لگا۔ یاسر اسے بھی دیکھ رہا تھا اور اس کی نظر ویگن کی طرف بھی تھی مگر جب ڈاکٹر، مکان کے سامنے پہنچا تو اس کی توجہ اس پر زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ مکان کے دروازے تک پہنچا تو یاسر کی نظروں سے اوجھل ہو گیا پھر اس نے کسی کے چلانے کی آواز سنی۔ اسی لمحے اسے لگا کہ کوئی ویگن والی سمت میں حرکت کر رہا ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا تو اب کوئی نظر نہیں آیا مگر حرکت اسے واضح محسوس ہوئی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ کیونکہ اس نے بھی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کیا تھا پھر ایک قارہ ہوا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور وہ بے ساختہ مکان کی طرف بڑھا۔

وہ مکان کے سامنے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر سینے پر ہاتھ رکھے ذرا جھکا کھڑا ہے اور اس کے سامنے ایک تو منہ اور ادھیڑ عمر قبائلی کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ گولی اسی نے چلائی تھی اور وہ غور سے ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ یاسر جانتا تھا کہ ڈاکٹر ٹھیک ہے، اس نے بلیٹ پروف پہن رکھا ہے۔ گولی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یاسر کی موجودگی محسوس کر کے اس نے بھڑک کر پستول والا ہاتھ یاسر کی طرف کیا تھا کہ ڈاکٹر بہت تیزی سے حرکت میں آیا اور اس کے ہاتھ میں چھپی فولادی سلاخ ٹھیک قبائلی کی کٹہنی پر لگی۔ ضرب شدید تھی اور وہ فوراً ہی زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے سلاخ کا رخ یاسر کی طرف کیا اور گرج کر بولا۔ ”یہاں کیوں آئے ہو، تم سے کیا کہا تھا؟“

”وہ۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ قارہ کی آواز۔“ اس نے ہکلا کر کہنا چاہا۔

”دفع ہو جاؤ اور ویگن کو دیکھو۔“ ڈاکٹر اس کی بات کاٹ کر دھاڑا۔ یاسر بوکھلا کر واپس بھاگا۔ وہ اپنی جگہ آیا تو اس نے ویگن کو اسی جگہ پا کر اطمینان کا سانس لیا ورنہ ڈاکٹر کے انداز سے تو لگ رہا تھا کہ ویگن غائب ہوگی۔ ڈاکٹر کچھ دیر بعد واپس آیا اور اس نے بیگ سے ہتھکڑی نکالی اور واپس چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر آیا اور اس نے بیگ سے شفاف پولیٹھین کا بنا ہوا اور آل نکالا کر اپنے لباس پر پہن لیا۔ اس نے دوسرا اور آل نکال کر یاسر کی طرف بڑھایا۔ ”اسے پہنو۔“

یاسر نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اور آل نے اسے ہیروں سے لے کر گردن تک مکمل ڈھانپ لیا تھا اور اب



اس کے لباس تلے پسینا اس کے بدن پر بہہ رہا تھا۔ کلبھاڑی وزنی اور اس کی دھار بہت تیز تھی۔ یہ ایک ہی ضرب میں جسم کا کوئی بھی حصہ کاٹ سکتی تھی۔ وہ قبائلی کی طرف بڑھتا تو اس کی تڑپ میں اضافہ ہو گیا۔ اتنی ہی شدت سے یاسر کا جسم کانپ رہا تھا۔ ڈاکٹر اس کے ساتھ آگے آیا۔ اس نے قبائلی کی کلائی پکڑی اور انگلی سے ایک جگہ نشان لگایا۔ ”اس جگہ مارنا ہے۔ کلائی سیکنڈ میں کٹ جائے گی۔“

یاسر نے کلبھاڑی اور پھر اس شخص کے ہاتھ کو دیکھا تو اسے لگا جیسے کوئی چیز اس کے معدے سے نکل کر حلق میں آرہی ہے۔ اس نے بے ساختہ گھومتے ہوئے قے کر دی۔ ڈاکٹر اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کسی قدر درشت لہجے میں کہا۔ ”یہ اتنا بڑا کام بھی نہیں ہے کہ تمہارا معدہ الٹ کر حلق میں آجائے۔“

یاسر ہانپ رہا تھا اور پسینا اس کی ناک سے بہہ رہا تھا۔ اس نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ چاہے آپ میرے سوتیلے باپ کو کال کریں یا میرے سگے باپ کو۔“

شاید اس نے بھی محسوس کر لیا کہ اس لڑکے سے یہ کام نہیں ہوگا۔ اس نے یاسر سے کلبھاڑی لی اور پلٹ کر اچانک قبائلی کے ہاتھ پر ماری۔ اس کے انداز میں غصہ تھا۔ قبائلی کی کلائی بازو سے الگ ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ درخت سے بھی آزاد ہو گیا۔ کیونکہ کٹ جانے والی کلائی سے ہتھکڑی کا کڑا نکل گیا تھا۔ وہ پھلتے ہوئے اپنی کٹی کلائی سے خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈاکٹر نے اس کے سر پر وار کیا اور وہ نیچے گر گیا۔ یاسر نے صرف ایک نظر کٹی ہوئی کلائی دیکھی تھی اور اب جھکا ہوا قے کر رہا تھا مگر اب اس کے منہ سے صرف ابکائیاں نکل رہی تھیں۔ اس کا معدہ مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ اس نے دوسرا وار ہوتے نہیں دیکھا مگر قبائلی کا چلتا ناک گیا تھا پھر اس نے سر اٹھایا تو ساکت رہ گیا۔ سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی جس نے اس سے یونیورسٹی سے لفٹ لی تھی۔

وہ اس وقت ٹی شرٹ اور جینز میں تھی اور اس نے پشت پر بیگ باندھ رکھا تھا۔ وہ ساکت کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ یاسر نے مڑ کر دیکھا تو ڈاکٹر قبائلی پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ یاسر نے سر کے اشارے سے لڑکی سے وہاں سے جانے کو کہا مگر وہ ساکت کھڑی رہی۔ پھر یاسر نے جسم کی اوٹ لے کر اسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ اس بار بھی نہیں سمجھی۔ قبائلی پر جھکے ڈاکٹر کی چھٹی

صرف اس کے ہاتھ، جوتے اور سر اس سے باہر تھا۔ یاسر سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کیوں یہ سب کر رہا تھا۔ آخر میں اس نے بیگ سے ایک چھوٹے دستے لیکن چوڑے پھل والی کلبھاڑی نکالی۔ جیسی کلبھاڑی فائر فائٹرز کے پاس ہوتی ہے، یہ بالکل ویسی ہی کلبھاڑی تھی۔ حد یہ کہ اس کے دستے کا رنگ تک سرخ تھا۔ اس نے یاسر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور جب وہ مکان کے سامنے پہنچے تو ایک درخت کے تنے کے گرد ادھیڑ عمر قبائلی کے دونوں ہاتھ کر کے اسے ہتھکڑی سے جکڑ دیا گیا۔ وہ ہوش میں آگیا تھا اور ایک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا مگر وہ بول نہیں سکتا تھا۔ اس کا منہ چوڑے ٹیپ سے بند تھا۔ ڈاکٹر نے اچانک کہا۔ ”تم نے کبھی کسی زندہ انسان کے جسم کے حصے کو کتنے دیکھا ہے؟“

یاسر کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ قبائلی نے سن لیا تھا اور وہ ہلنے لگا۔ یاسر نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔“

”مگر آج تم اس شخص کا دایاں ہاتھ کاٹو گے۔“ ڈاکٹر نے کہتے ہوئے کلبھاڑی اس کی طرف بڑھادی۔ قبائلی یہ سنتے ہی پھلتے اور مختلف آوازیں نکالنے لگا۔ ”نہیں۔“ وہ پیچھے ہٹ گیا۔

”یہ ضروری ہے۔“ ڈاکٹر نے یوں کہا جیسے اسے کوئی صحت بخش نسخہ تجویز کر کے اس کے استعمال پر زور دے رہا ہو۔

”کیوں؟“

”کیونکہ تمہارے باپ۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے سوتیلے باپ نے تمہیں کام پر بھیجا ہے۔ یہ تمہارا کام ہے۔“

”مگر یہ کیسا کام ہے؟“ یاسر بولا۔ ”اس شخص کا ہاتھ کیوں کاٹنا ہے؟“

”تمہارے باپ کو ایک لڑکی کی تلاش ہے جس نے اسے بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ وہ اس کے چار اہم ترین آدمیوں کو قتل کر چکی ہے اور اس نے اس لڑکی کی تلاش کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں مگر میں اکیلے یہ کام نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ اس لیے اس نے تمہیں میرے ساتھ بھیجا ہے۔ یہ شخص اس لڑکی کو جانتا ہے مگر زبان نہیں کھول رہا ہے۔ شاید اس کا ایک ہاتھ کسٹ جائے تو اس کی زبان کھل جائے۔ اب تم کلبھاڑی لے رہے ہو یا میں تمہارے باپ کو کال کروں؟“ اس نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے موبائل فون نکال لیا۔

ماجد کا سنتے ہی یاسر نے جلدی سے کلبھاڑی لے لی۔



حس نے اسے چونکایا اور اس نے سر آگے کر کے درخت کے تنے سے جھانکا تو اسے لڑکی نظر آگئی تھی۔ لڑکی کو قبائلی نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کے سر میں دھنسی کلباڑی کا دستہ ضرور دکھائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر آگے آیا اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیا حال ہیں بیگ لیڈی۔“

لڑکی کا چہرہ خوفزدہ ہو گیا۔ ڈاکٹر آگے آیا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ”یہ جگہ تم جیسی خوب صورت لڑکی کے لحاظ سے بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تم واپس چلی جاؤ۔“

یاسر نے دیکھ لیا تھا کہ ڈاکٹر کے پیچھے موجود ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا اور اس کا دل ایک بار پھر متلانے لگا کہ ابھی وہ اس لڑکی کو بھی شوٹ کر دے گا۔ لڑکی نے پلٹنا چاہا مگر ڈاکٹر کا ہاتھ سرعت سے سامنے آیا اور اس میں ایک چھوٹا سا پستول دبا ہوا تھا۔ وہ پھر ساکت ہو گئی۔ ڈاکٹر آگے آیا اور اس نے پستول کی نال کا رخ لڑکی کے چہرے کی طرف کر دیا۔ یاسر، قبائلی کا انجام دیکھ چکا تھا اور اب لڑکی کے قتل کے خیال سے اس کی حالت خراب ہونے لگی، اس نے منہ پھیر لیا اور دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ ڈاکٹر نے پستول لڑکی کے ماتھے پر رکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”مگر تم یہاں موجود ہو، آخر کیوں؟“

لڑکی خاموش رہی، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ ڈر رہی تھی کہ ڈاکٹر ابھی گولی چلا دے گا۔ ڈاکٹر نے پستول اس کے چہرے سے ہٹایا تو اس نے گویا سکھ کا سانس لیا۔ ڈاکٹر نے اسے اشارے سے بیگ اتارنے کو کہا۔ لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے حکم کی تعمیل کی۔ ڈاکٹر نے بیگ لے کر یاسر کی طرف اچھالا۔ ”اسے چیک کر دو۔“

یاسر نے بیگ پکڑ لیا تھا مگر اسے کھولا نہیں اور بولا۔ ”اسے جانے دیں۔“

”میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔“ ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا مگر اب یاسر متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ ”اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسے جانے دیں۔“

ڈاکٹر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور لڑکی اچانک بھاگی تو اسے قائل کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی۔ لڑکی بچ گئی۔ وہ درختوں میں اس طرح سے بھاگ رہی تھی کہ ڈاکٹر ٹھیک سے نشانہ نہیں لے پا رہا تھا۔ اس نے دوسرا قائل کیا۔ پستول کی آواز زیادہ نہیں تھی۔ اسی طرح اس کی گولی زیادہ

دور تک کام نہیں کرتی تھی۔ دوسرے قائل تک لڑکی خاصی آگے نکل گئی تھی۔ اس کا رخ ویکمن کی طرف تھا۔ ابھی تک ڈاکٹر کھڑے کھڑے لڑکی کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا مگر جب وہ ویکمن کے پاس پہنچی تو وہ حرکت میں آیا۔ اب ڈاکٹر اس کے پیچھے بھاگا اور یاسر اس کے پیچھے تھا۔ مگر جب تک وہ ویکمن تک پہنچتے، لڑکی ڈرائیونگ کپارٹ میں گھس کر انجن اسٹارٹ کر چکی تھی۔

اس نے ریورس گیر لگایا اور ڈاکٹر کی چلائی گولی کھڑکی کے شیشے پر لگی۔ وہ خود بال بال ہنسی تھی، شیشے سے آنے والی گولی اس کی نشست میں سر کے بالکل برابر میں اتر گئی تھی۔ ریورس ہوتے ہوئے ویکمن کھوی، ذرا لڑکھرائی اور پھر تیزی سے ہائی وے کی طرف روانہ ہو گئی۔ ڈاکٹر نے ایک قائل اور کیا مگر یہ بے سود تھا۔ یاسر اس کے پیچھے آ گیا۔ ڈاکٹر کا غصے سے برا حال تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے اس سے بیگ چھینا اور اسے کھولا۔ تو اس میں... ایک ساٹنسر لگا پستول اور کچھ رقم کے ساتھ بعض استعمال کی عام اشیا تھیں۔ اس نے پستول یاسر کے سامنے کیا۔

”اس لیے اسے روکا تھا۔ وہ یہاں ایسے ہی نہیں آئی تھی۔“ ڈاکٹر نے کہا اور واپس مکان کی طرف جانے لگا۔ یاسر اس کے پیچھے لگا۔

”پھر کس لیے آئی تھی؟“

”وہ اس قبائلی کے پاس آئی تھی۔ اب مجھے لگ رہا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جو تمہارے... باپ کو مطلوب ہے۔“ ڈاکٹر نے بیگ کے پاس آ کر سب کچھ اس میں ڈالا۔ پھر اوپر آل اتارا اور یاسر کو بھی اتارنے کو کہا۔ جن چیزوں پر خون لگ گیا تھا ان کو ندی پر لے جا کر صاف کیا۔ پولی ٹھین کے اوپر آل اسی لیے پہنے گئے تھے کہ قبائلی کے ٹکڑے کرتے ہوئے ان کا لباس خون سے محفوظ رہے۔ قبائلی کے ہاتھ سے ہتھکڑی بھی اتار لی تھی البتہ اس کی لاش وہیں چھوڑ دی تھی۔ ڈاکٹر پہلی بار غلٹ میں نظر آیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہائی وے کی طرف جا رہے تھے۔ یاسر نے کہا۔

”آپ نے ویکمن میں چابی کیوں لگی چھوڑی؟“

”تمہارے لیے احسن۔“ ڈاکٹر ابھی بھی غصے میں تھا۔ ”اگر میں پکڑا جاتا یا مارا جاتا تو تم یہاں سے نکل سکتے تھے۔ چابی میرے پاس ہوتی تو تم بھی پھنس جاتے۔“

یاسر سوچ رہا تھا کہ اسے بتائے یا نہ بتائے کہ وہ لڑکی اسے گزشتہ روز ملی تھی اور اس نے اسے لفٹ دی تھی۔ کسی قدر سوچنے کے بعد اس نے نہ بتانے کا فیصلہ کیا اس لیے



ہر اس سڑک کے کنارے کھڑے تھے اور ڈاکٹر نے ان پر پستول تان رکھا تھا۔ اس نے یاسر سے کہا۔ ”ڈرائیونگ سیٹ پر جاؤ۔“

یاسر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا تو ڈاکٹر نے مہذب لہجے میں جوڑے سے معذرت کی۔ ”میں بہت زیادہ مجبور ہوں ورنہ کبھی یہ حرکت نہ کرتا اور آپ کی حفاظت کے خیال سے آپ کو یہاں اتار دیا کیونکہ ہمارے ساتھ جانے کی صورت میں آپ کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ گاڑی بھی جلد یا بدیر آپ کو واپس مل جائے گی۔ یہاں جلد آپ کو مدد مل جائے گی۔ ایک بار پھر معذرت۔“

وہ کہتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر آ گیا اور یاسر نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ بھی ویکن کی طرح تیس سال پرانا ماڈل تھا مگر نہایت مضبوط اور طاقتور انجن کا حامل تھا۔ سینیٹس بہت بڑی اور نہایت آرام دہ تھیں۔ گاڑی کے اندر اور باہر سے لگ رہا تھا کہ اسے بہت سنبھال کر رکھا گیا ہے۔ اس بار یاسر نے ڈاکٹر کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ اس نے جیسا کہا، یاسر نے ویسا ہی کیا۔ ورنہ اسے اس بوڑھے جوڑے کے ساتھ ڈاکٹر کا یہ سلوک پسند نہیں آیا تھا۔ خود ڈاکٹر کو بھی اچھا نہیں لگا تھا اور اس نے جوڑے سے معذرت کی تھی۔ اس نے یاسر کے تاثرات بھانپ لیے۔ ”تمہیں اچھا نہیں لگا ہے نا۔۔۔ مجھے بھی نہیں لگا۔ مگر یہ تمہاری حماقت تھی جس نے مجھے اس حرکت پر مجبور کیا۔ مجھے ہر صورت اپنی ویکن واپس چاہیے۔“

کچھ آگے نکلنے کے بعد یاسر نے لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ ”اسے کیسے تلاش کریں گے؟“ ڈاکٹر نے اپنا موبائل نکالا اور یاسر سے کہا۔ ”اپنا سیل نمبر بتاؤ۔“

یاسر نے نمبر بتایا تو اس نے ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل جانے لگی۔ لڑکی نے چند لمحے بعد کال ریسیو کی۔ ڈاکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں بات کر رہا ہوں۔“ ”کہو۔“ لڑکی نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”کیوں کال کی ہے؟“

”تم میری ویکن لے گئی ہو۔ وہ تمہارے لیے غیر ضروری ہے لیکن میرے لیے بہت ضروری ہے۔“ ڈاکٹر اسی لہجے میں بولا۔ ”کیوں نہ ہم ایک ڈیل کر لیں؟“ ”کیسی ڈیل؟“

”تم مجھے ویکن واپس کر دو اور بدلے میں جو تم چاہتی ہو، وہ تمہیں مل جائے گا۔“

جب ڈاکٹر نے اچانک پوچھا۔ ”تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟“ وہ اچھل پڑا۔ ”میں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔“ ”تب تم نے مجھے خبردار کیوں نہیں کیا؟“ ”میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کوئی اور ملے ہو۔“ ”وہ تمہاری حماقت سے نکل گئی اب اسے تلاش کرنا ہوگا۔“

یاسر بے چین ہو گیا۔ ”وہ کیوں؟“ ”اس کے پاس میری ویکن ہے اور اس میں کچھ خاص سامان ہے جو کسی اور کے علم میں نہیں آنا چاہیے۔“ یاسر لڑکی کے بارے میں سوچتے ہوئے محتاط ہو گیا کہ اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو لڑکی سے اس کے تعلق کو واضح کر دے۔ اس لیے اب وہ جان بوجھ کر اس کے بارے میں سوچنے سے گریز کر رہا تھا مگر اس کا لاشعور کڑیاں ملتا رہا تھا۔ اس کے باپ کو کسی لڑکی کی تلاش بھی جو اس کے ساتھیوں کو مار رہی تھی اور یہ لڑکی اسے از خود یونیورسٹی کے باہر ملی اور اس سے لفٹ لی۔ اگر اس نے اس کے باپ کے آدمیوں کو مارا تھا تو وہ اس کے بارے میں بھی جان سکتی تھی۔ کیا وہ اسے بھی مارتا چاہتی تھی؟ مگر اس نے صرف لفٹ لی اور وہ بھی مشکل سے دس منٹ کے لیے۔ اس نے کوئی ایسا تاثر نہیں دیا جس سے اسے لگتا کہ وہ اسے جانتی ہے۔

وہ دونوں ہائی وے تک آ گئے تھے اور اسے کراس کر کے دوسری لین میں آئے جہاں گاڑیاں دارالحکومت کی طرف جا رہی تھیں۔ یاسر نے پوچھا نہیں کہ ڈاکٹر کو کیسے علم ہوا کہ وہ دارالحکومت کی طرف ہی گئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ اس کے مخالف سمت گئی ہو۔ ایک پرانے ماڈل کی شیورلیٹ کار ان کے سامنے رکی تو یاسر چونکا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سوچوں میں گم ہو گیا تھا اس لیے ڈاکٹر کو لفٹ کے لیے اشارہ کرتے نہ دیکھ سکا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر شریفانہ سے تاثرات تھے اور بیگ یاسر نے شانے پر لیا ہوا تھا۔ لڑکی والا بیگ بھی انہوں نے اسی میں ڈال لیا تھا۔ یہ ظاہر وہ لفٹ کے سخت لگ رہے تھے اور یہی سوچ کر ڈرائیور نے گاڑی روکی تھی۔ گاڑی میں ایک معمر جوڑا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر ایک معمر عورت تھی اور تقریباً اس کے مساوی عمر والا مرد ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”لفٹ چاہیے؟“

”نہیں گاڑی چاہیے۔“ ڈاکٹر نے کہا اور پستول نکال لیا۔ یاسر کا منہ کھلا رہ گیا۔ ایک منٹ بعد دونوں میاں بیوی



شکراؤ

دیا اور اسے رقم مل گئی۔ اسلحہ وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس کے ملک میں یہ بے وقعت تھا مگر یہاں اس کی بہت اچھی قیمت مل گئی۔ ہائر کیے دو افراد نے بہترین کام کیا اور انہوں نے ماجد کے لیے کام کرنے والے اہم ترین افراد کا پتا چلا لیا۔ یہ چار افراد تھے جو اصل میں ماجد کا دست و بازو تھے۔ وہ اپنے گھر کے قلعے میں بیٹھ کر انہیں استعمال کرتا تھا۔ صوفیہ نے ایک ایک کر کے ان چاروں کو پکڑا مگر وہ ان سے کوئی خاص بات معلوم نہ کر سکی۔ صرف ایک آدمی نے کہا کہ شاید یہ لڑکی آئی تھی مگر وہ آگے کھپ میں نہیں گئی۔ صوفیہ نے ان چاروں کو قتل کر دیا۔ وہ اس سے بھی زیادہ سخت سزا کے مستحق تھے۔ انہوں نے سیکڑوں لڑکیوں کو فروخت کیا تھا۔ صوفیہ کو انہیں مارتے ہوئے ذرا رحم نہیں آیا۔

مگر اس دوران میں اس کے آدمیوں سے کوئی غلطی ہوئی اور ماجد کے آدمی اس تک پہنچ گئے۔ اس کی قسمت نے ساتھ دیا اور وہ بچ نکلنے میں کامیاب رہی۔ اگر اسے یہ لڑکا نہ ملتا تو۔۔۔ شاید وہ ماجد کے بھیجے آدمیوں کے ہتھے چڑھ جاتی۔ وہ بچ اس لڑکے کی شکر گزار تھی اور اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے پھر ملے گا۔ جب وہ ماجد کے آدمیوں سے نمٹ رہی تھی تو شاید اپنا کوئی نشان چھوڑ آئی تھی اور اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ اس تک آئے اور اسے اس گیسٹ ہاؤس میں پالیا جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی مگر خوش قسمتی سے وہ ان کی آمد سے باخبر ہو گئی اور گیسٹ ہاؤس کی عقبی دیوار سے کود کر فرار ہو گئی۔ وہ گلی سے نکلی تو سامنے ہی یونیورسٹی کا مین گیٹ تھا اور وہ لڑکا وہیں سے لکھتا تھا۔ اس نے بے تکلفی سے لفٹ مانگ لی اور لڑکے نے بھی انکار نہیں کیا تھا۔

اب شہر میں رہنا اسے خطرناک لگ رہا تھا۔ اس نے ہائی وے کے ساتھ آبادی میں رہنے والے شخص کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ صوفیہ کا ہم وطن تھا مگر اس نے یہاں کی شہریت حاصل کر لی تھی اور اب یہیں رچ بس گیا تھا۔ اس کے لہجے سے بھی کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ اس کا تعلق پڑوسی ملک سے ہے مگر جب وہ اس کے بچلے پر پہنچی تو وہاں اس کی لاش پڑی تھی۔ اسے کسی نے بڑی اذیت دے کر قتل کیا تھا، اس کا پورا جسم تیز دھار آلے سے گدا ہوا تھا اور اس نے یقیناً بہت مشکل سے جان دی تھی۔ صوفیہ کو اس کی موت کا صدمہ ہوا تھا۔ اس کے پاس یہاں گاڑی نہیں تھی۔ رات اس نے اسی بچلے میں گزار دی اور صبح سے پہلے وہ روانہ ہوئی۔ ایک بس نے اسے اس جگہ اتارا جہاں اس کا دوسرا آدمی جنگل

”تم جانتے ہو، میں کیا چاہتی ہوں؟“

ڈاکٹر خاموش رہا پھر اس نے جواب دیا۔ ”نہیں لیکن میں تمہاری مدد ضرور کر سکتا ہوں۔“

”میں بتاؤں گی۔“ لڑکی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”مجھے رات آٹھ بجے کال کرنا۔“

☆☆☆

صوفیہ نے یہ کہہ کر کال کاٹ دی اور موبائل آف کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ جدید اسمارٹ فون کی لوکیشن کا پتا چلا یا جاسکتا ہے۔ وہ اس وقت دارالحکومت میں ایک نمائش گاہ کی پارکنگ میں موجود تھی۔ فی الحال وہاں کسی قسم کی نمائش نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے نمائش گاہ بند تھی اور پارکنگ خالی تھی۔ اگر وہاں کوئی نگرانی کرنے والا ہوتا تھا تو وہ بھی چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ ایک جان لیوا موقع سے بچ نکلنے کے بعد وہ یہاں آئی اور یہاں کی تنہائی کو انجوائے کر رہی تھی۔ سرحد پار کرنا اس کے لیے آسان ثابت ہوا۔ اس کے پاس حیات خان کے نام کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات تھے مگر اسے ان کو دکھانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ وہ سرحد پار کرنے کے لیے چور دروازوں سے واقف تھی۔

یہاں آنے کے بعد دو دن تک وہ بھٹکتی رہی۔ اس دوران میں اس نے کئی افراد سے رابطہ کیا مگر صحیح شخص تک رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ تیسرے دن وہ صوبائی دارالحکومت پہنچی اور اسے درست آدمی مل گیا۔ اسی نے رہنمائی کی۔ یہ شخص اسی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا جس سے لین دین کے تنازعے پر ابصار اور ماجد کا جھگڑا ہوا تھا اور اس نے بڑی خوشی سے صوفیہ کی رہنمائی کی کیونکہ اس لڑائی کے بعد اس کے گروہ کے اکثر بڑے ایک ایک کر کے مارے گئے اور یہ گروہ تتر بتر ہو گیا تھا۔ وہ صوفیہ کو حیات خان ہی سمجھ رہا تھا۔ اس سے بات کرنے کے باوجود صوفیہ کو پوری طرح یقین نہیں تھا کہ یہی گروہ اس کی بہن کے اغوا میں ملوث ہے مگر مذکورہ شخص نے اسے یقین دلایا تھا کہ مڈل ایسٹ کا سارا بزنس اسی کے پاس تھا۔ اس نے ماہ نور کی تصویر دیکھ کر یقین سے کہا۔

”یہ لڑکی اس قابل ہے کہ کسی شیخ کے حرم میں جائے۔“

اس کے بدلے پانچ لاکھ ڈالر ملنا معمولی بات ہوگی۔“

ماجد کیونکہ وفاقی دارالحکومت میں تھا اس لیے وہ یہاں آئی اور یہاں اس نے کچھ افراد کو ہائر کیا۔ اس کے پاس پیسہ زیادہ نہیں تھا مگر اس نے رقم کا بندوبست کر لیا۔ اس کے پاس کچھ اسلحہ تھا جو اس نے اچھے داموں فروخت کر



میں رہتا تھا مگر جب وہ وہاں پہنچی تو دوسرا آدمی بھی مر چکا تھا۔

اس کی چھٹی حس نے اشارہ دے دیا تھا اس لیے اسے اس حوالے سے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ ہاں وہ اس لڑکے کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی جو اسے یونیورسٹی کے باہر ملا تھا اور اس نے صوفیہ کولفٹ دی تھی۔ حیرت کی وجہ سے اس نے وہ وقت گنوا دیا جب وہ وہاں سے فرار ہو سکتی تھی۔ لڑکا اسے اشارہ کر رہا تھا اور وہ نہیں سمجھ سکی۔ اس نے دوسرے آدمی کو دیکھا تو اسے خطرے کا احساس ہوا۔ مگر اس سے پہلے وہ پلٹتی دوسرے آدمی نے اسے دیکھ لیا۔ وہ پشت پر ہاتھ کر کے آگے آیا۔ صوفیہ جانتی تھی کہ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوگا۔ اس نے وقت گزاری کے لیے صوفیہ کی یہاں آمد کو اس کی غلطی قرار دیا اور اسے جانے کا مشورہ دیا۔ مگر جیسے ہی صوفیہ حرکت میں آئی، اس نے پستول والا ہاتھ آگے کر دیا۔ صوفیہ جانتی تھی، اسے دوسرا قدم اٹھانا نصیب نہیں ہو گا اس لیے وہ پھر ساکت ہو گئی۔

صوفیہ نے قبائلی کی لاش نہیں دیکھی تھی مگر وہ جان گئی تھی کہ کلباڑی کس جگہ دھنسی ہوئی ہے۔ ان لوگوں کے یہاں ہوتے ہوئے اس کے زندہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بوڑھا بہت خطرناک تھا اور وہ اسے ہرگز نہ بخشتا مگر یہ لڑکے کی مہربانی تھی جو وہ وہاں سے بچ نکلی اور فرار کے لیے دیکھیں بھی اس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ البتہ اس کا پستول اور جمع پونجی بیگ کی صورت میں وہیں رہ گئی تھی اور اب اس کے پاس بہت معمولی سی رقم تھی۔ ہائی وے پر ایک جگہ دیکھیں روک کر اس نے اس کا عقبی حصہ کھولا۔۔۔ دیکھیں کی چابیوں میں اس کی چابیاں نہیں تھیں۔ پھر دونوں تالے اس کی توقع سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ثابت ہوئے تھے اور انہیں کھولنے میں اس کا نصف گھنٹا لگا تھا مگر اس کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی۔ وہ عقب میں موجود سامان دیکھ کر حیران رہ گئی، یہ کسی اعلیٰ درجے کے پیشہ ور قاتل کا سامان تھا۔

اس میں ہر طرح کا اسلحہ اور دوسرا سامان تھا جس کی کسی مہم میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس میں میک اپ اور گیٹ اپ کا سامان مع کپڑوں کے تھا مگر سب سے زیادہ خوشی اسے رقم کی ہوئی تھی۔ یہ شاید ایک لاکھ روپے تھے مگر اس کی ضرورت کے لحاظ سے کافی تھے۔ اس نے اسلحہ اور دوسرا سامان نہیں چھیڑا تھا۔ دونوں لاک لگا دیے۔ کیونکہ وہ ان کا میکرم سمجھ گئی تھی اس لیے اب ضرورت پڑنے پر وہ

انہیں جلد کھول سکتی تھی۔ اس نرم صورت نظر آنے والے بوڑھے کے بارے میں اس کا تاثر درست تھا۔ وہ بہت خطرناک آدمی تھا۔ صرف خطرناک ہی نہیں وہ یقیناً پیشہ ور قاتل تھا۔ یہ سامان دیکھ کر صوفیہ اپنی قسمت پر رشک کر رہی تھی کہ اس کی جان بچ گئی مگر وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ اس وقت وہ اس سے بے خبر تھی مگر اب وہ اسے جان گئی تھی اور اس سے نمٹ سکتی تھی۔

عقبی خانہ بند کر کے اس نے اگلے حصے کی تلاشی لی۔ وہاں اسے موبائل ملا۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں اسی لڑکے کی اور ایک عورت کی تصاویر تھیں۔ دونوں کی صورتیں آپس میں مل رہی تھیں اور صوفیہ کو خیال آیا کہ یہ عورت اس کی ماں ہے۔ اس نے ایک ایک کر کے ساری تصویریں دیکھیں۔ صرف ایک تصویر میں اسے ایک سرخ بالوں والے آدمی کے سر کی پشت دکھائی دی وہ اسی میز پر تھا جس پر عورت بیٹھی تھی۔ موبائل میں چند ایک ہی نمبر تھے۔ سوائے ایک نمبر کے باقی تمام نمبر یونی کے سائن کے ساتھ شروع ہو رہے تھے یعنی متعلقہ فرد یونیورسٹی میں ہوتا تھا۔ صوفیہ نے موبائل پاس رکھا، اسے معلوم تھا کہ عینک والا قاتل کال کرے گا۔ دیکھیں میں اس کی جو چیزیں تھیں، ان کے لیے وہ لازمی اس سے رابطہ کرتا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے کال کی تو وہ اس سے کیا بات کر سکتی تھی؟ کیا وہ اسے ماہ نور کے بارے میں معلومات دے سکتا تھا۔ اگر وہ ماجد کا آدمی تھا تو اسے ماہ نور کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے تھا مگر صوفیہ کو شبہ تھا کہ وہ ہائر کیا ہوا ہے۔ اس صورت میں ماہ نور کے بارے میں اسے مشکل سے ہی کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔

عینک والے کے بارے میں اسے یقین تھا مگر لڑکے کے حوالے سے وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تو وہ اسے سلجھا ہوا اور مثبت سوچ کا حامل لگا تھا مگر وہ اس قاتل کے ساتھ تھا۔ اگرچہ اس نے صوفیہ کو بچانے کی کوشش کی تھی اور پھر اسی کی وجہ سے وہ بچ کر بھاگی تھی اس کے باوجود یہاں اس لڑکے کی موجودگی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ہائی وے پر اس نے خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا۔ دیکھیں کے طاقتور انجن نے اس کا پورا ساتھ دیا تھا۔ مگر دارالحکومت میں داخل ہوتے ہی اسے محتاط ڈرائیونگ کرنی پڑی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس خطرناک دیکھنے کے ساتھ اسے کوئی روکے اور وہ اسی لیے یہاں ویران پارکنگ میں چلی آئی تھی۔ وہ کچھ دیر سکون سے آگے کا لائحہ عمل سوچنا چاہتی تھی اور یہ جگہ اس کے لیے بہت موزوں تھی۔



دیکھ لیا۔ اب اسے عینک والے قاتل کی کال کا انتظار تھا۔  
آنکھ بجتے ہی اس کی کال آئی۔ صوفیہ نے ریسیو کی۔ عینک  
والے نے بلا تہید پوچھا۔ ”کیا سوچا؟“  
”میں راضی ہوں۔“ وہ بولی۔  
”ملاقات کہاں ہوگی؟“

صوفیہ نے نمائش گاہ کا بتایا اور بولی۔ ”تم نے یہ جگہ  
دیکھی ہے؟“

”ہاں دیکھی ہے۔“ ڈاکٹر نے اقرار کیا۔ ”میری  
دیکھ کہاں ہے؟“

”میں اور دین دونوں یہاں ہیں آجاؤ۔“

صوفیہ نے کہا اور کال کاٹ دی۔ البتہ موبائل آن  
رہے دیا تھا۔ وہ دیکھن سے اتری، اس نے چابیاں اسی  
میں چھوڑ دی تھیں۔ اس نے ان تمام جگہوں سے اپنی  
انگلیوں کے نشانات صاف کیے جہاں جہاں اس کے ہاتھ  
لگے تھے۔ پھر وہ نمائش گاہ کے بعد چھوٹے سے جنگل سے  
ہوتی ہوئی اوپر تفریح گاہ کی طرف جانے لگی۔ اگرچہ یہاں  
راستہ نہیں تھا مگر وہ کسی نہ کسی طرح اوپر پہنچ گئی اور پتھر کی  
چوڑی دیوار پر بیٹھ کر اس نے دور بین آنکھوں سے لگا کر  
ایڈ جسٹ کی کوئی نصف کلومیٹر نیچے نمائش گاہ کا منظر صاف  
نظر آنے لگا تھا۔ اب اسے انتظار تھا جو زیادہ دیر نہیں کرنا  
پڑا۔ رات کے نوے اوپر کا وقت تھا جب سڑک سے ایک  
بڑی کار نمائش گاہ کی طرف مڑی۔ اس نے دور بین لگا کر  
دیکھی۔ کار کی اگلی نشستوں پر لڑکا اور عینک والا قاتل موجود  
تھے۔

☆☆☆

شیور لیٹ، دیکھن کے پاس آکر رکی اور ڈاکٹر نے اتر  
کر چاروں طرف دیکھا اور پھر پستول نکالتا ہوا دیکھن کی  
طرف بڑھا۔ اس نے بہت محتاط انداز میں اچانک دروازہ  
کھولا اور پھر کسی کو نہ پا کر وہ پرسکون ہو گیا۔ وہ آخری وقت  
تک احتیاط کرنے والا شخص تھا۔ اس نے کار سے اترتے  
ہوئے یا سر کی طرف دیکھا۔ ”وہ یہاں نہیں ہے۔“  
”میرا موبائل کہاں ہے؟“ پاسر نے پوچھا تو ڈاکٹر  
نے کلوزٹ میں دیکھا مگر وہاں موبائل نہیں تھا۔  
”اسی کے پاس ہے۔“ ڈاکٹر نے کہتے ہوئے اسے  
کال کی۔

آنکھوں سے دور بین لگائے صوفیہ نے بلوٹو تھ فونڈ  
فری کا بٹن دبا کر کال ریسیو کی۔ ”یس۔“  
”تم کہاں ہو؟“

کچھ دیر بعد بھوک لگنے لگی۔ دیکھن میں موجود شاہر  
میں کھانے کی اشیاء باسی ہو چکی تھیں اور ان سے بدبو اٹھ رہی  
تھی۔ اس نے شاہر پر ایک ڈسٹ بن میں ڈالے اور ناشتے  
کے لیے ایک ریستوران کا رخ کیا۔ اس نے دیکھن جان  
بوجھ کر عینک گلی میں کھڑی کی اور پیدل ریستوران میں آئی۔  
ناشتے کے وقت کا اختتام تھا اس لیے اسے چند سینڈویچز اور  
چائے ہی ملی۔ سینڈویچز خاص نہیں تھے مگر چائے بہت اچھی  
تھی۔ اس کا گزارہ ہو گیا تھا۔ ناشتے کے دوران میں وہ ایک  
کونے میں موجود ٹی وی پر خبریں دیکھتی رہی پھر اس کی  
مطلوبہ خبر آگئی۔ نیوز کاسٹر بتا رہی تھی۔ ”پولیس کی تحقیق کے  
مطابق وفاقی دارالحکومت میں دو دن میں ملنے والی چار  
لاشوں کا تعلق ممکنہ طور پر انسانی اسلنگ اور بردہ فروشی سے  
تھا۔ ان کے قتل میں کاروباری حریفوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“  
صوفیہ کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ پولیس  
والوں سے زیادہ انہیں کون جان سکتا تھا۔ ان کا دھندلا پولیس  
اور دوسرے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مدد کے  
بغیر چل ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر باہر رہی اور پھر باہر آ کر  
نزدیکی کمرشل ایریا آئی جہاں اب دکانیں کھل رہی تھیں۔  
اس نے ایک اسپورٹس شاپ کا رخ کیا۔ وہاں اس نے ایک  
چھوٹے سائز کا بیس بال بیٹ لیا۔ یہ بھاری اور ٹھوس لکڑی کا  
بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک طاقتور دور بین اور ایک شکاری  
چاقو لیا۔ اس کا واحد اسلحہ یعنی سائلنسر لگا ہوا پستول اس کے  
بیک میں تھا اور وہ قاتل کے پاس رہ گیا تھا۔ اگرچہ دیکھن  
میں اسلحے کی کمی نہیں تھی۔ مگر وہ اس معاملے میں محتاط رہنا  
چاہتی تھی۔ کسی دوسرے کا کیا دھرا اس کے گلے پڑ سکتا تھا۔  
اسلحے کے معاملے میں وہ اتنی محتاج بھی نہیں تھی، اس کے لیے  
چاقو بھی کافی تھا۔ یہ دیکھن اس کی مجبوری تھی مگر اس کے لیے  
بہت زیادہ رسکی بھی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد  
اس سے چھٹکارا پالے۔

دن میں گزارے کے لیے اس نے ایک بیکری سے  
کچھ ہلکے پھلکے آسٹم اور کولڈ ڈرنک کے ٹن لیے تھے۔ شام  
ہوتے ہی اس نے دوبارہ نمائش گاہ کی پارکنگ کا رخ کیا۔  
یہاں سے کچھ دور بلندی پر ایک تفریح گاہ تھی جہاں ہوٹل،  
ریستورانز اور دوسری شاہیں تھیں۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی  
اور ایک پلان واضح کر لیا۔ اب اسے اس کے مطابق عمل کرنا  
تھا۔ وقت گزاری کے دوران اس نے کچھ شاپنگ اور بھی کی  
تھی۔ اس میں ایک عدد بلوٹو تھ فونڈ فری بھی تھا۔ فونڈ فری  
اس موبائل کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس نے تجربہ بھی کر کے



”میں وہاں نہیں ہوں۔“ صوفیہ نے کہا۔ ”تمہیں  
ویگن مل گئی ہے؟“  
”ہاں۔“

”تو اپنے وعدے کے مطابق میری مدد کرو۔“  
”کیسی مدد؟“

”مجھے اپنی بہن کی تلاش ہے۔“

”میں تمہاری بہن کو نہیں جانتا۔“

”ویگن کے کلوزٹ میں اس کی تصویر موجود ہے۔“

ڈاکٹر نے ایک بار پھر کلوزٹ دیکھا تو وہاں تصویر تھی  
اس نے نکال کر دیکھی اور بولا۔ ”میں نے اس لڑکی کو کبھی نہیں  
دیکھا۔“

”مجھے بھی یہی امید تھی۔“ صوفیہ نے سر دلچہ میں  
کہا۔ ”امید ہے اب تم میرے پیچھے نہیں آؤ گے۔“

”ضرور۔“ ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ اس نے کال کاٹ  
دی اور ویگن کے عقی حصے میں آکر اس نے ایک بیلچہ اور ایک  
گیمتی نکالی۔ اس نے دونوں چیزیں یا سر کو تھما دیں اور نمائش  
گاہ کے ساتھ جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں جا کر ایک  
گڑھا کھودو۔“

”کس لیے؟“

”ایک لاش دفن کرنی ہے، وہ لڑکی یہاں آنے والی  
ہے۔“

یا سر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ شاید اسے یقین نہیں آیا  
تھا کہ لڑکی یہاں آسکتی تھی۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں اور بیلچہ و  
گیمتی اٹھا کر جنگل کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی ڈاکٹر  
نے موبائل نکال کر ایک نمبر ملا یا۔ دوسری طرف سے ماجد  
نے کال ریسیو کی۔ وہ روینہ کے ساتھ کھانے کی میز پر تھا۔  
”کہو۔“

”پہلا کام نہیں ہوا۔“ ڈاکٹر نے دھیمے لہجے میں کہا۔  
”دونوں آدمیوں نے زبان نہیں کھولی۔“

”دوسرا کام؟“ ماجد نے کہا، روینہ اسے غور سے  
دیکھ رہی تھی۔

”اس کا آغاز کر دیا ہے، بس ایک گھنٹا لگے گا۔“

”اوکے۔“ ماجد نے کہہ کر موبائل رکھ دیا۔ تو روینہ  
بولی۔

”کس کا فون تھا اور یا سر کب آئے گا؟“

”جلد آجائے گا۔“ ماجد نے بے پروائی سے کہا۔

”وہ دودھ پیتا پیچ نہیں ہے جو تم اس کی اتنی فکر کر رہی ہو۔“

☆☆☆

جاسوسی ڈائجسٹ

282 جولائی 2015ء

ڈاکٹر نے ماجد کو لڑکی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔  
اسے معلوم تھا کہ ماجد ناکامی معاف کر سکتا ہے، غلطی نہیں۔  
پھر یہ اس کی ساکھ کا سوال بھی تھا۔ ماجد کو صرف یا سر یہ بات  
بتا سکتا تھا مگر اب اسے یہ فکر بھی نہیں تھی۔ اس نے موبائل  
رکھا پھر بیگ سے لوہے والی چھڑی نکالی اور یا سر کی طرف  
بڑھا۔ وہ تندہی سے گڑھا کھودنے میں مصروف تھا اور اس  
نے اچھا خاصا گڑھا کھود بھی لیا تھا۔ یہاں مکمل ویرانی تھی  
اور جنگل کے اوپر موجود تفریح گاہ سے یہاں دیکھنا ممکن نہیں  
تھا۔ گویا انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ کام کے لیے اس سے  
زیادہ آئیڈیل حالات کم ہی ملتے تھے۔ نزدیک آنے پر  
ڈاکٹر نے چھڑی ہاتھ کے پیچھے کر لی تھی۔ یا سر نے ہانپتے  
ہوئے کہا۔ ”اتنا ٹھیک ہے۔“

ڈاکٹر نے اندر جھانکا اور بولا۔ ”ہاں ٹھیک ہے مگر یہ  
اس کی تہ میں کیا ہے؟“

یا سر نے اندر جھانکا تھا کہ ڈاکٹر کا ہاتھ حرکت میں آیا  
اور اس کے سر پر چھڑی کا مٹھ لگا۔ یا سر منہ کے بل گڑھے  
میں گرا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ وار کے لیے ہاتھ بلند کیا مگر اس کا  
ہاتھ نیچے نہیں آیا۔ یہ ختم کرنے والا وار تھا مگر اس کا دل نہیں  
مان رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے چھڑی ایک طرف ڈال دی  
اور یا سر کو گڑھے سے کھینچ کر ایک طرف کیا اور گیمتی اٹھا کر  
گڑھا مزید گہرا کرنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چند دن بعد  
بدبو آئے اور لاش دریافت ہو جائے۔ وہ اسے خاصی گہرائی  
میں دفن کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا اور یقینی وار کرنے کے بجائے  
اس نے مناسب سمجھا کہ یا سر کی موت کو دم گھٹنے سے ہونے  
دیا جائے۔ گڑھا مناسب حد تک گہرا کر کے اس نے چند  
لمحے رک کر سانس لیا اور پھر یا سر کے کپڑے اتارنے لگا۔  
ذرا دیر میں وہ صرف انڈر ویئر میں رہ گیا۔ ڈاکٹر نے ایک  
بار پھر رک کر اپنی سانس درست کی تھی اور گڑھے میں جھانکا  
تھا کہ عقب سے آواز آئی۔

”تم دونوں کے لیے ٹھیک ہے۔“

اس نے چونک کر دیکھا تو اسے بیس بال کا بلا اپنے سر  
کے پاس دکھائی دیا اور اگلے ہی لمحے وہ بہت قوت سے اس  
کی کپڑی سے ٹکرایا۔ وہ کراہ کر نیچے گرا اور دوسری ضرب نے  
اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ اسے لڑکی کی بس ایک جھلک نظر آئی  
تھی۔ اسے بالکل پتا نہیں چلا کہ وہ کب وہاں آئی۔ وہ سمجھ رہا  
تھا کہ وہ یہاں سے جا چکی ہے مگر وہ اس کی توقع سے زیادہ  
چالاک اور دلیر ثابت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کو بے ہوش کر کے  
صوفیہ نے بلا نیچے پھینکا اور اطمینان سے جھک کر اس کے



ہے۔۔۔۔۔ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟“ لڑکی آگے آئی اور اس کا گلا دبوچ لیا۔ اس کی گرفت خاصی سخت تھی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ”اونچی آواز مت نکالنا ورنہ پھر آواز نکالنے کے قابل نہیں رہو گے۔“

”او کے میں غلطی سے بول گیا۔“ اس نے جلدی سے آواز نیچی کر لی۔ ”اب بتاؤ، تم نے یہ سب کیوں کیا ہے؟“ صوفیہ نے ماہ نور کی تصویر نکالی اور یوں اس کے سامنے کی کہ اسے صاف دکھائی دے۔ ”اسے دیکھا ہے؟“ جب صوفیہ نے ڈاکٹر کو تصویر کے بارے میں بتایا اور اس نے ویگن سے نکالی تو اس نے یاسر کو نہیں دکھائی تھی۔ یاسر نے پہلی بار دیکھی اور چونک گیا کیونکہ یہ وہی لڑکی تھی جس کی ویڈیو اس نے ماجد کے کمپیوٹر میں دیکھی تھی اور ماجد اس پر تشدد کر رہا تھا۔ مگر وہ یہ بات اس خطرناک لڑکی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے نہیں دیکھا۔“

”تم چونکے تھے؟“

”ہاں کیونکہ اس کی صورت تم سے مل رہی ہے۔“

یاسر نے صفائی سے بات بتائی۔ ”کیا یہ تمہاری بہن ہے؟“

”ہاں۔“ وہ بولی۔

”تم نے مجھ سے لفٹ کیوں لی تھی، کیا تم میرا پیچھا کر رہی تھیں؟“

”وہ اتفاق تھا مگر یہاں تمہاری اور میری موجودگی اتفاق نہیں ہے۔“ صوفیہ نے اس کے چہرے پر نظر جما کر کہا۔ ”تم ایک ایسے شخص کے ساتھ ہو جو میرے ساتھیوں کو قتل کر چکا ہے اور میرے ساتھی ان لوگوں کے پیچھے تھے جنہوں نے میری بہن کو اغوا کر کے غائب کیا ہے۔“

”تمہاری بہن کو کیوں اغوا کیا ہے، کیا تم لوگوں سے کوئی دشمنی ہے؟“

”نہیں، یہ لوگ پیشہ ور بردہ فروش اور انسانی اسمگلر ہیں۔ ماجد نامی شخص ان کا سرغنہ ہے۔“

اس بار یاسر نے بڑی مشکل سے خود کو چونکنے سے روکا۔ ماجد کے بارے میں اسے پہلے ہی شک تھا اور اب یقین ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہاری بہن کو کہاں سے اغوا کیا گیا ہے؟“

”ہمارے گاؤں سے۔“ صوفیہ نے کہا مگر یہ وضاحت نہیں کی کہ اس کا گاؤں اس ملک میں نہیں بلکہ پڑوسی ملک میں تھا۔ اس نے یاسر کا موبائل نکالا۔ ”یہ تمہارا موبائل ہے؟“

”ہاں میرا ہے۔“

لباس کی تلاشی لی۔ اس کا پستول اور چابیوں کا کچھا نکال لیا اور پھر وہ ویگن کی طرف آئی۔ اس نے بے ہوش یاسر کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ یا ڈاکٹر دونوں ہی جلد ہوش میں آنے والے نہیں تھے۔

☆☆☆

یاسر کی آنکھ کھلی تو اسے لگا جیسے اس کے سر میں کنکریٹ کسر گھوم رہا ہو۔ ایسا شور اور دباؤ تھا جو بیان سے باہر تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ وقت گزرا تو کنکریٹ کسر رک گیا۔ شور ختم ہو گیا اور درد میں بھی کمی آئی۔ اس کے شانوں میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھ کھولی اور چونک گیا۔ اس کے جسم پر صرف انڈر ویئر تھا اور جسم مٹی میں لت پت تھا۔ اسے ابکائی سی آ رہی تھی مگر یہ بہت شدید نہیں تھی۔ وہ گہری سانس لے کر خود پر قابو پانے لگا۔ وہ اس جگہ نہیں تھا جہاں بے ہوش ہوا تھا۔ آخری لمحے تک اسے گمان نہیں تھا کہ ڈاکٹر اس کے ساتھ ایسی کوئی حرکت کرے گا۔ آخر اس نے اسے کیوں بے ہوش کیا تھا؟ پھر اسے ماجد کا خیال آیا اور اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ کیا ماجد نے ڈاکٹر کو اسے ٹھکانے لگانے کا حکم دیا تھا؟ مگر اس نے اسے ٹھکانے کیوں نہیں لگایا۔ وہ تو اپنے لیے گڑھا بھی کھود چکا تھا۔ اس میں یقیناً اس کی لاش دفنائی جاتی تھی۔

وہ اسی جنگل میں تھا اور ایک بڑے تنے والے درخت سے پشت ٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر کر کے درخت کی شاخ سے باندھے گئے تھے اور وہ عجیب پوزیشن میں تھا جس میں نہ وہ بیٹھا ہوا تھا اور نہ ہی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مگر بہت سخت تھیں۔ اس کے اندر خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر اس کے ساتھ کیا کر رہا تھا۔ اس نے آواز دی۔ ”ڈاکٹر تم کہاں ہو؟۔۔۔ یہ کیا حرکت ہے؟ مجھے کھولو۔“

”یہ کام ڈاکٹر نے نہیں کیا ہے۔“ ڈاکٹر کے بجائے صوفیہ کی آواز آئی اور پھر وہ اس کے سامنے آگئی۔ دور نما کش گاہ کی پارکنگ میں چلنے والے بلب کی روشنی یہاں تک آ رہی تھی۔ یاسر اسے دیکھ کر جلدی سے خود میں سمٹ گیا اس حالت میں ایک لڑکی کے سامنے اسے عجیب سا لگ رہا تھا مگر صوفیہ بالکل نارمل تھی۔ یاسر نے بوکھلا کر پوچھا۔

”پھر کس نے باندھا ہے مجھے؟“

”میں نے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”مگر کیوں؟“ یاسر چلا اٹھا۔ ”ڈاکٹر کہاں



”اس میں یہ کس عورت کی تصویر ہے؟“

”میری ماما کی۔“

صوفیہ تصویریں آگے کرنے لگی۔ ”مگر پورے موبائل میں نہ تو تمہارے باپ کی تصویر ہے اور نہ ہی کسی اور شخص کی؟“

”میرا باپ مر چکا ہے۔“ یاسر نے سچ کہا۔

”لیکن ایک تصویر میں یہ لمبے بالوں والا شخص ڈانٹنگ میبل پر موجود ہے، اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا، یہ کون ہے؟“

یاسر نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ”یہ ہمارا رشتے دار ہے۔“

وہ ذرا پیچھے ہٹی اور بولی۔ ”تم اچھے لڑکے ہو لیکن اس وقت تم سچ نہیں بول رہے ہو۔“

اس نے یقین دلایا۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں، میرا یقین کرو۔“

صوفیہ نے پستول نکال لیا۔ یہ اس کا اپنا پستول تھا جو بیگ میں تھا اور بیگ اسے شیور لیٹ کار میں موجود ایک بینڈ کیری سے ملا تھا۔ ”تم نے دوبار جھوٹ بولا ہے۔“

یاسر دہشت زدہ ہو گیا۔ ”خدا کے لیے میں نے غلط نہیں کہا ہے۔“

”اس شخص کو مارو گولی مجھے صرف میری بہن کے باسے میں بتادو۔ میں وعدہ کرتی ہوں تمہیں چھوڑ دوں گی۔“

یاسر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بلاوجہ ماجد کا جرم چھپاتے ہوئے اپنی جان خطرے میں ڈال رہا تھا، اسے کیا ضرورت تھی ایسا کرنے کی۔ اسے لڑکی کو بتادینا چاہیے تھا کہ اس نے اس کی بہن کو کہاں اور کس حال میں دیکھا تھا مگر اسے ڈر بھی لگ رہا تھا کہ کہیں اپنی بہن کے بارے میں سن کر یہ لڑکی مشتعل نہ ہو جائے۔ دوسری طرف وہ نہ بتاتا تب بھی لڑکی اس کے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے تم پوچھ سکتی ہو، میں ہر سوال کا درست جواب دوں گا۔“

”یہ شخص کون ہے؟“

یاسر چونکا۔ ”کون ڈاکٹر.... میں اسے نہیں جانتا.... میں کل سے اس کے ساتھ ہوں مگر میں نے کچھ نہیں کیا۔“

”کل سے اس نے کیا کیا ہے؟“

”کل یہ مجھے کے ایف سی کے باہر ملا۔ میری بائیک وہیں رہ گئی اور اس نے مجھے اپنے ساتھ دیکھن میں بٹھالیا اور

پھر ہم ہائی وے سے ہوتے ہوئے ایک چھوٹی آبادی تک پہنچے وہاں اس نے مجھے دیکھن میں چھوڑا اور خود ایک چھوٹے پتھلے میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو....“

”تو کیا....؟“

”اس کے ہاتھ پر خون لگا ہوا تھا۔ پھر یہ آگے اس جنگل تک گیا۔ اس وقت رات ہو گئی تھی، ہم جنگل میں رکے اور یقین کر دیمیرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس جگہ کوئی مکان بھی ہوگا۔ ہم تو پکنک منارہے تھے۔ پاس سے گزرنے والی ندی میں نہائے بھی تھے پھر صبح ڈاکٹر....“

”اس کا نام کیا ہے؟“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، بس اس نے اتنا بتایا کہ وہ اپنے کام میں بہت ماہر ہے اس لیے ڈاکٹر کہلاتا ہے۔“

”اوکے، آگے بڑھو۔“

”اس نے مجھ سے کہا کہ میں دیکھن پر نظر رکھوں اور خود بلٹ پروف جیکٹ پہن کر مکان کی طرف چلا گیا۔ فائر ہوا تو میں اس کی طرف بھاگا مگر وہ بچ گیا تھا اور اس نے قبائلی کو بے ہوش کر دیا اور اسے ہتھکڑی سے درخت سے جکڑ دیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں کلباڑی سے اس کا ہاتھ کاٹ دوں۔ میں نے انکار کیا تو اس نے یہ کام خود کیا اور پھر اس نے قبائلی کو بھی مار دیا۔ اسی وقت تم وہاں آ گئیں لیکن تم وہاں کیا کرنے آئی تھیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے تم اس قبائلی کے پاس آئی تھیں۔“

”وہ میرے لیے ہی کام کرتا تھا۔“ صوفیہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب مجھے اس کا حساب بھی لینا ہے۔ تم نے اصل بات نہیں بتائی کہ تم اس کے ساتھ کیوں ہو؟“

یاسر ہچکچایا۔ ”مجھے میرے سوتیلے باپ نے بھیجا تھا۔“

”سوتیلا باپ اس کا کیا تعلق ہے اس معاملے سے؟“

اس بار یاسر نے زیادہ مشکل سے جواب دیا۔ ”ماجد میرا سوتیلا باپ ہے۔“

صوفیہ نے یک دم پیچھے ہو کر اس پر پستول تان لیا اور یاسر کا دل ایک لمحے کو رکا اسے لگا، وہ ابھی اسے شوٹ کر دے گی۔ اس کے تاثرات بھی خطرناک ہو رہے تھے۔ یاسر نے سر نیچے کر لیا مگر اس نے گولی نہیں چلائی اور پھر ہاتھ نیچے کر لیا۔ ”تو تم اس لیے جھوٹ بول رہے تھے۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے تمہارے باپ کے آدمیوں سے بچنے کے لیے میں نے تم سے لفٹ لی تھی۔“



## سرداری

ایک سردار جی ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ وہ گارڈ کے پاس آئے (وہ بھی سکھ تھا) اور کہا۔ ”سرداری جی میں سونے لگا ہوں جب امر تر آئے تو مجھے جگا کر اتار دینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ جب میں نیند سے جاگوں تو مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ ہو سکتا ہے میں آپ کو گالیاں دوں کہ مجھے نہیں اترتا آپ زبردستی مجھ کو اتار دیں۔“

سردار نے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ میں اتار دوں گا۔“

گارڈ کی بات سن کر سردار جی جا کر سو گئے۔ جب آنکھ کھلی تو وہ لاہور پہنچے ہوئے تھے۔ سردار جی نے غصے میں گارڈ کو گالیاں دینی شروع کر دیں کہ مجھے امر تر اسٹیشن پر کیوں نہیں اتارا۔

لوگوں نے گارڈ سے کہا۔ ”سرداری جی وہ آپ کو گالیاں دے رہا ہے۔“

سرداری جی ایک ادائے بے نیازی سے بولے۔ ”اس نے کیا گالیاں دینی ہیں۔ اصل گالیاں تو اس نے دینی ہیں جس کو میں نے امر تر زبردستی اتارا تھا۔“

اتار دینی چاہیے تھی۔“

”ہم سب غلطی کرتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”اگر غلطی نہ کریں تو خدائی کا دعویٰ نہ کرنے لگ جائیں۔“

”وہ تو لوگ پھر بھی کرتے ہیں۔“ صوفیہ بولی اور اس نے لپک کر ڈاکٹر پر سوپ لگ کر آزمائی۔ وہ نیچے گرا تھا اور اس سے پہلے وہ اٹھتا، صوفیہ اس سے ستم گتھا ہو گئی۔ اس کی کوشش تھی کہ اس سے بلا چھین لے اور ڈاکٹر اسے دور پھینکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یاسر ان کی لڑائی دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر پستول پر گئی۔ اس نے آگے آنے کی کوشش کی مگر دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے، وہ باؤں سے بھی پستول اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا تھا۔ اس نے کوشش کر کے دیکھا تو اسے بائیں ہاتھ کی رسی کسی قدر ڈھیلی لگی اور وہ اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے بہت زور لگانا پڑ رہا تھا اور وہ مسلسل

ہاتھ گھما رہا تھا کہ رسی ڈھیلی ہو جائے۔ اس دوران میں صوفیہ اور ڈاکٹر وحشیوں کی طرح لڑ رہے تھے کیونکہ یہ زندگی و موت کی لڑائی تھی۔ جو ہارتا، وہ زندگی پا جاتا۔ وہ دونوں یہ بھی بھول گئے تھے کہ وہ کس صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خالص دو انسانوں کی لڑائی تھی۔

”اے میرا باپ مت کہو، مجھے اس سے نفرت ہے۔“

یاسر نے اگلا ج بولنے کے لیے اسے پہلے سے ہموار کرنا شروع کر دیا۔ ”میں اور میری ماں اس کے قیدی ہیں۔“

”مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہو گا۔“ صوفیہ نے کہتے ہوئے دوبارہ پستول تان لیا۔ ”اگر تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”میں قسم کھا کر کہتا ہوں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ خدا کے لیے پستول نیچے کر لو کیونکہ اب میں تمہیں جو سچ بتانے جا رہا ہوں ایسا نہ ہو کہ تم بے اختیار مجھے گولی مار دو۔“

”نہیں ماروں گی، مجھے خود پر اختیار ہے۔“

”پلیز با اختیار انسان بھی بھی بے قابو ہو جاتا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

صوفیہ نے پستول نیچے کر لیا اور بولی۔ ”اب بتاؤ۔“

تب یاسر نے اسے ویڈیو کے بارے میں بتایا جو اس نے ماجد کے کمپیوٹر میں دیکھی تھی۔ اپنی بہن پر ہونے والے ظلم کا سن کر صوفیہ کی حالت عجیب ہو گئی۔ اس کا چہرہ انتہائی حد تک سرخ ہو گیا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ابھی پھٹ پڑے گی۔ یاسر اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہا تھا۔ ”پھر ویڈیو ختم ہو گئی اور ماجد اندر آ رہا تھا اس لیے میں کوئی اور ویڈیو نہیں دیکھ سکا۔ جلدی سے اس کے کمرے سے نکل آیا۔“

صوفیہ کا جسم کانپ رہا تھا اور وہ گہرے سانس لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ اپنے گرد و پیش سے کچھ وقت کے لیے بے خبر ہو گئی تھی۔ رات ہونے پر جنگل سے بھاپ نما دھند اٹھنے لگی تھی، ماحول کسی قدر دھندلا ہو رہا تھا۔ اسی دھند سے یاسر نے ڈاکٹر کو آتے دیکھا اور وہ بے اختیار چلا یا۔ ”بیجو۔“

صوفیہ تیزی سے گھومی تھی مگر ڈاکٹر بیس بال کا بلا تھما چکا تھا۔ صوفیہ نے پھرتی دکھائی اس کے باوجود بلا اس کے بازو پر لگا اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر یاسر کے نزدیک آگرا۔ صوفیہ پستول کی طرف آنا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر نے اسے عقب سے بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ نیچے گری اور فوراً ہی قلابازی کھا کر پیچھے چلی گئی ورنہ اس بار بے کی ضرب اس کے سر پر لگتی۔ بازو کی چوٹ بھی شدید تھی مگر وہ حوصلہ کر کے برداشت کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بلا توالتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مجھے تر نوالہ سمجھا تھا۔“

”مجھ سے غلطی ہوئی۔“ صوفیہ اس سے فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اسی وقت تمہارے سر میں گولی



یاسر دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا۔ رسی نے اس کی کھال رگڑ ڈالی تھی اور خون رسنے لگا تھا مگر اس کی کوشش میں ہر گز رتے لمبے تیزی آرہی تھی۔ بالآخر وہ ہاتھ رسی سے نکالنے میں کامیاب رہا۔ اب اگلا مرحلہ پستول تک رسائی کا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ دوسرا ہاتھ آزاد کراتا۔ صوفیہ اور ڈاکٹر میں سے جو غالب آتا وہ سب سے پہلے پستول پر قبضہ کرتا اور وہ دونوں ہی اس کے لیے خطرناک ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹر نے تو ثابت بھی کر دیا تھا، اسے لڑکی پر بھی بھروسہ نہیں تھا۔ اس نے پاؤں آگے کیا۔ یاسر کا قد طویل تھا مگر اس کی پہ لبائی بھی کام نہیں آرہی تھی۔ اس کا پاؤں پستول سے دوا بچ دور رہ گیا۔ اگلی بار اس نے پورا جسم کھینچا اور پاؤں کو عین پستول کے اوپر لے گیا۔ کوشش کر کے اس نے انگوٹھا پستول کے دستے پر لگایا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ پستول اس کی طرف سرکا اور اس کے بعد کام آسان ہو گیا۔ مزید دو بار پاؤں کا استعمال کرنے پر پستول اس کے ہاتھ کی حد میں آ گیا۔ اس نے پستول اٹھایا اور چلا کر بولا۔ ”رک جاؤ۔“

ڈاکٹر چونک کر سیدھا ہوا۔ صوفیہ اس کے عقب میں تھی۔ اس نے اچانک ہی ڈاکٹر کو عقب سے ہاتھ مارا اور بھاگی۔ یاسر نے پستول اس کی طرف کیا مگر فائر نہیں کیا۔ یاسر نے پستول دانتوں سے پکڑ کر اپنا دوسرا ہاتھ آزاد کرایا۔ اس۔۔۔ دوران میں ڈاکٹر ساکت کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ساٹ تھا۔ یاسر نے ہاتھ آزاد کرا کے پستول سنبھالا۔ اسی لمحے پارکنگ کی طرف سے شیور لیٹ کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ ڈاکٹر نے یاسر کی طرف دیکھا۔ ”وہ جارہی ہے لیکن میں اسے نہیں روک سکتا۔“

یاسر کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ ”کیوں؟“

ڈاکٹر کا کوٹ۔۔۔ اپنے بائیں پہلو پر تھا۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا تو وہ خون سے تر ہوا تھا۔ یاسر اس کے پاس آیا۔ ”یہ کیا ہوا؟“

”میں تمہاری طرف متوجہ ہوا اور اس نے کوئی چیز ماری۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”میرا خیال ہے اس طرف کی شریان متاثر ہوئی ہے۔“

”میرے خدا۔“ یاسر اس کے پاس آیا۔ ڈاکٹر گر رہا تھا مگر اس نے اسے پکڑ لیا۔ ”میں تمہیں اسپتال لے چلوں؟“

”نہیں۔“ وہ گہرے سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہاں سے نکلو۔ وہ پھر واپس آ سکتی ہے۔“

یاسر اسے سہارا دے کر وین تک لایا۔ اس کے دروازے کھلے تھے اور چابیاں غائب تھیں۔ یاسر نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور خود کپڑوں کے لیے گڑھے تک آیا۔ اس کے کپڑے وہیں پڑے تھے۔ کپڑے پہن کر وہ واپس آیا تو ڈاکٹر کہیں سے وین کی دوسری چابی برآمد کر چکا تھا۔ اس نے چابی یاسر کی طرف بڑھائی اور بولا۔ ”ڈرائیو کرو۔“

یاسر نے اس کا زخم دیکھا جس سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں آپ کو اسپتال لے جاتا ہوں۔“

”نہیں“ میں اسپتال نہیں جاسکتا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ میں زندگی کی آخری سانسیں جیل کی چار دیواری میں لوں۔ دوسرے تم بھی پھنسو گے اگرچہ تم نے کچھ نہیں کیا مگر دو قتل تمہارے سر بھی جائیں گے۔“

یاسر نے وین اسٹارٹ کر کے پارکنگ سے نکالی۔ ”تب میں کیا کروں؟“

”کچھ نہیں“ مجھے جھیل والے پارک تک چھوڑ دو۔“

یاسر نے نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”وہاں کیوں؟“

ڈاکٹر نے ہاتھ سے اپنا زخم دبایا ہوا تھا تا کہ خون بہنے کی رفتار سست رہے۔ اس نے سگار مانگا۔ ”میں خود سے نہیں سکا سکتا۔“

یاسر نے ڈبے سے سگار نکال کر اس کے منہ میں لگایا اور لائیٹر سے اسے آگ دکھائی۔ ڈاکٹر نے گہرا کش لیا۔

”اب اچھا لگ رہا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ اگر میرا آخری وقت آیا اور مجھے موقع ملا تو میں مرنے سے پہلے اس پارک تک آؤں گا اور یہاں بیچ پر بیٹھ کر جان دے دوں گا۔“

یاسر کو لگا جیسے اس کے اندر کچھ سرسرا رہا ہو۔ کس قدر عجیب شخص تھا۔ مرنا بھی اپنی مرضی سے چاہتا تھا۔ پارک والی جھیل یہاں سے خاصے فاصلے پر تھی مگر اس نے کہا۔

”میں آپ کو لے جاؤں گا۔“

رات کے ایک بجے سڑکیں سنان اور ٹریفک سے خالی تھیں۔ وہ بتا کہیں ر کے جھیل والے پارک تک پہنچ گئے۔ یاسر نے ممکنہ حد تک وین کو اس جگہ کے قریب روکا جہاں جھیل کے سامنے بچیں لگی تھیں۔ اس موسم میں دن کے وقت اس پارک میں خاصا رش ہوتا تھا۔ مگر رات کے اس پہر یہاں کوئی نہیں تھا۔ یاسر نے اسے سہارا دے کر وین سے اتارا اور لے جا کر ایک بیچ پر بٹھا دیا۔ ڈاکٹر نے اسے



بھی ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ ”میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”کیسے۔“

”تم اس ویگن کو پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دینا۔ اس میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو میں نہیں چاہتا کہ کسی کے ہاتھ لگیں۔“

”میں ایسا ہی کروں گا۔“

ڈاکٹر نے اپنا موبائل نکال کر دیا۔ ”اسے جھیل میں پھینک دینا۔ تم بھی مت دیکھنا اسے یہ تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔“

یاسر اب تک اس سے پوچھنے کی ہمت نہیں کر پایا تھا کہ اس نے یاسر کو قتل کرنے کی کوشش کیوں کی۔ اس وقت بھی وہ نہیں پوچھ سکا تھا مگر ڈاکٹر نے خود جواب دیا۔ ”ماجد نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہیں اس طرح سے ہونے والے قتل میں ملوث کر دوں کہ پھر تم تمام عمر اس کے چنگل میں رہو اور وہ تم سے اپنی مرضی سے کام لیتا رہے۔ اگر میں اس میں ناکام رہوں تو تمہیں قتل کر دوں۔“

”آپ نے کوشش کی تھی۔“

ڈاکٹر نے سر ہلایا اور سگار منہ سے لگانے کی کوشش کی مگر اس کا بایاں ہاتھ اوپر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ زخم پر جما ہوا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ اب تک زندہ تھا۔ ورنہ خون زیادہ بہہ چکا ہوتا اور وہ مر جاتا۔ یاسر نے پھر سگار اس کے منہ سے لگا کر اسے لائیٹر دکھایا۔ ڈاکٹر نے کش لے کر سر ہلایا۔ ”ہاں مگر میں ناکام رہا۔ شاید اس لیے بھی کہ میری خواہش تھی، میں تمہیں قتل نہ کروں۔ آج تک ایسا نہیں ہوا جب کسی شکار کے لیے میرے دل میں ایسی خواہش بیدار ہوئی ہو۔ قسمت کو تمہاری زندگی منظور تھی۔“

یاسر نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”ماجد کیا کام کرتا ہے، آپ جانتے ہیں؟“

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”برودہ فروشی، وہ یہاں سے لڑکیاں مڈل ایسٹ بھیجتا ہے۔ اس کا باقاعدہ نیٹ ورک ہے جو ملازمت کے نام پر لڑکیوں کو یہاں سے باہر بھیجتے ہیں۔ اس نے جعلی کمپنیاں بنا رکھیں۔ یہ لڑکیاں مڈل ایسٹ میں عیاش لوگوں کو فروخت کی جاتی ہیں اور وہ پھر مرتے دم تک ان لوگوں کی غلامی کرتی ہیں۔“

”مجھے خود سے کھن آرہی ہے۔ میں اتنے عرصے اس شخص کے گھر میں رہا اور اس کی کمائی پر پلٹا رہا۔“ یاسر نے دکھ سے کہا۔ ”کاش کہ ماما مجھے لے کر کہیں بھاگ جاتی۔ ہم غربت میں رہ لیتے مگر اس شخص اور اس کی کمائی سے بچ

”تم اچھے آدمی ہو اور اب تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مگر ماجد صرف ہتھیار کی زبان سمجھے گا۔“ یاسر نے ذانت پیسے۔ ”میں اس سے اسی زبان میں بات کروں گا۔“

”تم لڑکی والا پستول لے جانا۔ میرا سارا اسلحہ بہت خطرناک ہے۔ اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔“

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ یاسر نے کہا۔ پستول اس کے پاس تھا۔ اس کی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی طرف سے پھر کوئی رد عمل نہیں آیا تو اس نے دیکھا۔ ڈاکٹر کا سر جھکا ہوا تھا اور منہ میں دبا ہوا سگار رفتہ رفتہ بجھ رہا تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے کب خاموشی سے مر گیا، یاسر کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور ڈاکٹر کے منہ سے سگار نکال کر اسے شیخ پر سیدھا کر کے بٹھا دیا۔ اب کوئی قریب آ کر غور سے دیکھتا تب ہی اسے پتا چلتا کہ وہ ایک لاش دیکھ رہا ہے۔ یاسر ویگن تک آیا۔ اس نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس پر پیٹرول چھڑکا۔ اس نے اب تک عقی خانہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے وہ سارا سامان جو بیگ میں تھا اسے بیگ سمیت ڈرائیونگ کھارٹ میں ڈال دیا اور ذرا پیچھے ہٹ کر اس نے لائیٹر جلا کر ویگن کی طرف اچھال دیا۔ پیٹرول کی وجہ سے اس نے بہت تیزی سے آگ پکڑی اور لہجوں میں پوری ویگن شعلوں میں گھر گئی تھی۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وہ تیزی سے ویگن سے دور ہوا اور پھر جھیل کے کنارے آیا۔ اس نے ڈاکٹر کا موبائل نکالا اور اسے پانی میں اچھال دیا۔ پھر اس نے لڑکی کے سائلنسر لگے پستول کی طرف دیکھا اور پارک کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ جہاں وہ تھی اب وہاں اس کا جلتا ہوا معمولی سا ڈھانچا ہی بچا تھا۔ باقی سب دھماکے نے تباہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی تھی کہ ویگن میں موجود اس کے سامان میں سے کچھ بھی کسی کے ہاتھ نہ لگے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا جسے دھماکا چونکا تا۔ وہ چلتا ہوا آدھے گھنٹے بعد ہائی وے تک آیا اور وہاں سے ایک لوڈنگ ٹرک نے لفٹ دے کر کے ایف سی سے کچھ ہی دور اتارا تھا۔ جب وہ بائیک اسٹارٹ کر رہا تھا تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔

☆☆☆

روبینہ نے رات بہت بے چین گزاری تھی۔ یاسر



اچانک گیا تو اسے لگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ماجد نے اسے کہاں بھیجا تھا؟ وہ جب پوچھتی، وہ یہی بتاتا کہ اس نے اسے کام سے بھیجا ہے۔ کھانے سے پہلے ماجد نے اسے مارا اور زبان بند رکھنے کا حکم دیا تھا۔ کھانے کی میز پر کال آئی اور ماجد کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی اہم آدمی سے بات کر رہا ہے۔ کھانے کے بعد روہینہ نے پھر ماجد سے پوچھا اور اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ تب روہینہ نے فیصلہ کن لہجے میں اس سے کہا۔ ”اگر صبح تک یاسر واپس نہ آیا تو میری اور تمہاری راہیں الگ ہوں گی۔“

اس پر ماجد نے اسے دھمکی دی۔ ”ایسا صرف ایک صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک قبر میں ہو۔“

”میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“ روہینہ بولی۔  
”یاسر کو صبح تک گھر میں ہونا چاہیے۔“

ماجد رات ہیڈ روم میں نہیں آیا تھا۔ صبح سے پہلے روہینہ بستر سے نکل آئی اور اس نے ماجد کے خاص کمرے کا دروازہ بجایا۔ خاصی دیر تک اس نے کوئی جواب نہیں دیا مگر روہینہ مستقل مزاجی سے بجاتی رہی۔ وہ باقی گھر میں نہیں تھا اور پورچ میں دونوں گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ اس کے بعد یہی کمرارہ جاتا تھا جہاں وہ موجود ہو سکتا تھا۔ خاصی دیر بعد ماجد نے کمر اکھولا تو اس کی آنکھیں نشے سے بو جھل ہو رہی تھیں، وہ پیتا رہا تھا اور شاید مدہوش پڑا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ”کیا ہے؟“

”یاسر ابھی تک نہیں آیا۔“  
”وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔“ ماجد نے مخمور لہجے میں کہا تو روہینہ اس پر جھپٹ پڑی اور اس نے ناخنوں سے ماجد کا منہ نوچ لیا۔  
”ذلیل، کتے میں جتنے قتل کر دوں گی۔“

ماجد نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا، اس کے گال سے خون نکل آیا تھا۔ اس نے نفرت سے کہا۔ ”کتیا۔۔۔ تیری یہ جرات۔“  
www.paksociety.com  
کہتے ہوئے ماجد کا ہاتھ گھوما اور روہینہ پلٹ کر لاؤنج کے پاس جا گری۔ ماجد غراتا ہوا اس کی طرف آیا تھا کہ لاؤنج کے بیرونی حصے سے یاسر نمودار ہوا اور اس کے ہاتھ میں موجود پستول کا رخ ماجد کی طرف تھا۔ یاسر نے اسے خبردار کیا۔ ”بس اب ایک قدم مت بڑھانا۔“

ماجد رک گیا پھر اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے روہینہ کو دیکھا۔ ”تم اپنے بیٹے کے

لیے فکر مند ہو رہی تھیں۔ تم نے دیکھا یہ دو ہی دن میں کتنا سیکھ کر آیا۔ مجھ پر پستول اٹھا رہا ہے۔ میرا پالا ہوا پالا مجھ پر بھونک رہا ہے۔“

”بکو اس بند کرو۔“ یاسر بے قابو ہو کر اس کی طرف آیا اور پستول کی نال اس کے ماتھے پر رکھ دی۔ ”مجھے مجبور مت کرو کہ میں ابھی تمہارا بھیجا باہر نکال دوں۔“

ماجد نے کوئی اثر نہیں لیا اور نہ ہی وہ ڈرا تھا۔ وہ پھر ہنسا۔ ”دیکھا کل تک تمیز سے بات کرنے والا اب بات کرنا بھی سیکھ گیا ہے۔“

یاسر کے پُر وحشت تاثرات نے روہینہ کو بھی ڈرا دیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ ماجد پر گولی نہ چلا دے۔ اسے ماجد کی پروا نہیں تھی مگر وہ اپنے بیٹے کو قاتل کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ چلائی۔ ”یاسر گولی مت چلاتا۔“

”ماما اس شخص نے مجھے میرے قاتل کے ساتھ بھیجا تھا تا کہ وہ مجھے ٹھکانے لگا دے۔ قاتل اب زندہ نہیں ہے لیکن میں زندہ ہوں اور اب میں اسے ٹھکانے لگاؤں گا۔“  
ماجد بدستور ہنس رہا تھا۔ وہ نشے میں تھا اور شاید یہ اس کا بھی اثر تھا۔ ”ہاں اب یہ بڑا ہو گیا ہے، اسے میری ضرورت نہیں ہے، یہ خود بھی کاروبار چلا سکتا ہے۔“

”میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمہارے کاروبار پر۔“ یاسر نے اس پر تھوک دیا۔ ماجد پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ اس نے منہ کھول کر کہا۔  
www.paksociety.com  
”یہاں گولی مارو۔“

”تم کیا سمجھتے ہو میں بلف کر رہا ہوں۔“ یاسر نے کہا اور پستول ہٹا کر ذرا پیچھے ہوا۔ روہینہ پھر چلائی۔  
”یاسر ایسا مت کرنا۔“

یاسر کی توجہ ایک لمحے کے لیے روہینہ کی طرف ہوئی تھی کہ نشے میں جھولتا ہوا ماجد حیرت انگیز پھرتی سے جھپٹا اور جب تک یاسر سمجھتا، وہ پستول اس سے چھین کر اس کی نال یاسر کے ماتھے پر مار چکا تھا۔ اس کا ماتھا پھٹ گیا اور وہ کراہ کر نیچے گرا تھا۔ روہینہ نے اس بار دہشت سے چیخ ماری اور وہ یاسر کی طرف جھپٹی۔ مگر ماجد نے راستے میں اسے روک لیا۔ بازو سے پکڑ کر اس نے روہینہ کو اپنی طرف کھینچا اور اس کے سر پر اپنے سر سے نگر ماری۔ روہینہ کے لیے ایک ہی ضرب کافی ثابت ہوئی اور وہ پیچھے جا گری۔ ماجد چکراتے ہوئے یاسر کے پاس آیا اور اس کے پیٹ پر ٹھوکر ماری۔ وہ کراہ لہر دہرا ہو گیا اور اسے مزید چند ٹھوکریں اپنے گول ہوئے جسم پر سہنا پڑیں۔ ماجد اسے مارتے ہوئے دلا۔



”میرا پلٹا۔۔۔ مجھ پر ہی بھونک رہا ہے۔۔۔ تم دونوں ماں بیٹے کو ایک ہی قبر میں دفن کروں گا۔۔۔ سنا تم نے۔“ اس نے یاسر کے بال پکڑ کر کھینچے اور پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ ”اب بتا کون تمھے قتل کرے گا۔۔۔ کتے کے پلے۔۔۔ تو مجھے قتل کرنے کی بات کر رہا تھا۔۔۔“ ماجد نے اسے چند گندی گالیاں دیں۔ ”اب میں تجھے قتل کروں گا۔“ اس نے جھک کر یاسر کی گردن میں بازو ڈال کر اسے جکڑ لیا اور پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ ”کیا خیال ہے تیرا بھیجانکا لوں۔“

یاسر خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نوجوان اور ماجد کے مقابلے میں طاقتور تھا مگر وہ اس سے کہیں زیادہ تجربے کار اور سخت جان تھا۔ ماجد اسے بچ بچ قتل کرنے جا رہا تھا۔ اس نے پستول کا ٹریگر نصف دبا بھی دیا تھا لہذا چانک رک گیا۔ ”نہیں یہاں تیرے گندے خون سے میرا قالین خراب ہو جائے گا۔“

وہ اٹھا اور یاسر کو گردن سے دبوچے ہوئے باہر لان کی طرف لے جانے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اچھی بات ہے پستول پر سائلنسر لگا ہوا ہے، تجھے مار کر اسے غائب کروں گا اور پھر تیری لاش بھی غائب کر دوں گا۔ تیری ماں سے وعدہ کیا ہے تاکہ دونوں ماں بیٹے کو ایک ہی قبر میں دفن کروں گا۔ میں ایسا ہی کروں گا۔“

وہ برآمدے سے ہوتا ہوا پورچ میں آیا اور لان کی طرف مڑ رہا تھا۔ اس نے توجہ نہیں دی کہ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر آنے کے بعد یاسر نے ریموٹ سے اسے بند نہیں کیا تھا۔ اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ماجد نے اسے لان میں دھکا دیا اور پستول اس کی طرف سیدھا کیا۔ یاسر نے ہاتھ چہرے کے سامنے کر لیا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ وہ آنے والی موت کو نہیں روک سکے گا۔ مگر گولی چلنے کی آواز نہیں آئی۔ شاید ماجد اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یاسر نے چہرے سے ہاتھ ہٹایا تو ماجد اسے ڈگمگاتا ہوا نظر آیا۔ یاسر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ڈگمگا کیوں رہا ہے جیسے اپنا توازن درست کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کا دایاں پہلو یاسر کے سامنے تھا اس لیے وہ ماجد کا بایاں پہلو نہیں دیکھ سکا۔ ماجد گیٹ کی طرف گھوم رہا تھا اور تب یاسر کی نظر آگے آتی لڑکی پر گئی۔

وہ ماجد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ماجد نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا اور کانپتے ہاتھوں سے گولی چلائی۔ مگر نشانہ خطا گیا اور گولی صوفیہ کے پاس سے گزر گئی۔ صوفیہ کے سکون

میں ذرا بھی فرق نہیں آیا، وہ اسی اعتماد سے آگے بڑھتی رہی۔ ماجد نے پھر فائر کیا اور اس بار بھی گولی کہیں اور گئی۔ سائلنسر کی وجہ سے معمولی سی آواز آرہی تھی۔ تیسرے فائر کے وقت صوفیہ ماجد سے مشکل سے چار گز کے فاصلے پر تھی اور یقیناً ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا جو ماجد اتنے قریب سے بھی اس کا نشانہ نہیں لے سکا تھا۔ ورنہ یہ صریحاً خودکشی تھی۔ صوفیہ نے اسے چوتھے فائر کا موقع نہیں دیا اور لپک کر اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ کر اوپر کر دیا۔ پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے ماجد کے بائیں پہلو پر کچھ کیا اور وہ لرزنے لگا تھا۔ صوفیہ نے زور لگا کر اس کے پہلو میں دھنسا چاقو باہر نکالا تو ساتھ ہی ماجد کی کرب ناک چیخ بھی نکلی تھی۔ صوفیہ نے اسے چاقو پھینک کر مارا تھا جب وہ یاسر کو شوٹ کرنے والا تھا۔ صوفیہ نے پوچھا۔

”میری بہن کہاں ہے؟“

ماجد ایک بار پھر ہنسا اور رک رک کر بولا۔ ”تم۔۔۔ یقیناً۔۔۔ ماہ نور کی۔۔۔ بہن ہو۔“

”ہاں میں اس کی بہن ہوں۔“

”وہ۔۔۔ اب اس ملک میں۔۔۔ نہیں ہے۔“ ماجد نے جواب دیا۔ ”کسی۔۔۔ وحشی گھوڑی۔۔۔ کی طرح تھی۔ وہ مجھے۔۔۔ پسند آئی۔۔۔ مگر اس کی قیمت بہت اچھی ملتی۔۔۔ اس لیے میں نے اسے آگے بھیج دیا۔“

”کہاں؟“ صوفیہ نے پوچھا۔

ماجد پھر ہنسنے لگا۔ ”مجھے خود نہیں معلوم کہ وہ اب کہاں ہے اور اگر معلوم ہوتا تب بھی میں نہیں بتاتا۔“

صوفیہ نے اسے غور سے دیکھا اور اچانک چاقو اس کے بائیں پہلو میں اتار دیا۔ ماجد لرزنے لگا۔ صوفیہ نے کہا۔ ”یہ ماہ نور کے نام ہے۔“

ماجد نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ جھکتا ہوا نیچے گر گیا۔ صوفیہ نے اس کے پہلو سے چاقو نکال کر اس کے کپڑوں سے صاف کیا اور یاسر کی طرف دیکھا۔ ”گیٹ بند کرو۔“

یاسر بائیک کی طرف لپکا۔ اس نے جلدی سے چابی میں لگے ریموٹ کا بٹن دبا کر گیٹ بند کیا اور اندر کی طرف بھاگا اسے روبینہ کی فکر تھی۔ وہ اندر آیا تو روبینہ ہوش میں تھی مگر اپنا سر تمام کر بیٹھی ہوئی تھی۔ یاسر نے اسے سہارا دے کر صوفیہ پر بٹھایا۔ ”ماما آپ ٹھیک ہیں؟“

”ہاں۔“ اس نے خوفزدہ انداز میں کہا۔ ”وہ کہاں ہے؟“



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](http://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](http://twitter.com/paksociety1)



”کیا مطلب؟“ روینہ نے پوچھا۔

صوفیہ اندر آئی۔ اس نے روپینہ کی طرف دیکھا اور  
 یاسر سے بولی۔ ”میں جا رہی ہوں۔“

صوفیہ نے سوچا اور بولی۔ ”پہلے مجھے اس کا خاص کرا دکھاؤ۔“

”تم لوگوں کے لیے خاموشی بہتر ہے اور میں ان معلومات کی مدد سے اپنی بہن کو تلاش کروں گی۔ تمہارے لیے کچھ اچھی خبریں بھی ہیں۔ یہاں ایک تجوری بھی ہے۔“

www.paksociety.com\_صوفیہ نے اس سے کہا۔

## جاسوسی ڈائجسٹ

فروخت کر کے یہاں سے کہیں اور منتقل ہو جاؤ اور اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اس دولت کے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

یا سر سچ گج اس کا شکر گزار تھا۔ ”اب تم کیا کرو گی؟“  
 ”میں اپنی بہن کی تلاش میں باہر ملک جاؤں گی جب  
 تک وہ مل نہیں جاتی میں چین سے نہیں بیٹھوں گی۔“  
 ”باہر جانے کے لیے تمہیں بہت ساری دولت کی  
 ضرورت ہو گی۔“ یا سر نے کہا۔ ”تم اس میں سے جو چاہے،  
 لے سکتی ہو۔“

صوفیہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”جو چاہے؟“  
 ”ہاں اگر تم ساری دولت بھی لے جاؤ تو مجھے کوئی  
 اعتراض نہیں ہوگا۔“

صوفیہ کوچ کوچ رقم کی ضرورت تھی مگر اس نے رقم کے بجائے تجوری میں موجود سونا اور جواہرات لیتا مناسب سمجھا۔ ”اگر تم اجازت دو تو، میں یہ لے لوں۔“

یاسر نے یہ سب ایک چری پاؤچ میں بھر دیا۔ صوفیہ خوش ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ دولت گنتی مشکلات چسکی بجاتے ہی آسان کر دیتی ہے۔ ابھی اسے طویل سفر کرنا تھا۔ اس نے خوش ہو کر یاسر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اچک کر اسے پیار کیا۔ ”میں ہمیشہ تمہاری شکر گزار رہوں گی۔“

یاسر کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس نے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم۔۔۔۔۔“

صوفیہ نے ایک بار پھر اس کے ہونٹ بند کر دیے اور پھر سرگوشی میں بولی۔ ”تم جانتے ہو یہ ممکن نہیں ہے، ہاں اگر میں نے اپنی بہن کو تلاش کر لیا تو شاید بھی اپنی ماں اور بہن کو لے کر یہیں آ جاؤں۔“

”میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ یا سرنے کہا تو صوفیہ کی آنکھوں میں خواب اتر آئے۔ پھر وہ چونکی اور گہری سانس لے کر اس سے الگ ہو گئی۔ [v.paksociety.com](http://v.paksociety.com) ”اب میں جاؤں گی۔“

یا سراس کے ساتھ باہر آیا۔ ”اس کا کیا کردگی؟“  
 ”یہ اور گاڑی دونوں ہمیشہ کے لیے دنیا سے غائب  
 ہو جائیں گے۔“ صوفیہ نے کہا۔ ”لیکن اگر کوئی مشکل ہوگی یا  
 انہونی ہوگی تو میں تمہیں خبردار کر دوں گی۔“

صوفیہ گاڑی میں بیٹھی اور بچکے سے کل گئی۔ یا سرنے  
آسمان کی طرف دیکھ کر گہری سانس لی۔ وہ اور روہینہ اب  
آزاد تھے۔  
w.paksociety.com